تذکرہ عُلماء و صُوفیائے پاک و ہند

مآثر الکرام

مُصنّفہ

میر غلام علی آزاد بلگرامی

اردو ترجمہ

مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری

دائرۃ المصنّفین کراچی

باسمہ سبحانہٗ

تذکرۂ علماء و صوفیائے پاک و ہند

یعنی

مآثر الکرام

مصنّفہ: نابغۂ دوراں، علّامہ

میر غلام علی آزاد بلگرامی

کا

اُردو ترجمہ

(ایک بسیط اور جامع مقدمہ کیساتھ)

تعارف: پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

مقدمہ نگار: ادیب شہیر حضرت شمس بریلوی

مترجم: مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری

ناشر

دائرۃ المصنّفین۔ کراچی

پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵۰۴۔ کراچی نمبر ۱۹۔ پاکستان

نام کتاب	مآثر الکرام
مترجم	شاہ خالد میاں فاخری
اڈیشن	بار اول
تعداد	ایک ہزار
طابع	مشہور آفسٹ پریس، کراچی
ناشر	دائرۃ المصنفین، کراچی
قیمت	[redacted] پے
سال طبع	سنہ ۱۹۸۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

میں

ترجمہ ثمر آثر الکرام

کو

ثقافت اسلامی کے عظیم مربی

اور

نظریہ پاکستان کے داعی

عالیجناب ریئر ایڈمرل ایم آئی ارشد صاحب بالقابہ

چیئرمین کراچی پورٹ ٹرسٹ

کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں

زتو چشم قبول آرزو دارم

شاہ محمد خان الزماں

فہرست مقدمہ مآثر الکرام

باسمہٖ سبحانہٗ

سخن ہائے گفتنی

الحمد للہ کہ طبقات علماء و صلحائے بلگرام (ہند) پر گرانقدر تصنیف "مآثر الکرام" کا اُردو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں آپ کے سامنے پیش کرنی ہیں جن کو "سخنہائے گفتنی" کے علاوہ اور کہیں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"مآثر الکرام" کے ترجمہ کا محرکِ خاص تو کتاب کی بلند پائیگی اور اس کی گراں مائیگی ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی نے بارہویں صدی ہجری میں مسلمانانِ برصغیر کی علمی اور ثقافتی تاریخ کو بڑی درایت اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے لیکن فارسی زبان آج عمومی زبان کے بجائے خصوصی زبان ہو گئی ہے اور ہر ایک تعلیم یافتہ شخص فارسی متون سے بہرہ اندوز اور مستفید نہیں ہو سکتا اس لیے شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ "مآثر الکرام" کو اُردو میں منتقل کیا جائے۔

میرے مکرم و محترم دوست حضرت شمس بریلوی نے مجھے اس جانب متوجہ کیا اور ترجمہ کیلئے "مآثر الکرام" مرحمت فرمائی۔ میں اس سلسلہ میں شاید کوئی عذر پیش کر دیتا لیکن جب میں نے کتاب کا مطالعہ کیا تو اس میں اپنے اسلاف کرام اور اجداد کا ذکر پاکر میرے شوق کی کوئی حد نہ رہی۔ مآثر الکرام میں کئی جگہ میرے مورث اعلیٰ افضل الاقطاب شیخ محمد افضل الہ آبادی، قطب الاقطاب شاہ محمد یحییٰ معروف بہ شاہ خوب اللہ الہ آبادی، قطب المحدثین شاہ محمد فاخر محدث زائر الہ آبادی، قطب الاولیاء شاہ محمد ناصر افضلی الہ آبادی قدست اسرارہم کا ذکر مصنف نے اُن کے کمالاتِ ظاہری و باطنی کے ساتھ کیا ہے میرے لیے مآثر الکرام کا ترجمہ حضرت شمس بریلوی کی صرف فرمائش نہیں رہا بلکہ "دودمانِ فاخریہ" کے ایک ادنیٰ خادم اور نام لیوا کی حیثیت سے یہ میرا فرض بن گیا کہ میں جلد از جلد اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دوں، تاکہ اپنے اسلاف کرام کا کچھ حق ادا کر سکوں۔

بتوفیقِ ایزدی چند ماہ میں اس کے ترجمہ سے فراغت پائی۔ چونکہ کتاب کا موضوع "طبقات العلماء طبقات الصوفیہ" ہے۔ اس لیے شدت سے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کتاب پر ایک ایسا مقدمہ

بھی ہونا چاہیے جو قاری کو "طبقات" جیسے اہم موضوع سے روشناس کرا سکے تاکہ کتاب کی افادیت میں کوئی خلا باقی نہ رہے۔

میرے محترم حضرت شمس بریلوی ایک ادیب شہیر کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں آپ کے نام سے متعدد گرانقدر کتابوں مثلاً غنیۃ الطالبین، تاریخ الخلفاء، عوارف المعارف اور نفحات الانس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ یہ تراجم اپنی سلاست بیان اور شگفتگی طرز ادا کے باعث اتنے پسند کیے گئے ہیں کہ ہر ایک ترجمہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

شمس صاحب کے تراجم کی کامیابی اور پسندیدگی ان کے مقدمات کی بہت کچھ مرہون منت ہے۔ میں نے محترمی شمس صاحب سے "مآثر الکرام" پر مقدمہ کی نگارش کی استدعا کی جس کو انہوں نے قبول فرمالیا، اور "مآثر الکرام" پر ایک جامع اور مبسوط مقدمہ لکھ کر ترجمہ کی دلکشی و دلپذیری اور قبولیت کے اسباب مہیا فرما دیئے۔

ترجمہ کے دوران میں نے چاہا کہ حضرت شاہ محمد افضل بانی دائرہ شاہ اجمل الہ آباد، حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی، حضرت شاہ محمد فاخر محدث زائر اور حضرت شاہ محمد ناصر افضلی کے مختصر حالات بطور ضمیمہ قلمبند کروں تاکہ ان حضرات کے سوانح اور حالات بھی قارئین کی دلچسپی کا سامان فراہم کر سکیں، لیکن یہ خیال کر کے کہ کہیں میرا یہ عمل ایسا آئینہ نہ بن جائے جس میں آئینہ ساز خود اپنا منہ دیکھنا چاہتا ہے لہٰذا اس خیال سے دستبردار ہو گیا۔ جو حضرات ان صاحبانِ فضل و کمال کے حالات سے آگہی کے خواہاں ہیں وہ میرا مترجمہ "تذکار اولیاء" ملاحظہ فرمائیں۔ اس تذکرہ میں قدرے تفصیل سے میں نے اپنے اسلاف کرام کو روشناس کرایا ہے۔ اگرچہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ پھر بھی اس "بدنام کنندہ نکو نامے چند" سے جو کچھ بن پڑا اس کی انجام دہی پر مسرور ہوں۔

میں حضرت شمس بریلوی اور اپنے مکرم و محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب پی ایچ ڈی کا صد درجہ شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے مقدمہ اور تعارف لکھ کر میرے ترجمہ "مآثر الکرام" کو رونمائی کے قابل بنا دیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام میری اس کوشش کو پسند فرمائیں گے تاکہ آئندہ بھی اس راہ میں قدم اٹھا سکوں۔

یہ کتاب " دائرۃ المصنفین کراچی" کی پہلی پیشکش ہے۔ دائرہ المصنفین جلد ہی " رجال" پر چند اہم کتابیں شائع کرنے والا ہے جن کی اس دور میں شدید ضرورت ہے۔ تالیف و ترجمہ کا کام تیزی سے جاری و ساری ہے۔ مستقبل قریب میں آپ کی خدمت میں ایک گرانقدر کتاب انشاء اللہ پیش کی جائے گی۔

آپ کا مخلص

سید شاہ محمد خالد فاخری

رکن

دائرۃ المصنفین کراچی

تعارف

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری
صدر: شعبۂ اُردو، وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج، کراچی

علاقہ اودھ میں مسلم اقتدار کی روایت کا آغاز سپہ سالار مسعود غازیؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے ہوا۔ ان کا مزار شریف بہرائچ میں واقع ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے قیام سے پہلے بعض مقامات پر مسلمان آباد ہو چکے تھے۔ محمود غزنوی کے قدم قنوج تک پہونچے۔[1] غوری کی کوششوں کے نتیجہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی دہلی میں قیام حکومت کے بعد مسلمانوں کے قدم پورب کی طرف بڑھے اور بقول علامہ سلیمان ندوی مرحوم جب اسلام کے علم و فضل کا موکب دہلی سے آگے بڑھا تو اس کی پہلی منزل بدایوں تھی، اور اس کے بعد کڑہ[2]۔ یعنی اودھ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اودھ میں بلگرام مسلمانوں کی اوّلین بستیوں میں سے ہے۔

عہدِ تغلق میں نظام الدین اولیاؒ بدایونی کے دو نامور خلیفہ شمس الدین یحییٰؒ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی روحانی تجلیوں نے تو ایک عالم کو روشن کر دیا۔ اس علاقہ میں شیخ علاؤ الدین نیلیؒ، مخدوم جہانگیر اشرف سمنانیؒ اور احمد عبدالحق ردولویؒ وغیرہ وہ مشہور و معروف عارفانِ باصفا ہے ریا گزرے ہیں کہ جن کی اسلامی خدمات کی گرمی آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

لہ شرائف عثمانی (بحوالہ ماثر الکرام مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۸) میں بلگرام کی فتح ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں بتائی گئی ہے اور اس سلسلہ میں تین اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں۔ سادات واسطیہ زیدیہ نے ترمیم و اصلاح کے بعد ان ہی اشعار کو اپنے حسب حال بنا لیا ہے۔ (قلمی بیاض سید تقی رضا بلگرامی) اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ شیوخ و سادات بلگرام فتح بلگرام کا شرف حاصل کرنے کے لیے اس نوع کے اشعار لکھتے رہے ہیں۔

لہ۲ حیات شبلی (مقدمہ) صفحہ ۷

جب غیاث الدین تغلق نے ہندوستان کی حکومت کو استحکام بخشا تو اس کے نامور بیٹوں ظفر خاں اور جونا خاں کے نام پر ظفرآباد اور جونپور دو شہر آباد ہوئے۔ خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جونپور کو مرکز بنایا اور اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے آزاد شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کا پایہ تخت جونپور قرار پایا۔

سلاطین شرقیہ کی معارف پروری و علم دوستی کی وجہ سے یہ شہر علماء و فضلا کا مرکز بن گیا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی جیسے اکابر علماء یہاں سکونت پذیر ہو گئے اور اس علاقہ میں مسلمانوں کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اودھ کے بہت سے قصبات و قریات مثلاً بلگرام، چریاکوٹ، گوپامئو، خیرآباد، کاکوری، سندیلہ، موہان، جائس، امیٹھی اور مبارک پور وغیرہ علماء و مشائخ کی سکونت کی وجہ سے علم و فضل، شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کے مرکز قرار پائے۔ ملا محمود جونپوری، ملا احمد عرف جیون امیٹھوی، ملا مبارک گوپاموی، ملا احمد اللہ سندیلوی، صفت اللہ خیرآبادی، ملا محب اللہ الہ آبادی، نظام الدین سہالوی، اور ملا عبد العلی بحر العلوم وغیرہ آسمانِ علم و فضل کے وہ آفتاب و ماہتاب ہیں کہ جن کی روشنی سے علمی دنیا ہمیشہ منور رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہجہاں بادشاہ نے ایک موقع پر کہا کہ:-

"پورب شیراز مملکتِ ما است"

جس علاقہ پر آج کل اودھ کا اطلاق ہوتا ہے دور اکبری میں وہ علاقہ دو صوبوں اودھ اور الہ آباد پر مشتمل تھا۔ آئین اکبری کے مطابق اودھ میں پانچ سرکاریں (۱) اودھ (۲) بہرائچ (۳) خیرآباد (۴) گورکھپور (۵) لکھنؤ اور صوبہ الہ آباد میں نو سرکاریں (۱) الہ آباد (۲) بنارس (۳) جونپور (۴) جناوہ (۵) غازی پور (۶) کٹرا (۷) کوڑہ (۸) کالپی اور (۹) مانک پور تھیں۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی اس علاقہ کی علمی سرگرمیوں پر مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:-[۱]

اگرچہ جمیع صوبجات ہند بوجود طالبان علم تفاخر دارند لیکن صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں

اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبے علماء کے وجود سے مفتخر ہیں۔ مگر صوبہ اودھ اور الہ آباد ایسی خصوصیت

یافت، چہ در تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الٰہ آباد بہ فاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفا و نجبا است کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسانِ عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہان کشادہ و صلائے اطلبوا العلم در دادہ، طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے می روند و ہر جا موافقت بہم دادہ و بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقانِ ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ می دارند و خدمت این جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند۔

رکھتے ہیں کہ جو کسی اور صوبہ میں نہیں پائی جاتی۔ تمام صوبہ اودھ اور اکثر صوبہ الٰہ آباد میں پانچ کوس پر یا زیادہ سے زیادہ دس کوس پر اشراف و معززین کی آبادیاں ہیں اور انکو سلاطین و حکام (سلف) سے وظیفے، زمین اور مدد معاش حاصل ہے۔ انہوں نے مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کیں اور موجودہ زمانہ کے علما ہر جگہ طلبہ پر علم کے دروازے کھولے ہوئے ہیں اور "علم طلب کرو" کا اعلانِ عام ہے۔ طلبہ جوق در جوق ایک شہر سے دوسرے شہر (طلب علم کیلئے) پہونچتے ہیں اور جہاں سہولت ہوتی ہے وہاں تحصیلِ علم میں مشغول ہوتے ہیں اور ہر بستی کے صاحب استطاعت حضرات طلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ سمجھتے ہیں۔

جب برہان الملک سعادت نیشاپوری نے اس علاقہ کی حکومت سنبھالی تو علم و فضل کی یہ فضا مرجھا کر رہ گئی ایران و توران کا قضیہ آڑے آیا۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں [1]

تا آنکہ برہان الملک سعادت خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اودھ شد اکثر بلاد عمدہ الٰہ آباد نیز مثل دار الخیر جونپور و بنارس و غازی پور وکڑہ و مانکپور و کوڑہ جہان آباد وغیرہا ضمیمہ حکومت گردید و وظائف و سیور غالات خانوادہائے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد و کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم

یہاں تک کہ محمد شاہ (بادشاہ دہلی) کی تخت نشینی کے آغاز میں برہان الملک سعادت خاں صوبہ اودھ کا حاکم ہو گیا اور بہت سے عمدہ عمدہ شہر مثلاً الٰہ آباد، جونپور، بنارس، غازی پور، کڑہ، مانکپور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ اسکی حکومت میں شامل ہو گئے۔ پرانے اور نئے خاندانوں کے وظیفے اور معافیاں یک قلم ضبط کر لی گئیں۔ شریفوں اور نجیبوں کا کام بگڑ گیا اور وہاں کے لوگوں کی معاشی

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۲

بازداشتہ وپیشہ سپاہگری انداخت و رواج تدریس و تحصیل باآں درجہ نماند و مدارسیکہ از عہدِ قدیم معدنِ علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد۔

پریشانیوں نے انکو تحصیلِ علم سے باز رکھا انہوں نے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور علم کی تدریس و تحصیل کا ویسا رواج نہ رہا اور وہ مدرسے جو قدیم زمانہ سے علم و فضل کا مرکز تھے، خراب و برباد ہوگئے اور ارباب کمال کی انجمنیں بڑی حد تک منتشر ہوگیئں۔

میر غلام علی آزاد بن سید نوح (پیدائش ۲۵ رصفر ۱۱۱۶ھ مطابق ۹ جون ۱۷۰۴ء، انتقال ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء) بلگرام کے مشہور خانوادہ سادات زیدیہ کے معزز رکن ہیں۔ انہوں نے علوم متداولہ کی باقاعدہ تحصیل کی تھی، وہ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف سے فطری مناسبت تھی۔ انہیں ملازمت، دربار اور مصاحبت کا خاص سلیقہ تھا۔ آزاد بلگرامی نے تذکرہ نویسی کی طرف خاص طور سے توجہ دی۔ انکو علم رجال و انساب وسیر سے خاص مناسبت تھی۔ اس موضوع پر ان کی مندرجۂ ذیل کتابیں ہیں۔

۱۔ سبحۃ المرجان فی آثارِ ہندوستان (عربی)

۲۔ روضۃ الاولیاء

۳۔ ید بیضا

۴۔ سروِ آزاد

۵۔ خزانۂ عامرہ

۶۔ مآثر الامراء، مؤلفہ صمصام الدولہ شاہنواز خان (ترتیب و تہذیب)

۷۔ مآثر الکرام تاریخ بلگرام

سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان

آزاد بلگرامی نے یہ کتاب ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳ء میں عربی زبان میں لکھی۔ اس کی چار فصلیں ہیں، پہلی فصل میں احادیث وغیرہ کی روشنی میں ہندوستان کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اس فصل کا ماخذ انکی کتاب "شمامۃ العنبر" ہے۔ دوسری فصل علماء اور فضلائے ہند کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی کتاب "تسلیۃ الفواد" سے کام لیا ہے۔ تیسری فصل صنائع و بدائع اور محاسن کے کلام کے

بیان میں ہے اور چوتھی فصل عاشق و معشوق کی خصوصیات سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں آزاد نے ہندوستان کی موسیقی اور ناٹکہ بھید پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں بمبئی سے طبع ہوئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ انجمن ترقی اُردو (کراچی) کے کتب خانہ میں اصل اور ترجمہ دونوں موجود ہیں۔

سبحۃ المرجان کے پہلے اور دوسرے باب کا فارسی ترجمہ شمس الدین بن شاہ وارث علی بنارسی نے بنارس کے راجہ مہاراج ایسری پرشاد کی فرمائش پر کیا۔ اور تیسرے اور چوتھے باب کا فارسی ترجمہ خود آزاد بلگرامی نے غزلان الہند کے نام سے اپنے دوست اور شاگرد عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی کی فرمائش پر کیا تھا۔[1]

روضۃ الاولیاء

آزاد بلگرامی ایک مدت تک دکن میں رہے۔ اعزاز و مناصب سے سرفراز ہوئے۔ خلد آباد (دکن) میں انکی آخری آرامگاہ ہے۔ انہوں نے خلد آباد کے بزرگوں کے حالات میں ایک کتاب روضۃ الاولیاء تقریباً ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں فارسی زبان میں لکھی ہے۔ یہ کتاب مطبع اعجاز صفدری حیدر آباد دکن میں سنہ ۱۳۱۰ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

ید بیضا

سیوستان (سندھ) کے دوران قیام آزاد نے فارسی شعرگو شعراء کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے جس کا نقش اول ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں تیار ہوا۔ اہلِ ذوق نے اس تذکرہ کی متعدد نقلیں لیں۔ سنہ ۱۱۴۷ھ میں جب وہ سندھ سے براہ لاہور وطن جا رہے تھے تو فقیر اللہ آفریں لاہوری نے نہایت اشتیاق سے اس کا مسودہ اول لے لیا۔ آزاد لکھتے ہیں[2]

چوں از بلاد سندھ عطف عنان نمودم و ہفتم رجب سنہ سبع و اربعین مائۃ و الف (۱۱۴۷ھ) وارد لاہور شدم و تا دوازدہم ماہ مذکور در انجا اقامت اتفاق افتاد۔ ملاقات مشارالیہ بمرات واقع شد، مسودہ اول تذکرہ "ید بیضا" تالیف فقیر کہ نقش ناتمام بود، خواہ مخواہ گرفت۔

جب میں علاقہ سندھ سے واپس ہوا تو ۷ رجب ۱۱۴۷ھ کو لاہور پہونچا اور ماہ مذکور (رجب) کی ۱۲ تاریخ تک وہاں رہنے کا اتفاق ہوا۔ مشارالیہ (آفریں لاہوری) سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ فقیر (آزاد) کی تالیف تذکرہ "ید بیضا" کا مسودہ اول کہ جو ناتمام نقش تھا زبردستی لے لیا۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۸
[2] سرو آزاد (حیدر آباد دکن ۱۹۱۳ء) ص ۲۰۵

الہ آباد کے دورانِ قیام میں آزاد کو تازہ مواد ملا اور انہوں نے پہلے نسخہ کو منسوخ کر کے ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۵ء میں "ید بیضا" کا نیا نسخہ تیار کیا[1]

اس نادر تذکرہ کا ایک خطی نسخہ کتب خانہ خانقاہ گیلانی (اوچ) میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔ یہ نسخہ بہت صحیح اور خوشخط نقل ہوا ہے، جس کا ترقیمہ درج ذیل ہے۔

"حصل الفراغ من تحریر ہذہ النسخۃ المبارکۃ المرغوبۃ الموسومہ بہ "ید بیضا" فی تذکرۃ الشعراء من تصنیف العلامہ فہامہ سید غلام علی المتخلص بہ آزاد روز پنجشنبہ وقت عصر بتاریخ ہژدہم ماہ ربیع الثانی ۱۲۳۲ھ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام حسب فرمائش مخدوم صاحب قبلہ خداوند صورت و معنی ادام اللہ اجلالہٗ و اقبالہٗ و افضالہٗ۔ دستخط فقیر حقیر پر تقصیر شاہ محمد ولد گل محمد قریشی ساکن بھوترو اہن غفرلہٗ۔"

سروِ آزاد

پہلے آزاد کا منصوبہ تھا کہ شعراء و علماء و صوفیہ کا ایک تذکرہ مآثر الکرام کے نام سے لکھا جائے۔ لیکن بعد کو شعراء کا تذکرہ سروِ آزاد کے نام سے علیحدہ شائع کیا اور اس کو مآثر الکرام کی دوسری جلد قرار دیا۔ اس تذکرہ میں ۱۴۳ فارسی گویوں اور آٹھ بھاکا زبان میں شاعری کرنے والے شعراء کے حالات شامل ہیں۔ فارسی گو شعراء میں ۲۹ بلگرامی شاعر شامل ہیں۔ ہندی زبان میں اظہارِ خیال کرنے والے سب کے سب اہلِ بلگرام ہیں۔ اس تذکرہ کی تاریخ تالیف مندرجہ ذیل قطعہ سے نکلتی ہے۔

خوش مشاطۂ کلک ہنر مند	بر رخسار ورق مالیدہ غازہ
شنو از قمریان غیب تاریخ	نشاند آزاد سروِ سبز تازہ

۱۱۶۶ھ

سروِ آزاد ۱۹۱۳ء میں عبداللہ خان (حیدر آباد دکن) کے حسنِ اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کی تلخیص جعفر حسین دیوبندی ملازم سرکار بھوپال نے ۱۲۸۳ھ میں کی تھی۔ جو خاکسار محمد ایوب قادری کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

خزانۂ عامرہ

آزاد بلگرامی کے بھتیجے اولاد محمد نے ان سے تحریک کی کہ ان شعراء کا ایک تذکرہ لکھا جائے کہ جو ملوک و امراء کے دربار سے وابستہ رہے ہوں اور مدح گستری کے صلہ

---

[1] سروِ آزاد (حیدر آباد دکن ۱۹۱۳ء) ص ۳۰۵

یں انعام واعزازات سے سرفراز ہوئے ہوں۔ آزاد نے اس نوع کا تذکرہ "خزانۂ عامرہ" کے نام سے ۱۱۷۱ھ میں مرتب کیا۔ آزاد نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے [1]

آزاد رستم نمود نو تذکرہ — در جیب ورق ریخت نقود سرہ
گنجور خرد گوہر تاریخ نشاند — حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ

اس تذکرہ میں ۱۳۵ شعرائے ایران وہندوستان (۱۱۷۱ھ) کا حال مع نمونۂ کلام درج ہے اس بزم شعراء میں بشمول آزاد (۷) سات بلگرامی ہیں۔ شعراء کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ، نظام الدولہ ناصر جنگ، امیر الممالک سید محمد خان، دوسرے ہم عصر امراء کے حالات اور مرہٹوں اور ابدالی کی جنگ کی کیفیت وغیرہ بھی لکھی گئی ہے۔ ولیم چیمبرز، آزاد کے ایک ہم عصر تھے۔ انہوں نے خزانۂ عامرہ کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ [2]

مآثر الامراء

۱۱۷۱ھ میں صمصام الدولہ شاہ نواز خاں مؤلف مآثر الامراء شہید ہو گئے۔ انکا گھر بار اور مال واسباب لٹ گیا۔ سارا کتب خانہ برباد ہو گیا۔ کتابوں کے پرزے پرزے بکھر گئے۔ صمصام الدولہ شاہنواز خاں کے محب صادق میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس قابل قدر کتاب مآثر الامراء کی تلاش کو جاری رکھا۔ ایک سال کے بعد اس کا سراغ ملا اور اس کے مختلف اجزاء ہاتھ لگے۔ درمیان سے اوراق غائب تھے۔ بہت محنت کے بعد ان منتشر اوراق کو مرتب کیا گیا۔ آزاد بلگرامی نے قطب الملک عبداللہ خاں، امیر الامراء حسن علی خان، نواب آصف جاہ اول اور ان کے فرزند نظام الدولہ کے حالات اپنی تالیف سرو آزاد سے لیکر شامل کیے۔ آزاد نے ایک خطبہ وتمہید اور مؤلف کتاب صمصام الدولہ شاہنواز خاں کے حالات بھی لکھ کر شامل کر دیئے۔ اس طرح آزاد بلگرامی نے مآثر الامراء کی تدوین وترتیب وتہذیب کے فرائض باحسن وجوہ انجام دیئے۔ [3]

مآثر الکرام

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مردم خیز خطہ بلگرام کے علماء فضلاء وصوفیہ وشعراء کے حالات لکھنے شروع کیے کہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں اچانک حرمین شریفین کا قصد کر لیا اور یہ کام نامکمل

[1] خزانۂ عامرہ (مطبع نولکشور کانپور ۱۸۷۱ء) ص ۳
[2] مآثر الکرام ص ۳۶
[3] مآثر الامراء از صمصام الدولہ شاہنواز خان (اردو ترجمہ از محمد ایوب قادری) (مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۸ء) جلد اول ص ۱۱، ص ۲۳، ۲۵

رہ گیا۔ واپسی کے بعد جب ان کو دکن میں سکون ملا تو انہوں نے اس کتاب کو مکمل کیا اور شعرا کے حالات سروِ آزاد کے نام سے علیحدہ جلد میں مرتب کر دیئے۔ اور صوفیہ و علماء و فضلاء کے حالات کو مآثر الکرام کا نام دیا۔ اس کی ترتیب کی تاریخ "مختار مسک" سے نکلتی ہے۔ ۱۱۶۶ھ

آزاد نے نہایت سعی و کوشش سے مواد فراہم کیا، کتابوں کے علاوہ سجلات و فرامین اور دوسرے کاغذات اور دستاویزوں کو بھی پیش نظر رکھا، واقف کار اور باخبر لوگوں سے حالات معلوم کئے۔ اس طرح یہ کتاب "مآثر الکرام تاریخ بلگرام" مرتب ہوئی۔ مآثر الکرام کے مآخذ میں مندرجہ ذیل کتابوں کا حوالہ خاص طور سے ملتا ہے۔

مرآۃ المستبدین (شریف بلگرامی)، اخبار الاصفیا (عبد الصمد) گلزار ابرار (غوثی)، سبع سنابل (میر عبد الواحد بلگرامی) نفحات الانس (جامی)، دبستان المذاہب (ذو الفقار موبد) منتخب التواریخ (ملا عبد القادر بدایونی) نفائس المآثر (میر علاؤ الدولہ) لسان الزماں (شیخ محمد عقلیہ مکی) اعلام الانام (شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی) احوال مشائخ ہند (سید شریف) طبقات الکبریٰ (شعرانی) طبقات شاہجہانی، معارج الولایۃ (عبد اللہ خویشگی) مرآۃ العالم (بختاور خان) تحفہ شرح منہاج (ابن حجر مکی) کشف الظنون، اخبار الاخیار (شیخ عبد الحق) تاریخ طبری، تاریخ مشائخ سندھ، تاریخ فیروز شاہی (برنی) وغیرہ۔

مآثر الکرام دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں ۸۰ صوفیہ کا تذکرہ ہے، جن میں سے اکسٹھ ۶۱ مشائخ خاص بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے ایک خاتون ہیں۔ بقیہ ۱۹ حضرات دوسرے مقامات کے رہنے والے ہیں۔ ان میں سے پانچ عہدوان (بیرونِ ہند) سے تعلق رکھتے۔ بقیہ چودہ ۱۴ حضرات کا تعلق کسی نہ کسی طرح مشائخ بلگرام یا غلام علی آزاد بلگرامی سے منسوب ہے۔ آزاد بلگرامی نے ملا عبد القادر بدایونی مورخ دورِ اکبری اور شیخ محمد حیات سندھی محدث کو صوفیہ میں شمار کیا ہے۔ بلگرام کے اکسٹھ صوفیہ میں سے ۲۳ بزرگ خاص آزاد بلگرامی کے خاندان زیدیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری فصل تہتر ۷۳ علماء و فضلاء کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تیس ۳۰ بلگرام نژاد ہیں۔ اور ان میں سے سترہ آزاد کے خاندانِ زیدیہ کے ارکان ہیں۔ خود آزاد دونوں مجالس (صوفیہ و علماء) میں رونق افروز ہیں۔ جب ہم اس فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو ملک گیر شہرت کے بزرگ کم ہی نظر آتے ہیں۔ تعجب ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی بھی اس بزم میں بار نہ پا سکے۔ دیار سندھ سے لعل شہباز قلندر کا ذکر طبقۂ فضلا

میں کیا گیا ہے اور مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی (ف ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰-۶۱ء) جیسے اکابر علماء کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے[1]

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے ان تذکروں کے ردعمل کے طور پر بلگرام کے دوسرے خاندانوں کے اہلِ قلم نے بھی قلم اُٹھایا۔ اور نہ صرف آزاد سے اختلافِ رائے کیا بلکہ ان کے بعض مندرجات کا رد بلیغ کیا جیسا کہ مندرجہ ذیل کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ شرائف عثمانی شیخ غلام حسین ثمین کی تالیف ہے جو مآثر الکرام اور سرو آزاد کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ ثمین، شرائف عثمانی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:[2]

"جب آزاد نے اپنی دو کتابیں مآثر الکرام اور سرو آزاد دکن سے بلگرام بھیجیں اور وہ فضلاء و روسائے بلگرام کی نظر سے گزریں تو وہ حیران و ششدر رہ گئے کیونکہ مآثر الکرام کے اکثر بیانات "تاریخ و اسناد و حقائق و ذرائع" کے خلاف تھے۔ اس کتاب کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ساقط از اعتبار ہے۔ آزاد کے ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی سے رجوع کیا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلہ میں آزاد سے دریافت کیا اور وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔"

شیخ غلام حسین ثمین کے یہ بیانات کچھ سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ ان کی تصدیق کسی اور ذرائع سے نہیں ہوتی۔

۲۔ تحقیق السداد فی مزلات الآزاد محمد صدیق سخنور عثمانی بلگرامی نے مآثر الکرام اور سرو آزاد کے جواب میں یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں آزاد کے اسلوبِ بیان اور شاعری پر خاص طور سے تنقید کی گئی ہے، لہجہ سخت اور درشت ہے۔ تحقیق السداد کے جواب میں آزاد کے شاگرد عبدالقادر نے ایک کتاب "تادیب الزندیق فی تکذیب الصدیق" لکھی۔

شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ مدراس کے مشہور مصنف و عالم ملا محمد باقر آگاہ (ف ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء) نے آزاد کی تصانیف اور شاعری میں چار سو سے زیادہ غلطیاں نکالی ہیں۔ اور اس کتاب کا نام "چہار صد ایراد بر کلام آزاد" یا "عشرات آزادیہ" رکھا ہے۔ اس کے نسخے شروانی کلیکشن، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور

---

[1] مولوی عبدالحق بابائے اُردو نے مآثر الکرام (طبع اول) کے مقدمہ میں تبصرہ کیا ہے کہ آزاد نے مرتضیٰ بلگرامی کے حالات نہیں لکھے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ مآثر الکرام کی تالیف کے وقت سولہ سال کے تھے۔ ان کا ذکر ان کے دادا سید قادری کے ذیل میں بنام سید محمد مقتدیٰ کیا ہے۔ بلگرام کے مختلف شجروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ ان کا بچپن کا نام ہے بعد کو انہوں نے "مرتضیٰ" نام قرار دیا تھا۔ مآثر الکرام ص۳ (مقدمہ) لیکن آزاد نے کہیں بھی اس کا اشارہ نہیں کیا ہے، حالانکہ تالیف کتاب ۱۱۶۶ھ کے بعد وہ ۱۲۰۰ھ میں فوت ہوئے۔

کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں۔

اسی طرح وارستہ سیالکوٹی نے بھی آزاد بلگرامی کی شاعری پر اعتراضات کیے ہیں اور انکی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الشعرائے وارستہ یا جنگ رنگا رنگ [۱]

یہ حقیقت ہے کہ آزاد نے تذکرہ نویسی کے ضمن میں قابل قدر کام کیا ہے۔ بعض غلطیوں یا تسامحات کے باوجود ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں [۲]

"اس میں کلام نہیں کہ معاصر تاریخی واقعات کے بیان میں آزاد نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ واقعات سنین میں حزم و احتیاط کی وجہ سے مآثر الکرام اور سرو آزاد کو دیگر کتابوں میں ایک امتیاز حاصل ہے اکثر محققین و مورخین نے آزاد کے بیانات کی صحت کو سراہا ہے اور ان کے حین حیات میں ہی بعض اقتباسات کے انگریزی تراجم، انگریز مورخوں کی توجہ کا مرکز رہ چکے ہیں۔"

آگے چل کر پھر ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں [۳]

"تذکرہ نگاری میں تاریخی واقعات کی طرف کا جو التزام علامہ آزاد نے کیا ہے اس سے یہ تذکرے تاریخی معلومات کا گنجینہ بن گئے ہیں۔ خصوصاً مآثر الکرام کے ہر دو حصے تاریخی حالات کا نادر و نایاب ذخیرہ ہیں۔ بظاہر حصہ اول بلگرام کے مشاہیر کا تذکرہ ہے لیکن ضمناً بعض اشخاص کے حال میں ہند و بیرون ہند کے واقعات بھی رقم ہوئے ہیں۔"

بڑی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ ہمارے فاضل دوست حضرت مولانا محمد خالد فاخری صاحب نے اس قابل قدر تذکرہ مآثر الکرام کا اردو ترجمہ کیا ہے اور اسکو باسم تاریخی "تذکرۂ عباد ۱۴۰۲ھ" اور "ذکر اصحاب فکر ۱۴۰۲ھ" سے موسوم کیا ہے۔

ترجمہ نہایت صاف اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں حسب ضرورت حواشی بھی لکھے ہیں، جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

محمد ایوب قادری

یکم جنوری سنہ ۱۹۸۳ء

مطابق ۱۵ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۳ھ بروز شنبہ

اے ۱۷۴/۱ این بلاک، شمالی ناظم آباد، کراچی ۳۳

---

[۱] مآثر الکرام صفحہ ۲۰-۲۱
[۲] ایضاً صفحہ ۲۲-۲۳
[۳] ایضاً صفحہ ۲۴-۲۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

مقدمہ

از ادیب شہیر علّامہ شمسؔ بریلوی

تاریخ کا موضوع جس قدر وقیع ہے اتنا ہی وسیع ہے پھر یہ کہ تاریخ کی انواع یا اسکی فروع اس قدر ہیں کہ ان سب کا استقصا اور احاطہ کرنے کیلئے دفتر کے دفتر درکار ہونگے اور پھر بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کے مصداق یہ کہنا دشوار ہوگا کہ ان تمام انواع کا بھرپور طریقہ سے اور سیر حاصل طور پر تعارف کرا دیا۔

میں یہاں تاریخ کی تعریف اور اس کے ادوار بیان نہیں کروں گا کہ معرفت زمان و مکان واحوال وحوادث، قصص الانبیاء، مللِ قدیمہ جس کا دائرہ ہبوطِ آدم علیہ السلام سے طوفانِ نوح علیہ السلام تک اور طوفانِ نوحؑ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک، تعمیرِ کعبہ سے حضرت یوسف علیہ السلام تک اور ان کی سلطنت سے بنی اسرائیل کے خروج تک۔ بنی اسرائیل کے خروج اور سرگردانی تیہ سے حضرت داؤد تک، حضرت داؤد علیہ السلام سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیرِ ہیکل تک اور تعمیرِ ہیکل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک، پھر طلوعِ اسلام سے ہجرتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تک تاریخ عالم کا ایک ایسا سلسلہ (مربوط وغیر مربوط) چلا آتا ہے کہ ان کڑیوں کا شمار اور اس طویل مدت کے بے شمار واقعات کا بیان کرنا دشوار ترین مرحلہ ہے اور وہ بھی کسی کتاب کے مقدمہ کے طور پر جبکہ اس کو معرضِ تحریر میں لانے کے لیے تو ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہیں۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا یہ تو تاریخ انبیاء (علیہ السلام) کے خد وخال تھے۔ غیر اسلامی سلسلۂ تاریخ کو دیکھئے تو حمیر کی تاریخ، آلِ غسان کا ذکر، سدِّ مآرب کی تفصیل، اہلِ یمن اور صنعاء کا تعارف اور پھر غلبۂ فارس!

غلبۂ فارس کی طرف نظر اُٹھائیے تو بادشاہ کیومرث سے سلسلہ شروع کرنا ہوگا ہخامنشی دور سامنے آتے گا، یزدگرد اور اردشیر بابکان اور نوشیروان عادل اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جو آپ کو جوڑنا ہوں گی۔

رُوم کی سرگذشت کی طرف قلم کو حرکت دیجئے تو دارا کا قتل، سکندر مقدونی کی سلطنت، قبطیوں کی سوانح، بخت نصر کے احوال جس کا سلسلہ (کم از کم) آپ کو ملکۂ مصر قلوپطرہ پر ختم کئے بغیر چارۂ کار نہ ہوگا۔ یہودیوں کی تاریخ کی کچھ کڑیاں بھی اسی سلسلۃ الذہب میں آکر اُلجھ جاتی ہیں۔ بیت المقدس کی تباہی، یہودی تاریخ کا آغاز ہے اور عیسوی تاریخ رفعِ حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے آپ کو شروع کرنا ہوگی، ہنود میں مہابھارت کی جنگ، چندرگپت موریا اور چندرگپت موریا سے راجہ بکرماجیت تک، راجہ بکرماجیت سے عصرِ حاضر تک، یہ ہیں تاریخِ عالم کی چند کڑیاں۔ اب آپ غور فرمائیں کہ ان سب اہم واقعات اور ہزاروں برسوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کو ہزاروں صفحات میں ہی سمیٹنا ممکن ہے۔ اس کے لیے کتنا وقت اور کتنے مجلدات درکار ہوں گے۔ مقدمہ کے یہ صفحات تو اسلامی تاریخ کے خدو خال ہی اُجاگر نہیں کرسکتے چہ جائیکہ وقائع اور سوانح تاریخِ عالم!

یہاں میں اختصار کے ساتھ "اسلام میں تاریخ یا اسلامی تاریخ" کے آغاز سے آپکو متعارف کرائے دیتا ہوں، تفصیل میں نہیں جاسکوں گا۔ جو کچھ عرض کروں گا وہ نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ ہوگا۔

اسلام میں تاریخ کا آغاز اور اس کی ابتدا بالکل مذہبی نوعیت کی تھی۔ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی اور سرایا کے واقعات کو سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ صدرِ اسلام میں تحریر و انشا کا بہت اہتمام نہ تھا، اکثر و بیشتر حضرات اس سے نابلد تھے اس لیے صحابۂ کرام نے ان تمام واقعات و سوانح کو (جو ان کے سینوں میں محفوظ تھے) اپنی اولاد کی طرف منتقل کردیا اور ان کو حفاظت کی تاکید بھی فرمادی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو عہدِ جاہلیت اور ایامِ عرب سے بھی باخبر کیا خصوصاً حرب بسوس، حرب ادجس، حرب ذی وقار اور حرب فجار کی تباہ کاریوں

اور بربادیوں سے باخبر بنایا۔[۱]

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات و والاصفات، آپ کے مقدس سوانح اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی فتوحات سے آگاہ کیا اور اُن کے ضبط و حفظ کا خاص طور سے اُن کو امین بنایا۔

حضرات صحابۂ کرام کے بعد جب تابعین کرام کا زمانہ آیا تو ان حضرات نے بھی اپنے اسلاف کرام کے نقشِ قدم کو اپنا رہنما ٹھہرایا، یہاں تک کہ دورِ بنی اُمیّہ میں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے تدوینِ حدیث کی طرف توجہ فرمائی۔ تاکہ احکامِ دین کے ساتھ ساتھ مغازی و سرایا اور مِلَلِ قدیمہ کے وقائع کا بھی تحفظ ہو جائے۔ تدوینِ حدیث کا کام جب شروع ہُوا تو صحت و کذب کے معیار و مقیاس کے لیے محدّثین کرام نے رواۃ کی شخصیتوں اور ان کے حالات کے تفحص و تحقیق کی طرف قدم بڑھایا اور فنِ اسماء الرجال وضع کیا اور حدیث شریف کے سلسلہ میں اسناد کا اہتمام اور ان کی صحت کا معیار اسماء الرجال کو ٹھہرایا۔ اور اس ضمن میں بہت سخت اصول معیّن کیے۔ جس طرح حدیث شریف کے سلسلہ میں سند کا التزام ضروری قرار پایا اور سند کی صحت کے لیے اسماء الرجال کا آغاز ہوا۔ اسی طرح جب عِلم وقائع سوانح اور اخبار کی تدوین شروع کی گئی تو اس سلسلہ میں بھی سند کا ذکر ضروری قرار پایا تاکہ واقعات کے معرضِ بیان اور ضبطِ تحریر میں لاتے وقت اس کی صحت پر پورا پورا اعتماد کیا جا سکے۔

آپ سیرتِ مبارکہ پر لکھی جانے والی مشہور قدیم کتب کا مطالعہ کیجئے آپ ہر واقعہ کے بیان میں سند موجود پائیں گے۔ لیکن جب بھی سوانح اور وقائع بار بار معرضِ تحریر میں آتے اور متعدد

---

[۱] قرآنِ حکیم میں مِلَلِ قدیمہ کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں اور جن کی صراحت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے صحابۂ کرام تک پہنچی تھی ان واقعات و تصریحات کو بھی ان حضرات نے بے کم و کاست اُن تک پہنچا دیا۔ آپ قرآنِ حکیم میں سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ، سورۂ آل عمران، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، سورۂ السبا، سورۂ اعراف سورۂ انعام، سورۂ انفال، سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ الانبیاء، سورۂ النمل، سورۂ قصص اور دیگر سورتوں میں ان تمام امم کی تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔

حضرات نے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کو قلم بند کیا تو رفتہ رفتہ یہ اہتمام باقی نہیں رہا۔ سیرتِ ابن ہشام اور اس کے قریب العہد کی کتب سیر ملاحظہ کیجئے، آپ کو میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی! سیرت ابنِ ہشام کے ساتھ ساتھ علامہ شبلی اور مولانا سلمان منصور پوری کی کتب سیرت دیکھئے! ابن ہشام کے یہاں سند کا التزام ہے جب کہ مؤخر الذکر کتب میں ایسا شاذ ہے۔ وقائع اور سوانح مبارک کو اس قدر کثرت سے تحریر کیا گیا کہ اس کثرت ضبط و تدوین نے اس ضرورت کو باقی نہیں رکھا۔ ورنہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مغازی اور سرایا کے بیان میں اسناد کو بڑی اہمیت حاصل تھی، رواۃ حدیث کے سلسلہ میں جو شدتِ احتیاط برتی جاتی تھی وہ عام اخبار کے ضبط و بیان میں نہیں کی جاتی تھی کیونکہ احادیث تو دین کی اساس تھیں اور آج بھی ہیں لہٰذا اس باب میں کامل احتیاط اور شدتِ تحقیق کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔

قرونِ مابعد کے وہ مصنفین و مؤلفین تاریخ جو ضبط و عدل و حفظ و عدالت میں شہرتِ عام رکھتے تھے ان کی کتب نے جو قبولیت کی سند پائی، اسناد کے عدمِ ذکر کے باوجود ان کی تاریخوں کے مشمولات اور متون قابل اعتنا سمجھے گئے اور آج بھی سمجھے جاتے ہیں۔ ابنِ سیرینؒ، یاقوت حمویؒ، علامہ ذہبیؒ، ابن کثیرؒ، علامہ عسقلانیؒ، بدر الدینؒ عینی اور ابنِ خلدون وغیرہ حضرات کی کتب تاریخ ایسی ہی متعدد و مقبول کتب میں شامل ہیں کہ ان حضرات کی شخصیتیں ان ضروری اوصاف سے متصف تھیں جو تاریخی درایت کے لیے ضروری ہیں۔ البتہ ان حضرات سے کہیں کہیں جو سہو ہُوا بعد کے آنیوالے مؤرخین نے ان مقامات کی نشاندہی اور تسامحات کی تصحیح کر دی اس طرح ان مسلمان مؤرخین کی تاریخیں جو تدوین تاریخ کے دورِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں ہمارے لیے قابلِ قدر ذخیرہ بن گئیں۔ لیکن آپ یہ خیال نہ کریں کہ متقدمین کا یہ تمام ذخیرہ تاریخی صحت و درایت کی دستاویز ہیں۔ میں صرف ان مورخین کے بارے میں یہ عرض کر رہا ہوں جن کی شخصیتیں شک و شبہ سے بالاتر تھیں ان کی تاریخوں نے قبولِ عام کی سند حاصل کی اور وہ آج بھی مشہور ہیں اور جس مؤلف یا مؤرخ کے یہاں قوتِ تحقیق کا فقدان ہے یا عقیدہ کی جنبہ داری اس کی تاریخ میں موجود تھی اس کو قبولِ عام کی سند حاصل نہیں ہوئی اور وہ ایک طبقہ کی نظریاتی تاریخ بن کر ہمارے سامنے آئی! ایسے مؤرخین کے معاصرین نے

اُن کے بعد آنے والے دیدہ ور حضرات نے ان کی اس جنبہ داری یا نظریاتی پاسداری کا پردہ چاک کیا اور ان کی جنبہ داری یا غلط نگاری کی طرف مطالعہ کرنے والوں کو توجہ دلائی اور ان کی غلطیوں یا نظریاتی جنبہ داری کی تصحیح کرکے آنے والی نسلوں پر ایک احسانِ عظیم کیا ورنہ خدا معلوم اُن کے ہاتھوں تاریخ کے فن پر کیا کچھ گزرتی۔

بایں ہمہ مسلمانوں نے تاریخ کے موضوع پر اتنا کچھ سرمایہ چھوڑا ہے کہ آج اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ دنیا کا مشکل ہی سے کوئی ایسا ملک ہوگا جس کی تاریخ نہ لکھی گئی ہو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ یہ تمام سرمایہ مسلمانوں کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ دنیا کے غیر مسلم ممالک کے مؤرخین نے بھی جو ظاہر ہے کہ غیر مسلم ہی ہوں گے اپنی نوعیت کی تاریخی کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو اس سلسلہ میں جو برتری اور بالادستی حاصل ہے وہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

مسلمانوں کے قلم سے تاریخ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب کی کثرت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حافظ سخاویؒ (متوفی ۹۰۲ھ) اپنی مشہور ناقدانہ تاریخی کتاب "کتاب التوبیخ لمن ذم التاریخ" میں رقمطراز ہیں کہ:

"تاریخی کتب اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا حصر ممکن نہیں ہے۔ اور ان کی کثرت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حافظ علاؤ الدین مغلطائی حنفی نے اپنی کتاب "اصلاح بن صلاح" کے اس نسخہ پر جو خود اُن کے قلم کا تحریر کردہ ہے یہ یادداشت تحریر کی ہے کہ میں نے صرف ایک مُلک کے متعلق تاریخ کی ایک ہزار تصانیف دیکھی ہیں"

یہ تو نویں اور دسویں صدی ہجری کی شہادت ہے۔ گیارہویں صدی ہجری کے مشہور مصنف علامہ چلپی "کشف الظنون" میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"ہم نے اب تک جو تاریخی کتب شمار کی ہیں ان کی تعداد ایک ہزار تین سو ہے"

امام ابو سعد (متوفی ۲۳۰ھ) کی طبقات ابنِ سعد، حافظ امام ابو عمر یوسف ابن عبدالبر اندلسی (۴۶۳ھ) کی مشہور زمانہ کتاب "استیعاب" ہے۔

علامہ شیخ عزالدین علی بن احمد الجزری یعنی ابن اثیر ساتویں صدی ہجری کے مشہور مؤرخ و مصنف ہیں۔ ان کی تاریخ یا طبقات صحابہ "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" کے

نام سے ۵ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔

نویں صدی ہجری کے مشہور محدّث ، مفسّر اور مورّخ علامہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی ہیں ۔ ان کی مشہور تاریخ یا طبقات صحابہ موسوم " الاصابہ فی تمییز الصحابہ " آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور آجکل بھی دستیاب ہے ۔

پھر یہ نہیں کہ تاریخ کی یہ کتابیں موجودہ عصر کی تاریخی کتابوں کی طرح تین چار سو صفحات پر محتوی و مشتمل ہوں ، جی نہیں آپ حیران ہوں گے کہ علامہ جزری المعروف بہ ابن اثیر کی تاریخ " الکامل " بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور متعدد بار طبع ہو چکی ہے ۔ تاریخ " ابوالفدا " (اسمٰعیل ملک حماہ) بھی بہت ہی ضخیم جلدوں میں ہے ۔ اس تاریخ کا نام " المختصر فی اخبار البشر " ہے المختصر کا لفظ ملحوظ رہے ۔

علامہ عبدالرحمان بن محمد بن خلدون الاشبیلی المعروف بہ ابن خلدونؒ کی تاریخ آٹھ جلدوں میں ہے ۔ متعدد بار طبع ہو چکی ہے ۔ ہند و پاکستان میں اس کے اُردو تراجم شائع ہو چکے ہیں ۔ تاریخ کا اصل نام " العبر و دیوان المبدأ والخبر " ہے ۔

علامہ حافظ ذہبی کی " تاریخ اسلام " بھی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔ علامہ ذہبی کے شاگرد رشید علامہ حافظ عماد الدین ابوالفدا اسمٰعیل آٹھویں صدی ہجری کے مشہور تاریخ نگار مصنّف ہیں ۔ دنیائے علم و ادب میں آپ ابنِ کثیر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی تاریخ بھی تاریخ ابن کثیر کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے متن کی زبان عربی ہے اور یہ چودہ (۱۴) جلدوں پر مشتمل ہے ۔ بعض ناشرین نے اس کے اُردو تراجم بھی شائع کیے ہیں جو دس دس بارہ بارہ جلدوں پر محتوی ہیں ۔

تاریخِ اسلام و تاریخِ عمومی کے مشہور مصنّفین اور اُنکی تصانیف

تاریخ طبری

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مشہور مورخ علامہ طبری کا آتا ہے یعنی امام محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) انکی کتاب واقعات و اخبار کے اعتبار سے بہت مشہور اور مستند ہے بعد کے مورخین کے لیے ماخذ رہی ہے۔ تاریخ طبری دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ عربی متن متعدد بار شائع ہو چکا ہے اور اُردو زبان میں بھی اس کے متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ چلپی نے کشف الظنون میں اس کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔

مروج الذہب

تاریخ مسعودی، تاریخ طبری کے بعد تالیف ہونے والی مستند اور مشہور کتاب ہے جس کو امام ابوالحسن علی بن حسین مسعودی (م ۳۴۶ھ) نے مرتّب کیا ہے۔ یہ دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ ان کی ایک اور مبسوط اور ضخیم تاریخ موسوم بہ " اخبار الزماں " بھی ہے لیکن امتداد زمانہ کے باعث آج مفقود ہے۔

تجاربُ الاُمم

علامہ طبیب احمد بن محمد بن مسکویہ المعروف بہ ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) کی تالیف ہے یہ تاریخ ابو شجاع محمد بن الحسین (وزیر المستظہر باللہ) کے حواشی کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

المنتظم

مشہور زمانہ عالم و ناقدِ تصوّف اور کثیر التصانیف شخصیت یعنی حافظ ابن الجوزی کی تصنیف ہے (متوفی ۵۹۷ھ) جس کو انہوں نے سن وار وقائع کی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔

تاریخ کامل

تاریخ کامل کے مصنف علامہ شیخ عزالدین علی بن محمد جزری المعروف بہ ابن اثیر ہیں۔ تاریخ کامل، بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ۶۲۹ھ تک کے وقائع و حوادث پر مشتمل ہے۔ ۶۳۰ھ میں علامہ جزری کا انتقال ہو گیا۔ تاریخ کامل، تاریخ ابن اثیر کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

المختصر فی اخبار البشر

المختصر فی اخبار البشر، کے مؤلف ابوالفدا اسمٰعیل مالک حماہ متوفی ۷۳۲ھ ہیں۔ ابوالفدا اسمٰعیل آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں۔ المختصر فی اخبار البشر تاریخ ابوالفدا "المختصر" کے نام سے مشہور ہے، اور متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں اس کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ اسلام

یہ ساتویں صدی ہجری تک کے واقعات و اخبار پر مشتمل ہے۔ اور اس کے مصنّف مشہور زمانہ محدّث امام حافظ ابوعبداللہ محمد بن احمد الذہبی ہیں جو متعدد طبقات کے بھی مصنّف ہیں۔ حافظ ذہبی نے ۷۴۸ھ میں انتقال کیا۔

العبر و دیوان المبتدا والخبر

عام طور پر اسکو تاریخ ابن خلدون کہا جاتا ہے۔ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ پر نہایت مشہور اور مفید تاریخ ہے۔ اس کے نامور مؤلف علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون الاشبیلی (تیونسی) ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے ۸۰۸ھ میں وفات پائی۔ علامہ ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مصنف ہیں۔ ان کی تاریخ آٹھ جلدوں میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ اس کا مقدمہ اپنے موضوعات کے اعتبار سے عجیب و غریب ہے، اور نہایت ہی مفید ہے۔ تاریخ سے زیادہ مقدمہ پسند کیا جاتا ہے جو زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی تعبیر و تفسیر اور فلسفۂ تاریخ و معاشرت اور سماجیات پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ ابنِ خلدون کی اس تاریخ میں جو نکات اور مباحث ہیں وہ کسی دوسری تاریخ میں

نہیں ہیں۔ یہ تاریخ معمولی ضخامت کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

تاریخ ابن کثیر

تاریخ ابنِ کثیر بڑی جامع تاریخ ہے۔ اگرچہ یہ بھی امام ذہبی کی "تاریخ اسلام" کی طرح آٹھویں صدی کے آغاز تک واقعات واخبار کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن اس میں حافظ ذہبی کی تاریخ کے مقابلہ میں واقعات زیادہ وضاحت وصراحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس لیے اس کا حجم ماقبل کی تمام تاریخوں سے بڑھ گیا اور یہ چودہ (۱۴) جلدوں پر مشتمل ہے۔ تاریخ ابن کثیر کے مصنف حافظ عماد الدین ابوالفدا ہیں جو علامہ ذہبی کے شاگرد ارشد ہیں۔

نفح الطیب

اسلامی اندلس، فضلائے مغرب (تیونس وغیرہ) کے تذکروں پر مشتمل ہے نفح الطیب اوسط درجہ کی چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ نفح الطیب علامہ احمد بن محمد المقری التلمسانی (م ۱۰۴۱ھ) کے قلم کا شاہکار ہے۔

اب تک جن مشہور کتبِ تواریخ کا ایک سرسری جائزہ میں نے پیش کیا ہے۔ یہ سب کی سب عمومی اسلامی تواریخ ہیں۔ البتہ بعض میں حضرت آدم علیہ السلام سے سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم تک بہت ہی مختصر تذکرہ ہے اور پھر اسلام کا آغاز، غزوات وسرایا، خلافتِ راشدہ کے اذکار واحوال کے بعد عمومی اسلامی سلطنت کی تاریخ ہے۔ لیکن ہمارے مورخین نے تاریخ نگاری میں صرف اسی نوع تاریخ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلامی تاریخ کی ایک خاص نوع یعنی احوال واخبار صحابہ کو اپنا موضوع بنایا اور ملتِ اسلامیہ ان کی شکرگزار ہے کہ ان کی کاوش کی بدولت سیر الصحابہ کے مطالعہ سے بہرہ اندوزی کے مواقع ہم کو حاصل ہیں۔

میں یہاں اب اُن چند کتب معتبرہ کا آپ کے سامنے ذکر کروں گا جو صرف صحابۂ کرام کے حالات وسوانح سے متعلق ہیں۔ اگرچہ اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب بہت زیادہ ہیں، مگر یہاں صرف مشہور کتب کا تذکرہ مقصود ہے:

طبقات ابنِ سعد

یہ امام ابوعبداللہ محمد بن سعد الزہری متوفی ۲۳۰ھ کی تالیف ہے اور خالصاً احوالِ صحابہ میں پہلی تصنیف ہے۔ یورپ اور اس کے بعد مصر میں طبع ہوئی، برصغیر ہند وپاک میں بھی طبع پذیر ہوئی۔

اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

استیعاب استیعاب حافظ امام ابو عمر یوسف بن عبد البر اندلسی (م ۴۶۳ھ) کی تصنیف ہے۔ مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کو طبقات ابن سعد جیسی شہرت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن احوال صحابہ کرام میں مستند کتاب ہے۔

اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ پانچ (۵) جلدوں میں ہے اور اس کے مصنف علامۂ زماں شیخ عزالدین علی احمد الجزری المعروف بابن اثیر ہیں۔ طبقاتِ صحابہ میں، اسد الغابہ بہت ہی بلند پایہ کتاب ہے۔ یہ ساتویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔
علامہ ابن اثیر نے ۶۳۰ھ میں انتقال کیا۔ اسد الغابہ کے بعد طبقات الصحابہ میں "الاصابہ" نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔

الاصابہ فی تمییز الصحابہ یہ کتاب ایک اعتبار سے طبقات ابن سعد، استیعاب اور اسد الغابہ تینوں کے مواد اساسی پر مشتمل ہے اور پھر مؤلف کے خود اپنے اضافے اس پر مستزاد ہیں۔ اس لیے اس کی ضخامت آٹھ (۸) جلدوں پر محتوی ہے۔ مشہور زمانہ شافعی محدث حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی "اصابہ" کے مؤلف ہیں "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" بہت ہی جامعیت کی حامل ہے۔ بعد میں سیر الصحابہ کے مصنفین و مؤلفین کا ماخذ رہی ہے۔ الاصابہ نویں صدی ہجری کی تالیف ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ۸۵۲ھ میں رحلت فرمائی۔ مصر سے اس کتاب کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں بھی دستیاب ہے۔ ضخامت کے باعث اب تک اردو ترجمہ نہیں ہوا۔

تاریخ الخلفاء تاریخ الخلفاء حافظ، محدث و مفسر علامہ جلال الدین سیوطی کی مشہور تاریخ ہے جو خلفائے راشدین اور بنی امیہ اور بنی عباس کے امراء المسلمین کے حالات پر مشتمل ہے۔ لیکن معاشرتی اور تمدنی احوال اور اس کی تبدیلیوں پر نظر نہیں ڈالی

گئی ہے، بلکہ حکمرانوں کی جانشینی اور ان کے عزل و نصب کے اسباب کا صرف تذکرہ ہے۔ علامہ ذہبی کی تاریخ اس کا ماخذ ہے۔ اس طرح یہ آٹھویں صدی ہجری تک کے امراء المسلمین کی تاریخ ہے۔ تاریخ الخلفاء عبیدیانِ مصر کے احوال پر منتہی ہو جاتی ہے۔ متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور اُردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مورخینِ اسلام نے اس طبقات نگاری کے دائرہ کو اور وسیع کیا اور حضرات تابعین کے احوال کی نگارش کی طرف توجہ کی بلکہ تبع تابعین کے بعد آنے والے بزرگوں کے سوانح اور حالات بھی قلمبند کیے۔ ایسی تالیفات میں مشہور ترین کتابیں یہ ہیں :

تاریخ بغداد

مصنفہ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) اس کتاب میں علماء و فضلاء بغداد اور ہر اس قابل ذکر، محترم و محتشم شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کا تعلق بغداد سے رہا ہے۔ یہ تاریخ چودہ (۱۴) ضخیم جلدوں میں ہے۔

تاریخ ابن عساکر

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ علامہ حافظ ابوالقاسم ابنِ عساکر کی تالیف ہے عوام و خواص سب میں یہ تاریخ مشہور، معروف اور مستند رہی ہے یہ بیس (۲۰) ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔ کچھ مدت کے بعد دمشق کے ایک فاضل نے اس کو مختصر کیا (سندوں کو حذف کر دیا) اختصار کے باوجود بارہ (۱۲) ضخیم جلدوں پر محتوی ہے۔

یہ عظیم و ضخیم تاریخ طبع ہو چکی ہے۔ یہ تاریخ بھی تاریخ بغداد کے مانند تاریخ دمشق ہے۔ وہاں کے علماء و فضلاء اور ہر قسم کے اربابِ کمال کا تذکرہ ہے۔ دمشق میں مستقل قیام کے زمانے والے علماء و فضلاء اور عارضی قیام کرنے والے اور وہاں سے گذرنے والے ارباب فضل کے حالات پر مشتمل ہے علامہ ابن عساکر نے ۵۶۶ھ میں انتقال کیا۔ اس طرح ان کی یہ تاریخ چھٹی صدی ہجری کی ایک تاریخ عمومی لیکن مخصوص علاقائی تاریخ ہے۔

بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب

مصنفہ امام کمال الدین عمر ابن احمد بن العدیم الطائی (م ۶۶۰ھ) تاریخ حلب آٹھویں صدی ہجری کی عمومی علاقائی یا بلدی تاریخ ہے۔ اس تاریخ

میں بھی علامہ خطیب بغدادی کی طرح ان تمام اعاظم و اکابر شخصیتوں اور علماء فضلاؔ اور ارباب فنون کا تذکرہ ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح حلب سے پایا جاتا ہے

وفیات الاعیان یہ بہت ہی مشہور و معروف تاریخ ہے اور بعد کے مؤرخین کے لیے ایک اعلیٰ اور مستند ماخذ ہے۔اس کے مصنف علامہ قاضی احمد بن خلکان (خطاب توصیفی ہے) نے حضرات تابعین کرام کی سوانح اور ان کے تراجم سے ابتدا کی ہے اور اپنے عہد یعنی ساتویں صدی ہجری تک کے اعاظم علماء و فضلاء کے تذکرے کیے ہیں اور ان کے سالِ وفات کو قلم بند کیا ہے۔جس سے بعد کے مؤرخین نے خوب استفادہ کیا ہے۔قاضی احمد بن خلکان نے سنہ ۶۸۱ھ میں وفات پائی۔یہ عظیم کتاب طبع ہو چکی ہے۔

مذکورہ بالا کتب تاریخ آٹھویں صدی ہجری تک تالیف ہونے والی کتب ہیں جن کا موضوع خالص اسلامی تاریخ ہے۔تاریخ ملوکیت سے گریز کیا گیا ہے۔آخری صدی ہجری تک خلافت کے لباس میں سلطنت کا کاروبار چلتا رہا ہے۔حالانکہ عبیدیانِ مصر کی حکومت کو جو چند صدیوں تک جاری و ساری رہی، کسی اعتبار سے بھی دورِ خلافت یا ان کی حکومت کو خلافت اور حکمران کو خلیفہ نہیں کہا جا سکتا۔بایں ہمہ اس عصر کی تاریخوں میں اس کو دورِ خلافت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔میں یہاں اس سلسلہ میں تفصیل میں نہیں جا سکتا، صرف یہ عرض کروں گا کہ نویں صدی ہجری سے پہلے ہی علماء فضلاء و محدثین و مفسرین کرام مصر و عراق و شام کی سکونت اور قیام کو ترک کر کے ارضِ رُوم اور سرزمینِ ایران میں پہنچ گئے تھے۔اور یہاں کے غزنوی، سلجوقی اور گورگانی سلاطین کی قدر افزائی اور علم دوستی کی بنا پر نہایت طمانیت قلب اور آسودگی فکر کے ساتھ علمی کارناموں میں مصروف و مشغول تھے اور انہوں نے اس تاریخ عمومی کے موضوع پر بھی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی طرح اپنی فکر و قلم کے بہترین نمونے یادگار چھوڑے، لیکن شہنشاہیت اور ملوکیت کی آب و ہوا میں پرورش پانے والی۔ اور انعامات شاہی سے سرفراز ہونے والی شخصیتوں نے جب تاریخ نگاری پر قلم اُٹھایا تو تاریخِ بغداد، تاریخ حلب یا وفیات الاعیان کے طرز پر

وہ کوئی یادگار نہ چھوڑ سکے۔ بلکہ انہوں نے ملوکیت کی تاریخ نگاری کا حق ادا کردیا۔ جسطرح برصغیر ہندوپاک میں ملوکیت کی تاریخیں لکھی گئیں جن کا ذکر میں آئندہ اوراق میں کروں گا۔

دورِ غزنویہ، ایران میں علم و ادب کا درخشندہ دور ہے اور سلاطین غزنویہ میں محمود سُبکتگین رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم مجاہد و مدبر اور سلطان کی طرح ایک عظیم مصنّف بھی ہے۔ فقہ حنفیہ پر سلطان محمود انار اللہ برہانہٗ کی ایک تصنیف موجود ہے۔ اس مجاہد اور علم دوست سلطان کے دَور میں جو تاریخی کتب لکھی گئیں ان کا تذکرہ یہاں ضروری ہے۔ دورۂ غزنویہ سے قبل ایران میں سلطنت سامانیہ کے زیرِ نگرانی اور منصور بن نوح سامانی کی فرمائش پر علامہ جریر طبری کی ضخیم تاریخ المعروف بہ تاریخ طبری کا اصل تاریخ عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا اور بس :۔

دَورِ غزنویہ میں تاریخی کتب میں بعض مورخین نے علامہ ابوریحان البیرونی کی کتاب "آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" کو داخل کیا ہے۔ لیکن وہ مستقل تاریخ نہیں ہے بعض تاریخی مباحث ضرور اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ دورِ غزنویہ میں لکھی جانے والی اہم تاریخی کتاب ابوالفضل بیہقی کی "تاریخ آلِ ناصریہ" ہے لیکن اس ضخیم تاریخ کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا صرف سلطان مسعود کے عہد کی تاریخ کے اجزا باقی رہ گئے۔ یہی تاریخ بیہقی یا تاریخ مسعودی کے نام سے موجود ہے۔ بیہقی نے "تاریخ آلِ ناصر" کو ۴۵۱ھ میں تمام کیا۔ علامہ ابوالفضل بیہقی کا سالِ وفات ۴۷۰ھ ہے۔ ایران میں دورِ غزنویہ کے تاریخی آثار میں یہی ایک کتاب ہے۔

دورِ غزنویہ کے بعد دورِ سلجوقیہ علماء و فضلاء کی قدردانی کا ایک عجیب و غریب دَور تھا۔ ہزاروں علماء و فضلاء اس دودمان و خاندان کی علم دوستی کی بدولت اس دربار میں جمع ہوگئے تھے۔ سلجوقیوں کی حکومت کا مرکز خراسان تھا۔ بعد میں یہ مصر، شام، عراق کرمان، کردستان اور رُوم تک وسیع ہوگیا تھا اور اواخر قرن ہفتم تک یہ ممالک سلجوقیوں کے زیرنگیں رہے۔ اس طویل مدّت میں علمی تاریخ پر جو کام ہوا اس کی تفصیل یہ ہے :۔

زین الاخبار علامہ ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود گردیزی نے فارسی زبان میں "زین الاخبار" کے نام سے تاریخ لکھی جس میں ایران پر اسلام کے تسلط تک کے احوال کو مختصر طور پر لکھا ہے اور اس کے بعد سامانیوں اور غزنویوں کے عہد کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

راحۃ الصدور دورِ سلجوقیہ اور حکومتِ سلجوقیہ کی ایک عظیم تاریخ ہے۔ جس کو عام طور پر "تاریخ راوندی" کہتے ہیں۔ راحۃ الصدور کے مؤلف علامہ ابوبکر محمد راوندی ہیں۔ راحۃ الصدور قرن ششم کے آخر میں تالیف ہوئی اور اس کو مؤلف نے سلجوقی تاجدار کیخسرو بن قلیج ارسلان (سلجوقیان روم) کے نام پر معنون کیا۔ راحۃ الصدور سلطنت سلجوقیہ کے قیام سے لیکر اس کے اختتام تک ہے۔ اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ راحۃ الصدور دولت سلجوقیہ کی مستند تاریخ ہے۔

عصرِ مغول و تیموریاں اس دور میں جو (وسط قرن ششم ہجری سے دسویں صدی ہجری کے آغاز تک محیط ہے) عمومی تاریخ کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب میں اس کتاب نے بہت شہرت پائی۔

تاریخ جہاں کشا جو علاء الدین عطا ملک جوینی کی تالیف ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے اور ظہور مغول سے ۶۵۵ھ تک کے حوادث و اخبار پر مشتمل ہے۔ بعد میں لکھی جانیوالی تاریخوں کا یہ تاریخ ماخذ رہی ہے اور اس کو بہت مستند سمجھا گیا ہے۔ عطا ملک جوینی نے ۶۸۱ھ میں وفات پائی۔ ایک عمومی تاریخ کے ساتھ ساتھ تاریخ جہاں کشا کا ایک ادبی مقام بھی ہے اسی عہد میں تالیف ہونے والی تاریخ عمومی طبقات ناصری ہے۔ جس کا تفصیلی تعارف دورِ ہند یہ میں پیش کیا جائے گا۔

جامع التواریخ یہ تاریخ دو جلدوں میں ہے اس کے مؤلف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی ہیں جو سلاطین مغول مثلاً آباقا، غازان اور الجایتو کے درباروں سے وابستہ رہے تھے اور سلاطین مغول کے مقربین میں ان کا

شمار ہوتا تھا ۔ اس تاریخ میں مؤلف نے سلطنت مغول و غازان کے اخبار و سوانح کو تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ سلطنت مغول کے احوال و وقائع میں یہ ایک جامع تاریخ ہے ۔

تاریخ وصّاف

تاریخ وصّاف کے مؤلف شہاب الدین عبداللہ شیرازی ملقب بہ وصّاف حضرت ہیں ۔ جامع التواریخ کے مؤلف کے معاصرین میں سے ہیں ۔ تاریخ وصّاف کو جامع التواریخ کا تکملہ کہنا چاہیے ۔ یعنی فتح بغداد اور اس خاندان کے آخری بادشاہ ابوسعید تک کے اخبار بیان کیے گئے ہیں ۔

تاریخ وصّاف ، عبارت آرائی ، تصنع ، مقفیٰ اور مسجع عبارت کا ایک مرقع ہے اس لیے قاری کو مطالعے سے الجھن ہوتی ہے ۔ اگرچہ یہ مغول کی تاریخ پر ایک مستند دستاویز ہے لیکن جامع التواریخ کی طرح مقبول نہ ہو سکی ۔

تاریخ گزیدہ

یہ عمومی تاریخ ، تاریخ جہاں کشا ، جامع التواریخ اور تاریخ وصّاف سے بعد میں لکھی جانے والی کتبِ تواریخ میں شمار ہوتی ہے ۔ اور مؤلف نے جامع التواریخ سے جابجا استفادہ کیا ہے اور اقتباسات بھی پیش کیے ہیں ۔ تاریخ گزیدہ کا مؤلف حمداللہ مستوفی قزوینی ہے ۔ تاریخ گزیدہ کا سالِ تکملہ سنہ ۷۳۰ھ ہے ۔ صدر اسلام سے دورِ مغول تک تاریخی وقائع اور اخبار پر مشتمل ہے ۔

زبدۃ التواریخ

زبدۃ التواریخ کے مؤلف خواجہ نور الدین لطف اللہ المعروف بہ حافظ ابرو ہروی ہیں ۔ شاہرخ مرزا کے دربار سے وابستہ تھے ۔ زبدۃ التواریخ سنہ ۸۳۰ھ میں تالیف کی ۔ اس دور کی چند اور مشہور تاریخی کتب یہ ہیں مثلاً :۔

مجمل فصیحی

جو فصیحی خوانی کی تصنیف ہے مطلع العدین تالیف عبدالرزاق سمرقندی ظفر نامہ اور تاریخ ہرات ۔

تاریخ ہرات تاریخِ ہرات مولانا معین الدین اسفرائینی کی تالیف ہے۔ جو اواخرِ دورِ تیموریہ میں تالیف کی گئی۔

روضۃ الصفا دورۂ تیموریہ کی سب سے بُلند پایہ تاریخ ہے۔ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ تاریخ اسلام و تاریخ ایران کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ اور دورۂ مغول و تیموریہ کے حوادث و اخبار کو بہت تفصیل سے تحریر کیا ہے اس کے مؤلف محمد بن خاوند شاہ بن محمود معروف بہ میر خواند ہیں۔ جو میر علی شیر نوائی (وزیر ابو الغازی سلطان حسین والئ ہرات) کے مقربین میں سے تھے۔ میر خواند نے ۹۰۳ھ میں ہرات میں وفات پائی۔

مندرجہ بالا تصریح سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ عہدِ تیموریہ میں ایران کی سرزمین میں تاریخ عمومی پر سب سے زیادہ کام ہوا لیکن اسلامی تاریخ، طبقات یا اسماء الرجال پر کچھ نہیں لکھا گیا البتہ طبقات الشعرا یا تذکرۃ الشعرأ زیادہ مرتب ہوئے جس کا سبب شہنشاہیت کا مزاج، اس کے مقتضیات اور پذیرائی ہے چونکہ سلاطین کو شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی تھی لہٰذا بکثرت شعرأ پیدا ہوتے۔ تاریخ نویسی دربار شاہی میں قربت کا ذریعہ تھی لہٰذا عمومی یا شاہی خاندان کی تاریخیں لکھ کر انعام و کرام سے بہرہ ور ہوئے۔

ایران میں تیموری خاندان کا آخری علم دوست بادشاہ سلطان حسین بائقرا کے انتقال کے بعد ہرات پر صفویوں نے قبضہ کر لیا اور صفوی خاندان جو غالی شیعہ تھے برسرِ اقتدار آ گئے۔ صفویوں نے اہلِ سنت و جماعت پر بے پناہ مظالم ڈھائے جس کے نتیجہ میں ہزاروں علماء و صلحاء اور صوفیائے کرام ترک وطن کر کے شام و عراق اور ارضِ رُوم چلے گئے۔ اور اکثر نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ دودمان تیموری کا ایک جیالا فرزند ظہیر الدین بابر ہندوستان کے لودھی خاندان کے فرمانروا کو شکست دے کر تختِ حکمرانی پر قابض ہو چکا تھا۔ برِ صغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی یہی بادشاہ ہے۔

اسمٰعیل صفوی، صفویہ خاندان کا پہلا مطلق العنان غالی شیعہ حکمران تھا۔ وہ علماء و فضلاء اہلسنت کی کیا پرورش کرتا، البتہ شیعہ علماء سے شیعہ مذہب کے موضوعات پر کتابیں تصنیف

کرائیں چنانچہ شیعہ حضرات کا مذہبی ذخیرہ اسی اسماعیل صفوی کا رہین منت ہے۔ اس دور میں ایک شیعہ فاضل نے ایک تاریخ عمومی تالیف کی جس کا نام حبیب السیر ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام سے شاہ اسماعیل صفوی کی وفات یعنی ۹۳۰ھ کے وقائع و اخبار تک ہے۔

احسن التواریخ تاریخ عالم آرائے عباسی، شاہ طہماسپ صفوی اور شاہ عباس اول کے عہد کی تاریخیں ہیں۔ شاہ طہماسپ صفوی کے عہد کی ایک اور تاریخ:۔ **لُبّ التواریخ** مؤلفہ یحییٰ بن عبد اللطیف قزوینی ہے۔

تاریخ نادری تاریخ جہانکشائے نادری، عہد نادر شاہ کی صرف یہی ایک تاریخ ہے۔ اس تاریخ کے مؤلف میرزا مہدی خان بن محمد نصیر استرآبادی ہیں، جو دربارِ نادری میں منشی کے منصب پر فائز تھے۔ جہانکشائے نادری، نادری سلطنت اور نادر شاہ کی وفات تک کے وقائع پر مشتمل ہے۔ اس کا فارسی متن انشا پردازی کا شاہکار ہے۔

تاریخِ گیتی کشا ایران کے عہدِ زندیان کی تاریخ ہے جن کا دور سلطنت بہت کم مدت رہا ہے اور صفوی اور قاچاری دور کے عہد کی درمیانی کڑی ہے۔

ناسخ التواریخ عہدِ قاچار میں لکھی جانے والی معتبر اور مستند تاریخ ہے اور پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے اسلام اور تاریخ ایران بعد اسلام کا حصہ بہت تفصیل سے لکھا ہے ناسخ التواریخ کا مؤلف میرزا تقی سپہر، ناصر الدین شاہ، قاچار کے دربار سے وابستہ تھا۔ میرزا تقی سپہر نے ناسخ التواریخ دو جلدوں تک تالیف کی تھی۔ کہ مؤلف کا انتقال ہو گیا۔ میرزا تقی کے انتقال کے بعد عباس قلی خان نے کہ وہ بھی ناصر الدین شاہ قاچار کے درسے وابستہ تھا اس کو پندرہ جلدوں تک پہنچایا، بعد کی چار جلدوں میں ائمہ کرام کے تفصیلی حالات اور ناصر الدین شاہ قاچار کے وقائع سلطنت بڑی تفصیل سے قلمبند کئے ہیں۔

تاریخ منتظمِ ناصری بھی عہدِ ناصر الدین شاہ قاچار کے ایک درباری امیر جو وزیر الطباعات کے عہدہ پر فائز تھے یعنی محمد حسن خان صنیع الدولہ نے تالیف کی ہے۔ یہ کتاب مؤلف نے تین سال کی مدت میں مکمل کی

یعنی سنہ ۱۳۹۸ء سے شروع کی اور سنہ ۱۴۱۳ء میں اس کی تکمیل کی ۔ یہ تاریخ آغاز اسلام سے مؤلف کے عہد تک اخبار و احوال پر مشتمل ہے ۔

یہ تھیں دورِ غزنویہ سے عہدِ قاچار تک مرتب اور تالیف ہونے والی عمومی تاریخی کتب ۔ ایران میں تاریخ کی دیگر انواع پر بھی قلم اٹھایا گیا ۔ یعنی طبقات اور تذکرے مرتب کیے گئے ۔ ان کا ذکر بھی میں طبقات اور اسماء الرجال کی کتب کے تحت کروں گا ۔

ایران میں علماء و فضلاء کے تراجم و احوال پر بھی بعض کتابیں تالیف ہوئیں ۔ جن کا تعلق دورِ قاچاریہ سے ہے گویا فارسی زبان میں بھی طبقات پر کچھ کام ہوا ۔ لیکن اتنا شاندار نہیں تھا جتنا عربی زبان میں سابقہ قرون میں سرانجام پایا ۔

برِّصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان کی ابتداء اور اس کا ارتقاء

" فرغانہ " کی چھوٹی سی ریاست ظہیر الدین بابر کی اولوالعزمیوں اور اس کی جنگجویانہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے والی نہ تھی چنانچہ اس نے برِصغیر پاک و ہند کا رخ کیا ۔ وہ گیارہ برس ہی کا تھا کہ سلطنت فرغانہ کا تخت نشین ہو گیا ۔ کچھ تو اس کی اپنی طبیعت کا اقتضا اور فطری تہور اور کچھ دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ، نتیجہ یہ نکلا کہ مخالفوں سے کشمکش کا آغاز ہوا ۔ اور ایک کشمکش اور زور آزمائی کے بعد اس کو اپنا تاج و تخت اور موروثی وطن چھوڑنا پڑا ۔ کابل میں اس کے پیر ٹک گئے تھے ۔ لیکن ہندوستان کے بعض امیروں کی دعوت سے جو درپردہ سلطانِ وقت ابراہیم لودھی کے خلاف سازش میں مصروف تھے ۔ اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور سنہ ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی اور دہلی پر قابض ہو گیا لیکن پورے برِصغیر پاک و ہند پر اس کے قبضہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا تھا ۔ سنہ ۱۵۲۹ء میں رانا سانگا دو لاکھ فوج کے ساتھ بابر کو ہندوستان سے بیدخل کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا ۔ جہاد کے نعرے اور مسلمانوں کی جان بازی کی بدولت سیکری کا میدان بابر کے

ہاتھ رہا۔ میں بابر کی سلطنت کے قیام، اس کی توسیع اور اس کے استحکام کے بارے میں یہاں کچھ نہیں عرض کروں گا اور نہ یہ میرا موضوع ہے۔ مجھے بتانا یہ مقصود تھا کہ فارسی زبان کو مغلیہ سلطنت کے قیام سے بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور فارسی زبان میں عمومی اور سیاسی تاریخی کتب کثرت سے لکھی گئیں ورنہ عہد ہائے ماقبل میں تاریخ عمومی پر چند ہی کتابیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ہاں مذہبیات پر جو کام ان عہد ہائے ماقبل میں ہوا، اس کی نظیر ادوار ہائے مابعد میں نہیں ملتی۔ مغلیہ حکمرانوں میں جو مسلمان خاندان یہاں حکمران ہوتے ان کی مادری زبان بھی فارسی اور تصنیف و تالیف کی زبان زیادہ تر فارسی ہی تھی۔ اگرچہ بعض علمائے کرام نے عربی زبانمیں بھی اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

تاریخِ معصومی

چنانچہ تاریخ معصومی سندھ میں لکھی جانے والی عربی زبان میں پہلی تاریخ کہی جا سکتی ہے جس کے مؤلف میر محمد معصوم بھکری ہیں۔ تاریخِ معصومی کے اُردو تراجم ہو چکے ہیں۔ چچ نامہ بھی اسی قبیل کی مملکت سندھ کی تاریخ ہے۔ اس میں احوال و وقائع کا آغاز محمد بن قاسم رحمتہ اللہ علیہ کی سندھ میں آمد اور ان کی فتوحات سے ہوتا ہے چچ نامہ بھی عربی تاریخ سے فارسی میں ترجمہ ہے لیکن اس ترجمے نے اتنی شہرت حاصل کی کہ اصل کتاب رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ چچ نامہ کا اُردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

فنِ اسماء الرجال اور طبقات نگاری

اب تک جو کچھ میں نے قارئین کرام کے سامنے پیش کیا ہے یہ تاریخ کی صرف ایک نوع تھی۔ "تاریخ ملوکیت یا احوال سیاسی کی تاریخ" کے سلسلہ میں ایک بہت ہی مختصر سا جائزہ تھا کہ مقدمہ کے محدود صفحات مجھے تفصیل میں جانے سے مانع تھے ورنہ اور بہت سی کتب کا تعارف آپ سے کرایا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علاقائی تاریخوں کا مفصّل ذکر میں نے نہیں کیا۔ اور نہ میں نے مخطوطات کا ذکر کیا۔ کتب تاریخ بصورت مخطوطات برصغیر ہند و پاک اور مغربی ممالک میں اتنی تعداد میں محفوظ ہیں کہ ان کا استقصاء اور ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ پاکستان ہی میں داتا گنج بخشؒ لائبریری، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات کی فہرست کئی ضخیم جلدوں

میں جمع ہو چکی ہے۔ آپ اگر ان فہرستوں کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو حیرت ہوگی۔

تاریخ کی دوسری انواع پر نظر ڈالیے۔ ایک تو ان انواع کی کثرت اور پھر ان انواع پر کتب کا ذخیرہ محیّر العقول ہے۔ میں نے آغاز کلام میں ان انواع کا تذکرہ کیا ہے۔ ان انواعِ تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں کے اگر صرف نام ہی لکھے جائیں تو ابنِ ندیم کی "الفہرست" سے دوگنی اور تگنی ضخامت کی ایک اور فہرست مرتب ہو جائے۔

تاریخ کی انواع میں تاریخِ سیاسی یا تاریخِ ملوکیت کے بعد تاریخِ طبقات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اس مقدمہ کا موضوع بھی "طبقات نگاری" ہی ہے۔ اس لیے آپ کی توجہ میں تاریخ کی اس خاص نوع کیطرف مبذول کراؤں گا۔ طبقات نگاری کے سلسلہ میں "فنِ اسماء الرجال" کا تذکرہ ضروری ہے کہ طبقات نگاری کا بنیادی یا مرکزی نقطہ یہی ہے۔ طبقات پر مبنی کتب "یا تذکرے" اس فنِ تاریخ کی ایک فرع ہے۔ دوسرے علوم کی طرح علم اسماء الرجال پر بھی ہمارے اسلاف کرام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور وہ حضرات اس موضوع پر بھی ایک وقیع اور گرانمایہ سرمایہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں اور یہی سرمایہ آج ہماری دسترس میں ہے لیکن اسماء الرجال کا یہ ذخیرہ اور اس موضوع پر مرتب ہونے والی تالیفات، حضرات مفسرین، محدثین رواۃ حدیث اور فقہائے عظام کے بہت ہی مختصر حالات پر مشتمل اور محتوی ہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ایک معمولی ضخامت کی تالیف میں ہزاروں افراد کے تذکروں کو منضبط کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کے لیے دو دو تین تین سطروں سے اور زیادہ کیا لکھا جا سکتا تھا، یعنی نام مع کنیت (اگر ہے) مولد و منشا تاریخ ولادت اور تاریخِ وفات اور باعتبار راوی انکے ضعیف یا قوی ہونے کا اظہار اور بس ۔ اور یہ اسی ضرورت کے تحت کیا گیا جس کا میں اظہار کر چکا ہوں کہ سیکڑوں ہزاروں افراد کے بارے میں اختصار کیساتھ بھی کچھ لکھا جائے تو وہ ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ یہاں میں مثال کے طور پر "مشکوۃ المصابیح" کے اسماء الرجال کا ذکر کروں گا۔ اس میں مشکوۃ شریف کے رواۃ میں سے ہر ایک کے لیے ایک یا دو سطریں مخصوص کی گئی ہیں اور اس پر بھی وہ ایک اوسط درجہ کی ضخیم کتاب بن گئی ہے۔ اگر ہر ایک راوی کے لیے چند سطروں کے بجائے چند صفحات تو کیا ایک صفحہ بھی مخصوص کر دیا جاتا تو کتاب کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

اسماء الرجال اور تاریخ کا فرق

اسماء الرجال پر تالیف ہونے والی کتب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس فرع کا اس کی اصل کے درمیاں فرق بتا دوں یعنی یہ وضاحت کہ اسماء الرجال اور تاریخ میں کیا فرق ہے اور ان دونوں کا دائرہ کہاں تک محیط ہے ۔ طبقات الرجال اور تاریخ میں فرق یہ ہے کہ بحیثیت ذات دونوں کا مرجع ایک ہے ۔اور بحیثیت اعتبار دونوں کے درمیان تباین اور تغائر ہے ۔یعنی راویوں کے حالات بتانے میں دونوں جمع ہیں ۔لیکن واقعات اور حوادث کے بیان سے صرف تاریخ کو سروکار حاصل ہے ۔ بعض متاخرین نے ان دونوں کے درمیان یہ فرق بیان کیا ہے کہ تاریخ میں ولادت اور وفات اصل چیز ہے جو پیشِ نظر رکھی جاتی ہے اور احوال سے بحث تبعاً کی جاتی ہے اور طبقات الرجال میں بالذات حیثیت احوال کی ہے اور ولادت و وفات پر نظر تبعاً ڈالی جاتی ہے لیکن اوّل الذکر فرق ہی زیادہ مناسب ہے کہ واقعات و حوادث کا بیان تاریخ کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ولادت و وفات کا تذکرہ ضمناً اور تبعاً کیا جاتا ہے ۔ مقصود بالذات نہیں ہوتا ۔

اسماء الرجال یا طبقات اسماء الرجال کی نگارش پر تدوینِ حدیث کے ساتھ ہی ساتھ کام شروع ہو گیا تھا ۔لیکن اس موضوع پر مندرجۂ ذیل حضرات کی طبقات معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہیں اور بہت مشہور ہیں :۔

	صاحبِ طبقات	سالِ وفات
۱۔	علامہ شیخ ابوالولید یوسف بن عبدالعزیز دباغ	متوفی ۵۴۶ھ
۲۔	علامہ حافظ ابن الجوزی	〃 ۵۹۷ھ
۳۔	علامہ شیخ ابن دقیق العید	〃 ۷۰۲ھ
۴۔	علامہ ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی (علامہ ذہبی)	〃 ۷۴۸ھ
۵۔	علامہ حافظ ابوالمحاسن محمد بن علی حسینی	〃 ۷۵۶ھ
۶۔	علامہ تقی الدین محمد بن ابی فہد مکی	〃 ۷۸۱ھ

ان حضرات کے علاوہ دیگر علمائے کرام نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ میں نے یہاں طبقات المحدثین کے چند مشہور مؤلفین کا ذکر کیا ہے۔ ان مذکورہ علمائے کرام نے اپنی تالیفات میں رواۃ حدیث کو بیان کیا ہے اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کرنا اپنے موضوع سے ہٹنے کے مترادف ہوگا۔ اس مقدمہ کا یہ موضوع نہیں ہے۔ مجھے یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ اسماء الرجال کے سلسلہ میں جب سے تدوین حدیث پر کام شروع ہوا اس کے بعد آنے والی ہر صدی میں اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کام ہوا ہے۔ ہر چند کہ آپ ان کتابوں سے شخصی تفصیلات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں محدثین کرام کے حالات پر جو کچھ کام ہوا اس میں آپ کو کچھ تفصیلات مل جائیں گی کیونکہ یہ محدثین حضرات رواۃ حدیث کی طرح بیشمار نہیں ہیں اور ان کے شمار کا دائرہ محدود ہے لیکن اس سلسلہ میں بھی یہ ہوا کہ چند محدثین کرام کے حالات پر مشتمل ایک تالیف مرتب کر دی گئی۔ جداگانہ حالات پر اس موضوع پر بھی آپ کو تالیفات نہیں ملیں گی۔ بعض تالیفات میں زیادہ سے زیادہ یہ تخصیص روا رکھی گئی کہ ایک باب اس کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔

شذرات الذہب اور طبقات الشافعیہ (از علامہ تاج الدین سبکیؒ) اسی قبیل کی تالیفات ہیں اور طبقات الشافعیہ تو اس تخصیص پر ایک اور قید مزید ہے۔ یعنی علامہ تاج الدین ابن تقی الدین سبکی نے اپنے عہد یعنی ساتویں صدی ہجری تک کے ان تمام علمائے عظام مفسرین و محدثین کرام کے تفصیلی حالات منضبط کیے ہیں جن کا مسلک شافعی تھا۔ اس نکتہ کی مزید صراحت و وضاحت آپ آئندہ اوراق میں کسی جگہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ طبقات الشافعیہ، علمائے شافعیہ کی مستند انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "شذرات الذہب" اور طبقات الشافعیہ، بعد کے مصنفین و مؤلفین کے لیے اس موضوع پر بطور مستند ماخذوں کے کام آتی رہی ہیں اور آج بھی ان سے بہت کچھ استفادہ کیا جا رہا ہے۔ طبقات الشافعیہ کے نہج پر طبقات الحنفیہ بھی مرتب کی گئیں۔ ان میں جواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیہ بہت مشہور ہے۔ جواہر المضیہ میں فقہ حنفی پر کام کرنے والے حضرات اور دیگر مصنفین احناف کا ذکر ہے۔ جس طرح جواہر المضیہ مرتب کی گئی اسی طرح اس برصغیر میں علامہ عبدالحئی لکھنوی نے فوائد البہیہ مرتب کی اور لکھنے بعد ان کے ہمنام مولانا عبدالحئی ندوی نے "نزہتہ الخواطر" آٹھ مختصر اور کم ضخامت پر مشتمل

مجلدات میں مرتب کی ۔ ان کتب کا تفصیلی تعارف میں دورِ ہندیہ میں پیش کروں گا۔ جواہر المضیہ کے انداز پر چند طبقات الحنفیہ اور بھی مرتب ہوئیں ۔ ان میں علامہ بدر الدین عینیؒ کی طبقاۃ الحنفیہ بھی اس موضوع پر ایک مستند کتاب ہے۔

طبقات نگاری کا آغاز اور ارتقا

پانچویں صدی ہجری میں "طبقات نگاری" ایک مستقل موضوع نگارش بن گیا تھا اور اس تیزی سے اس موضوع کے تحت کام شروع ہوا کہ اگر آج صرف تمام کتب طبقات ہی کو شمار کر لیا جائے تو ان کتابوں سے اسلامی ادب کا ایک ایسا وقیع ذخیرہ مرتب ہو جائے گا کہ دوسری اقوام کے مجموعی ادبیات کے مقابل میں اسکو رکھا جا سکتا ہے۔ اب میں مختصراً ان طبقات کا آپ سے تعارف کراتا ہوں۔

طبقات القراء، طبقات المفسرین اور طبقات المحدثین پر متعدد کتابیں مرتب ہونے کے بعد طبقات نگاری میں جن موضوعات کو اپنایا گیا ان میں سب سے اول صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاکیزہ احوال اور انکے مقدس شب و روز کے سوانح پر مشتمل کتب طبقات تالیف کی گئیں ۔ ان "طبقات الصحابہ" میں مشہور کتابیں یہ ہیں جن کا بہت ہی مختصر تعارف میں اس سے قبل کرا چکا ہوں ۔

(۱) امام عبداللہ محمد بن سعد الزہری ——— متوفی ۲۳۰ھ ——— طبقات ابن سعد یہ مشہور زمانہ کتاب طبقات ابن سعد تیسری صدی ہجری کے عشرۂ اول میں مرتب ہوئی ۔ اس میں صحابۂ کرام کے حالات تفصیل کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور جس قدر حالات پیش کیے ہیں اُنکی صحت پر کافی دقت نظر اور تفحص سے کام لیا گیا ہے۔ "طبقات ابن سعد" اپنے موضوع پر دنیائے اسلام کی بہت ہی مقبول کتاب ہے اور جو قبولیت اس کو پہلے حاصل تھی وہی آج بھی حاصل ہے۔

(۲) حافظ امام ابو عمر یوسف بن عبد البر اندلسی ——— متوفی ۴۶۳ھ ——— استیعاب طبقات ابن سعد کی طرح صحابۂ کرام کے مقدس حالات پر بڑی مشہور جامع کتاب ہے اور بہت مستند سمجھی جاتی ہے۔

(۳) علامہ شیخ عزالدین علی بن احمد الجزری المعروف بہ ابنِ اثیرؒ متوفی سنہ ۶۳۰ھ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ

اسد الغابہ احوال صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بڑی مشہور کتاب ہے اور اس کی شہرت کا باعث اس کی جامعیت ہے۔ اس کے اردو تراجم پہلے ہند میں پھر پاکستان میں شائع ہوئے جو انہی ہندی اشاعتوں کی دلپذیر نقلیں ہیں۔ بہرحال اس کتاب کی مقبولیت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج اصل کمیاب ہے اور ترجمہ دستیاب ہے۔ اصل کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔

(۴) علامہ حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانیؒ ——— متوفی ۸۵۲ھ ——— الاصابہ فی تمیز الصحابہؓ

الاصابہ فی تمیز الصحابہ" الاستیعاب اور اسد الغابہ کا ایک اعتبار سے تکملہ ہے یعنی ان دونوں کتابوں پر بہت سے مفید اضافے ہیں اور ان مفید اضافوں کے باعث اسکو خود ایک انفرادی کتاب کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ان مفید اضافوں کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ "اسد الغابہ" پانچ جلدوں میں ہے۔ اور "الاصابہ" آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان مندرجہ بالا کتابوں کا موضوع حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقدس و پاکیزہ احوال ہیں اور یہی ان کی قبولیت کا راز ہے۔ ان ہی قرون میں بعض ارباب علم اور صاحبانِ فکر و نظر نے اپنے لیے ایک اور راہ نکال لی۔ ان حضرات نے جب یہ دیکھا کہ حضرات صحابہ کرام کے حالات و سوانح پر مشتمل بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور اس طرح لکھا گیا ہے کہ اب مزید اس پر کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تو پھر انہوں نے اس موضوع کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ اپنے لیے ایک اور راہ نکال لی، یعنی حضرات تابعین اور تبع تابعین کے حالات و سوانح کو اپنا موضوع بنایا۔ ان طبقات میں مندرجہ ذیل طبقات نے زیادہ شہرت پائی۔ ان میں سے بعض حضرات نے اس موضوع کو کمال کی اس بلندی تک پہونچا دیا کہ اس سے آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ ان مؤلفین طبقات " حضرات تابعین و تبع تابعین " میں سرآمد روزگار یہ حضرات ہیں۔

(۱)۔ علامہ خطیب بغدادی متوفی سنہ ۴۶۳ھ آپ کے مولفہ و مرتبہ طبقات کا نام طبقات کے روایتی نام پر نہیں ہے بلکہ اس کا نام "تاریخ بغداد" ہے۔ آپ نام سے حیران نہ ہوں میں صراحت کرتا ہوں۔

تاریخ بغداد بہت ہی عظیم وضخیم کتاب ہے۔ چودہ (۱۴) ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور چونکہ یہ صرف حضرات تابعین و تبع تابعین کے سوانح اور حالات پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اسمیں علاوہ حضرات تابعین، تبع تابعین کے حالات کے ان بزرگوں اور صاحبانِ علوم وفنون کے حالات وسوانح بھی ہیں، جن کا تعلق کسی نہ کسی طور پر بغداد سے رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کا مولد ومنشا بغداد رہا ہو۔ اسی قبیل کی ایک دوسری کتاب تاریخ بغداد کے ایک سو سال بعد تالیف کی گئی یعنی:-

(۲) علامہ حافظ ابوالقاسم ابن عساکر المعروف بہ ابن عساکر — متوفی ۵۷۱ھ — تاریخ ابن عساکر یا تاریخ دمشق

(۳) امام ہمام شیخ عبداللہ یافعی قدس سرہٗ — ۷۵۰ھ کے بعد آٹھویں صدی ہجری — مراۃ الجنان

تاریخ ابن عساکر بیس ۲۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس کی تلخیص بھی بارہ (۱۲) جلدوں میں ہے۔ تاریخ ابنِ عساکر بھی تاریخ خطیب بغدادی کی طرح بہت مشہور ہے۔ اور اس کا نہج واسلوب بھی "تاریخ ابنِ عساکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ "تابعین وتبع تابعین" حضرات کے علاوہ ان علماء وفضلاء اور اُدَبا کے اذکار پر مشتمل ہے۔ جن کا بجائے بغداد کے دمشق سے تعلق رہا ہے۔

مراۃ الجنان یا تاریخ یافعی:- امام یافعی کی تاریخ جو سال بسال واقعات اور ہر سال کے اکابر واعاظم علماء وفضلاء کے احوال وسوانح کا بہترین اور مستند مجموعہ ہے۔ تاریخ ابنِ عساکر اور تاریخ خطیب بغدادی کے نہج پر لکھی گئی ہے۔ علماء کرام کی نظر میں بڑی مستند کتاب ہے۔ اور بعد کے مصنفین کے لیے ایک بہترین ماخذ ہے۔ اسی طرز پر ایک "تاریخ حلب" بھی ہے۔ اس کے مؤلف احمد الحلبی متوفی ۶۶۰ھ ہیں۔

(۴) علامہ عبدالحی بن العماد الحنبلی ——— متوفی ۱۰۸۹ھ ——— شذرات الذہب

دنیائے علم وادب کی مشہور کتاب ہے اور بعد کے مصنفین کے لیے ایک زبردست ماخذ ہے۔ اب تک جن کتابوں کا میں نے ذکر کیا، ان میں سے ہر ایک کسی ایک صدی سے مختص تھی۔ یہ کتاب ہزار سالہ ارباب علم واصحاب فکر ونظر اور اکابر ملت کا تذکرہ ہے۔ حالات بڑی تحقیق

وتجسس وتفحص کے بعد تحریر کیے گئے ہیں۔ اس لیے یہ تمام طبقات قرونیہ میں سب سے زیادہ مشہور ومقبول کتاب ہے۔ "شذرات الذہب" آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

(۵) علامہ قاضی احمد بن خلکان ——— متوفی سنہ ۶۸۱ھ ——— وفیات الاعیان

یہ کتاب حضرات تابعینؒ کے احوال سے شروع کی گئی ہے اور مصنف نے اپنے عہد تک یعنی ساتویں صدی ہجری کے وسط تک جو بزرگ اور مقتدر علماء و صلحاء اور ادبا گذرے ہیں ان کے سوانح اور تراجم لکھے ہیں۔ وفیات الاعیان کی ہر دور کے مصنفین کے لیے تراجم احوال کے سلسلہ میں ایک اہم حیثیت رہی ہے۔ طبقات اور سوانح میں یہ بہت ہی معتبر کتاب ہے۔ متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

اس موضوع نے بہت جلد قبولیت حاصل کر لی اور علما اور اُدبا کی یہ کوشش ہوئی کہ اس کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اپنی تالیف کو مقبول اور پسندیدہ بنانے کیلئے اس موضوع میں کچھ جدت طرازی کیجائے لہذا انھوں نے ایک راہ نکالی۔ ایک مصنف نے کسی ایک صدی کو اپنے طبقات کا موضوع بنالیا اور اس مخصوص صدی کے اکابر کے حالات وسوانح تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ جو حالات پہلی تصانیف یا طبقات میں اختصار کے ساتھ ملتے تھے وہ ان طبقات صدی کی بدولت تفصیل سے پائے جانے لگے۔ ان طبقات قرونیہ (قرن وار طبقات) میں مشہور ترین طبقات یہ ہیں:۔

(۱) علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی سنہ ۸۵۲ھ { الدرر الکامنۃ فی اعیان المأۃ الثامنۃ

یہ کتاب یا طبقات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے اکابر و اعیان کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے۔ یہ چار ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کس قدر تفصیل سے لکھے گئے ہوں گے اور کتنے ادبا اور اکابر کا اس میں ذکر کیا گیا ہوگا۔ یہ کتاب مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

(۲) علامہ حافظ محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی متوفی سنہ ۹۰۲ھ

اس کا نام "الضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع" ہے۔

الضوء اللامع " نویں صدی ہجری کے علماء، فضلاؑ اور اکابر کے حالات پر مشتمل ہے۔ علامہ سخاویؒ نے اس کو اپنے استاد علامہ ابن حجر عسقلانی کے طرز پر مرتب کیا ہے۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ بارہ (۱۲) جلدوں پر مشتمل ہے۔ طباعت پذیر ہو چکی ہے۔ بعد کے مصنفین کے لیے تراجم وسوانح احوال میں بڑی کار آمد اور مستند کتاب ہے۔

(۳) علامہ حافظ نجم الدینؒ دمشقی   متوفی ۱۰۶۱ھ

" الکوکب السائرہ فی اعیان المأة العاشرہ "

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دسویں صدی ہجری کے اکابر و علماء و فضلاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ یہ علامہ سخاوی کی طبقات کی طرح ضخیم تو نہیں، پھر بھی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کی تصحیح علامہ راغب طبّاخ نے کی ہے۔

(۴) علامہ محمد بن المحبی دمشقی   متوفی ۱۱۱۱ھ

" خلاصہ الاثر فی اعیان الحادی عشر "

یہ گیارہویں صدی ہجری کے علماء وفضلاء کی طبقات ہے۔ یعنی ان کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ چاروں جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک عمدہ ماخذ ہے لیکن شذرات الذہب ایسی شہرت اس کو نصیب نہیں ہو سکی۔ کاش اس طرز پر چوتھی یا پانچویں صدی ہجری سے کام شروع ہوتا یعنی قرن وار اکابر و علماء کے حالات قلمبند کیے جاتے تو یہ ذخیرہ اور بھی وقیع اور مہتم بالشان ہوتا، پھر بھی اس سلسلہ اور طرز طبقات نگاری نے کچھ ایسی قبولیت حاصل کی کہ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے مشاہیرِ علم اور اکابرِ ملت کے سوانح وحالات پر مشتمل مختلف طبقات مرتب ہوئے۔ بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کی کتب یا طبقات تراجم یہ ہیں:-

(۱) علامہ محمد خلیل المرادی دمشقی   متوفی ۱۲۰۵ھ   سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر

(۲) علامہ شیخ عبدالرزاق البیطار دمشقی   متوفی ۱۳۳۵ھ   حلیۃ البشر فی اعیان القرن الثالث عشر

یہ بلند پایہ کتاب طبع نہیں ہو سکی۔ علامہ راغب طباخ فرماتے ہیں کہ اس کا قلمی نسخہ خاندان کے افراد کے پاس ہے۔ خیال تو یہی ہے کہ شاید ہی اس کے طبع کرنے کا خیال ان افراد کے دل میں پیدا ہو جب کہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

(۳) علامہ راغب طباخ متوفی سنہ ۱۳۷۰ھ اعلام النبلاء

علامہ راغب طباخ "الثقافۃ الاسلامیہ" جیسی معرکۃ الآرا اور گرانمایہ کتاب کے مصنف ہیں۔ اس کتاب کی بدولت علامہ مبرور و مغفور نے بہت شہرت پائی۔ چونکہ آپ کا تعلق حلب کی یونیورسٹی سے تھا اور ثقافت اسلامیہ کے شعبہ سے آپ متعلق تھے، چنانچہ آپ نے حلب کے مشاہیر مصنفین اور اکابر علماء و فضلاء کا تذکرہ "اعلام النبلا" کے نام سے مرتب کیا۔ یہ تذکرہ ان اصحاب کے حالات اور سوانح پر مشتمل ہے جن کا تعلق تیرہویں صدی ہجری اور وسط قرن چہار دہم ہجری سے ہے اور حلب اور مضافات حلب سے جن کا تعلق رہا ہے۔ یہ کتاب حلب سے شائع ہو چکی ہے

(۴) علامہ شیخ جمیل الشطی دمشقی متوفی سنہ ۱۳۷۵ھ روض البشر فی اعیان القرن الثالث عشر

یہ تذکرہ تیرہویں صدی ہجری کے اکابر علماء و ادباء کے سوانح و حالات پر مشتمل ہے۔ دمشق سے شائع ہو چکا ہے۔

(۵) علامہ محمود شکری الآلوسی متوفی سنہ ۱۳۴۲ھ المسک الاذخر

(محمود بن عبد اللہ)

یہ بہت ہی مشہور تذکرہ ہے۔ اس زمانہ کے مصنفین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ یہ تیرہویں اور چودہویں صدی کے اوائل تک جو اکابر علماء بغداد میں گذرے ہیں ان کے سوانح و حالات پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ ہے اور دستیاب ہے۔

تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری کے اکابر و علماء مصر و شام و عراق اور حجاز کے سوانح حالات پر مشتمل چند اور تالیفات بھی ہوئیں۔ ان میں سے چند مشہور طبقات یا تذکرے یہ ہیں۔

اشہر مشاہیر الشرق مصنفہ مشہور ادیب جرجی زیدان، جو آداب اللغۃ العربیہ کے مشہور مصنف

ہیں۔ اسی طرح کے تذکرے ایران میں بھی شائع ہوئے ۔ ایران پر شعر و شاعری کا مذاق غالب تھا۔ لہٰذا دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک وہاں "طبقات العلماءؒ" کے بجائے "تذکرۃ الشعراء" زیادہ مرتب ہوئے ہیں ۔ میں ان تذکروں کا یہاں ذکر نہیں کروں گا کہ یہ موضوع زیرِ بحث نہیں ہے۔ صفوی سلطنت کے قیام سے پہلے ہرات میں حضرت جامیؒ کے قلم سے "نفحات الانس" آخری طبقات الصوفیہ یا تذکرۃ الصوفیہ ہے ۔ اس کی تفصیل حسبِ موقع پیش کروں گا ۔ دورِ صفویہ میں جیسا کہ آپ کے علم میں ہے شیعیت کو بہت فروغ ہوا اور علمائے اہلِ سنّت کو جبر و تشدّد کا نشانہ بنایا گیا ، اس لیے ان حضرات نے سرزمین برِ صغیر پاک و ہند کا رُخ کیا ۔ دورِ صفویہ میں علمائے جعفریہ یا امامیہ کے تذکرے لکھے گئے ، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ۔ میں صرف طبقات اہلِ سنت کا ذکر کر رہا ہوں ۔ اسی وجہ سے میں نے طبقات الشعراء کے تذکرہ سے قلم کو روکا ہے ۔

متذکرۂ بالا طبقات کسی ایک طبقہ کے لیے مخصوص نہیں تھے ۔ ان طبقات میں اکابر ملت بھی ہیں ، علمائے کرام بھی ہیں ، اُدباء ، صوفیہ اور زہاد سب ہی شامل ہیں ۔ اس لیے ان طبقات کے ڈانڈے "اصطلاحی طبقات الرجال" سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں ۔ ان مجموعی طبقات کے ساتھ ہی ساتھ "طبقات الرجال" یعنی ایک موضوع یا صنفِ خاص پر قلم اُٹھانے یا علم کے ایک مخصوص شعبہ اور فرع سے تعلق رکھنے والے حضرات کے سوانح و تراجم پر بھی کام ہوتا رہا اور یہ کام اس لیے زیادہ مفید اور گرانقدر ہے کہ ایک فن سے تعلق رکھنے والے حضرات پر ایک مبسوط اور ضخیم کتاب میں جو لکھا جائیگا وہ یقیناً زیادہ مفصل ہوگا۔ اول الذکر تذکروں سے احوالِ اکابر پر شعبہ وار یا صنف وار طبقات کا دائرہ بہت وسیع ہے ، بیشمار علوم و فنون ہیں اور ان تمام فنون و علوم کے علمائے متبحر کا احاطہ کرنا اور ان کے سوانح حیات کو ایک کتاب میں جمع کر دینا ایک امرِ محال ہے ۔ بیسیوں دفتر میں بھی اس وسیع دائرہ کو محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لیے اربابِ قلم اور صاحبانِ تصنیف و تالیف نے ایک ایک فن اور علوم کے ایک ایک شعبہ پر قلم اُٹھایا اور اس مخصوص شعبہ کے علمائے متبحرین و مصنفین کو دنیائے علم میں متعارف کرایا ۔

ان طبقات نگار حضرات کا امت پر بڑا احسان ہے کہ ان کی مساعی اور تفحص و کاوش فکر و قلم سے ان حضرات کے احوال و سوانح اور ان کے علمی آثار تاریخ اسلام میں محفوظ رہ گئے اور اور لبعد میں آنے والے مصنفین و مؤلفین کے لیے یہ اولین کاوشیں ایک ایسا ماخذ بن گئیں، جن پر ان کی تصانیف و تالیفات کی خوبی اور عمدگی کا حصر ہے۔

اس دَور کا مصنف جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے خصوصاً ایسے موضوع پر جس کا تعلق ملتِ اسلامیہ کی تہذیب و ثقافت اور علمی کمالات سے ہے تو اس راہ میں پیش آنے والی دشواریوں اور راستہ کے سنگ ہائے گراں اور تاریک گھاٹیاں انہی حضرات کی فکر و کاوش کی شمع کی لَو سے اتنی پُر نور بن جاتی ہیں اور وہ رکاوٹیں اس طرح دُور ہو جاتی ہیں کہ بآسانی راستہ طے کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی حضرات کی علمی کاوشیں اِن سنگ ہائے گراں کو دُور کرنے کے لیے ذہن و فکر کی قوتوں اور بازوئے عمل میں زور پیدا کر دیتی ہیں۔

اِن حضرات کی تلاش اور کاوشِ فکر کے نتیجے جب سامنے ہوتے ہیں تو یہ پیش آمدہ دشواریاں آسانیوں سے بدل جاتی ہیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب ہمارے بزرگوں نے طبقات نگاری کی طرف توجہ کی تو نوعِ انسانی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں چھوڑا جس کو انہوں نے اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ جیسا کہ میں گذشتہ اوراق میں اجمالاً عرض کر چکا ہوں اور نہایت ایجاز و اختصار سے ان کی نشاندہی کی ہے۔ اگر ان سب حضرات کا میں ایک ایک دو دو سطروں میں بھی تعارف کراؤں تو یہ مقدمہ بجائے خود ایک تاریخ طبقات نگاری بن جائیگا، اس لیے میں یہاں صرف ان مشاہیر طبقات نگار حضرات کا ذکر کروں گا جنہوں نے صرف علماء و فضلاء اور صوفیہ کرام کی طبقات نگاری کو اپنا موضوع بنایا اور ان حضرات کے تراجم و سوانح پر اپنے طبقات یادگار چھوڑے اور ان میں سے بھی صرف مشہور اور ضروری طبقات نگار حضرات کا آپ سے تعارف کراؤں گا۔

ادیبوں کے تذکرہ پر مشتمل کتاب "طبقات الأُدَبا" کے نام سے چھٹی صدی ہجری میں تالیف ہوئی۔ اس کے مؤلف ابوالبرکات عبدالرحمٰن الانباری، المتوفی ۵۷۷ھ ہیں یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

"طبقات الادبا" سے بھی زیادہ شہرت پانے والی کتاب "طبقات الحفاظ" ہے۔

یہ مشہورِ زمانہ فاضل جلیل علامہ حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی المعروف بہ علامہ ذہبی متوفی سنہ ۷۴۸ھ کی تالیف ہے۔ یہ کتاب عام طور پر طبقاتِ علامہ ذہبی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

قارئین کرام! یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ "طبقات الحفاظ" حافظانِ قرآن شریف کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ یہ راویانِ احادیث شریفہ کا جامع تذکرہ اور ان حضرات کے سوانح حالات کا ایک مبسوط مجموعہ ہے، صاحبانِ مسانید و معاجم و جوامع و صحاح کیلئے یہ "طبقات الحفاظ" ایک ضروری و مفید ماخذ ہے۔ طبقات الحفاظ، مصر و ہند میں شائع ہو چکی ہے اور دستیاب ہے۔

طبقات نگاری کے سلسلہ میں بعض ارباب قلم نے ایک اور موضوع اور شق کو اپنایا۔ بعض مذاہب اربعہ کے فضلاء اور علماء کا تذکرہ اپنے اپنے فقہی مسلک کے لحاظ سے مرتب کیا۔ ان میں اولیت کا شرف "طبقات الحنابلہ" کو حاصل ہے۔ اس میں وسط قرن ششم تک کے حنبلی علماء و فقہا کے تراجم و سوانح حالات کو تحقیق و تنقیح کے بعد جمع کیا ہے۔

"طبقات الحنابلہ" کے مولف علامہ ابوالحسن محمد بن احمد حنبلیؒ متوفی سنہ ۵۲۶ھ ہیں۔ اس طبقات میں انہوں نے اس دَور تک گذرنے والے تمام فقہائے حنبلی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ طبقات الحنابلہ کی تالیف واشاعت نے حنفی مصنفین کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ بھی اسی نہج پر حنفی علماء و فقہا اور مشہورِ زمانہ اُدبا کا تذکرہ مرتب کریں۔ چنانچہ شیخ جلیل فاضل نبیل عبدالقادر بن محمد القرشی متوفی سنہ ۷۷۵ھ نے الجواہر المضیہ "یا طبقات الحنفیہ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی۔ اسی کتاب کا خلاصہ "الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ" کے نام سے شیخ تقی الدین التمیمی متوفی سنہ ۱۰۰۵ھ نے مرتب کیا۔ علمائے احناف کے طبقات میں یہ تلخیص بڑی مستند اور مبسوط ہے۔ ابھی تک یہ اُردو زبان میں منتقل نہیں ہوئی ہے۔ اسی نہج اور طرز پر علمائے شافعیہ کا ایک ضخیم تذکرہ "طبقات الشافعیہ" کے نام سے علامہ تاج الدین السبکی ابن تقی الدین السبکی متوفی سنہ ۷۷۱ھ نے مرتب کیا۔ یہ تذکرہ بہت ضخیم ہے۔ چھ (۶) جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور علمائے شافعیہ کے تراجم کے سلسلہ میں ایک اہم اور مستند ماخذ کا کام دیتا ہے۔ اس

کتاب نے بڑی شہرت پائی - یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ اب فقہ اربعہ کے علمائے کرام میں فقہ مالکیہ کے ارباب فضل وکمال رہ جاتے تھے۔ اس کمی کو آٹھویں صدی ہجری میں ایک مشہور مالکی عالم اور مصنف نے پورا کیا یعنی شیخ برہان الدین ابراہیم بن فرحون مالکی متوفی سنہ ۷۹۹ھ نے "دیباج الذہب" یا "طبقات المالکیہ" لکھ کر پورا کیا۔ یہ کتاب مصر سے شائع ہو چکی ہے اور علمائے مالکیہ کے تذکرہ میں قابل اعتماد اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں طبقات کا سلسلہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہا، بلکہ ہر فن اور علم کے صاحبانِ فضل وکمال کے سوانح حالات کو منضبط کیا گیا۔ طبقات اُدباء، طبقات الشعراء طبقات الحکما، طبقات نحاۃ اور متعدد موضوعات اور فن کے لحاظ سے طبقات مرتب ہوئیں۔ اس مختصر مقدمہ میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری صدی ہجری کے اواخر سے اسلام میں ایک اور طبقہ اپنے زہد و اتقا خلوصِ عبادت اور راستی و پاک بینی کے اعتبار سے ابھرنا شروع ہوا۔ یعنی طبقۂ صوفیہ شیخ ابو الہاشم دوسری صدی ہجری کے اواخر کی پہلی شخصیت ہیں، جو زاہد یا متقی کے نام سے بلکہ صوفی کے مقدس اور معتبر نام سے موسوم کیے گئے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یہ حضرات حجاز، عراق وشام و مصر اور ایران میں ہر طرف پھیل گئے۔ انھوں نے اپنی عبادت اور تزکیۂ نفس کیلئے خلوت نشینی کی خاطر زاویے یا خانقاہیں تعمیر کرائیں اور دو صدیوں میں یعنی چوتھی صدی ہجری تک ان کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو گئی اور اس علمی نظریۂ حیات نے ایک باقاعدہ عملی زندگی کے حدود میں قدم رکھا۔

تیسری صدی ہجری سے اس نظریۂ حیات پر باقاعدہ تصنیف و تالیفات کا آغاز ہو گیا جس کی تفصیل میں نے "عوارف المعارف" کے اردو ترجمہ کے مقدمہ میں پیش کی ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ تیسری صدی ہجری میں اس "مقدس طبقہ" نے یہ اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طبقہ میں عوام ہی نہیں بلکہ خواص علمائے متبحرین اور فضلائے نبیل وجزیل شامل تھے۔

ان حضرات میں محدثین بھی تھے اور مفسرین بھی، فقہا بھی تھے اور حکماء بھی۔ اسلیے ضرورت ہوئی کہ ان مشاہیر صوفیہ کے تعارف اور تفصیلی احوال پر مبنی طبقات مرتب کیے جائیں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس موضوع پر شیخ الطریقت ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین السلمی نیشاپوری[1] نے قلم اٹھایا اور آپ نے "طبقات الصوفیہ" مرتب فرمائی ۔ یہ کتاب پانچ طبقات پر منقسم ہے۔

اس طبقات الصوفیہ کا ہروی زبان میں کچھ اضافوں کے ساتھ ابو اسمٰعیل عبداللہ ہروی نے ترجمہ املا کرایا اور تکملہ کے بعد اس کا نام بھی طبقات الصوفیہ رکھا گیا۔ عجم میں طبقات الصوفیہ پر یہ پہلی کتاب ہے شیخ سلمی نیشاپوری کے قریب العہد ہی محدثِ عظیم حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ نے طبقات الصوفیہ پر اوّل الذکر طبقات سے ضخیم اور جامع کتاب مرتب فرمائی ۔ اس کا نام آپ نے "حلیۃ الاولیاء" رکھا ۔ یہ چار جلدوں میں ہے اور مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے ۔ محدث ابو نعیم اصبہانی کی طبقات کا دائرہ شیخ سلمی نیشاپوری کی طبقات سے زیادہ وسیع ہے ۔ یعنی اس میں صحابۂ کرام، حضرات تابعین میں سے کچھ حضرات ، تبع تابعین کی ایک جماعت ، مشہور ائمۂ صوفیہ اور اہلِ زہد و تقویٰ کا ذکر کیا ہے اسمیں ان حضرات کے صرف تراجم و سوانح حالات ہی نہیں بلکہ ان بزرگوں کے اقوال اور پاکیزہ کلمات بھی نقل کیے ہیں ۔ اکثر حکایات اور اسناد بھی مذکور ہیں ، جس کے باعث کتاب کی ضخامت زیادہ ہو گئی ہے ۔ بہر حال طبقات پر چوتھی صدی ہجری کی ایک جامع اور مبسوط کتاب ہے۔

شیخ ابن الجوزیؒ جو تاریخ میں سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے تصوف پر ایسی تنقید کی ہے جو ارباب صفا کے قدرے خلاف ہے اور "تلبیس ابلیس" کے نام سے اس تنقید کو پیش کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حافظ محدث ابو نعیم اصبہانی قدس سرہٗ کی ضخیم طبقات موسوم بہ "حلیۃ الاولیاء" یعنی طبقات الصوفیہ کی تلخیص ایک جلد میں کی ہے گو انھوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ میری کتاب "صفوۃ الصفوۃ" حافظ ابو نعیم اصبہانی قدس سرہٗ کی "حلیۃ الاولیاء" کی تلخیص ہے لیکن مباحث و عنوانات کی یکرنگی کے باعث "علامہ راغب طباخ" نے اس کو "حلیۃ الاولیا" کی تلخیص ہی بتایا ہے ۔

---

[1] آپ نے نیشاپور میں ۴۱۲ھ میں وصال فرمایا ۔ آپ کی طبقات تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے ارباب تصوف کے تراجم یا سوانح حالات پر مشتمل ہے۔

"الثقافۃ الاسلامیہ" میں تحریر فرماتے ہیں

اسی حلیۃ الاولیا کو ایک اچھے اسلوب اور اندازِ خوب میں حافظ ابوالفرج عبدالرحمٰن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ نے مختصر کیا ہے۔ اور اس کو "صفوۃ الصفوۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے اور "حلیۃ الاولیا" کے بعض نکات پر تنقید بھی کی ہے۔"

یہاں یہ بحث نہیں کہ "صفوۃ الصفوۃ" حلیۃ الاولیا" کی تلخیص ہے یا خود مستقل ایک تصنیف ہے بلکہ اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ محدث عظیم ابونعیم اصبہانی قدس سرہٗ کی حلیۃ الاولیا کے بعد طبقات الصوفیہ پر ابن الجوزی کی صفوۃ الصفوۃ بھی ایک قابلِ ذکر کتاب ہے۔

بعد کے مصنفینِ طبقات الصوفیہ کے لیے حلیۃ الاولیا ایک اساس اور ایک اہم ماخذ بنی رہی، چنانچہ آٹھویں صدی ہجری میں علامہ محمد بن حسن بن عبداللہ شافعی متوفی ۷۶۶ھ کی مشہور کتاب "مجمع الاخبار فی مناقب الاخیار" اسی حلیۃ الاولیا کا اختصار ہے۔ لیکن انہوں نے بعض تراجم کا اضافہ بھی کیا ہے۔ یعنی اپنے عہد تک کے بعض اربابِ تصوف کے سوانح حالات اس میں بیان کیے ہیں۔

نفحات الانس

بعض حضرات کا یہ خیال کہ نفحات الانس مصنفہ حضرت جامی قدس سرہٗ بھی حلیۃ الاولیا کی تلخیص ہے درست نہیں ہے بلکہ یہ شیخ سلمی نیشاپوری کی کتاب "طبقات الصوفیہ" پر مبنی ہے جس کو کچھ اضافوں کے ساتھ حضرت شیخ ابواسمٰعیل عبداللہ انصاری ہروی نے ہروی زبان میں املا کرایا تھا (حضرت جامی قدس سرہٗ نے پہلی مرتبہ اس ہروی زبان کی طبقات الصوفیہ کو فارسی میں متعدد اضافوں کے ساتھ منتقل کیا۔ یہ اضافہ ان بزرگوں کے تراجم اور سوانح حالات کا ہے جو ہروی زبان کی طبقات الصوفیہ میں بیان نہیں کیے گئے تھے۔ البتہ دسویں صدی ہجری میں مشہور زمانہ عالم محدث فقیہ شیخ عبدالوہاب بن احمد شعرانی متوفی ۹۵۲ھ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "الواقع الانوار فی طبقات السادۃ الاخیار" اسی طبقات الصوفیہ (ابونعیم اصبہانی) کو ماخذ بنا کر مرتب فرمائی۔ یہ کتاب "حلیۃ الاولیا" کی تلخیص کہی جا سکتی ہے۔ مذکورۂ بالا طبقات الصوفیہ کے علاوہ گیارہویں صدی

ہجری میں مرتب ہونے والی اس کتاب کا ذکر بھی ضروری ہے اس سے میری مراد " الکوکب الدریہ فی مناقب الصوفیہ " ہے ۔ جس کے مؤلف علامہ شیخ محمد بن عبد الرؤف المناری ہیں ، جن کا سالِ وفات ۱۰۳۱ھ ہے ۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے ۔

بعض اصحاب فکر و ارباب قلم نے طبقات نگاری میں ایک نئی راہ پیدا کی ، یعنی بعض مشائخ متقدمین اور صوفیہ عظام قدس اللہ اسرارہم نے موضوع تصوف پر جب قلم اُٹھایا اور تصوف کو علمی حیثیت سے پیش کیا تو اپنی تصانیف میں ایک باب " تذکرۃ الصوفیہ " یا " احوال الصوفیہ " کیلئے بھی مختص کیا ۔ ایسے بزرگوں میں حضرت امام طریقت شیخ ابو القاسم قشیری[1] قدس سرہ کو اولیت کا فخر حاصل ہے ۔ آپ نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف موسوم بہ " رسالہ قشیریہ " میں ایک باب احوال الصوفیہ کیلئے بھی مخصوص رکھا ہے ۔ رسالہ قشیریہ ایک اوسط درجہ کے حجم کی تصنیف ہے ۔ امام قشیری نے ایک مخصوص باب میں (۸۳) تراسی مشائخ معروف کا تذکرہ لکھا ہے ۔ ہر چند کہ یہ سوانح حالات مختصر ہیں لیکن بڑے مستند اور دلپذیر انداز میں تحریر کیے گئے ہیں ۔ یہ رسالہ ۱۳۱۴ھ میں مصر سے طبع ہو چکا ہے ۔ رسالہ قشیریہ عربی زبان میں ہے ۔

اسی زمانہ میں برِ صغیر پاک و ہند کے پہلے شیخ الطریقت جنہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ مبذول فرمائی ۔ شیخ الطریقت قدوۃ السالکین حضرت علی بن عثمان جلابی الہجویری الغزنوی قدس سرہٗ المعروف بہ داتا گنج بخش رح متوفی ۴۶۵ھ ہیں جنہوں نے لاہور کی سرزمین کو اپنے قیام سے رونق بخشی اور اپنی مشہورِ زمانہ کتاب " کشف المحجوب " کا یہاں تکملہ کیا ۔ کشف المحجوب لارباب القلوب " تصوف کے موضوع پر فارسی زبان میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے ۔ کشف المحجوب کو قرنِ پنجم کی تصوف کے موضوع پر جامع ترین کتاب تسلیم کیا گیا ہے ۔ حضرت ہجویری قدس سرہٗ نے " کشف المحجوب کے کشف (باب) اٹھارہ کے ذیل میں پہلی صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک کے مشائخ کرام کے سوانح حالات تحریر فرمائے ہیں ۔

" طبقات الصوفیہ " کے طرز پر فارسی زبان میں " تذکرے " بھی مرتب ہوئے ، ان

---

[1] شیخ الطریقت ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری النیشاپوری المعروف بہ استاذ القشیری امام قشیری متوفی ۴۶۵ھ

تذکروں میں اوّلیت کا شرف شیخ الطریقت شیخ فریدالدین عطار قدس سرہٗ متوفی ۶۲۰ھ کو حاصل ہے۔ آپ کا مرتب کردہ تذکرہ "تذکرۃ الاولیاء" کے نام سے مشہور و معروف اور متداول ہے۔ یہ تذکرہ "رینالڈ آلن نکلسن" مشہور برطانوی مستشرق کی کوشش سے دو جلدوں میں کافی تصحیح اور تقابل نسخ کے بعد لیڈن سے شائع ہو چکا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے اور اُردو زبان میں اس کے کئی ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ فارسی زبان میں چھٹی صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک صوفیہ کرام کے تذکروں میں ایک خلا موجود ہے اس کے اسباب و علل پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس تین سو سال کی مدت میں تصوف کے موضوع پر بڑی بلند پایہ اور گرانقدر تصانیف لکھی گئیں، لیکن طبقات الصوفیہ پر قلم نہیں اٹھایا گیا۔ صرف نویں صدی ہجری میں "نفحات الانس" ایک قابلِ قدر اور گرانمایہ تذکرۃ الصوفیہ ہے، جس کی تالیف کا کام ۸۸۱ھ میں شروع ہوا، اور ۸۸۳ھ میں اس کا تکملہ ہوا۔ "نفحات الانس" میں چھ سو سے زائد بزرگانِ تصوف اور مشائخ طریقت کا ذکر ہے۔ بعض سوانح بہت مختصر ہیں اور بعض کچھ تفصیل کے ساتھ ہیں۔ اس تذکرہ کا معتد بہ حصہ جیسا کہ خود حضرت جامی قدس سرہٗ نے نفحات الانس کے مقدمہ میں اس کی صراحت کی ہے، حضرت شیخ ابو اسمٰعیل عبداللہ ہرویؒ کے طبقات الصوفیہ (بزبان ہروی) پر مبنی ہے۔ امالی ہرویؒ پر مزید اضافے اور دیگر سوانح حالات خود حضرت جامی قدس سرہٗ کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں۔

نفحات الانس کے بعد عرب و عجم میں اس موضوع پر کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا البتہ برصغیر میں اس موضوع پر قلم اُٹھایا گیا اور خوب خوب لکھا گیا۔ ان تذکروں میں شیخ امیر خورد المتوفی ۷۷۰ھ کا تذکرہ سیر الاولیا، اور سلطان ابراہیم لودھی کے استاد شیخ جمالی کا مصنفہ تذکرہ "سیر العارفین" شیخ الہدیہ کا مرتبہ تذکرہ "سیر الاقطاب" شیخ غوثی منڈوی شطاری کا مرتبہ تذکرہ "گلزار ابرار" برصغیر پاک و ہند میں لکھے جانے والے قدیم تذکرے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں گیارہویں صدی ہجری میں لکھے جانے والے دو تذکرے اور قابلِ ذکر ہیں جو آج تک مشہور ہیں اور قبولِ عام کی سند ان کو حاصل ہے، ان میں سے ایک محدث عظیم شیخ الطریقت عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ متوفی ۱۶۴۲ء کا تصنیف کردہ تذکرہ

"اخبار الاخیار" ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے۔ اس تذکرہ کا آغاز تبرکاً و تیمناً حضرت غوث الثقلین قطب ربانی محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے تذکرہ سے کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مبنی ہے "تذکرۂ صوفیائے ہند" پر۔ دوسرا مشہور تذکرہ جو اخبار الاخیار سے قریب العہد ہے۔ وہ "سفینۃ الاولیا" ہے۔ اس کا مرتب شہزادہ والا قدر دارا شکوہ مقتول ہے۔ یہ صرف صوفیائے ہند و پاک پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہے اور مشاہیر صوفیۂ عجم و عرب و عراق کا بھی تذکرہ ہے۔ لیکن زیادہ ضخیم نہیں ہے۔ زبان فارسی ہے۔ ان مجموعی تذکروں کے بعد اس نہج پر اس برصغیر میں اور بھی تذکرے لکھے گئے ہیں۔ یہ تھی بحیثیت مجموعی "تذکرۃ الصوفیہ" کی ایک مختصر تاریخ۔

تاریخ تصوف کا مطالعہ کرنے والے حضرات واقف ہیں کہ عرب و عجم میں تصوف کے بہت سے خانوادے ظہور میں آئے اور ان کے تراجم و سوانح پر بھی بہت سی کتب بطور طبقات مرتب ہوئیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ میں یہاں اُن کا تذکرہ ضروری خیال نہیں کرتا کہ اگر میں صرف اُن کے نام اور سالِ تصنیف ہی کو معرضِ نگارش میں لاؤں تو یہ مقدمہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اب میں برصغیر کی تاریخی کتب کی تفصیل شروع کروں گا۔

برصغیر پاک و ہند کے صوفیائے کرام کے ان تذکروں کے ساتھ تاریخ کی دوسری انواع پر بھی قلم اُٹھایا گیا ہے۔ وقائع سلاطین یا ملوکیت کی تاریخ نگاری اس برصغیر میں خوب پروان چڑھی۔ چنانچہ تاریخ ملوکیت میں ہماری نگاہوں کے سامنے سب سے پہلے "فتح نامہ سندھ" المعروف بہ "چچ نامہ" آتا ہے جو برصغیر میں لکھی جانے والی ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ آج وہ عربی تاریخ موجود نہیں لیکن اس کا یہ فارسی ترجمہ موجود ہے جو مشہور انشا پرداز علی کوفی نے اپنے ممدوح سلطان ناصر الدین قباچہ (۶۰۲ھ تا ۶۲۵ھ) گورنر سندھ ملتان کے لیے لکھا تھا۔ چچ نامہ کے علاقائی اور اُردو زبان میں تراجم ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد سندھ کے وقائع پر "تاریخِ معصومی" ہے جو میر معصوم بھکری نے تالیف کی۔ اس کا متن عربی ہے اور اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

"تاج المآثر" مصنفہ نظام الدین حسن نظامی نیشاپوری، یہ عہد قطبی کی تاریخ ہے جو قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کے عہد کے وقائع پر مشتمل ہے۔

"سلسلۃ الانساب" مصنفہ فخر مدبر دہلوی (فخر الدین مبارک شاہ) اس کی زبان

عربی ہے ۔ یہ تاریخ ، تاریخ فخرالدین مبارک شاہ کے نام سے بھی معروف ہے ۔

عہد ناصری

(سُلطان ناصرالدین محمود)

سلطان ناصرالدین کا عہد تاریخی کتب کے اعتبار سے بھی ایک یادگار عہد ہے اور اس عہد کی مشہور تاریخ " طبقات ناصری " ہے جس کے مؤلف قاضی منہاج سراج جرجانی ہیں ۔ قاضی منہاج نے اپنی کتاب " طبقات ناصری " کا تکملہ ۱۲۵۹ء تا ۱۲۶۰ء (۶۵۸ھ تا ۶۵۹ھ) میں کیا اور اس کو سلطان ناصرالدین محمود کے نام نامی پر معنون کیا ۔ اس تاریخ میں سلاطین غزنہ سے سُلطان ناصرالدین محمود کے زمانہ تک کے حالات ہیں اور اس کے متن کی زبان فارسی ہے ۔ (اس کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے)

تاریخ فیروز شاہی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، عہد فیروز شاہی کی مشہور تاریخ ہے اور اس کا مولف مشہورِ عالم ضیاء الدین برنی ہے ۔ یہ تاریخ ، " تاریخ برنی " کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ تاریخ فیروز شاہی ، طبقات ناصری کا تکملہ ہے ۔ برنی کی اس تاریخ نے بہت شہرت پائی اور آج تک مشہور ہے اور مستند سمجھی جاتی ہے ۔

تاریخ فیروز شاہی مرتبہ سراج عفیف ، یہ تاریخ بھی فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مرتب ہوئی ۔ یہ ایک عمومی تاریخ ہے لیکن فیروز شاہ تغلق کے وقائع تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں ۔ سراج عفیف نے اس کو ۱۲۹۸ء (۶۹۷ھ) میں مرتب کیا ۔

فتوح السلاطین اپنی نوعیت کی واحد تاریخ ہے یعنی علامہ عصامی نے اس کو نظم کیا ہے ۔ یہ منظوم تاریخ فخرالملک عصامی کی تصنیف ہے اور سلاطینِ دہلی کے وقائع پر مشتمل ہے ۔

دورِ مغلیہ میں مدوّن اور مرتّب ہونیوالی کتب تاریخ

عہدِ بابری عہدِ بابر میں کوئی عمومی یا ملکی تاریخ نہیں لکھی گئی بجز اس کے کہ شہنشاہ بابر نے

جو ایک بلند پایہ انشا پرداز بھی تھا اپنے زمانہ کے واقعات کو خود ہی قلمبند کیا ، اور " توزک بابری " نام رکھا ، یہ توزک عہد بابری کے یے ایک مستند اور عمدہ ماخذ ہے ۔

عہد ہمایوں

شہنشاہ ہمایوں کا دَور ملک کی سیاسی ابتری کا دور ہے ۔ خود ہمایوں کو سکون و آرام سے حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا ۔ ہمایوں کے دور میں عمومی تاریخ کی کمی کو کسی قدر شہنشاہ بابر کی شاہزادی گلبدن بیگم نے " ہمایوں نامہ " لکھ کر پورا کر دیا ۔ اگرچہ ہمایوں نامہ شخصی وقائع اور سوانح پر زیادہ تر مشتمل ہے لیکن ضمناً عمومی تاریخی واقعات بھی اس سلسلہ میں آ گئے ہیں ۔ اس دَور میں صوفیہ اور فقراء کے تذکرے بھی مرتب ہوتے ، جن کا ذکر میں جداگانہ کروں گا ۔

دَورِ اکبری

مغل اعظم جلال الدین محمد اکبر کی سلطنت جس قدر وسیع اور مستحکم تھی وہ قارئین سے پوشیدہ نہیں ۔ اس دور میں سیاسی استحکام نے ارباب علم و فضل کے قلم کو بھی اپنی جولانیاں دکھانے کا موقع فراہم کیا ۔ دربار کے امراء و عمائدین میں سے اکثر نے تاریخ نگاری پر قلم اٹھایا ۔ ان میں اوّلیت کا فخر ابوالفضل کو حاصل ہے جس کی آئین اکبری اگر ایک طرف جلال الدین اکبر کے آئین و ضوابط سلطنت پر مشتمل ہے تو دوسری طرف ابوالفضل نے اکبر نامہ جیسی ضخیم تاریخ اس عصر کی مرتب کی چونکہ اکبر کا دَور ایک طویل دور ہے ۔ یعنی ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ) اس لیے اس طویل دور کی تاریخ بھی بہت ضخیم ہے ۔ جب کہ تمام وقائع کا اس میں احاطہ کیا گیا ہے ۔

اسی زمانہ میں ملا عبدالقادر بدایونی ابن ملوک شاہ نے اکبری عہد میں اپنی تاریخ موسوم بہ " منتخب التواریخ " مرتب کی (یہ تاریخ تین جلدوں میں ہے لیکن اکثر مقامات پر مؤرخانہ اور ادیبانہ شائستگی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے ۔ منتخب التواریخ ، طبقاتِ اکبری کے تین سال بعد ۱۵۹۶ء میں لکھی گئی ۔ اکبری عصر کی ایک اور اہم تاریخ " طبقاتِ اکبری " ہے ۔ جس کے مصنف

نظام الدین ہروی ہیں۔ اس تاریخ کا تکملہ ۱۵۹۳ء (۱۰۰۲ھ) میں ہوا۔ اکبرنامہ کے مقابلہ میں اس کی زبان نہایت سادہ اور صاف ہے۔ (واضح ہو کہ سلاطین مغلیہ کی دفتری زبان فارسی تھی۔ اور اس عہد کی تمام غیر مذہبی تصانیف فارسی زبان میں ہیں)

دورِ اکبری کی ایک اور مشہور تاریخ "تاریخ فرشتہ" ہے۔ جس کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ ہے۔ اس نے دربارِ اکبری سے ہزاروں کوس دور بیجاپوری سلاطین کے دار الخلافہ میں بیٹھ کر یہ تاریخ لکھی۔ ہم نے دورِ اکبری کے تحت تاریخ فرشتہ کا ذکر محض ایک معاصرانہ تاریخ کے اعتبار سے کیا ہے۔ ورنہ شہنشاہ اکبر یا اس کے درباری امرا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ فرشتہ یا گلشن ابراہیمی جو ابراہیم عادل شاہ کے نام سے معنون ہے "مسلمانوں کے ورود ہند" کے بعد کی ایک عمومی تاریخ ہے۔ بعد کے مورخین نے اس کتاب سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور اس کو قابل استناد سمجھا ہے۔ صوبائی احوال کے سلسلہ میں بھی تاریخ فرشتہ کافی مواد فراہم کرتی ہے۔

محمد قاسم ہندو شاہ نے اپنی تمام زندگی جنوبی ہندوستان ہی میں گزاری اور شمالی ہندوستان آنے کا کبھی قصد نہیں کیا۔ محمد قاسم ہندو شاہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کا ایک نیک نام مشہور مورخ ہے۔ تاریخ فرشتہ کا اُردو ترجمہ ہو چکا ہے اور دستیاب ہے۔ تاریخ فرشتہ کا متن فارسی ہے اور یہ کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔

تاریخ معصومی

علاقائی تاریخوں میں عہد اکبری کی مشہور تاریخ "تاریخ معصومی" ہے لیکن یہ صوبہ سندھ کی سیاسی تاریخ ہے۔ تاریخ فرشتہ کی طرح اس کا موضوع وسیع نہیں ہے۔ تاریخ معصومی کا متن عربی ہے اور اس کے مصنف میر معصوم بھکری ہیں۔ ۱۰۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ تاریخ معصومی کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ تاریخِ معصومی سندھ پر پہلی تاریخ نہیں ہے بلکہ اس سے بہت پہلے چچ نامہ لکھا جا چکا تھا۔

عہد شاہ جہانی

شاہ جہاں (سلطان شہاب الدین) ایک بہت ہی علم پرور بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں ایک طرف تو عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں تو دوسری طرف ارباب قلم نے اپنی بے مثال د

وبے نظیر تالیفات و تصنیفات سے ہمارے علمی و ادبی خزانہ کو معمور کیا۔ میں اس دور کی علمی تاریخ بیان کرنے سے اپنے قلم کو روک کر اپنے موضوع کے اعتبار سے ان تاریخی کتب کا ذکر کروں گا جو شاہ جہاں کے دور میں لکھی گئی ہیں۔ عہدِ شاہ جہانی کی تاریخی کتب میں عبد الحمید لاہوری (متوفی ۱۶۵۴ء مطابق ۱۰۶۵ھ) کا "بادشاہ نامہ" بہت مشہور ہے۔ "بادشاہنامہ" شاہجہاں کے ابتدائی بیس سالہ عہد کی مفصل تاریخ ہے۔ شاہجہاں نے ان کو ٹھٹھ سے طلب کر کے تاریخ نگاری پر مامور کیا۔ اور انہوں نے فارسی زبان میں بیس سالہ دورِ شاہجہانی کی تاریخ مرتب کی اور انعاماتِ خسروی سے سربلند ہوتے۔ عبد الحمید لاہوری عہدِ شاہجہانی کے دوسرے مشہور مورخ محمد صالح کنبوہ کے ہم عصر ہیں۔ محمد صالح نے "عمل صالح" میں ان کا ذکر بہت عزت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ بادشاہ نامہ ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۵۵ھ تک وقائع شاہجہانی پر مشتمل ہے

عمل صالح

شاہجہانی دور کی دوسری مشہور تاریخ ہے۔ عمل صالح "یا شاہجہاں نامہ" محمد صالح کنبوہ کی تصنیف ہے۔ اس کی زبان بھی فارسی ہے۔ تین مختصر جلدوں میں ہے۔ اس کا متن اور اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ عمل صالح عہدِ شاہجہانی کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ لیکن بادشاہ نامہ" کے برخلاف یہ شاہجہاں کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و وقائع پر مشتمل ہے۔ بادشاہنامہ کی طرح یہ کتاب بھی سنہ وار واقعات پر مشتمل ہے۔ شاہجہاں کے مرگ بیکسی کو جس انداز سے اس مورخ نے تحریر کیا ہے وہ بہت ہی عبرت خیز مرقع ہے۔ عمل صالح کی آخری جلد میں شاہجہاں کے وزرا، امراء، اور اس عصر کے شعرا، صلحا اور اربابِ علم و فضل کا تذکرہ بہت ہی پُر از معلومات ہے۔

عمل صالح کا تکملہ بقول مصنف ۱۰۷۰ھ میں ہوا، لیکن شاہ جہاں کی نظر بندی اور وفات (۱۶۶۶ء مطابق ۱۰۷۶ھ) کے واقعات بھی اس میں موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود مصنف نے تکملہ کے بعد اس میں اضافہ کیا ہے۔

محمد صالح کنبوہ کا انتقال ۱۰۸۵ھ میں ہوا۔ اس طرح انہوں نے عہدِ شاہجہانی اور عالمگیری دونوں کو پایا ہے۔ ان کی صاف گوئی اور حقیقت نگاری قابلِ ستائش ہے کہ شاہجہاں کے ایام اسیری اور اس کی وفاتِ حسرت آگیں کا بیان جس طرز پر کیا ہے وہ عالمگیر کے دامن پر ایک دھبہ ہے لیکن محمد صالح نے عالمگیر کی پسند یا ناپسند کا خیال قطعی نہیں کیا اور ان واقعات اور حقائق پہ پردہ

ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

عمل صالح تاریخی صداقت کے اعتبار سے نہایت ہی اہم کتاب ہے۔

عہدِ شاہجہانی کی بعض دوسری تاریخی کتب بھی ہیں یعنی بادشاہ نامہ مولفہ میرزا محمد قزوینی ملخص بادشاہ نامہ مولفہ محمد طاہر آشنا، تاریخ دلکشا اور تاریخ حقی از محدث دہلوی مولانا عبدالحق قدس اللہ سرہٗ لیکن یہ کتب آج کل نایاب ہیں صرف بعض کتب میں ان کے نام باقی رہ گئے ہیں یا ان کے مخطوطات کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس عصر کی ایک علاقائی تاریخ یعنی ترخان نامہ" یا ارغون نامہ" قابلِ ذکر ہیں۔ خاندان ارغون یا سندھ کے ترخانی حکمرانوں کی ایک مستند تاریخ ہے۔ ترخان نامہ کے مولف میر جلال الدین حسینی شیرازی ہیں جنہوں نے سنہ ۱۰۶۵ھ میں اس کو تالیف کیا اور محمد صالح ترخان حاکم سندھ کے نام سے معنون کیا اور اسی مناسبت سے اس کا نام ترخان نامہ" رکھا۔ ترخان نامہ کا متن فارسی ہے اور مطبوعہ دستیاب ہے۔

دورِ عالمگیری

اورنگ زیب عالمگیر سنہ ۱۶۱۸ء میں " دوحد " کے مقام پر پیدا ہوئے اور سترہویں صدی کے وسط یعنی سنہ ۱۶۵۹ء میں شاہجہاں کی نظربندی کی حالت میں تخت نشین ہوئے اور سنہ ۱۷۰۷ء (۱۱۱۸ھ) میں نوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اورنگ زیب کا دور بھی علم و فضل خصوصاً احیاء فقہ اسلامی کا دور ہے۔ فتاویٰ ہندیہ اسی دور کی تالیف ہے۔ اس دور کی عمومی تاریخوں یا ملکی و سیاسی تاریخی کتب میں " مآثر عالمگیری از مستعد خان محمد ساقی اور " وقائع نعمت خان عالی" بہت مشہور ہیں۔ مآثر عالمگیری کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور سنہ جلوس عالمگیری سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ بیچارہ مورخ یہاں مجبور ہے وہ پیدائش اور تخت نشینی تک کے حالات کس طرح رقم کرتا۔ اس کو عہدِ عالمگیری میں منصب بھی حاصل تھا اور عالمگیر کا درباری بھی تھا !! اس طرح پیدائش اور تخت نشینی تک کے حالات کے لیے بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری اور عمل صالح ہی بعد کے موٴرخین کے لیے تاریخی ماخذ ہیں۔ سید نجیب اشرف ندوی نے جو رقعات عالمگیری جمع کیے ہیں، وہ بھی ایک مستند تاریخی مواد اورنگ زیب عالمگیر کے سلسلہ میں فراہم کرتے ہیں۔

وقائع نعمت خان عالی

نعمت خان عالی (المخاطب بہ مقرب خان) اورنگ زیب کا ایک دربار کی امیر تھا۔ دکن میں اورنگ زیب کے محاربات میں شرکت کی اور اورنگ زیب عالمگیر کے ان محاربات کے وقائع بیان کرنے میں طنز و تعریض کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وقائع نعمت خان عالی اورنگ زیب عالمگیر کی نظر سے گذری یا نہیں، رقعات عالمگیری میں اس طرف اشارے ضرور ملتے ہیں کہ شہنشاہ نعمت خان عالی کی طنز و تعریض کو طرح دے جاتے ہیں۔ وقائع نعمت خان عالی، تاریخ جہاں کشائے جوینی اور تاریخ وصاف کی طرح انشاپردازی کے محاسن سے آراستہ ہے۔ تاریخی بیان کیلئے جو سادگی چاہیے" وہ مفقود ہے۔ نثر پر تصنع اور آورد کا رنگ بڑھا ہوا ہے۔ اورنگ زیب کے انتقال ۱۷۰۷ء کے بارہ سال بعد ۱۷۱۹ء میں نعمت خان عالی کا انتقال ہوا۔

اس عصر کی تیسری تاریخ سجان رائے بٹالوی (م ۱۶۹۵ء) کی تاریخ "خلاصۃ التواریخ" ہے۔ دورِ مغلیہ میں ایک ہندو فرد کی گرانقدر نگارش ہے۔ یہ ایک بہت ہی جامع تاریخ ہے۔ سب سے اول ہندوستان کی قدیم تاریخ راجہ پرتھی راج تک بیان کی ہے۔ پھر مسلم سلاطین یعنی غزنوی سے اورنگ زیب تک کے واقعات بیان کیے ہیں۔ مسلم سلاطین کے حالات بہت ہی مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ وہ اگر تفصیل سے بیان کیے جاتے تو کئی جلدوں میں تاریخ ختم ہوتی۔ بعض محققین نے سجان رائے کا نام "سجان سنگھ ویر" لکھا ہے۔ خلاصۃ التواریخ اوسط تقطیع کے ۵۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

شہنشاہ عالمگیر کے عصر و سیاست پر دوسری لکھی جانیوالی تاریخی کتاب "واقعاتِ عالمگیری" یا عالمگیر نامہ ہے جس کے مصنف عاقل خاں رازی ہیں جن کو شاہی دربار میں ایک امیر کی حیثیت حاصل تھی۔

عالمگیر نامہ

ایک غیر معروف مصنف و مؤرخ میر محمد کاظم نے بھی مرتب کیا تھا، لیکن اسکو شہرت نہ مل سکی اس کے بعض نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

احکام عالمگیری

احکام عالمگیری کے مولف حمید الدین خان بہادر ہیں جو اورنگ زیب کے زمانہ میں ایک ممتاز فرد تھے۔ حمید الدین خان نے اورنگزیب کی وفات کے بعد اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔

اورنگزیب عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد ملک سیاسی ابتری کا شکار ہو گیا۔ تقسیم ملکی کے

سلسلہ میں باپ کے وصیت نامہ کو شاہزادگانِ والا تبار نے قبول نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں ''جنگ پسران اورنگ زیب نے'' ملک کے امن و امان کو تہ و بالا کر ڈالا۔ اورنگ زیب کا دوسرا بیٹا شہزادہ معظم جنگ میں کامیاب ہُوا، اور ''بہادر شاہ'' کے لقب کے ساتھ تخت سلطنت پر جلوس کیا اور بہت جلد شاہزادہ کام بخش کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اتنی وسیع و عریض سلطنت کا بوجھ بہادر شاہ بھی برداشت نہ کر سکا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سکھوں، جاٹوں، وغیرہ سے لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ میں اس دورِ ابتلا کی تاریخ یہاں کیا بیان کروں۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس افراتفری میں بھی صاحبانِ قلم نے قلم ہاتھ سے نہیں رکھا اور مختلف موضوعات پر صدہا کتابیں لکھی گئیں۔ اور نگ زیب کے بعد لکھی جانے والی کتبِ تاریخ کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

منتخب اللباب از خافی خان: شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد لکھی جانے والی تاریخی کتب میں اس کا خاص مقام ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ خافی خاں (نظام الملک) نے یہ تاریخ ۱۷۱۷ء میں لکھنا شروع کی اور بعض موانع کے باعث مدت مدید کے بعد یعنی ۱۷۳۳ء میں اس کا تکملہ ہوا۔ یہ موانع اس دور کی سیاسی ابتری اور کمزور حکومتوں کے قیام کے بعد اندرونی و بیرونی یورش اور خانہ جنگیاں تھیں۔ معاصرانہ حالات و واقعات پر مستند کتاب ہے۔

جلدِ اوّل : بابر سے جہانگیر تک

جلدِ دوم : دورِ شاہجہانی پر مشتمل ہے۔

جلد سوم : دورِ عالمگیر سے مختص ہے

جلد چہارم : شاہ عالم سے ناصر الدین (محمد شاہ) تک ہے۔

منتخب اللباب ہندستان کے مغلیہ خاندان کی معتبر تاریخ ہے۔ چاروں جلدوں کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ منتخب اللباب کی تالیف کے کافی عرصہ بعد سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی (۱۸۲۷ء و ۱۸۱۵ء) ہیں۔ دورِ مغلیہ کی یہ آخری تاریخ ہے۔ سیر المتاخرین کا تکملہ ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ آخری مغلیہ دور پر یہ بہت مستند دستاویز ہے، لیکن عقیدہ کی جنبہ داری کی جھلکیاں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ سیر المتاخرین کی زبان بھی فارسی ہے۔ اس تاریخ پر اٹھارہویں صدی عیسوی کی تاریخ نگاری کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد فارسی زبان میں عمومی اور ملکی تاریخ کوئی اور سامنے نہیں آتی۔ اُنیسویں صدی میں آخری مغل

تاجدار کے حسب ارشاد میرزا غالب دہلوی نے "مہر نیم روز" کے نام سے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنا شروع کی تھی، لیکن وہ تمام ذکر نہ کر سکے۔ آپ "مہر نیم روز" کو میرزا غالب کی نثر نگاری اور انشاپردازی کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے دورِ مغلیہ کی تاریخ نگاری کا خاتمہ حقیقت میں سیر المتاخرین پر ہی ہوتا ہے۔

انیسویں صدی میں برصغیر ہند و پاک میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ بہت سی ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر بزم تیموریہ کی شمع سحر گاہی کی طرح تھے آخرکار ۱۸۵۷ء میں بزم تیموریہ کی بساط اُلٹ دی گئی۔ اور یہ شمع رنگون میں گل ہو گئی۔

ایسے پر آشوب اور مسلوب الاختیار دور میں شاہی حکم سے کیا کوئی تاریخ لکھی جاتی، البتہ صوبائی، علاقائی اور ریاستی وقائع کی بنیاد پر بہت سی تاریخیں لکھی گئیں، جن کا یہاں مجملاً میں ذکر کرونگا۔

علاقائی اعتبار سے سب سے پہلی لکھی جانے والی تاریخ "چچ نامہ" ہے، جس کا مختصر آذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ اس کو علاقائی تاریخ کہیں یا برصغیر ہند و پاک میں مسلمان سلاطین کی اولین تاریخ سے یاد کریں۔ اس کے بعد مسلّم طور پر "تاریخ معصومی" (از میر معصوم بھکری) سب سے پہلی علاقائی تاریخ ہے یا سندھ کی عمومی تاریخ۔ اور اس کے بعد بارہویں صدی ہجری میں تاریخ و طبقات کا ایک شاہکار "تحفۃ الکرام" مصنفہ میر علی شیر قانع تتوی ہے جس کا سالِ تالیف ۱۱۸۱ھ ہے۔ میں نے جو تاریخ اور طبقات کی ترکیب تحفۃ الکرام کیلئے استعمال کی ہے۔ جب آپ اس کی تفصیل ترتیب ملاحظہ کریں گے تو آپ اس کی تصدیق کریں گے۔

علاقائی تاریخی کتب میں میر علی شیر قانع تتوی (ولادت ۱۱۴۰ھ وفات ۱۲۰۳ھ) کی جامع اور ضخیم تاریخ موسوم بہ تحفۃ الکرام ہے جس کی تالیف سے مولف ۱۱۸۱ھ میں فارغ ہوا۔ خود مصنف نے سالِ تکملہ کا اِس طرح اظہار کیا ہے:۔

شکرِ خدا کہ تذکرۂ تحفۃ الکرام — اندر ۳ جلد یافت تزئین اِختتام
قانع اگرچہ نیست سزاوار ذکر ایں — لیکن بفیض اہلِ خبر، یافت ایں مرام
سالِ تمامیت چو نمودم خرد سوال — اینک چہ منتخب "زدل آید مرا پیام

تحفۃ الکرام تین جلدوں پر مشتمل ہے؛

جلد اوّل: احوال انبیاء، اولیاء، حکماء و ملوک و خلفاء و سلاطینِ اسلام پر مشتمل ہے۔

جلد دوم: احوالِ ملوک و امراء، والیان، اولیأ، سادات، فضلاء، اہلِ ہُنر جن کا تعلق تتہ سے ہے معرضِ بیان میں لائے گئے ہیں۔

جلدِ سوم: یہ جلد احوال مشائخ سندھ اور سندھ کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس جلد کے تین ابواب ہیں۔

بحیثیت مجموعی "تحفۃ الکرام" تاریخ اسلام بھی ہے اور تاریخ ملوکیت بھی۔ طبقات علماء بھی ہے اور طبقات الأمراء بھی۔

اس اعتبار سے تحفۃ الکرام برصغیر ہند و پاک میں لکھی جانے والی ایک جامع اور بے نظیر کتاب ہے۔

دورِ مغلیۂ ہند میں وسعت سلطنت کے اعتبار سے اگر آپ دیکھیں تو علاقائی عمومی تاریخ نگاری کے لیے کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہی تھی، اس لیے اکبر سے لے کر اورنگزیب تک جس قدر تاریخیں لکھی گئیں وہ تمام تر عہدِ مغلیہ کی سیاسی احوال کی ترجمان ہیں۔

عہدِ مغلیہ کے زوال کے بعد چونکہ یہ حدود سمٹ کر صرف لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اور برِ صغیر پاک و ہند میں بہت سی آزاد ریاستیں معرضِ وجود میں آچکی تھیں، اس لیے مورخ نے جب اس صدی میں قلم اُٹھایا تو وہ ان ریاستوں کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان خود مختار ریاستوں میں حیدر آباد دکن اور اودھ کی ریاستیں اپنے اندر وہ سوانح اور وقائع رکھتی تھیں جن پر ایک مورخ قلم اُٹھا سکتا ہے اور اپنی نگارش کا قرار واقعی صلہ بھی پا سکتا ہے۔ چنانچہ تاریخ اودھ، تاریخ بیجاپور، دہلی کے حالات بدایوں کی تاریخ، سندھ کی تاریخ (تحفۃ الکرام) میرزا محمد ہادی المخاطب بہ کافور خان کی تصنیف چہار گلشن، فرحت الناظرین وغیرہ اسی قبیل کی علاقائی تاریخیں ہیں۔ اس کے علاوہ اور ریاستوں اور مخصوص علاقوں کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندو مورخین نے بھی برِ صغیر کی ملوکیت کی تاریخ پر قلم اٹھایا۔ یہ تاریخیں مذہبی تعصب سے خالی نہیں ہیں۔ اکبر جہانگیر، شاہجہاں اور خاص طور پر اورنگزیب ان کا موضوع رہا ہے۔ چنانچہ ایشوری پرشاد، پروفیسر قانون گو اور جادو ناتھ سرکار کی تاریخیں اس کی شاہد ہیں کہ انہوں نے اپنے حسبِ منشا تاریخی واقعات کی صورت مسخ کی ہے۔ ان کی یہ تاریخیں اعلیٰ و ثانوی مدارس سرکاری میں بطور نصاب

شامل ہیں اور نوجوان مسلمان طلبا کی طبائع پر ان سے جو اثرات مرتب ہوئے وہ ظاہر و باہر ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں جبکہ انگریزی تعلیم ارتقائی منازل برصغیر پاک و ہند میں طے کر رہی تھی مسلمان سلاطین ہند پر انگریزی زبان میں بہت سی تاریخیں لکھی گئیں۔ ان تمام تاریخوں میں "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" خاص طور پر مشہور ہے۔ اس کی جلد چہارم اکبر، جہانگیر شاہجہاں اور اورنگ زیب پر مشتمل ہے۔ اس کو سر ولزلی ہیگ نے مرتب کیا ہے اور ہندو مورخین نے تذکرۂ سلاطین میں سے ہر ایک پر محققانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے اور اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب پر تفصیلی تاریخی مواد اس میں موجود ہے۔ لیکن اورنگ زیب پر جو کچھ لکھا ہے اس میں تنقیدی رنگ نمایاں ہے۔

بیسویں صدی میں امیر تیمور، بابر، اکبر، جہانگیر اور اورنگ زیب پر اردو زبان میں بہت سی تاریخی کتابیں یا سوانح عمریاں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ علامہ شبلی و حالی نے سوانح نگاری کو ایک نیا انداز بخشا۔ ان حضرات کی الغزالی، المامون، (سیرت النعمان) حیات جاوید، یادگار غالب حیات سعدی وغیرہ سوانح نگاری میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ لیکن تاریخ کی دوسری انواع خصوصاً طبقات پر بہت کم کام ہوا۔ اور ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں تذکرے بھی لکھے گئے لیکن وہ "تذکرۃ الشعرا" ہیں۔

جواہر المضیۂ، مآثر الکرام، مآثر الامراء، تذکرہ علمائے ہند، فوائد البہیۃ، نزہۃ الخواطر جیسی بلند پایہ کتب طبقات کی اُردو میں بہت کمی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اس طرف توجہ کی جائے اور اُردو زبان کا دامن اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب سے بھی بھر جائے۔

برصغیر ہند و پاک میں فارسی زبان کا آغاز تو مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ لیکن جب یہاں اسلامی حکومت کا دورِ غزنویہ شروع ہوا تو فارسی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا۔ اسلامی ہند میں حضرت داتا گنج بخش قدس سرہٗ کی عظیم کتاب "کشف المحجوب" برصغیر میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے اور اس کا متن فارسی زبان میں ہے۔ اس میں طبقات کی جھلکیاں بھی ہیں یعنی چند مشاہیر صوفیہ کرام کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس طرح برصغیر ہند و پاک میں طبقات الصوفیہ پر یہ پہلی کتاب ہے۔

کشف المحجوب سے کئی سو سال بعد یہاں ملفوظات کا ایک مجموعہ مرتب ہوا جو "سیر الاولیا" کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس میں اسماء الرجال یا طبقات کا مواد "کشف المحجوب" سے قدرے زیادہ ہے۔ اس سے میری مراد امیر خورد کرمانی (متوفی ۷۷۰ھ) کی تالیف انیف موسوم بہ "سیر الاولیا" ہے جس کا سالِ تالیف مولف نے ذکر نہیں کیا ہے۔ اخبار الاخیار میں بھی تذکرہ کا سال تالیف مذکور نہیں ہے۔

"سیر الاولیا" کے باب اول میں بہت ہی اختصار کے ساتھ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہے۔ اور اس باب کو حضرت نظام الدین اولیا کے ذکر پر ختم کیا ہے۔

باب دوم حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری کے خلفاء کے احوال پر مشتمل ہے۔

باب سوم: تراجم و احوالِ مریدانِ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر پر مبنی ہے۔

باب چہارم: حضرت نظام الدین اولیاؒ کے احوال پر محتوی ہے اور ان بزرگانِ دین و ملت کے سوانح کے ضمن میں بہت سے وقائع اور کرامات بھی مذکور ہیں۔ لیکن اختصار کا یہ عالم ہے کہ ان تمام اصحابِ طریقت اور سرآمدگان کا تذکرہ تقریباً ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ باب پنجم تا باب دہم یعنی ختم کتاب، تصوف کے مباحث اور طریقت کے موضوعات پر بحث کی ہے جو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ طبقات الصوفیہ یا تذکرۃ الصوفیہ کا اولین نمونہ ہم کو "سیر الاولیا" میں ملتا ہے۔

سیر العارفین

طبقات الصوفیہ پر دوسری اہم کتاب سیر الاولیاء کے بعد "سیر العارفین" ہے جس کے مولف شیخ جمالی ہیں۔ سیر العارفین، امیر خورد کرمانی کی وفات کے تقریباً سو سال بعد شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں مرتب ہوئی۔ شیخ جمالی کا سالِ ولادت ۸۵۵ھ اور سال وفات ۹۴۲ھ ہے۔

یہ تذکرہ (سیر العارفین) طبقات مشائخ پر ایک عمومی تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف دو خانوادہ ہائے تصوف کے چند اکابر کے حالات پر مشتمل ہے۔ یعنی سلسلہ چشتیہ کے چھ بزرگوں اور سلسلہ سہروردیہ کے صرف سات مشائخ کا ذکر ہے۔ چونکہ شیخ جمالی اسی سلسلہ میں بیعت رکھتے تھے، اس لیے اپنے مرشد شیخ سماء الدینؒ کا ذکر بھی ان حضرات سبعہ میں شامل کیا ہے۔

سیر العارفین ۹۳۸ھ اور ۹۴۱ھ کے درمیان مرتب ہونیوالا "تذکرۃ المشائخ" ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے قلم سے دستیاب ہے۔ اصل کتاب بھی مطبوعہ لاہور مل جاتی ہے۔

اخبار الاخیار سیر الاولیاء اور سیر العارفین کے بعد سب سے زیادہ جامع اور مستند تذکرہ یا "طبقات الصوفیہ" اخبار الاخیار ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تذکرہ ۱۰۰۰ھ میں مرتب کیا۔ جیسا کہ "اخبار الاخیار" کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

پس دریں صحیفہ شریفہ کہ مجموعہ ایست از عجائب اخبار و آثار و غرائب حقائق و اسرار از ابتدائے زمان خواجہ بزرگ معین الحق والشرع والدین تا منتہائے الف عاشرہ ۱۰۰۰ھ کہ تاریخ کتابت ایں کلمات متین است۔ انچہ از احوال اولیا و اصفیا و عرفا و مشائخ و بزرگان دین ....
.... نوشتہ آمد:-

مقدمہ اخبار الاخیار کی سطور بالا سے ظاہر و باہر ہے کہ سنہ ایکہزار ہجری میں اس کی تالیف و تدوین ہوئی۔ مطبع مجتبائی کے مطبوعہ نسخہ پر خاتمۃ الکتاب میں اس کی تاریخ اس طرح مرقوم ہے جو یکسر غلط ہے۔

طیب اللہ حق انفاسک　　　زادک اللہ قوۃ وغنیٰ
نام و تاریخ ایں کتاب عزیز　　　گر کنی "ذکر اولیا احسن"

۹۹۹ ہجری

لیکن "ذکر اولیا احسن" سے ۱۰۸۰ھ عدد نکلتے ہیں۔ آخری مصرعہ قافیہ کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔ بظاہر مصرعہ میں تحریف معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال سال تکملہ ۱۰۰۰ھ ہے۔

شہنشاہ جہانگیر آپ سے ملاقات کا حال اس طرح بیان کرتاہے۔ جو وقائع ۱۴ سالہ جلوس جہانگیری کے تحت "تزک جہانگیری" میں مرقوم ہے۔

شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہلِ فضل و ارباب سعادت است دریں ایام آمدہ دولت ملازمت دریافت۔ کتابے تصنیف نمودہ مشتمل بر احوال

مشائخ ہند بہ نظر در آمدہ ، خیلکے زحمت کشیدہ ، مدت ہا است کہ در گوشۂ
دہلی بوضع توکل و تجرید بسر می بُرد مرد گرامی است ۔ (توزک جہانگیری)

اخبار الاخیار مشائخ ہند کا ایک جامع تذکرہ ہے ۔ اسکو گیارہویں صدی ہجری میں طبقاتِ مشائخ پر ایک جامع کتاب کہا جا سکتا ہے ۔ اخبار الاخیار کو حضرت شیخ نے اپنی نسبت قادریت کی بنا پر حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے ترجمہ سے شروع کیا ہے اور اس کے بعد مشائخ اور اربابِ طریقت کے احوال و تراجم بیان کیے ہیں ۔

حدیقۃ الاولیاء

جس طرح سیر العارفین ، دو خانوادوں یعنی چشتیہ و سہروردیہ کا ایک منتخب تذکرہ ہے اسی طرح علاقائی نقطۂ نظر سے اسی عہدِ جہانگیری کا ایک اور علاقائی تذکرہ " حدیقۃ الاولیا " ہے ۔ یہ تذکرہ سندھ کے مشائخ سے مخصوص ہے ۔ اور گیارہویں صدی ہجری تک سندھ میں جو مشہور اربابِ طریقت گذرے ہیں ان کا ایک مختصر تذکرہ ہے ۔ اس کے مولف سندھ کے مشہور بزرگ سید عبدالقادر ابن سید محمد ہاشم ٹھٹوی ہیں ، جو مرزا جانی بیگ حاکم سیوستان و ٹھٹہ کے ہم عصر تھے اور مرزا جانی بیگ ان کا ممدوح تھا لیکن یہ تذکرہ سید عبدالقادر نے حاکم ٹھٹہ امیر خسرو خان کے نام معنون کیا ہے ۔ حدیقۃ الاولیا میں سرزمینِ سندھ کے اکتالیس بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کا سالِ تکمیل ۱۰۱۶ھ ہے جیسا کہ خود مولف نے اس کا اظہار کیا ہے :-

بہ تائیدِ عنایاتِ الٰہی — رسید ایں نامہ در حدِ تناہی
ز ہجرت بود الف و شانزدہ سال — کہ شد آراستہ ایں شاہد قال
۱۰۱۶ھ
بماناند از من یادگارے — چو نبود دور گردوں را مدارے

(خاتمۃ الکتاب حدیقۃ الاولیا)

حدیقۃ الاولیا کا متن فارسی میں ہے ۔ سندھ ادبی بورڈ سے یہ متن شائع ہو چکا ہے ۔

دورِ جہانگیری کا ایک اور مشہور تذکرہ صوفیہ یا طبقات مشائخ " گلزار ابرار " ہے ۔ اس کے مرتب و مولف شیخ غوثی حسن مانڈوی ہیں ۔ اخبار الاخیار کی طرح یہ بھی ایک عمومی تذکرۃ المشائخ ہے ۔ نام کی مناسبت سے اس کو چار چمن (چار ابواب) میں تقسیم کیا ہے ، لیکن حقائق نگاری کی طرف مولف نے توجہ کم کی ہے ۔ ممکن ہے مولف کو مستند حالات نہ مل سکے ہوں ۔

اس کا متن فارسی ہے۔ زبان و بیان پر تصنع اور آورد کا رنگ غالب ہے۔ بعض مقامات پر تو صرف لفاظی ہی لفاظی ہے مطلب کی بات بہت کم ہے۔

"سنوات الاتقیا" کا مقصد بھی اس سے پورا نہیں ہوتا۔ اس تذکرہ کا سالِ تکمیل ۱۰۲۲ھ ہے "مخلوتِ بے حجاب" (حجاب کے تخرجہ) سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔
۱۰۳۶ - ۱۴ = ۱۰۲۲

شیخ غوثی شطاری مانڈوی کے تذکرہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بیشمار غیر معروف اربابِ طریقت کا تذکرہ کر کے ان کو عہدِ حاضر میں بھی روشناس کرا دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں شیخ غوثی نے اس سلسلہ میں احتیاط و اعتبار کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ ان حضرات ابرار کی محفل میں "علامہ فیضی" بھی موجود ہیں۔ جن کو آج ملحدوں اور زندیقوں میں بڑی شد و مد کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔ گلزار ابرار کے ترجمہ اذکار ابرار کے صفحہ ۵۲۴ پر آپ کا ذکر ہے اور صاحبِ تذکرہ فرماتے ہیں :-

آپ ان صوفیوں میں سے ہیں جو وحدت وجود کے مقر ہیں زمانہ کے ورق پر آپ کی بہت سی تصانیف یادگار ہیں۔ یہ تصنیفات میرے بیان کی مستحکم دلیل ہیں۔

(اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار)

گلزار ابرار میں ۶۱۲ شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ جس میں اکثر و بیشتر غیر معروف اصحاب ہیں۔ گلزار ابرار کا اردو ترجمہ ۱۹۰۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اور موجودہ اردو اشاعت اس مطبوعہ نسخہ کا عکس ہے۔

گلزار ابرار کے بعد، "حضرات قدس" ایک قابل ذکر تذکرہ ہے جو ایک عمومی تذکرہ تو نہیں ہے لیکن مشائخ نقشبندیہ کا معتبر اور مستند تذکرہ ہے جس کو ہم "طبقات اکابر نقشبندیہ" کہہ سکتے ہیں۔ یہ تذکرہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی وفات ۱۰۳۴ھ کے چند سال بعد ہی مجدد صاحب کے صاحبزادگان گرامی اور مجدد صاحب کے مرید خاص مولانا بدر الدین احمد سرہندی نے (جن کے نام حضرت مجدد صاحب کے بہت سے مکتوبات ہیں) مرتب کیا تھا۔ اس میں سلسلہ نقشبندیہ کے تمام بزرگوں کے حالات حضرت مجدد صاحب تک تاریخی درایت کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ دو جلدوں میں ہے۔ میں یہاں خواجہ ہاشم کشمی کے مرتبہ تذکرہ "زبدۃ المقامات"

کو جو حضرات القدس سے پہلے تالیف ہوا طبقات الصوفیہ میں شامل نہیں کر سکا ہوں کہ وہ حضرت باقی باللہ کے مخصوص تراجم کے اعتبار سے سوانح عمری کے تحت مذکور ہو سکتا ہے۔

شاہجہانی دور میں طبقات مشائخ پر قابلِ ذکر دو کتابیں اور ہیں جو شاہزادۂ مظلوم داراشکوہ کی کاوشِ قلم کی مرہونِ منت ہیں ان میں ایک کتاب "سکینۃ الاولیا" تو ایک مخصوص خانوادہ کے مشائخ کے تراجم پر مشتمل ہے، یعنی حضرت میاں میر قادری قدس اللہ سرہٗ، داراشکوہ کے پیر و مرشد یعنی مُلّا شاہ بدخشی اور حضرت میاں میر کے دیگر خلفا کے تراجم پر مشتمل ہے۔ تہران سے اس کا اعلیٰ ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

سفینۃ الاولیا سکینۃ الاولیا کے بعد لکھا گیا۔ اس کا سالِ تکمیل ۱۰۴۹ھ/۱۶۴۰ء ہے۔ سفینۃ الاولیا میں داراشکوہ نے خود اس کی صراحت کی ہے۔

حضرت میاں میرؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

چوں پیش ازیں رسالہ مسمّیٰ بہ "سکینۃ الاولیا" در احوال و اوضاع آنحضرت (میاں میر) و پیروان و مریدان ایشاں مفصل نگاشتہ بود۔ دریں کتاب (سفینۃ الاولیا) ہمیں قدر اکتفا نمود۔

سفینۃ الاولیا میں ۴۱۱ بزرگانِ دین و ملت اور اربابِ طریقت کے مختصر حالات ہیں۔ نفحات الانس حضرت جامیؒ اور اخبار الاخیار کے بعد یہ ایک عمومی تذکرہ ہے جو عہدِ شاہجہانی میں اس برصغیر میں مرتب ہوا۔ سکینۃ الاولیا اور سفینۃ الاولیا، ایران اور ہند و پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے متون فارسی زبان میں ہیں۔ ان کے اردو تراجم بھی دستیاب ہیں۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے طبقات الصوفیہ کے مختصر تذکرہ کے بعد طبقات کی ایک نوعِ خاص کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔ یعنی طبقات الامراء:

"طبقات الامراء" میں "ذخیرۃ الخوانین" مؤلفہ شیخ فرید بھکری سب سے زیادہ مشہور اور قابلِ ذکر ہے۔ ذخیرۃ الخوانین دورِ شاہجہانی کا ایک گرانقدر تذکرۃ الامراء ہے۔ یہ ایک نایاب تذکرہ تھا جو ۱۰۶۱ھ میں مرتب ہوا۔ ۱۸۴ ایسے امراء کے تراجم پر مشتمل ہے جن کا تعلق اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں سے رہا ہے۔ اگرچہ بعض تراجم کے لیے صرف دو یا تین تین

سطروں سے زیادہ مخصوص نہیں ہے لیکن اکثر و بیشتر امراء کے احوال تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔

ذخیرۃ الخوانین کی تالیف سے قبل عصری تاریخوں میں اختتام پر اس عصر یا حکومت کے امراء، فضلاء اور شعراء کے مختصر تراجم ایک جداگانہ باب میں ذکر کر دیئے جاتے تھے۔ جیسا کہ اکبر نامہ، بادشاہ نامہ اور عمل صالح وغیرہ میں التزام کیا گیا ہے۔ ذخیرۃ الخوانین اس سلسلہ میں پہلی کامیاب کوشش ہے جس میں اکبری، جہانگیری اور شاہجہانی امراء کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف کا سالِ وفات معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کے مرتب اور دیباچہ نگار جن کی کوشش سے یہ نایاب کتاب اشاعت پذیر ہوئی یعنی ڈاکٹر معین الحق صاحب نے بھی دیباچہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کا تعلق دسویں صدی ہجری سے ہے اور خود مؤلف طبقات اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا ہے۔

ذخیرۃ الخوانین کے تقریباً ایک سال بعد طبقات الامراء کی تالیف پر دوسری کامیاب کوشش صمصام الدولہ شاہنواز خان کی ہے۔ جنہوں نے مآثر الامراء کے نام سے طبقات الامراء کو مرتب کیا۔ یہ تذکرہ چھ سال کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یعنی ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۶۰ھ تک اس کی تالیف کا کام جاری رہا۔ صمصام الدولہ محمد شاہ کے عہد کی طوائف الملوکی یعنی ۱۱۷۱ھ میں قتل کر دیئے گئے۔ اور ان کا گھر بار لُٹ گیا۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے جو شاہنواز خان کے نہ صرف معاصر تھے بلکہ مابین گہرے روابط قائم تھے سخت کاوش سے ان اوراقِ منتشرہ کو ترتیب دے کر حقِ دوستی اور ادب نوازی ادا کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مشائخ کا کوئی عمومی تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔

زبدۃ المقامات سلسلہ نقشبندیہ کی ایک بزرگ ہستی یعنی حضرت مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی (سہرندی) کا ایک بہترین تذکرہ ہے۔ جس کا سالِ تکمیل ۱۰۳۷ھ ہے۔ شیخ بدرالدین کا تذکرہ "حضرات قدس، خاندان نقشبندیہ کا جامع تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ "زبدۃ المقامات" کے بعد میں مرتب ہوا، لیکن "زبدۃ المقامات" کے مقابلہ میں اس کی جامعیت زیادہ ہے۔ یہ دونوں تذکرے عہدِ عالمگیری کے بعد کی تصانیف ہیں۔ ہم ان کو گیارہویں صدی ہجری کے ہندی طبقات میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے شخصی تذکرے اور سوانح حیات مجددی حضرات نے اور بھی لکھے ہیں لیکن وہ سوانح عمریاں ہیں، طبقات الصوفیا انہیں نہیں کہا جا سکتا۔

بارہویں صدی ہجری میں "ماثر الکرام" ایک گرانقدر تذکرہ ہے اگرچہ بظاہر اس کی حیثیت علاقائی ہے (کہ وہ بلگرام (اودھ) کے فضلاً، علماء و مشائخ کے تذکرہ پر مبنی ہے) لیکن ضمناً اس میں بہت سے ارباب علم و فضل اور اصحاب طریقت کا ذکر آگیا ہے۔ اس کی حیثیت ایک عمومی تذکرۃ الصوفیہ کی ہوگئی ہے۔ یہ تذکرہ بہت ہی مقبول ہوا اور اس کی قبولیت کے باعث ماثر الکرام کے بعد عمومی طبقات اور طبقات الصوفیہ پر بہت کچھ لکھا گیا اس سلسلہ میں طبقات الامراء پر صمصام الدولہ شاہنواز خان جو سیاسی ہنگامہ میں ۱۱۷۵ھ میں قتل کر دیئے گئے "ماثر الامرا" تالیف کی جس کی تکمیل و ترتیب صاحب "ماثر الکرام" نے پاس دوستی شاہنواز خان کے انتقال کے بعد بڑی کاوش سے کی۔ جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں۔

علامہ میر غلام علی آزاد نے طبقات نگاری یا کتب اسماء الرجال" کی نگارش کی ایسی بنا ڈالی کہ آپ کے بعد نہ صرف یہ کہ ہند کے علمائے کرام اور فضلائے عظام کے تراجم و سوانح کی تدوین و تالیف کی گئی بلکہ علاقائی اور صوبہ جاتی نہج پر بھی طبقات نگاری پر کام شروع ہو گیا۔ چنانچہ علمائے دہلی، علماً و فضلائے پنجاب و گجرات، علمائے بنگال و علمائے برہانپور (دکن) علمائے جونپور پر بھی علیحدہ علیحدہ کتابیں مرتب کی گئیں بلکہ برِ صغیر ہند و پاک کے مردم خیز بلاد جیسے بدایوں، مراد آباد، رامپور، جونپور و لاہور وغیرہ کے فاضلوں اور عالموں پر بھی کتابیں مرتب ہوئیں۔

تیرہویں صدی کے اواخر اور چودہویں صدی ہجری کے آغاز میں طبقات پر لکھی جانے والی کتب یا تذکروں میں خزینۃ الاصفیا، تذکرہ رحمان علی یعنی تذکرہ علمائے ہند، فوائد البہیہ از علامہ عبدالحئی لکھنوی اور نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحئی ندوی صاحب تذکرہ گلِ رعنا بہت ہی گرانقدر اور مشہور تذکرے یا کتب طبقات ہیں۔ یوں تو اور بھی علاقائی نہج پر بہت سے تذکرے معرض نگارش میں آئے جیکی تفصیل تذکرہ علمائے ہند کے مقدمہ میں ڈاکٹر معین الدین صاحب نے کی ہے لیکن مندرجہ بالا کتب طبقات جس قدر مشہور ہوئیں وہ شہرت دوسری کتب کو میسر نہ آسکی۔ خزینۃ الاصفیا سے قبل گیارہویں صدی میں اسی نہج پر حدیقۃ الاولیا مرتب ہوئی تھی۔ ان دونوں کتابوں کا انداز تحریر و ترتیب، اخبار الاخیار جیسا ہے لیکن اخبار الاخیار سے زیادہ مشائخ کرام کا ذکر ہے۔ خزینۃ الاصفیا صرف مشائخ برصغیر ہند و پاک کے اذکار پر منحصر و محتوی نہیں ہے بلکہ ہند و بیرون ہند کے مشائخ و صوفیائے عظام کے تذکار پر

بھی مبنی ہے۔

فوائد البہیہ (فوائد البہیہ فی تراجم حنفیہ) جس کا ضمیمہ طرب الاماثل فی تراجم الافاضل سے موسوم ہے فاضل نبیل علامہ دوراں نابغۂ زماں علامہ عبد الحیؒ (فرنگی محلی) لکھنوی کی تصانیف متعددہ میں بہت ہی بلند مقام کی حامل ہے۔ آپ نے طبقات پر یہ کتاب، طبقات الشافعیہ از علامہ تاج الدین سبکی اور جواہر المضیہ مرتبہ علامہ عبد القادر قرشی کے نہج و اصول پر لکھی ہے لیکن طبقات الشافعیہ اور طبقات الحنفیہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے علمائے مذہب شافعیہ اور علمائے حنفیہ پر الگ الگ تخصیصِ مسلک کے ساتھ تالیف کی گئی ہیں۔ طبقات الشافعیہ کے مطالعہ سے علمائے احناف کے تراجم (سوانح و احوال) کے مطالعہ کی تشنگی دور نہیں ہوتی تھی اور طبقات الحنفیہ و جواہر المضیہ کے مطالعہ کے بعد یہ تشنگی باقی رہجاتی تھی کہ کسی عصر کے علماء شوافع کے حالات سے بہرہ اندوزی کا موقع نہیں ملتا تھا۔ علامہ عبد الحیؒ فرنگی محلی نے کسی حد تک اس کمی کو دُور کر دیا اور علمائے شوافع اور علمائے احناف دونوں کے تراجم اپنی مشہور تالیف میں جمع فرما دیئے ہیں بلکہ میں تو یہ عرض کرونگا کہ علمائے شوافع کے تراجم اس میں شریکِ غالب ہیں لیکن حیرت یہ ہے کہ علامہ میرور و مغفور نے کتاب کا نام فوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ کیوں رکھا جبکہ شوافع کے تراجم اس میں بکثرت ہیں۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ زیادتی ناشر کی طرف سے ہوئی ہے کہ اس نے کتاب کی لوح پر اپنی طرف سے فوائد البہیہ کی صراحت اسمی میں "تراجم الحنفیہ" کا اضافہ کر دیا لیکن فوائد البہیہ کے آغاز میں جب آپ کی سوانح حیات کے مطالعہ کا موقع ملا جو صاحب نزہۃ الخواطر کے قلم سے ہے اس میں جہاں یہ بتایا ہے کہ "وكان على مذهب ابى حنيفه فى الفروع والاصول لكنه كان غير متعصب فى المذهب (آپ کا مذہب حنفی تھا فروع اور اصول دونوں میں لیکن آپ مذہب میں متشدد اور متعصب نہیں تھے) وہاں آپ کی تصانیف کے بیان میں صاحب نزہۃ الخواطر تحت عنوان "وفى النسب والاخبار" تحریر فرماتے ہیں۔

"حسرة العالم لوفاة مرجع العالم والفوائد البهيه فى تراجم الحنفيه والتعليقات السنية على الفوائد البهية والمقدمة الهداية الخ"

اس صراحت سے ظاہر ہوا کہ تالیف کے وقت ہی سے یہ کتاب الفوائد البہیہ فی تراجم

الحنفیہ کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔

قارئین کرام " فوائد البہیہ " علماء و فضلاء ہند کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ فوائد البہیہ میں ۲۲۹ تراجم ہیں اور طرب الاماثل میں ۳۹۹ حضرات کا ذکر ہے۔ لیکن بہت ہی اختصار کے ساتھ مثل اسماء الرجال کے۔ شاید آپ کو یہ خیال پیدا ہو کہ فوائد البہیہ میں تراجم کی اکثریت علمائے شوافع کی ہے اس لیے آپ نے فوائد البہیہ کا ضمیمہ مرتب فرمایا اور کثرت سے علمائے احناف کا ذکر کیا ہے ممکن ہے کہ درست ہو لیکن بہت ہی اختصار کے ساتھ یہ تراجم ہیں۔ ایک ترجمہ کے ساتھ چند سطریں ہیں۔ جبکہ فوائد البہیہ میں نصف صفحہ، ایک صفحہ اور دو صفحات ایک ترجمہ کے لیے مخصوص ہیں۔ اس طرح وہ خلاء تو پُر نہ ہو سکا۔

بہرحال فوائد البہیہ اپنی افادیت کے اعتبار سے بہت بلند پایہ کتاب ہے۔ فوائد البہیہ کی تالیف اور اس کے تکملہ کے سلسلہ میں علامہ عبدالحیؒ مقدمۃ الکتاب میں فرماتے ہیں:-

وکان اختتام ھذا الکتاب یوم السبت الحادی عشر من صفر من شہور السنۃ الثانیۃ والتسعین بعد الالف والمأتین من الھجرۃ النبویہ یعنی اس کتاب کا اختتام بروز ہفتہ ۱۲ رصفر المظفر ۱۲۹۲ھ میں ہوا۔

فوائد البہیہ کا تکملہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا اس کے تین سال بعد پنجاب کے ایک فاضل نبیل یعنی مولوی فقیر محمد جہلمی (ولادت ۱۲۶۰ھ وفات ۱۳۳۴ھ) نے طبقات پر ایک عظیم تالیف کا کام شروع کیا اور تین سال کی محنت اور سخت کاوش کے بعد انھوں نے اپنی مبسوط کتاب " حدائق الحنفیہ " کا تکملہ کیا اور فوائد البہیہ میں جس پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تھا یا جس خصوصیت سے وہ خالی تھی، اس کا ازالہ کر دیا، یعنی حدائق الحنفیہ میں تمام علمائے احناف (صاحب تصانیف خصوصاً فقہائے احناف خواہ ان کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہو یا دیگر اقالیم سے۔ انھوں نے ان حضرات کے تراجم بڑی کاوش و تفحص سے جمع کر دیئے۔

حدائق الحنفیہ

کے ابواب کو کتاب کے نام کی مناسبت سے حدیقہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب میں ۱۴ حدائق ہیں۔ حدیقہ اول چار خیابانوں پر مشتمل ہے۔

حدیقۂ اوّل کا خیابان اوّل فقہ اور اس کے مالۂ اور ما علیہ پر مشتمل ہے اور امام اعظمؒ کے تاریخی احوال شامل ہیں۔ خیابان دوم امام اعظمؒ سے متعلق بشارتوں پر مشتمل ہے۔ خیابانِ سوم امام اعظمؒ کے فضائل ومناقب میں ہے اور چوتھا خیابان ان مطاعن کے رد میں ہے جو بعض کوتاہ بینوں کی طرف سے کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد حدیقۂ دوم بقید صدی شروع ہوتا ہے یعنی اس میں دوسری صدی ہجری کے فقہا کے تراجم ہیں اس طرح ہر حدیقہ ایک قرن کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور کتاب "حدیقۂ سیزدہم" یعنی تیرہویں صدی ہجری کے فقہا پر ختم ہوتی ہے۔ حدائق حنفیہ میں ۹۱۴ فقہا کے تراجم ہیں۔ جن میں ۱۸۰ فقہا کا تعلق برصغیر پاک وہند سے ہے۔ باقی حضرات دوسری اقالیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

حدائق حنفیہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کا حصر فقہائے احناف پر ہے۔ کسی غیر حنفی کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے جبکہ بیشتر طبقات میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اردو زبان میں فقہائے احناف پر اتنی جامع اور مبسوط کتاب اور کوئی دوسری نہیں۔ حدائق حنفیہ کی تالیف کا آغاز ۱۲۹۴ھ میں ہوا۔ اور تین سال کی کاوش کے بعد ۱۲۹۷ھ میں اس کا تکملہ ہوا۔ حقیقت میں "حدائق الحنفیہ" ہی "طبقات الحنفیہ" کہلانے کی مستحق ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں حدائق حنفیہ کا متن تصنع یا شکوہ الفاظ کی پُر پیچ راہوں سے آزاد ہے۔ نہایت سلیس اور سلجھی ہوئی زبان میں تراجم بیان کیے گئے ہیں۔ تکملہ کے چند سال بعد ہی نولکشور پریس لکھنؤ سے چودھویں صدی کے آغاز پر اس کی اشاعت ہوئی۔ لاہور سے چند سال ہوتے اسی نولکشوری نسخہ کا چربہ شائع ہوا ہے ضروری اشارات اور توضیحات کے ساتھ جو ایک بڑا کام ہے۔ حدائق حنفیہ کے ماخذ مستند اور معتبر کتابیں ہیں۔ فاضل مولف نے مقدمہ میں ان کو بیان کر دیا ہے۔

تذکرہ علمائے ہند یا تذکرہ رحمان علی

چودھویں صدی ہجری میں فوائد البہیہ اور حدائق الحنفیہ کے بعد طبقات علمائے ہند" پر یہ تذکرہ بہت ہی جامع ہے۔ یہ ۱۲۴۱ علمائے پاک وہند کے تراجم پر مشتمل ہے اگرچہ بہت سے ارباب فضل وکمال کے تراجم نظر انداز ہو گئے ہیں جن کی نشاندہی اس تذکرہ کے اردو مترجم محبی جناب ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب نے ترجمہ کے مقدمہ میں فرما دی ہے بایں ہمہ اس کی گراں مائگی مسلّم ہے۔

ان ۱۲۴۱ علماء کے تراجم میں شخصیت یا صاحب ترجمہ کسی فن یا موضوع سے مقید نہیں ہے۔

بلکہ برصغیر پاک و ہند میں جس شخصیت کو بحیثیت عالم جانا پہچانا جاتا تھا اور وہ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے مشہور تھا۔ اس کا ذکر طبقات علمائے ہند میں کیا گیا ہے۔

فاضل مرتب نے حدائق حنفیہ کی طرح اس کی قرن وار ترتیب نہیں رکھی ہے بلکہ فوائد البہیہ کی طرح تراجم کو بقید حروف ہجا بیان کیا ہے تاکہ قاری کو ترجمہ کی تلاش میں دقت نہ ہو۔ یہ مبسوط اور جامع تذکرہ ۱۳۰۵ھ میں مکمل ہوا۔ تکملہ کے بعد اس کی طباعت و اشاعت بھی نولکشور پریس لکھنؤ کی مرہون منت ہے۔ نولکشور پریس اس کو ۱۳۱۲ھ میں پہلی بار شائع کیا، اس کا متن فارسی ہے لیکن افسوس کہ آج اصل متن نایاب ہے۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی ایما پر محترم ی قادری صاحب نے اس کا بہت سلیس اور نفیس اردو ترجمہ کیا اور تاریخی و تحقیقی اضافوں نے جو پاورق میں دیئے گئے ہیں اسکی افادیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے لیکن آج یہ اردو ترجمہ بھی کمیاب ہے۔

بحیثیت مجموعی طبقات العلما پر یہ ایک گرانقدر کتاب ہے۔ جس کے تمام ماخذ مستند اور معتبر ہیں۔ مؤلف تذکرہ مولوی رحمان علی صاحب (محمد عبد الشکور) نے تذکرہ کے اختتام پر ان کتابوں کا ذکر کر دیا ہے جو اس کی تالیف کے وقت ان کے پیش نظر رہیں یعنی سبحۃ المرجان از علامہ غلام علی آزاد بلگرامی۔ منتخب التواریخ از عبد القادر بدایونی۔ اخبار الاخیار از حضرت عبد الحق محدث دہلوی۔ تاریخ جدید ولیہ از منشی غلام علی سندیلوی۔ حدیقۃ الاقالیم از شیخ اللہ یار بلگرامی۔ طبقات اکبری از ملا نظام الدین ہروی۔ خزانہ عامرہ از علامہ غلام علی آزاد بلگرامی۔ تاریخ فرشتہ از محمد قاسم ہندو شاہ۔ طرب الاماثل فی تراجم افاضل از علامہ عبد الحیٔ فرنگی محلی۔ سفینۃ الاولیا از دارا شکوہ۔ تاریخ اولیا از مولانا اشرف علی۔ تاریخ فیروز شاہی از برنی۔ سیر المتاخرین مولفہ غلام حسین طباطبائی۔ تذکرہ الکرام مولفہ مولوی ابو الحیات پھلواروی۔ اس کے علاوہ اور چند تاریخی کتب بھی اس کا ماخذ ہیں تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں سر سید احمد خان کی آثار الصنادید کا باب چہارم بھی قابل ذکر ہے جو علمائے دہلی کا ایک ضمنی تذکرہ ہے۔ یہ ضمنی تذکرہ علمائے دہلی، حضرت عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ کے اس طرز کے تتبع میں کیا گیا ہے جو حضرت محدث دہلوی نے اپنی گرانقدر کتاب فہرست تو الیف میں ضمناً پیش کیا ہے۔ یہ ضمنی تذکرہ علمائے دہلی فہرست توالیف کے شروع میں دیا گیا ہے۔

نزہۃ الخواطر طبقات پر سب سے زیادہ جامع کتاب نزہۃ الخواطر ہے جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی جلدیں زیادہ ضخامت نہیں رکھتیں۔ اس کی آٹھویں جلد چودھویں صدی ہجری کے علماء و فضلاء کے تراجم و سوانح پر مشتمل ہے۔ کافی ضخیم ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے علماء و اکابر ہند سے پہلی جلد کا آغاز کیا ہے۔ علماء و فضلاء کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس دور یا صدی کے سریر آرائے سلطنت کا بھی تذکرہ کیا ہے اور چونکہ تراجم بہ ترتیب حروف ہجا تحریر کیے ہیں اسلئے ترجمہ حال کے عنوان کے تحت دور شاہی کو بھی رقم کر دیا ہے جو قاری کے لیے ایک مفید چیز ہے۔

طبقات کی اس مفید و عظیم کتاب پر علامہ سید عبدالحیٔ ندوی لکھنوی (صاحب گل رعنا) نے کئی سال صرف کیے اور جس اہم پہلو (یعنی تذکرہ علماء و فضلائے ہند) کو حضرت علامہ عبدالحیٔ فرنگی محلی نے نظر انداز کر دیا تھا اس کی تکمیل بکمال محنت و کاوش اور تفحص کے بعد فرمادی۔ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم پر آپ کے فرزند (سید ابوالحسن علی ندوی) نے جو تعارف یا مقدمہ لکھا ہے اس میں انہوں نے یہ صراحت کی ہے کہ:

لقد كانت ساعة سعيدة حين قرّر السيد عبد الحي بن فخر الدين الحسني (ولادت ۱۲۸۶ھ وفات ۱۳۴۱ھ) في فجر القرن الرابع عشر الهجري ان يؤلف كتابًا في تراجم علماء الهند واعيانها من القرن الاسلامي الاول حين دخل فيها الاسلام الى قرن الرابع عشر الذي يعيش فيها۔

(چودھویں صدی ہجری کے آغاز کی وہ کیسی ساعت سعیدہ تھی جب کہ سید عبدالحیٔ ابن فخرالدین الحسنی (ولادت ۱۲۸۶ھ وفات ۱۳۴۱ھ) نے یہ طے فرمایا کہ ایک ایسی کتاب مرتب کریں جسمیں ہندوستان میں اسلام کے آغاز سے چودھویں صدی ہجری تک جس میں وہ بقید حیات تھے کے علماء و اکابر ملت کے تراجم پیش کئے جائیں۔

اس ضخیم طبقات کی تکمیل میں فاضل نبیل سید عبدالحیٔ مرحوم نے تیس سال کی طویل مدت صرف کی۔ بہت کم ایسی کتابیں ہیں جن کی تالیف و ترتیب میں اتنی طویل مدت صرف ہوئی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشاہیر علماء و فضلاء و اعیان ملت کے صحیح حالات و سوانح کی تلاش و تفحص میں

آپ نے کسقدر سعی بلیغ فرمائی ہو گی۔ چنانچہ اس ضمن میں مقدمہ نگار تحریر کرتے ہیں:

واشتغل بہذا التالیف ثلاثین سنہ (وہ اس تالیف میں تیس سال تک مشغول رہے)

گویا اس عظیم کتاب کا تکملہ ۱۳۳۰ھ میں ہوا۔ قارئین کرام اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فاضل مرتب نے کس قدر جانکاہی اور جانفشانی سے اس کام کو سرانجام دیا لیکن افسوس ہماری قدرشناسی کہ آج اس کتاب کے تمام حصے دستیاب ہونا ناممکن ہیں۔ حیدرآباد دکن کے دائرۃ المعارف نے ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء میں پہلی جلد شائع کی تھی اور اس کے بعد باقی اجزاء کی طباعت جاری تھی کہ زوال سلطنت حیدرآباد کے بعد یہ کام رُک گیا اور صرف پانچ اجزا (جلد اوّل تا پنجم) کی طباعت و اشاعت ہو سکی۔ کچھ مدت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ سے (جبکہ وہ وزیر تعلیم تھے) دائرۃ المعارف کو حکم دیا گیا کہ اس کی باقی جلدیں شائع کر دی جائیں، چنانچہ چھٹی جلد ۱۹۵۷ء میں اور ساتویں ۱۹۵۹ء میں طباعت پذیر ہوئی۔ آٹھویں جلد کی طباعت و اشاعت کراچی کے مشہور ناشر اصح المطابع نے کی ہے۔ لیکن اسّی (۸۰) روپے قیمت رکھ کر اپنی علمی خدمت کو تاجرانہ خدمت سے بدل دیا ہے۔

بہر حال "نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر" چودھویں صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند میں لکھی جانے والی منفرد اور عظیم کتاب طبقات العلماء پر ہے، لیکن افسوس کہ چونکہ متن کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس لیے عوام اس سے مستفید نہیں ہو سکتے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ جلد ہشتم کے علاوہ باقی جلدیں بھی نایاب ہیں۔ دکن سے کتابوں کا حصول متعذر اور اس کی دشواری ظاہر و باہر ہے۔ مدت ہوئی گذری مقبول اکیڈمی لاہور نے اس کے ترجمہ کی طرف توجہ مبذول کی تھی اور چند ابتدائی جلدوں کے اُردو ترجمے مجلدانہ شائع بھی کئے تھے لیکن عدم پذیرائی کے باعث ان کی ہمت ٹوٹ گئی اور تمام جلدوں کا ترجمہ نہیں ہوا۔ آج وہ اُردو ترجمہ بھی نایاب ہے۔ یہ عرض کر چکا ہوں کہ نزہۃ الخواطر کا متن عربی ہے۔ نزہۃ الخواطر کا اسلوب بیان سادہ اور شگفتہ ہے۔ زبان پر تصنع یا اُردو کا رنگ نہیں چڑھا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کہتے ہیں البتہ اپنی رائے قائم کرنے میں صاحب نزہۃ الخواطر نے عدم احتیاط سے کام لیا ہے، یا محض افواہوں پر یقین کر لیا ہے۔ چونکہ جناب مؤلف ندوۃ العلماء لکھنؤ سے وابستہ تھے اس لیے دوسرے مکاتب فکر (اسلام) کے اصحاب کے ساتھ بعض مقامات پر انصاف نہیں ہو سکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس مقدمہ کی تنگ دامانی کے باعث میں ایسے

مقامات کی نشاندہی سے معذور ہوں۔

بہر حال یہ ضرور عرض کروں گا کہ ملتِ اسلامیہ کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ہزاروں علماء کرام اور اعیانِ ملت کے سوانح اور حالات خواہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں اُن کے مولد و منشا اور اُن کی تاریخ ہائے وفات، ان کی تصانیف کے نام خصوصاً متقدمین علمائے پاک و ہند کی مساعی اور نتائج فکر سید عبدالحیؒ مرحوم و مغفور کی کاوش کی وجہ سے محفوظ رہ گئے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم قومی و ملّی خدمت ہے۔
آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ جس طرح متقدمین علمائے عراق و شام و مصر و عجم نے قرن وار طبقات پر کتابیں مرتب کرتے وقت علمائے برصغیر پاک و ہند کو نظر انداز کر دیا تھا اور علامہ حافظ ابن حجر نے قرن ہشتم کے اکابر اور علماء پر "الدرا لکامنہ فی اعیان المأۃ الثامنہ" اور اس سلسلہ کی آخری کتاب "اعلام النبلاء" مرتبہ علامہ راغب طباخ استاذ جامعہ حلب میں برصغیر کے علماء سے بے اعتنائی برتی تھی۔ نزہتہ الخواطر اس کو ایک بہت ہی مسکت اور مدلّل جواب ہے۔

چودھویں صدی کے اواخر میں جب کہ اُردو زبان ترقی کے مدارج طے کر چکی تھی اور ہر قسم کے علم و فن اور موضوع پر اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ صباح الدین احمد نے "بزم صوفیہ" تصنیف کی، جو ایک قسم کا تذکرۂ صوفیہ یا طبقات الصوفیہ ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چشتیہ مشائخ اور ان کے عصر پر ایک گرانقدر تصنیف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ جناب خلیق احمد نظامی نے "مشائخ چشت" لکھی۔ یہ تاریخ مشائخ چشت بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد اسی نہج پر پاکستان میں "مشائخ نقشبند" مرتب کی گئی۔ علمائے کرام کے تذکرہ یا طبقات العلماء پر قلم اٹھایا گیا اور علمائے پنجاب کا تذکرہ لکھا گیا۔ ہندوستان میں ظہور الدین شارب نے "تذکرہ اولیائے ہند و پاک" مرتب کی۔ جس کو حضرت علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخشؒ) قدس سرہٗ العزیز کے ترجمہ سے شروع کیا ہے اور حضرت وارث علیشاہ دیوہ شریف کے تذکرہ پر اس کو ختم کیا ہے۔ اس تذکرہ کا سالِ تالیف ۱۹۶۵ء ہے۔ اس سے قبل بھی مصنف "دلّی کے بائیس خواجہ" کے نام سے تذکرہ اولیائے دہلی لکھ چکے تھے۔ ان طبقات یا تذکروں کے علاوہ بھی تذکرے لکھے گئے۔ اس سلسلہ میں مصنفین نے ایک اچھوتا موضوع تلاش کیا اور وہ ان علماء کا تذکرہ ہے جن کی کتب درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس کے مرتب پروفیسر اختر راہی ہیں اور تذکرہ کا نام "تذکرہ مصنفین درسِ نظامی"

ہے۔ راہی صاحب کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے اس کا سالِ تالیف ۱۹۷۵ء ہے۔ ان مجموعی شخصیتوں کے تذکروں کے علاوہ انفرادی شخصیات پر بھی قلم اٹھایا گیا جن کی تفصیل بہت طوالت طلب ہے۔ میں نے خاص خاص ان تذکروں کا ذکر کر دیا ہے جن کو ہم طبقات میں شامل کر سکتے ہیں۔

اس برصغیر پاک و ہند میں طبقات پر گرانمایہ کتاب بارہویں صدی ہجری میں "ماثر الکرام" ہے۔ اس سے قبل "شاہنواز خان" دورِ مغلیہ کے آخری ایام میں یعنی بعہد محمد شاہ "ماثر الامرا" مرتب کر چکے تھے اور انہوں نے ماثر الامرا میں جو خلا چھوڑا تھا یعنی علماء و فضلاء اور صوفیہ کرام کا تذکرہ نہیں کیا تھا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انہوں نے صرف "امراء شاہی" کے احوال و سوانح تک اس کو محدود رکھا تھا۔ اس کمی کو بارہویں صدی ہجری کے ایک فاضل نبیل علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے "ماثر الکرام" لکھ کر پورا کر دیا۔ اسی ماثر الکرام کا اُردو ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی ملقب بہ "حسان الہند" کا تعلق برصغیر کے علماء متاخرین سے ہے۔

ماثر الکرام کی جامعیت کے بارے میں شیخ محمد اکرام مرحوم رقمطراز ہیں:۔

"آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ عربی میں ایک کتاب "صحیح بخاری" کے چند ابواب کی شرح میں ہے اور ایک اہم کتاب "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" ہے۔ فارسی میں انھوں نے سروِ آزاد، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیا اور ماثر الکرام لکھیں۔ انہیں پہلی کتابوں میں شعرا اور روضۃ الاولیا میں روضہ (خلد آباد) کے اولیاء کرام کے حالات ہیں۔ ماثر الکرام بلگرام کے اولیا اور فضلا و شعرا کے متعلق ہے اور ضمناً بلگرام سے باہر کے کئی بزرگوں کے حالات بھی آگئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ یہ کتابیں نہ لکھ جاتے تو مورخین کو اسلامی، دینی، ادبی اور مذہبی تاریخ مرتب کرنے میں بہت زیادہ دشواریاں ہوتیں۔ بلکہ سبحۃ المرجان کے شروع میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس امر پر بجا فخر کیا ہے کہ ہندستانی علماء و فضلاء کے حالات کو انھوں نے پہلی مرتبہ منضبط کیا۔ ہندوستان میں اولیاء کے تذکرے بہت تھے۔ علماء کا کوئی نہ تھا۔ سبحۃ المرجان اور ماثر الکرام میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے"

(رود کوثر)

ہے ۔اسی طرح مشائخ وصلحا کے ذکر میں کتاب "اخبار الاخیار" تالیف کی ہے جو کافی مشہور ہے اور بہت سے ہاتھوں میں پہونچ چکی ہے لیکن میں علماء وشعراء کا کوئی تذکرہ مرتب نہیں کر سکا باوجودیکہ مجھے پختہ یقین ہے کہ ان حضرات کی تعداد بہت ہے لیکن چونکہ ان حضرات کا نام نشان موجود نہیں ہے، اور نہ ان کی تصانیف وتالیفات سامنے ہیں اس لیے میں ان کا تذکرہ نہیں لکھ سکا۔"

اس بیان سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ علماء وفضلاء کے احوال وتراجم کی نگارش کس قدر دشوار ہے جبکہ ان کے آثار وتصانیف بھی موجود نہ ہوں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بارہویں صدی ہجری میں "ماثر الکرام" اس موضوع پر برصغیر پاک وہند میں علماء وفضلاء عصر پر پہلی جامع کتاب ہے جس کو ہم "طبقات العلماء" سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بعد کے محققین کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ :-

میر غلام علی آزاد بلگرامی ہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے برصغیر میں اس موضوع پر مستقل تصنیف کی۔

اس موضوع پر بعد کی تصانیف کے لیے مرکزی نقطہ بھی تذکرہ ماثر الکرام رہا ہے۔ خود حضرت آزاد بلگرامی کو پیش آمدہ مشکلات کے باعث یہ کہنا پڑا :-

جز من از یاراں کیست کہ ایں قدر ہمت در احیاء اسم ورسم وطن صرف کردہ۔

(دیباچہ ماثر الکرام)

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نابغۂ دوراں تھے۔ عربی زبان پر جو دسترس اور عبور ان کو حاصل تھا وہ علامہ زبیدی بلگرامی کے سوا شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوا ہو۔ عربی اور فارسی زبانوں میں آپکی متعدد تصانیف موجود ہیں لیکن برصغیر میں یہ وصف صرف آپ ہی کے ساتھ مختص ہے کہ آپ عربی زبان میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت عشق کا درجہ رکھتی تھی چنانچہ نعت مصطفوی میں آپ نے ہزاروں اشعار کہے ہیں (میں اس اردو ترجمہ میں آپ کے عربی نعتیہ اشعار کیا پیش کروں) اسی بنا پر آپ کو حسان الہند کہا جاتا تھا۔ اور آج تک آپ اسی لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولوی رحمان علی صاحب تذکرہ علمائے ہند، حضرت آزاد کے تذکرہ

شاید یہ مآثر الکرام کی نگارش اور اس کی قبولیت کا نتیجہ تھا کہ مآثر الکرام کے بعد عمومی طبقات اور علاقائی طبقات الصوفیہ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ البتہ مفتی غلام سرور نے طبقات الصوفیہ پر "خزینۃ الاصفیا (دو جلد) کے نام سے ایسا تذکرہ مرتب کیا جس میں سلسلہ ہائے قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کے ارباب طریقت کا ذکر کیا ہے۔ غلام سرور مرحوم نے اسی نہج اور طرز پر دوسرا تذکرہ " حدیقۃ الاولیا " کے نام سے لکھا ہے جس میں صوفیائے پنجاب کا تفصیلی ذکر ہے۔

سابقہ اوراق کے مطالعہ سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ تیرھویں صدی ہجری اور چودھویں صدی ہجری کے وسط اوّل تک طبقات نگاری پر بہت کچھ لکھا گیا۔ فوائد البہیہ اور نزہۃ الخواطر کی زبان عربی ہے اور باقی طبقات اس وقت کی عمومی زبان فارسی میں لکھے گئے۔ علماء و فضلاء کے طبقات پر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں " حضرت عبدالحق محدث دہلوی " کی کتاب " فہرست التوالیف " کا ابتدائیہ یا کتاب کا مقدمہ " علمائے دہلی " کے ذکر کو متضمن ہے۔ اور اس کو ہم طبقات پر ایک باقاعدہ تالیف نہیں کہہ سکتے۔

مصنفین کو احوال و تراجم نگاری میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے اس کا اظہار حضرت محدث دہلوی نے اپنی کتاب " تالیف قلب الالیف بکتابۃ فہرست التوالیف " میں اس طرح فرمایا ہے :-

> کاتب السطور (عصم اللہ اوقاتہ عن الضیاع والفتور) تذکرہ ملوک و امراء در تاریخ نامہ ایں دیار (دہلی) کہ مسمی " بذکر ملوک " و متضمن تاریخ تصنیف است ضبط نمودہ، ذکر مشائخ و صلحا در کتاب اخبار الاخیار کہ موسوم بسمت شیوع و اشتہار است ذکر کردہ " اما ذکر فضلا از علما و شعرا بعد از جزم و یقین بآنکہ بسیار بودند، چوں نام و نشان ایشاں پیدا نیست و اعمال و آثار تصنیفات و تالیفات ہویدا نے نتوانست نوشت۔
>
> (ابتدائیہ تذکرہ المصنفین دہلی)

راقم السطور نے (اللہ تعالیٰ اس کے اوقات کو فتور اور ضیاع سے محفوظ رکھے) اس شہر دہلی کی تاریخ میں ملوک و امراء کا ذکر کیا ہے، جس کا تاریخی نام " ذکر ملوک "

میں رقمطراز ہیں :۔

"حسان الہند غلام علی آزاد بلگرامی ابن سید نوح حسینی نسباً واسطی اصلاً، حنفی مذہباً، چشتی مشرباً۔ آپ کا مولد بلگرام ہے۔ ۲۵ر صفر روز یکشنبہ ۱۱۱۶ھ (۱۷۰۴ء) میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ از اول تا آخر شیخ طفیل محمد اترولوی سے پڑھیں۔ لغت و سیرت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم، احادیث نبوی اور عربی و فارسی اشعار کی سند جد مادری میر عبد الجلیل بلگرامی سے حاصل کی۔ شاہ لطف اللہ بلگرامی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ صحیح بخاری علامہ شیخ محمد حیات سندھی سے پڑھی اور صحاح ستہ کی ان سے اجازت حاصل کی۔ حجاز سے واپس آکر نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ابن نواب نظام الملک آصف جاہ والیٔ حیدرآباد کی مصاحبت میں رہے۔ آپ کی تصانیف یہ ہیں"۔

عربی تصانیف : ضوء الدراری شرح صحیح بخاری (تا کتاب الزکوٰۃ) تسلیۃ الفواد (عقائد)۔ تراجم علماء۔ عربی اشعار کے دو دیوان (جو تین ہزار اشعار پر مشتمل ہیں) کتاب سبحۃ المرجان میں سات سو عربی اشعار بطور مثال درج کیے ہیں۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان۔

فارسی تصانیف : ید بیضا، سرو آزاد، خزانۂ عامرہ (تذکرۃ الشعراء) روضۃ الاولیا (تذکرہ بعض اولیائے خلد آباد) ماثر الکرام (بلگرام کی تاریخ اور بلگرام کے شعراء و فضلا اور اولیا کا تذکرہ۔ سند السعادات فی سند السادات، دیوان فارسی، مظہر برکات، سبعہ سیارہ (سات دیوان اشعار) (اردو ترجمہ اقتباس تذکرہ علمائے ہند صفحات ۳۶۲-۳۶۳)

آزاد بلگرامی کے معاصرین میں سے تو کسی نے ایسا تذکرہ نہیں لکھا، البتہ تذکرۃ الامراء ضرور مرتب ہوئے۔ آپ کے بعد وسیع اور قابل ذکر طبقات العلماء پر چار کتابیں ہیں۔ اس سے میری مراد فوائد البہیہ اور نزہۃ الخواطر، تذکرہ علمائے ہند (از مولوی رحمان علی) اور حدائق الحنفیہ (از حضرت فقیر محمد جہلمی) ہیں۔

آزاد مرحوم کے بعد تذکرہ علماء و فضلاء موسوم بہ تذکرہ علمائے ہند مولفہ مولوی رحمان علی مرتب ہوا۔ اس میں علامہ غلام علی آزاد کے سلسلہ میں متن کی یہ سطور موجود ہیں :۔

"حسان الہند سید غلام علی آزاد بلگرامی ابن سید نوح حسینی نسباً واسطی اصلاً حنفی مذہباً و چشتی مشرباً و بلگرامی مولداً و منشاءً بتاریخ بست و پنجم صفر روز یکشنبہ سال یکہزار و یکصد و شانزدہ ہجری (۱۱۱۶ھ) در بلگرام متولد شد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ و صحیح بخاری از شیخ حیات سندھی در مدینہ منورہ قرأت کردہ اجازت صحاح ستہ ازو بگرفت و ہندوستان واپس آمد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منجملہ تصانیف عربیہ او ضوء الدراری شرح صحیح بخاری تا کتاب الزکوٰۃ و تسلیۃ الفواد در قصائد خود و تراجم علماء و دو دیوان عربی کہ در ہر دیوان ۳ ہزار اشعار اند و ہفت صد اشعار عربی کہ در کتاب سبحۃ المرجان بطور مثال درج کردہ و سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان از تصانیف فارسیہ او ید بیضا و سرو آزاد و خزانۂ عامرہ، تذکرۃ الشعراء و روضۃ الاولیا تذکرہ بعض اولیائے دکن، مآثر الکرام (تاریخ بلگرام و ذکر اولیاء و فضلاء و شعرائے بلگرام) و سند السعادات فی حسن خاتمۂ سادات و دیوان فارسی و مظہر البرکات و سبعہ سیارہ و غیرہ ازو یادگار اند۔ در سال یکہزار و دو صد ہجری (۱۲۰۰ھ) ازیں جہاں رحلت نمود۔ نور اللہ مضجعہٗ"

تذکرہ رحمان علی کے بعد علامہ فقیر محمد جہلمی مرحوم نے حدائق الحنفیہ تالیف کی۔ حدائق الحنفیہ میں علمائے قرنِ دوازدہم کے تحت آزاد بلگرامی کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں :۔

"**غلام علی آزاد** : غلام علی بن سید نوح واسطی بلگرامی۔ حسان الہند لقب اور آزاد تخلص تھا۔ یکشنبہ کے روز ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ میں قصبہ بلگرام علاقہ صوبہ اودھ میں پیدا ہوئے۔

کتب لغت و حدیث و سیر نبوی و فنون ادب کو میر عبد الجلیل بلگرامی اپنے جد مادری سے اخذ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سند صحیح بخاری اور اجازت صحاح ستہ وغیرہ کی شیخ محمد حیاتؒ سندھی مدنی اور سماعت بعض فوائد علم حدیث کی شیخ عبد الوہابؒ طنطاوی سے مکہ معظمہ میں حاصل کی۔ علامہ طنطاوی نے آپکے عربی اشعار کی نہایت تحسین کی۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں :۔

ضوءالدراری شرح صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ تک ۔ شمامۃ العنبر ماورد فی الہند من سید البشر، تسلیۃ الفواد من قصائد آزاد، سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات، روضۃ الاولیا درحالات مشائخ روضہ (دولت آباد)، ید بیضا تذکرہ شعراء، مآثرالکرام تاریخ بلگرام، خزانہ عامرہ تذکرہ شعراء، سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، غزالان ہند، دیوان فارسی، مثنوی مظہر اکبر ہفت دفتر عربی میں مرأۃ الجمال قصیدہ درمدح سراپائے محبوب، دیوان عربی تین ہزار بیت، شفاء العلیل فی اصطلاحات کلام ابی طیب متنبی، سات دیوان عربی المسمیٰ بہ سبع سیارہ اوران میں قصائد، مستزاد و مردّف و مزدوج و ترجیع بھی ہیں جو کسی شاعر نے آپ سے پہلے اس قسم کے نظم نہیں کیے ۔ اور اہل ہند سے کسی کو نہیں سنا گیا کہ اس نے عربی میں کوئی دیوان بنایا ہو۔ پس کجا سات دیوان، ان دواوین میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بیان کثیرہ و نادر ایجاد فرمائے ہیں جو مثل آپ کے کسی شاعر کو یہ بات حاصل نہیں ہوئی ۔

وفات آپکی سنہ ۱۲۰۰ھ میں اورنگ آباد میں ہوئی، اور اورنگ آباد ہی میں دفن کیے گئے ـــــــــــ " شمع لامعۂ ہندوستان " تاریخ وفات ہے "

نزہۃ الخواطر جلد ہفتم میں بھی حکیم عبدالحیٔ ندوی نے تقریباً انہی خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ البتہ آپ کی تاریخ ولادت بجائے سنہ ۱۱۱۶ھ کے سنہ ۱۱۱۰ھ لکھی ہے جو غلط ہے ۔ اسی عصر کا ایک اور تذکرۂ علماء ہے، اس سے میری مراد فوائد البہیہ فی طبقات الحنفیہ ہے جس کے مصنف علامہ عبدالحیٔ فرنگی محلی ہیں لیکن فوائد البہیہ میں علامہ غلام علی آزاد کے ترجمہ کی تلاش بے سود ہے جبکہ اس قدر ضخیم تذکرہ میں صاحب تذکرہ نے دو ہندیوں کا تذکرہ کیا ہے اور وہ بھی ضمناً ۔ تمام تذکرہ ان علمائے شوافع اور احناف پر مبنی ہے جن کا تعلق ماورائے ہند سے ہے ۔ گویا علامہ علینی کے تذکرہ " الثمار الجنیہ فی طبقات الحنفیہ " کی مانند ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حضرت علامہ عبدالحیٔ مرحوم نے علامہ تاج الدین سبکی شافعی کے " طبقات الشافعیہ "

کی پوری پوری پیروی کی ۔ اسی لیے انہوں نے علمائے ہند میں سے کسی کا ذکر کرنا پسند نہیں کیا ۔

ان تذکروں کے بعد اور کوئی مشہور تذکرہ برصغیر ہند و پاکستان میں تیرہویں یا چودہویں صدی ہجری میں مرتب نہیں ہوا بجز اس کے کہ حکیم غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء کے نام سے ایک مبسوط اور ضخیم تذکرہ صوفیائے قادریہ چشتیہ سہروردیہ اور نقشبندیہ پر مرتب کیا اور علامہ غلام علی آزاد اگرچہ سلسلہ چشتیہ میں بیعت تھے ۔ لیکن ان کی شہرت محض ایک مورخ ، تذکرہ نگار ، اور شاعر کی تھی شاید اسی وجہ سے حکیم غلام سرور لاہوری نے آپ کا تذکرہ نہیں کیا ۔ میں نے خزینۃ الاصفیا کا متن فارسی تعمق نگاہ سے دیکھا ، لیکن میر غلام علی آزاد بلگرامی کا تذکرہ اس میں مفقود ہے ۔ بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ آزاد مرحوم دکن میں سکونت پذیر تھے ۔ دکن کے ارباب کمال کا شہرہ بہ سبب بُعد مسافت لاہور تک پہونچنا دشوار تھا ۔ بہر حال کوئی سبب بھی ہو خزینۃ الاصفیا علامہ مرحوم کے ذکر سے خالی ہے ۔

خزینۃ الاصفیا کے بعد کچھ تذکرے اردو زبان میں اور بھی لکھے گئے لیکن وہ زیادہ تر علاقائی نوعیت کے تھے جیسے تذکرہ کاملان رامپور ، تذکرہ علمائے جونپور ، تذکرہ علمائے پنجاب ۔ ان علاقائی تذکروں میں حضرت آزاد کیلئے جگہ کس طرح پیدا ہوتی ، لیکن حیرت ہے کہ " دربار ملی " کے مولفین نے حسان الہند علامہ غلام علی آزاد کے ذکر سے صرف نظر کی ہے جب کہ " دربار ملی " کے بہت ہی مختصر دیباچہ میں مؤلفین حضرات رقمطراز ہیں کہ :

" دربار ملی میں برصغیر کی فارسی نثر کا انتخاب ہے اور قوم کی سیاسی ، مذہبی ، ادبی ، فکری اور فنی تاریخ کے متعلق اہم ترین اندراجات اس طرح یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قوم کے شاندار ماضی کا ایک متنوع اور خوش رنگ مرقع نظر کے سامنے آجائے ، لیکن اس دلکش اور حسین مرقع میں بھی علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کی تصویر آپ کو نہیں ملے گی ۔

دربار ملی " قومی زندگی کی کہانی معاصرین کی زبانی " ہے ۔ اس کا آغاز " فتح نامہ سندھ "

یعنی "چچ نامہ" کے ترجمے سے کیا گیا ہے اور "چچ نامہ" کے عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے والے آٹھویں صدی ہجری کے ایک صاحبِ فضل و کمال "علی" کوفی ہیں۔ اس تاریخ ملی کا اختتام سید احمد خان (م ۱۸۹۸ء) کے مکتوبات کے نثری نمونوں پر کیا گیا ہے۔ اس تاریخ ملی میں بعض ایسے اصحاب کا بھی تذکرہ ہے جو نثر فارسی میں کتابچے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں لیکن افسوس کہ خزانۂ عامرہ، سروِ آزاد، مآثر الکرام جیسی بلند پایہ کتب کے مصنف، بارہویں صدی ہجری میں عربی زبان کے واحد نعت نگار شاعر (جس کے باعث حسان الہند کا لقب دیا گیا) اور ایسے عربی نعت گو کہ کئی مبسوط و ضخیم دیوان یادگار چھوڑے، فارسی شاعری کی طرف نظر ڈالیے تو فارسی ہی میں کئی دیوان ان کے یادگار ہیں افسوس کہ ایسے عظیم نثر نگار اور عربی و فارسی کے متبحر عالم کو "مولفین دربار ملی" نے کن وجوہ کے باعث درخورِ اعتنا نہ سمجھا جبکہ دربار ملی میں بہت سے ایسے نثر نگاروں کا تذکرہ ہے جن کی نثر فارسی میں ایسی تصانیف نہیں ہیں جو کسی اسلوب خاص کی ترجمان ہوں یا شہرت و قبولیت کے باعث ہر کہ و مہ کی زبان پر ان کا تذکرہ ہو۔ دربار ملی کا سال تالیف تو معلوم نہیں البتہ طبع اول کا سال ۱۹۶۱ء ہے اور مآثر الکرام نایاب تو کیا کمیاب کتب میں بھی شامل نہیں بلکہ اپنے خصائص کے باعث متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

بہر حال اس فروگذاشت کی تلافی جناب ڈاکٹر عبد الوحید قریشی صاحب نے اس طرح کر دی کہ انہوں نے جشن دو ہزار پانصد سالہ شہنشاہی ایران کے موقع پر ۱۹۷۱ء میں مآثر الکرام کی طبع جدید پر (جو حواشی سے مزین ہے) ایک مختصر مقدمہ تحریر فرمایا۔ یہ ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا ہے، ۳۰×۲۶/۸ کے آٹھ صفحات مآثر الکرام کے مصنف کے احوال و کوائف پر مشتمل ہیں اور اس میں زیادہ تر توجہ ان کتب کے تعارف پر مرکوز کی گئی ہے جو علامہ آزاد بلگرامی کی تالیف مآثر الکرام کی رد میں لکھی گئی ہیں اور ان پر مآثر الکرام کے اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بہر حال دربار ملی کے مؤلفین نے تذکرہ آزاد سے جو گریز کیا تھا اس کی تلافی ہو گئی۔ دربار ملی کے دوسرے مولف اور مسلمانانِ برصغیر کی ثقافتی اور ادبی تاریخ کے عظیم مورخ جناب شیخ محمد اکرام مرحوم و مغفور مؤلف رود کوثر، موج کوثر اور آب کوثر نے رود کوثر میں "آزاد" پر ایک جامع تبصرہ فرما کر اس کو خلا کو پُر کر دیا، جو دربار ملی میں ان کے تذکرہ سے صرف نظر کرنے سے پیدا ہوا تھا۔ شیخ اکرام مرحوم نے رود کوثر میں اگرچہ مختصر سہی لیکن بہت ہی جامع اور بھرپور تبصرہ حضرت آزاد پر کیا ہے۔ سابقہ اوراق میں آپ اس کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہہ و مفتی مولوی عبد الاول جونپوری (۱۲۸۴ــــ ۱۳۳۹ھ) نے اپنی مشہورِ زمانہ اور مستند کتاب "فقہ اسلامی" میں جہاں بارہویں صدی کے علماء کا تذکرہ کیا ہے وہاں انہوں نے حضرت آزاد بلگرامی کو بھی ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

آزاد بلگرامی : " حسان الہند سید غلام علی حنفی چشتی بلگرامی ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے۔ کل کتب درسیہ مولانا سید طفیل محمد بلگرامی استاذ المحققین سے پڑھیں اور کتب لغت و حدیث اور سیر و فنون ادب اپنے نانا مولوی عبد الجلیل بلگرامی سے پڑھیں اور فن عروض و قوافی کو اپنے ماموں میر محمد بلگرامی سے سیکھا۔ سید لطف اللہ بلگرامی کے مرید تھے۔ آپ بڑے نامی گرامی شاعر اور اعلیٰ درجہ کے ناثر تھے۔ آپ کے سات دیوان عربی زبان کے مدوّن ہیں۔ تصانیف آپ کی بہت ہیں از انجملہ شرح صحیح بخاری، شمامۃ العنبر، تسلیۃ الفواد، روضۃ الاولیاء، ید بیضا (تذکرۃ الشعرا) مآثر الکرام، خزانۂ عامرہ، سبحۃ المرجان، غزالان ہند، مرآۃ الجمال، شفاء العلیل، مظہر برکات، دیوان فارسی، سرو آزاد ہیں۔ صوبہ اودھ میں بلگرام ایک قصبہ کا نام ہے جہاں کے لوگ فطرتاً ظباع اور سلیم الطبع ہوتے ہیں۔"

تذکرہ علمائے ہند، حدائق حنفیہ، نزہۃ الخواطر، فقہ اسلامی (تاریخ فقہائے ہند) کے علاوہ قاموس اعلام حصہ اول، تذکرۂ بے نظیر اور اتحاف النبلاء (صدیق حسن بھوپالی) میں بھی آزاد کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان تذکروں میں آزاد کی سوانح پر کھل کر نہیں لکھا گیا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ حسان الہند آزاد بلگرامی مرحوم نے خود اپنی تصانیف و توالیف میں اپنا ترجمہ بے کم و کاست تحریر فرما دیا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم نے مآثر الکرام کے اس ایڈیشن پر جو حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوا تھا۔ ایک مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ جس کے مطالعہ سے آزاد مرحوم کے سوانح کے کچھ خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں مولوی عبد الحق مرحوم دکن میں سر رشتہ تعلیمات سے منسلک تھے۔ مولوی عبد الحق مقدمہ میں رقمطراز ہیں :-

" اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے عہد اسلامی میں ایسی ایسی تاریخیں لکھی گئیں کہ جن کی نظیر فارسی زبان میں نہیں ملتی لیکن مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ صحیح فن تاریخ نویسی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ البتہ مولانا غلام علی آزاد نے اس فن کی لاج رکھ لی، اور آخر وقت میں اس ذوقِ صحیح کی داد دی۔ ان کی تصانیف زیادہ تر تاریخ کی اسی شاخ سے متعلق ہیں جسے فن اسماء الرجال

کہتے ہیں۔

آزاد نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ ہندوستان میں پہلے شخص وہی ہیں جنہوں نے اس فن پر قلم اٹھایا ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے صاحب تاریخ نظامی، سید عبدالقادر بدایونی علامہ ابوالفضل اپنی اپنی تاریخوں میں اپنے اپنے عہد کے امراء علماء اور فضلاء کے کچھ حالات لکھ چکے تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ مولانا آزاد نے اس میں خاص اہتمام کیا ہے اور اس فن کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ (دیباچہ مآثر الکرام مطبوعہ حیدرآباد دکن)

جس طرح حسان الہند کی تصانیف کو سراہا گیا ہے اور ان کی بلند پائیگی کا اقرار واقعی اعتراف کیا گیا ہے اسی طرح آپ کی مشہور ترین کتاب مآثر الکرام پر اعتراض بھی کیے گئے ہیں لیکن زیادہ تر اعتراضات محض اختلافات کی بناء پر کیے گئے ہیں مثلاً "درثمین وغیرہ، میں یہاں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، بلکہ حضرت آزاد کی جو اہم فروگذاشتیں مآثر الکرام کے سلسلہ میں ارباب تحقیق نے پیش کی ہیں ان کا ذکر اور ان کا امعان نظر اور تحقیقی نگاہ سے یہاں جائزہ لیا جائے گا۔

ان اعتراضات یا فروگذاشتوں میں سب سے اہم اعتراض وہ ہے جو بابائے اردو عبدالحق مرحوم نے مآثر الکرام (حیدرآبادی ایڈیشن) پر اپنے مقدمہ میں کیا ہے فرماتے ہیں:-

خاک بلگرام میں ایک ایسا جید فاضل گذرا ہے جسے فخر علمائے ہند کہنا بجا ہوگا۔ علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس کا ذکر نہ ہو۔ یہ آزاد بلگرامی کے ہم عصر تھے۔ ہمارے دل نے ہرگز گوارہ نہ کیا کہ یہ کتاب جو علمائے ہند اور خصوصاً علمائے بلگرام کا تذکرہ ہے اس فاضلِ بے عدیل کے ذکر سے خالی رہے۔ لہٰذا یہ تذکرہ آخر کتاب میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جس سے اس شخص کے تبحر اور کمالاتِ علمی کا حال معلوم ہوگا۔

(عبدالحق حیدرآباد دکن)

افسوس کہ ۱۹۱۰ء کا ایڈیشن میرے سامنے نہیں ہے اور جو پاکستانی ایڈیشن مکتبہ احیاء العلوم شرقیہ لاہور میرے سامنے ہے۔ اس پہ مولوی عبدالحق مرحوم کا یہ مقدمہ موجود ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے یہ اضافہ ضرور کیا ہوگا، لیکن لاہوری ایڈیشن میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ اب قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ مولوی عبدالحق کے اس اعتراض میں کس قدر وزن ہے۔ وہ کہ خاکِ

بلگرام کے ہم عصر فاضل کا تذکرہ آزاد نے نہیں کیا ؟"

قارئین کرام ! حسان الہند آزاد کا سالِ ولادت ۱۱۱۶ھ ہے اور تمام تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ علامہ مرتضیٰ بلگرامی زبیدی ۱۱۴۵ھ میں پیدا ہوتے۔

مولوی رحمان علی مرحوم علامہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں :۔

سید مرتضیٰ حسینی ، زبیدی ، قادری ، حنفی نامش سید عبدالرزاق ، لقب وے محی الدین وکنیت او ابوالیقین است ۔ محدث وفقیہ ولغوی و ادیب جامع علوم عقلیہ ونقلیہ بود در یازدہ صد و چہل وپنج ہجری بقصبہ بلگرام متولد گشتہ و دراوائلِ عمر بزیارتِ حرمین شریفین مشرف شدہ ، ہم در آں دیار بعزم تحصیل علوم کمرِ ہمت بستہ زمشائخ و علمائے زبید (یمن) ومصروحجاز وغیرہ کسب کمالات ظاہر و باطن کردہ ..... "

چونکہ وَے تا مدت دراز بہ زبید مقیم بود بزبیدی شہرت یافت تا اینکہ اورا کسے ہندی نمی دانست واز زبید بمصر قدوم آوردہ افاضۂ وافادۂ علوم می داد علاوہ دیگر مسترشدان عبدالمجید سلطان روم ومحمد پاشا صدرالوزارت ازو اجازت حدیث یافتند ۔ بالجملہ باخود علم ونشر علوم بتوسط کثرت تلامذہ وتصانیف کتب کہ بحیاتش صیت وَی ۔ اکناف عالم را در گرفتہ اگر وَے را مجدد صدی سیزدہم گویند رواست ۔ بماہ شعبان بسال دوازدہ صد وپنج ہجری بمرض طاعون وفات یافتہ بدرجہ شہادت فائز گشت ومزار سیدۂ رقیہ رضی اللہ عنہا مدفون گردید ۔ "

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ علامہ مرتضیٰ بلگرامی حضرت آزاد بلگرامی سے ۲۹ سال چھوٹے تھے اور عنفوان شباب سے قبل ہی وہ ہندوستان سے بغرض تحصیل علوم وفنون باہر چلے گئے تھے اور پھر ہندوستان واپس نہ ہوئے ۔ زبید ومصروحجاز میں بغرض افادۂ علوم مقیم رہے اور مدینہ منورہ میں بمرض طاعون انتقال فرمایا اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے مشہد میں دفن کیے گئے ۔ اس صورت میں آزاد دکن میں رہ کر ان سے کس طرح آگہی حاصل کر سکتے تھے جبکہ ان کی تصانیف کا شہرہ بارہویں صدی کے اواخر میں ہوا ۔ خصوصاً تاج العروس شرح قاموس نے ان کو برصغیر پاک وہند میں متعارف کرایا ۔ اگرچہ ان کا انتقال علامہ آزاد بلگرامی سے صرف تین سال بعد ہوا لیکن علامہ آزاد کی زندگی میں اس نابغہ دوراں کی شہرت اس برصغیر میں نہیں پہونچی تھی ۔ اسی بنا پر علامہ رحمان علی کا یہ خیال درست ہے کہ

ان کو تیرہویں صدی کا مجدد کہنا چاہیے کہ اپنی ۶۶ (چھیاسٹھ) گرانقدر تصنیف کے باعث وہ اس لقب کے حقدار ہیں۔ علامہ آزاد سے ۲۹ سال چھوٹے ہونے کے باعث وہ آزاد کے ہم عصر تو ضرور تھے لیکن ایسے ہم عصر جو ملک ہند سے باہر تحصیل علوم اور پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے اور جن کی تصانیف کا علم تیرہویں صدی ہجری سے پہلے لوگوں کو نہ ہو سکا۔ اں بارہویں صدی ہجری کا کوئی مورخ علامہ مرتضیٰ زبیدی کا ذکر کرتا تو ضرور آزاد پر حرف آتا کہ وہ ایک اپنے گرانقدر معاصر کو بھول گئے۔"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا کہ آزاد کے بعض معاصرین نے ان کی شاعری، ان کے تاریخی کارنامے اور اسماء الرجال کی گرانقدر تصنیف "مآثر الکرام" پر بعض اعتراضات کیے ہیں، لیکن وہ زیادہ تر اعتراض برائے اعتراض کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان میں کوئی وزن نہیں ہے مآثر الکرام کی ادبی اور تاریخی حیثیت کے سلسلہ میں بعض تذکرہ نگاروں کے خیالات اور ان کے تبصروں کو میں پیش کر چکا ہوں۔ یہاں ایک تبصرہ آپ کی خدمت اور پیش کروں گا۔ یہ تبصرہ بہت وقیع ہے اور علامہ آزاد کی خدمت میں ایک مشہور سیرت نگار نقاد یعنی مولانا شبلی نعمانی کا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اپنے ایک مقالہ میں آزاد کی خدمات کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:۔

"ہندوستان کے سیکڑوں علماء و فضلاء کے حالات پر آج گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے علماء اور ارباب فضل کے حالات قلمبند کیے۔ آزاد نے اس اولیت پر خود جا بجا فخر کا اظہار کیا ہے۔" (مقالات شبلی)

ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحب اس مقدمہ میں جو انہوں نے مآثر الکرام کے جدید ایڈیشن پر تحریر فرمایا ہے، لکھتے ہیں:۔

" اس میں کلام نہیں کہ معاصر تاریخی واقعات کے بیان میں آزاد نے جو لکھ دیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ واقعات سنین میں حزم و احتیاط کی وجہ سے اکثر محققین و مورخین نے آزاد کے بیانات کی صحت کو سراہا ہے اور ان کے ضمن حیات میں ہی بعض اقتباسات کے انگریزی تراجم انگریزی مورخوں کی توجہ کا مرکز رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اسی سلسلہ میں آگے رقمطراز ہیں:۔

آزاد سہ زبان ادیب و مورخ تھے۔ عربی و فارسی میں صاحب دیوان ہوئے،

اُردو میں ان کی شاعری کا اقرار تذکرہ نگاروں نے کیا ہے بلکہ اگر ان کے شاگرد کے بیان کو تسلیم کیا جائے تو وہ اُردو میں بھی صاحبِ دیوان تھے۔

(مقدمہ مآثر الکرام از ڈاکٹر عبد الوحید قریشی)

آزاد کے اُردو دیوان کے سلسلے میں آزاد کے شاگرد (تمنا اورنگ آبادی) کے حوالہ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ اُردو میں بھی صاحبِ دیوان تھے۔ لیکن "سروِ آزاد" کی دوسری فصل یعنی ہندی زبان کے شعراء کے تذکرے کے آغاز میں علامہ آزاد کہتے ہیں:

من ہیچمداں با زبانِ عربی و فارسی و ہندی آشنایم و از ہر سہ میکدہ بقدر حوصلہ قدحے پیمایم، در عربی و فارسی عمرہا مشق سخن کردم و نو رسانِ معانی را در آغوشِ فکر پروردم۔ مشق سخن ہندی ہر چند اتفاق نیفتاد فرصت تسخیر سخنانِ ایں قلمرو دست بہم نداد اما سامعہ را از نوائے طوطیانِ ہند حظ وافر است۔

(مقدمہ سروِ آزاد فصلِ دوم نولکشوری ایڈیشن)

فرماتے ہیں کہ: مجھ ہیچمداں آزاد کو عربی و فارسی اور ہندی زبان سے واقفیت ہے اور تینوں میکدوں سے میں نے اپنے پیالے مے فکر پُر کیے ہیں، عربی اور فارسی زبان میں مدتوں میں نے فکرِ سخن کی ہے۔ (شعر کہے ہیں) معانیِ نو کو آغوشِ فکر میں پرورش کیا ہے، لیکن ہندی زبان میں مجھے اب تک شعر گوئی کا اتفاق نہیں ہوا البتہ ہندی کے اشعار سننے کا مجھے بہت شوق ہے، اور ہندی شعرا کا کلام سننے کا بہت مشتاق ہوں۔"

اس موقع پر آزاد نے اپنے اُردو کلام کی کوئی وضاحت نہیں کی کہ اس سے بہتر موقع اس کے اظہار کا اور کوئی نہیں تھا۔ بارہویں صدی اردو زبان کا ترقی یافتہ دور نہیں تھا اس لیے آزاد نے اس وقت کی اُردو میں شعر کہنا پسند نہیں بلکہ انہوں نے ہزاروں اشعار فارسی اور عربی میں اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ آزاد کی فکرِ سخن کا محور صرف عربی اور فارسی زبانیں تھیں اور بس!!

علامہ آزاد کی تصانیف

علامہ آزاد کی عربی و فارسی تصانیف کا مختصر جائزہ سوانح عمری کے ضمن میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اب میں یہاں ان کی بعض کتب کا جو آج بھی دستیاب ہیں قدرے تفصیلی جائزہ پیش کروں گا۔

علامہ آزاد کی سب سے پہلی تصنیف "تذکرہ ید بیضا" ہے۔ اس تذکرہ کی زبان فارسی ہے۔ یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جو علامہ آزاد نے سیوستان کے دوران قیام لکھنا شروع کیا، اور ۱۱۴۵ھ میں اس کی تکمیل ہوئی جس میں آزاد نے ۱۱۴۸ھ میں مزید اضافہ کیا۔ اس کی تاریخ علامہ آزاد نے "طبع کلیم ید بیضا نمود" خود کہی ہے۔ ید بیضا نامی تذکرہ اپنے سفر حج سے پہلے مرتب کیا تھا۔

سفر حج سے واپسی کے بعد آزاد بجائے بلگرام کے دکن پہونچے اور نواب نظام الدولہ کے حبیب خاص کے طور پر ان کے ساتھ رہے۔ سنہ ۱۱۶۱ھ میں خلد آباد (دکن) کے اولیائے کرام کا تذکرہ مرتب کیا جو "روضۃ الاولیا" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے۔

۱۱۶۳ھ میں آزاد جب دوسری مرتبہ برہان پور (دکن) پہونچے تو یہاں ان کو اتنا موقع ملا کہ انہوں نے ان تمام احادیث اور بعض تفسیری روایات کو جمع کیا، جن میں ہند کا ذکر موجود ہے، اور اسی مناسبت سے انہوں نے اس کتاب کا نام "شمامۃ العنبر ما ورد فی الہند من سید البشرؐ" رکھا۔ یہ ایک معمولی ضخامت کا رسالہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے۔

مآثر الکرام

بیت اللہ شریف جانے سے قبل (سنہ ۱۱۵۰ھ) آزاد نے علماء و فضلاء اور فقراء و صلحائے بلگرام کے حالات پر مبنی ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور کچھ حصہ اس کا ترتیب بھی دے چکے تھے کہ شوق اس مبارک سفر پر ان کو لے گیا۔

زیارت حرمین شریفین سے واپسی چونکہ بلگرام نہ ہو سکی اور دکن میں مستقل قیام ناگزیر ہو گیا تو انہوں نے یہ نامکمل مسودہ وطن سے یہاں منگالیا اور اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ یہ تذکرہ فضلاء و علماء، فقراء و صلحاء اس قدر ضخیم ہو گیا کہ انہوں نے اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا۔ مآثر الکرام (جس کا ترجمہ قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے) اور "سرو آزاد" ان دونوں تذکروں کی تاریخیں بھی انہوں نے خود نکالیں کہ آزاد کو تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا۔ "ختامہ مسک" (۱۱۶۶ھ) مآثر الکرام کی تاریخ ہے اور "نشاند آزاد سرو سبز تازہ" (۱۱۶۶ھ) سے سرو آزاد کی تاریخ نکالی ہے[1]۔

---

[1] یہی وہ زمانہ ہے جبکہ بلگرام کی ایک مایۂ ناز ہستی صاحب تاج العروس شرح قاموس اور دوسری پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف، مؤلف علامہ سید مرتضیٰ زبیدی یمن کے شہر زبید میں کسب علوم و فنون میں مصروف تھے۔ بھلا اس صورت میں آزاد "مآثر الکرام" میں ان کا ذکر بحیثیت ایک مصنف کیا کرتے ؟؟۔

جیسا کہ آپ مطالعہ کریں گے۔ مآثر الکرام ۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں جس کو آزاد فصل اوّل کہتے ہیں (۸۱) فقراء کے حالات ہیں (جو بہت اختصار سے لکھے گئے ہیں) اور دوسرا حصہ یا فصل دوم (۱۰۷) علماء کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں حصوں میں علماء و فقراء بلگرام کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ضمناً علمائے ہند کا تذکرہ بھی آگیا ہے مثلاً ردیف "ا" میں بلگرام کے صرف تین علمائے کرام ہیں یعنی میر احمد بن عبد اللطیف بلگرامی، میر سید اسمٰعیل بلگرامی اور قاضی الہداد بلگرامی اور بیرون بلگرام یا علمائے ہند میں شیخ ابوالفیض فیضی، مولانا احمد تھانیسری، شیخ احمد المعروف بہ ملّا جیون اور حافظ امان اللہ بنارسی ہیں۔ کچھ یہی صورتِ حال تذکرۂ فقراء و صلحاء میں ہے۔

سروِ آزاد

یہ ایک تذکرۃ الشعراء ہے، جس کی صراحت خود آزاد فرماتے ہیں:۔

"نام این دفتر سروِ آزاد است نیز محتوی بر دو فصل۔ فصل اوّل در ذکر صاحب طبعان فارسی ایدھم اللہ بروح القدس، فصل ثانی در ذکر قافیہ سنجانِ ہندی جزاہم اللہ بجائزۃ الخیر"

وبرائے شعرائے عربی انموذجے علیحدہ بزبان عربی طرح انداختم و شعرائے تازی را با شعرائے فارسی ممزوج نساختم۔

اس طرح آزاد نے عربی شعراء کا تذکرہ جُداگانہ تحریر کیا ہے۔ سروِ آزاد کی یہ خصوصیت یا تخصیص بھی پیش نظر ہے کہ علامہ آزاد نے ان متاخرین شعراء کا ذکر کیا ہے جن کی پیدائش یا جن کی وفات ۱۰۰۰ھ کے بعد ہے یعنی آپ نے معاصرین یا ۱۰۰۰ھ کے بعد وفات پانے والے شعرائے فارسی کا ذکر ہے۔ ان شعراء کا نمونۂ کلام بھی علامہ آزاد نے دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شعرائے بلگرام کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

چنانچہ سروِ آزاد کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

راقم اوراق دریں صحیفہ جمعے از قافیہ سنجان متاخرین راکہ ابتدائے ظہور یا انتہائے وجودِ ایشاں بعد از ہزار (۱۰۰۰) ہجری است بہ صدر بیان نشاندہ بعد از اں موزونانِ بلگرام را رونق ایں انجمن میگرداند" (دیباچہ سروِ آزاد)

مآثر الکرام کی طرح سروِ آزاد بھی دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ میں ۱۴۳ فارسی شعراء کا تذکرہ ہے اور دوسرے حصہ میں آٹھ ایسے شعراء کا ذکر ہے جو ہندی یا بھاشا میں فکر سخن کرتے تھے دونوں حصوں میں

ہر شاعر کے ساتھ نمونۂ کلام موجود ہے۔ قصائد کے نمونوں سے گریز کیا ہے۔

خزانۂ عامرہ خزانۂ عامرہ بھی تذکرہ شعرائے فارسی ہے لیکن سروِ آزاد کی طرح علاقائی قید سے آزاد ہے۔ اس میں صرف یہ التزام موجود ہے کہ شعرائے مدحت طراز کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ انہوں نے اپنے برادر زادہ (میر اولاد علی بلگرامی) کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اس میں ہند و بیرونِ ہند کے (۱۳۵) شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن بہت ہی اختصار کے ساتھ۔ ہر ایک شاعر کے لیے صرف چند سطریں (باستثنائے چند) مخصوص کی ہیں۔ اور چند اشعار نمونۂ کلام کے طور پر دیئے ہیں۔ البتہ ناصر جنگ، امیر الممالک اور بعض دوسرے ہم عصر امراء کے حالات خصوصاً مرہٹوں اور ابدالی کی جنگ پر بہت مستند تاریخی مواد اس میں موجود ہیں۔ اس کی تاریخ تالیف دوسری توالیف کی طرح آزاد نے اس طرح کہی :۔

گنجور خرد گوہر تاریخ فشاند   حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ
۱۱۷۶ھ

خزانۂ عامرہ کی تاریخ تالیف بعض اصحاب نے ۱۱۷۶ھ لکھی ہے یہ درست نہیں ہے۔

• حق دادہ عجب خزانۂ عامرہ" کے اعداد ۱۱۷۶ ہیں۔ علامہ آزاد کی دیگر تصانیف کی طرح یہ تذکرہ بھی نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ (۱۸۷۱ء)۔

خزانۂ عامرہ کے بعد آزاد نے "سبحۃ المرجان" (فی آثار ہندوستان) کی تالیف پر قلم اُٹھایا۔ "سبحۃ المرجان" میں "شمامۃ العنبر" بطور فصل اوّل شامل ہے۔ اس کی دوسری فصل بعض علمائے ہند کے تراجم پر مشتمل ہے۔ تیسری فصل علم بدیع پر ہے۔ چوتھی فصل میں محب اور محبوب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اور ہندوستان کی موسیقی پر تفصیل سے لکھا ہے امیر خسرو نے اس موضوع پر فارسی زبان میں آزاد سے بہت پہلے قلم اُٹھایا تھا، لیکن عربی زبان میں اس موضوع پر لکھنے والے علامہ آزاد پہلے شخص ہیں۔ یہ کتاب ہند اور مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ "سبحۃ المرجان کا سالِ تالیف ۱۱۷۷ھ ہے۔

غزالان ہند یہ سبحۃ المرجان کے تیسرے اور چوتھے باب کا فارسی میں ترجمہ ہے جو آزاد کی تمام تالیفات میں ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے شمار کی جاتی ہے۔ غزالانِ ہند کا سالِ تالیف ۱۱۷۸ھ ہے۔ سبحۃ المرجان کے پہلے اور دوسرے باب کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

مآثر الامراء یہ کتاب یا طبقات الامراء اصل میں صمصام الدولہ شاہنواز خان مرحوم کی تالیف ہے۔ صمصام الدولہ نے اپنے عہد کے امراء اور خوانین کے حالات مرتب کیے

تھے۔ کتاب کا تکملہ قریب قریب ہو چکا تھا کہ سنہ ۱۱۷۱ھ میں وہ ایک جنگ میں مارے گئے اور گھر بھی لٹ گیا۔ مآثر الامراء کے اجزا تتر بتر ہو گئے۔ علامہ آزاد کے مرحوم و مغفور سے خصوصی تعلقات تھے اور آزاد کو مآثر الامراء کی تالیف کا علم تھا۔ آزاد نے بھرپور کوشش کے بعد مآثر الامراء کے اوراقِ منتشرہ کو حاصل کیا اور جن معاصرین امراء کے حالات تحریر نہیں ہوئے تھے ان کو تحریر کر کے مآثر الامراء کا تکملہ کیا۔ اس طرح سنہ ۱۱۹۴ھ میں اس کتاب کو انہوں نے مکمل کیا۔ یہ کتاب بھی فارسی میں لکھی گئی تھی[1]۔ یہ تھی تفصیل علامہ آزاد کی فارسی تصانیف کی۔

عربی تصانیف

علامہ آزاد بلگرامی کی عربی تصانیف میں سبحۃ المرجان کو خاص قبولیت حاصل ہے لیکن فی زماننا "سبحۃ المرجان" کمیاب ہے۔ بعض کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں اور میرے عزیز دوست فاضل نوجوان مولانا جمیل احمد صاحب نعیمی کے پاس بھی ایک عمدہ مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔

ضوء الدراری

صحاح ستہ میں بخاری شریف کو جس طرح اولیت اور قبولیت کا شرف حاصل ہے اسی طرح وہ اس وصف میں بھی منفرد ہے کہ صحاح ستہ میں سب سے زیادہ اسی صحیح کی شروح لکھی گئی ہیں۔ علامہ آزاد کی ضوء الدراری اسی بخاری شریف کی شرح ہے، لیکن نامکمل ہے۔ اسی سبب سے وہ عام اور مقبول نہ ہو سکی۔ میری نظر سے اس کا نسخہ نہیں گزرا اس لیے میں اس سلسلہ میں زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔

دواوین اشعار عربی

علامہ آزاد بقول ان کے پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جنہوں نے عربی زبان میں اسقدر اشعار کہے ہیں کہ بقید ردیف انہوں نے دو دیوان مرتب کر لیے۔ یہ دواوین ان کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہیں۔ مدت ہوئی یہ دیوان حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکے ہیں۔

تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد

یہ علامہ آزاد کے قصائد کا مجموعہ ہے۔ اس میں نعتیہ قصائد شریک غالب ہیں۔ تسلیۃ الفواد کا کچھ حصہ "سبحۃ المرجان"

---

[1] اس کا اردو ترجمہ محترمی پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب نے کیا ہے اور شائع ہو چکا ہے۔

میں شامل ہے۔ آزاد نے چند قصائد بر سبیلِ تذکرہ مآثر الکرام میں بھی پیش کیے ہیں ان پر تفصیلی بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔

سبعہ سیارہ یہ علامہ آزاد بلگرامی کے سات دواوین کا مجموعہ ہے جس میں ۱۱۶۹ھ سے ۱۱۹۴ھ تک کا کلام عربی شامل ہے۔ یہ تمام دواوین شائع نہ ہو سکے۔ صرف ان کا انتخاب "مختار دیوان آزاد" کے نام سے ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ آزاد کے ان دواوین سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ آزاد کو عربی شاعری پر کس قدر عبور اور مہارت حاصل تھی۔

عربی زبان میں ان مشہور کتب منظومہ و منثورہ کے علاوہ علامہ آزاد کی یہ کتابیں بھی مشہور ہیں:۔

۱۔ **مظہر البرکات** یہ ایک صوفیانہ مثنوی ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کے بعض سوانح نگاروں نے اس کو عربی زبان میں آزاد کی مثنوی کہا ہے لیکن یہ قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان میں صنف مثنوی موجود نہیں ہے۔ یہ غالباً شعرائے فارسی کی ایجاد ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ طویل نظم ہے جو سات دفتروں پر مشتمل ہے

۲۔ **شفاء العلیل فی اصلاحات کلام ابی الطیب متنبیؔ** مشہور عربی شاعر متنبی کے کلام کی بعض اصلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔

۳۔ **کشکول** عربی و فارسی کے منتخبہ اشعار کا مجموعہ ہے۔

فارسی زبان میں علامہ آزاد کی یہ کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں:۔

سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو سادات کے فضائل و مکارم پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

دیوان فارسی علامہ آزاد کا یہ دیوان بہت مشہور ہے۔ ۱۸۸۳ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکا ہے لیکن آج کل کمیاب ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی نے اکثر تصانیف میں مختصراً اپنے حالات تحریر فرما دیے ہیں چنانچہ مآثر الکرام، سروِ آزاد اور خزانۂ عامرہ میں آپ کے سوانح

موجود ہیں اور سروِ آزاد میں آپ نے تقریباً دو سو منتخب اشعار بھی دیئے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اس انتخاب سے چند اشعار پیش کرتا ہوں، علامہ آزاد بہت عجز و انکسار کے ساتھ سروِ آزاد میں کہتے ہیں:۔

اکنوں برخے ترشحات از دیوانِ خود بہ ترتیب ردیف
بعرض سخن سنجاں می رسانم و بضاعت مزجات
از نظر عزیزان مصر مروت می گذرانم تا عیب را
بہ قیمت بر گیرند و مہرِ ذرگل را بہ بہائے گوہر بہ پذیرند
اینجا عرض بندہ بدرجۂ قبول رساد و ردِ ناکامی بہ ہیچ
وجہ مبیاد :۔

صاحبِ قال حسبِ حال گوید ؎

تمام علیم و خوباں خریدہ اند مرا — زحسن خلق بزر بر کشیدہ اند مرا

کمند جاذبۂ دوستاں اسیرم کرد — وگرنہ صورتِ رم آفریدہ اند مرا
عجب عنایت ممتاز دیدہ ام آزاد — بہ داغِ بے ہنری بر گزیدہ اند مرا

آزاد کی غزل نازک خیالی کا مرقع ہوتی ہے۔ جس کو وہ رنگینیٔ بیان سے آراستہ کرتے ہیں۔

بر آر از بدبسم اللہ تیغ خوش مقالی را — مسخر کن سوادِ اعظمِ نازک خیالی را
خیال نازک از جوشِ نزاکت رازِ دل باشد — نباشد جز کرامت فہم کردن فکرِ عالی را

اے وائے رنگ و بوئے چمن کرد غارت — کم فرصتی ز زندگی مستعار ... ما
آخر شود کمند غزالے رمیدہ — آزاد رشتۂ نگہ انتظار ... ما

دانش جستم و آخر نشیتم باز نخدانش
لب چاہے غنیمت می شود گم کردہ منزل را

نازک خیالی کے ساتھ ساتھ وہ مضمون آفرینی کے بھی دلدادہ ہیں۔

سرِ شوریدۂ من طرفہ اوجے داشت در طالع
کہ در وقت جدا کردن بپا افتاد قاتل را

بہارِ ایں چمن آزاد آخر رنگ می بازد
چو شبنم از جہانِ رنگ و بو بربند محمل را

اے نمک بر زخمِ دل از لعلِ خندانِ شما
صبحِ محشر داغ از شورِ نمکدانِ شما

تشنۂ مارا بآسانی تواں سیراب کرد
بوسۂ کافی است از چاہِ زنخدانِ شما

کشود مشتری ما گرہ زد شنامے
نگہ ہمیں زرِ نارائج است قسمت ما

گریستیم من و شبنم آنچناں آزاد
کہ گل بخونِ جگر غوطہ زد ز رقتِ ما!

میں آزاد کی شاعری پر مزید یہاں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ مجھے آزاد کی نثر نگاری پر موضوع کی مناسبت سے کچھ کہنا ضروری ہے

فارسی نثر اور آزاد کا طرزِ نگارش

اس اردو ترجمہ میں اگرچہ آزاد کی نثر کے اسلوب اور طرزِ نگارش پر کچھ کہنا بے محل سی بات کہی جا سکتی ہے اور نہ یہاں اس کی کچھ خاص ضرورت ہے۔ میں صرف مختصر طور پر اتنا عرض کروں گا کہ آزاد کی فارسی نثر پر تصنع کا رنگ غالب نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف اور سلیس فارسی میں اس وقت کی زبان میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کو انشا پردازی کا کمال دکھانا مقصود نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نثر سادہ نویسی کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ حالانکہ اسوقت ہندوستان کی سرزمین میں فارسی انشا تصنع سے ہمکنار تھی۔ مقفیٰ اور مسجع نثر لکھنا ارباب کمال کا شیوہ تھا۔ مرزا غالب نے آزاد کے بہت بعد نثر فارسی پر قلم اٹھایا ہے لیکن انہوں نے نظم فارسی کی طرح نثر میں بھی معنی آفرینی اور نزاکت تخیل کی رعایت کو ہر مرحلہ پر روا رکھا ہے، جس کے نتیجہ میں کلام تصنع کا ایک مرقع اور آورد کی ایک منہ بولتی تصویر بن گئی یہ ضرور ہے کہ آزاد اپنے تبحر علمی کے باعث کہیں کہیں عربی کے جملے اور عربی

ضرب الامثال استعمال کر جاتے ہیں لیکن حواشی میں خود ہی ان کی تشریح کر دیتے ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کے وسط میں ہندوستان میں فارسی کی نثر تصنع اور تکلف کا شکار تھی۔ شکوہ الفاظ، پیچدار تراکیب، دوراز کار تشبیہات اور استعارات اس کا مایۂ خمیر تھے۔ علامہ آزاد کے دور میں فارسی نثر پر بیدل اور نعمت خان عالی کا اسلوب اور ان کا طرز چھایا ہوا تھا۔ لیکن آزاد نے تاریخی بیانات اور سوانح کیلئے اس کو پسند نہیں کیا بلکہ انہوں نے بارہویں صدی کے مورخین خانی خان اور شاہنواز خان کے طرز تحریر اور اسلوب بیان کو اپنایا۔ اگر آزاد نے نثر مرجع و مسجع کو اپنایا ہوتا تو تذکرہ ماٰثر الکرام اس قبولیت سے محروم رہتا جو بارہویں صدی سے چودہویں صدی تک اس کو حاصل رہا۔ حقیقت نگاری کیلئے سچ تو یہ ہے کہ ایسا اسلوب بیان کبھی بھی قبولیت کی سند نہ پا سکا۔ تاریخ وصاف اور تاریخ جہاں کشائے جوینی کو مدتوں سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ آزاد اس رمز سے بخوبی آشنا تھے ورنہ وہ اپنی تبحر علمی کے باعث انشاپردازی کے بہترین نمونے پیش کر سکتے تھے انہوں نے جو کچھ کہا وہ وقت کی عمومی زبان میں کہا اور یہی ان کی کامیابی اور قبولیت کا سرمایہ ہے۔

ماٰثر الکرام پر آزاد کا جو مختصر سا مقدمہ ہے اس کی بعض توضیحات پر ردّ و قدح کی گئی ہے۔ اور ان کو غلط ثابت کیا گیا ہے اس پر یہاں کچھ لکھنا مقدمہ کے اختصار کے پیش نظر دشوار ہے البتہ ان کا یہ مقدمہ اور "سروِ آزاد" کا مقدمہ جو شعر کے جواز میں علامہ آزاد نے لکھا ہے وہ بہت ہی جامع ہے اور دلچسپ بھی۔ اسی طرح ماٰثر الکرام میں آزاد نے جو بعض عربی قصائد ایراد کیے ہیں آج ہم کو وہ ۔ ۔ ۔ ۔ عسیر الفہم نظر آتے ہیں لیکن آزاد کے علمی دور میں وہ عسیر الفہم نہ تھے اور آزاد نے بیساختگی کے ساتھ ان کو پیش فرما دیا ہے اور حاشیہ میں بعض مشکل مقامات کی خود ہی توضیح بھی کردی ہے۔

بظاہر ماٰثر الکرام، اسماء الرجال یا طبقات پر ایک اوسط درجہ کی کتاب ہے جو علماء و فضلاء اور فقراء و صلحاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے لیکن بارہویں صدی کی اسلامی تہذیب و تمدن اور علم و فن پر ایک وقیع دستاویز ہے۔ علماء و فضلاء بلگرام کے ضمن میں اسلامی علوم و فنون کی ایک نشین اور وقیع مستند تاریخ، تاریخ نگاروں کے سامنے آجاتی ہے اور ان حضرات کے سلسلہ سے سارے ہند اور بیرون ہند کی سرگرمیوں، ان کی تصانیف اور تالیف سے بصیرت اندوزی اور آگہی کے مواقع ملتے ہیں۔

ان علمائے کرام نے جن ارباب فضل وکمال سے استفادہ کیا ان سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے، جن ارباب علم وفضل کے تذکروں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ آزاد نے مآثرالکرام کے ذریعہ ان عظیم شخصیتوں سے اخلاف کو روشناس کرایا۔ بقول مولانا شبلی مرحوم!

"آزاد سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کے علماء اور ارباب علم کے حالات قلم بند کیے اور آزاد نے اس اوّلیت پر خود جا بجا فخر کیا ہے اور بجا کیا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ مآثر الکرام ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ پر بارہویں صدی کی مستند دستاویز ہے جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے علامہ آزاد کے تذکرہ میں لکھا ہے اور میں قارئین کے سامنے ان سطور کو گذشتہ اوراق میں پیش کر چکا ہوں۔ یہاں ان کا اعادہ نہیں کروں گا۔

مآثرالکرام، بظاہر، بلگرام کے علماء وفضلاء اور صوفیہ کے طبقات الرجال پر ایک گرانقدر تصنیف ہے لیکن اس کے مطالعہ سے ہم بارہویں صدی کے ہندوستان کی ادبی، علمی اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے کماحقہٗ آگاہ ہو جاتے ہیں اور اس کی مدد سے اس وقت کے سماجی آگہی کا سررشتہ ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ آزاد نے مآثرالکرام میں مورخانہ احتیاط کو کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور معاصر تاریخی واقعات کے سلسلہ میں آزاد نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

مآثرالکرام کے سلسلہ میں ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن مقدمہ کی طوالت مزید نگارش سے مانع ہے۔ اسی طرح سوانح آزاد پر تفصیلاً کچھ لکھنے سے گریز کیا ہے کہ تعارف ترجمہ مآثرالکرام پر ہمارے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری ایم اے پی ایچ ڈی نے باوصف اختصار حضرت آزاد بلگرامی پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ان کی سوانح کے سلسلہ میں قاری کیلئے بہت کچھ مواد رکھتا ہے۔

والسلام

ناچیز

شمس بریلوی

ترجمہ مآثر الکرام

فہرست ترجمہ مآثر الکرام

"یا فتاح"

باسمہٖ سبحانہٗ

ترجمہ مآثر الکرام

حصہ اول

تذکرۃ الصوفیہ والمشائخ

اچھی عادتوں اور بہترین خصلتوں کی نرم و نازک ہوائیں دائمی سبزہ زار کی جانب رواں دواں ہوں اور صلوٰۃ وسلام کے شگوفے اس کے نام کے ساتھ تخت احمدی پر نزول فرمائیں۔ سلام اور تحیّہ کے قافلے ان کی شریف اور بزرگ اولاد کی قیام گاہوں کی جانب گامزن ہوں اور رضا اور خوشنودی کے سحاب ارباب رحمت اصحاب کے مکانوں پر سایہ گستر ہوں۔

ارباب بصیرت پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ دنیا کے پیدا کرنے والے نے (جس کی بڑی شان ہے اور جس کی دلیل بزرگ ہے) دنیا کی شکل و صورت کو نئے انداز اور بہترین ترتیب سے پیدا کیا ہے اور وہ تمام شکلیں جو کسی نہ کسی مکان کی محتاج ہیں انھیں مناسب مکانوں سے تعلق بخشتا ہے اور تمام اشیاء کی طبیعتوں کو ان کے مرکزِ اصلی کا والہ و شیفتہ بنایا ہے اور وطن کی محبت عالم علوی اور عالم سفلی کی جمیع مخلوقات کے دل میں ڈال دی ہے۔

آسمانوں کا (جنھیں چرخ و گردوں کہا جاتا ہے) جگہ بدلنا محال ہے اور ستارے جو مختلف پہلوؤں پر رات گزارتے ہیں کیا مجال کہ وہ اپنے دائرہ سے باہر نکل سکیں وہ آگ جو گرمی سے گھری ہوئی ہے جب راہِ نجات پاتی ہے تو اپنی پرواز کے لیے بلندی کی جانب مائل ہوتی ہے اور سانس جو غوطہ خور کی گرفت میں ہے جب دریا کی گہرائی میں باہر نکلتی ہے۔ تو شوق کی کمند ہوا کی بلندی پر ڈالتی ہے

وہ پانی جو چشمہ کے سوت سے بہتا ہے تیز رفتاری کے ساتھ نیچے کی جانب دوڑتا ہے اور وہ خاک جو ہوا میں اُڑتی ہے بالآخر اپنے مرکز کی طرف نیچے واپس آتی ہے۔

طائرِ قفس آشیانہ کی یاد میں بیتاب ہے اور ماہی صید شدہ خاکِ ساحل پر بغیر پانی کے مری پڑی ہے۔ انسان جو مختلف عالموں کا مجموعہ ہے اس کی محبت بھی تمام محبتوں کا مجموعہ ہے اور جن سے اس کی الفت ہے اور جو اس کے مالوفات ہیں وہ بھی سب سے زیادہ ہیں۔ یقیناً اس کی الفت وانسیت کے وجوہ بھی فراواں اور بکثرت ہیں۔

روایت ہے کہ جب حضرت ابان رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور سید کائنات

صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کی عزت حاصل کی۔

(متن حدیث کا ترجمہ)

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے ابان! تم نے مکہ کو کیسا چھوڑا؟" انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اس حال میں چھوڑا ہے کہ شاخیں اور پتے نکل آئے تھے (یعنی موسم بہار تھا) اور "ثمام" کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ اچھی طرح نشوونما پا چکی ہے۔ یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک سے آنسو بہنے لگے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ قال صلی اللہ علیہ وسلم لمکۃ ما اطیبک من بلدۃ واحبک الیّ ولولا ان قومی اخرجونی منک ما سکنت غیرک۔ مکہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: "کتنا اچھا شہر ہے تو" اور میں تجھے کتنا محبوب رکھتا ہوں۔ اگر تیری قوم نے مجھے نکالا نہ ہوتا تو میں تیرے علاوہ کہیں نہ رہتا۔ اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد حبا۔ اے اللہ! مدینہ کی محبت میرے اندر زیادہ کر جتنی محبت مجھے مکہ سے ہے یا اس سے بھی زیادہ کر دے۔

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اسی حالت میں جب بھی ہوش میں آتے یہ دو بیت بآواز بلند پڑھتے تھے۔ ؎

الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃ   بواد وحولی اذخر وجلیل

وھل اردن یوما میاہ مجنۃ   وھل یبدون لی شامۃ وطفیل

(جلیل (جیم کے زبر کے ساتھ) ایک خوش بو دار گھاس کا نام ہے اور مجنۃ (میم اور جیم کے اوپر زبر اور نون کے اوپر تشدید) مدینہ کے ایک گاؤں کا نام ہے اور شامہ اور طفیل مکہ کے دو پہاڑ ہیں اور لیت شعری کا جملہ کسی تمنا اور خواہش کے لیے استعمال ہوتا ہے) یعنی کیا میں کوئی ایسی رات وادی مکہ میں بسر کر سکوں گا کہ میرے چاروں طرف اذخر و جلیل اُگی ہوئی ہوں اور کیا مجنہ کے پانی تک کسی دن جا سکوں گا

ان دونوں بیت کا ماحصل مکہ مکرمہ (زادہا اللہ شرفا و تعظیما) یا وہاں کے مکانات یا وہاں کی نباتات کا اشتیاق و شوق ہے۔ اور اس سے مالوفات انسانی کا قدرے اظہار ہوتا ہے[1]۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ "صحرائے گمنامی" کے بسنے والے یعنی آزاد بلگرامی کو وطن کی محبت نے متوجہ کیا کہ بلگرام (اللہ اس کو حادثات زمانہ سے محفوظ رکھے) کے صاحبان کمالات کا ایک تذکرہ تحریر کروں اور اس انجمن کے چراغوں کا پرتو جو فقیری کے آئینہ میں چمک رہا ہے اس سے کاغذ کی وسیع اور کشادہ فضا کو جگمگاؤں۔ شاید کہ وطن جسمانی کا یہ تذکرہ رفتہ رفتہ روحانی وطن کے تذکرہ تک جا پہنچے اور مجھے اس تنگ نائے دنیا سے نکال کر لامکان کے وسعت کدہ تک لے جائے۔

---

[1] اور حدیث حب الوطن من الایمان، جیسا کہ سخاوی نے مقاصد ص۱۸۳ میں کہا ہے۔ سے ظاہر ہے۔

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب   ما کان حدیثا یفتری

اللہ ہی کی تعریف اور اس کا شکر و احسان ہے کہ میں نے انتہائی کوشش اور کامل جدوجہد سے تمنا کے اسپ بیزاد کو قلم کے افسوں سے مسخر کرلیا اور اس تصور کو جو میرے دل کے چاروں طرف مضطربانہ پھر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے تصویر اور تحریر کے قبضہ میں لے آیا۔ پرانے لوگوں کے زمانے کی دریافت کے لیے ایک عجیب خیال دل میں پیدا ہوا اور اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا اور صحیح رائے کی نشاندہی سے میں نے اس کو طے کرلیا۔ یعنی میں شہر کے ہر بڑے اور چھوٹے سے علما اور اسلاف کے مہرنامے جو دستبرد زمانہ سے بچ گئے تھے، وہ سب کے سب میں نے حاصل کرلیے۔ بعض علماء و مشائخ کی دستخطی تحریریں نظر آئیں اور اس گروہ کے عہد و زمانہ کا پتہ ان مہرناموں کی تاریخ کے ذریعہ معلوم ہوا چنانچہ برائے آگہی کتاب میں جگہ جگہ ان کو میں نے پیش کیا ہے اور ہر ایک عہد نامہ کو اذعان وطاعت کی مہر سے مزین کیا ہے۔ مجھ سے پہلے کسی نے بھی اس حد تک کوشش نہیں کی ہے۔ اور اسلاف اور ان کے اخلاف کے لیے خدمت کی کمر اس قدر کوشش سے کسی نے نہیں باندھی ہے۔ حقیقت کا پھول ورق کے دامن میں ڈالنے کے لیے میں نے سخت کاوش و کاہش کی ہے اور بہت سا سونا میں نے فکر کی کٹھالی میں گداختہ کیا ہے تب کہیں تفصیل کی یہ ہیکلی گلوئے قلم کی زینت بنا سکوں ہوں۔ دوستوں میں سے میرے علاوہ کون ہے جس نے وطن کی رسم اور نام کے زندہ کرنے میں اس قدر کوشش کی ہو اور ان تمام پرانے اور نو رسیدہ درختوں کو ایک ساتھ آب بقا سے پرورش کیا ہو امید رکھتا ہوں کہ بزرگوں کا حسن قبول نیاز مند کو "کان سعیکم مشکورا" کے خطاب سے نوازے گا اور عزیزوں کی حق شناسی مخلص خادم کو "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" کی خوش خبری سے مسرور کرے گی۔

حکم الٰہی سے جب مصور نے اس کتاب کی تصویر کے خیال کا نقشہ باندھا اور اندیشۂ دخیال کا صیاد مطالب کی غزالان رمیدہ کے لیے کمین گاہ میں بیٹھا تو یکایک حرمین شریفین (اللہ تعالیٰ ان کی بزرگی زیادہ کرے) کا سفر پیش آگیا اور مسافت کی جلدی میں کام میں مصروف ہاتھ کو تعطل کی حالت پیدا ہوئی (یعنی کام رک گیا) قاسم ازل (اللہ تعالیٰ) نے جس کی شان بڑی عزت والی ہے میری خاک مقامات مقدسہ میں پہنچا دی اور اس ہمیشہ رہنے والی دولت کے حاصل کرنے کے بعد ممالک دکن کی سیر پر مامور فرمایا۔ ان ہی ایام میں اس مسودہ کو میں نے وطن سے طلب کیا۔ اور درستگی کی میزان میں بقدر توانائی اس کا وزن کیا جن اشخاص کا ذکر اس کتاب میں ہونا چاہیے اور ان کے کارہائے پسندیدہ کے علَم بلند کرنا چاہیے ان کے پانچ گروہ ہیں۔ ۱۔ مشائخ ۔ ۲۔ فضلاء ۔ ۳۔ شعراء عربی ۔ ۴۔ شعراء فارسی ۔ ۵۔ اور شعراء ہندی ۔ پس یہ کتاب مشائخ اور فضلاء کے احوال واذکار کے لیے مخصوص ہے اور ان ہر دو معزز گروہوں کے عکوس کی آئینہ دار ہے باقی تینوں زبانوں کے شعراء کے لیے مسودہ کا رنگ علیحدہ پھیلاؤں گا (ان کے حالات علیحدہ تحریر کروں گا) بعض وجوہ سے دو فصلوں کو شعراء کی فصلوں کے ساتھ میں نے نہیں ملایا ہے۔ اس کتاب کا نام "مآثر الکرام تاریخ بلگرام" ہے اس عمدہ کتاب کے مضامین دو فصلوں میں بیان کیے گئے ہیں۔

فصل اول فقراء کے ذکر میں ہے (اللہ ان کے اسرار کو اور بزرگ کرے)۔

اور فصل ثانی فضلاء کے ذکر سے مخصوص ہے (اشدان کی خواب گاہوں کو منور فرمائے) شراب مروّت کے ساتھیوں اور دنیائے انصاف کے مستوں سے توقع ہے کہ اگر وہ کوئی پوشیدہ راز اس میکدہ کی سیر سے حاصل کریں گے۔ تو خاکسار کو دعا میں ضرور یاد کریں گے۔

وللارض من کاس الکرام نصیب
ملتا ہے کچھ زمین ...... کو بھی کاس اکرام سے

اور اگر کوئی لغزش نظر میں آئے تو مقتضائے بشریت جان کر معاف کردیں گے۔ ؎

"والعذر عند کرام الناس مقبول"

فصلِ اوّل

فقراء کے ذکر میں

(اللہ ان کے اسرار کو مقدس کرے)

ستاروں کی طرح روشن طبیعتوں پر ظاہر و باہر ہے کہ اولیائے امت کا وجود ہر ملک میں شہروں کی فتوحات اور شعائرِ اسلام کی جلوہ افروزی پر منتج ہے چنانچہ ہندوستان کی فتح **ولید بن عبد الملک**[۱] کے عہد میں **محمد بن قاسم** کے ہاتھوں ہوئی اور ۹۲ھ کے وسط سے ۹۵ھ کے آغاز تک اسلام کا علم ولایت سندھ کی حدود سے قنوج تک لہرا دیا اور ملک کے تمام باغیوں کو مطیع اور فرمانبردار بنایا۔ اس عہد سے پانچویں صدی ہجری تک خلفاء مروانیہ اور عباسیہ کے عاملین سندھ کے ساحل سمندر سے دریا پور کی حدود تک حکومت کرتے رہے اور ممالک مشرقی ہندی راجاؤں کے قبضہ میں رہے اور جب **سلطان محمود غازی**[۲] (اللہ اس کی برہان کو اور روشن فرمائے) غزنین کے تخت پر متمکن ہوئے تو چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں ہندوستان پر جہاد کو مطمحِ نظر بنایا اور کمر ہمت باندھی۔ متعدد مرتبہ فتح مند فوج کے ساتھ میدان کارزار گرم کیا[۳] اور بلند اقتدار راجاؤں کو مغلوب و ذلیل کیا۔ اور اس قدر مالِ غنیمت پر جو دنیا کے خیال میں بھی نہ سمائے قبضہ کیا پھر ملک سندھ کو ۴۱۶ھ میں **القادر باللہ بن المقتدر باللہ عباسی**[۴] کے حکام کے ہاتھ سے چھین لیا۔

---

۱ ولید بن عبد الملک۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ۸۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا اور اپنی خلافت کے زمانہ میں بہت سے ممالک تسخیر کیے ۹۶ھ میں وفات پائی۔ اس کی حکومت کی مدت ۹ سال اور ۹ ماہ ہے۔ اس کے عہد میں محمد بن قاسم (۹۲ھ ـ ۷۱۳م) نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ فتح کیا۔

۲ پسر سلطان ناصر الدین سبکتگین نے ۳۸۷ھ اپنے والد کی وفات کے بعد غزنین میں تخت سلطنت کو رونق بخشی اور چونتیس ۳۴ سال حکومت کے بعد ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

۳ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی بارہ مرتبہ ہندوستان آئے اور بڑی فتوحات کیں۔ اور بہت سا مال غنیمت لے گئے اور ۴۱۶ھ میں سومنات کی تسخیر کے قصد سے آئے جنگ کے بعد قلعہ کو فتح کیا بت خانہ کو جڑ سے کھود ڈالا اور سومنات کے بت کو غزنین لیجاکر جامع مسجد کے صدر دروازہ پر ڈال دیا اور اس جامع مسجد کے بارے میں کسی نے کہا ہوگا سے کج محراب، قبلہ راست

۴ القادر باللہ ابن اسحاق بن المقتدر باللہ عباسی۔ پچیسواں عباسی خلیفہ تھا الطائع باللہ بن مطیع اللہ کی معزولی کے بعد ۳۸۱ھ میں لوگوں نے اس کو مسند سلطنت پر بٹھایا اور ۴۲۲ھ میں اکتالیس سال اور تین ماہ کی خلافت کے بعد انتقال کیا۔

لیکن سلطان محمود نے ہندوستان میں قیام نہیں کیا البتہ ان کے جانشین غزنین سے لاہور تک حکمرانی کرتے رہے یہاں تک کہ غزنین کی حکومت و ملکی اقتدار سلاطین غوریہ نے حاصل کرلیا اور سلطان معزالدین سام مشہور بہ **سلطان شہاب الدین غوری**[1] نے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ کیا اور لاہور پہنچ کر غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک کو ۵۸۲ھ میں زیر کرلیا۔ اور ہندوستان کے اکثر ممالک پر بزور شمشیر قبضہ کرلیا ۵۸۹ھ میں دہلی کو دارالحکومت بنالیا۔ اس تاریخ سے اس وقت تک ہندوستان کے ممالک "فرمانروایان ملت اسلام" کے قبضہ میں رہے۔ اور ہند راجگان کے مطیع اور باجگزار رہے اور ظاہر ہے کہ اس دنیا میں ابتدائے اسلام سے لے کر کوئی زمانہ بھی اولیائے امت اور اصفیائے ملت سے خالی نہیں رہا۔ چنانچہ ساتویں صدی ہجری کی ابتداء سے اس گروہ کے احوال اب تک محفوظ ہیں۔ ان سے پہلے کے اکابر کے تذکرے اور ان کے نشانات بہت سی وجوہ کے باعث پردہ خفا میں پڑے ہوئے ہیں اور بحکم هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا۔ کا مصداق ہیں اور بہت کم ایسے حضرات ہیں جن کا احوال بیان کیا گیا ہے ایسے اصحاب میں سے چند حضرات یہ ہیں:۔

ابوحفص ربیع بن صبیح السعدی البصری[2] تبع تابعین سے ہیں اور جن کا شمار ثقات محدثین میں ہوتا ہے آپ بڑے صادق و عابد و مجاہد تھے اور اسلام میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی (پہلے مصنف ہیں)، **حضرت حسن بصری**[3] اور **عطاء**[4] سے سماعت حدیث کی۔ قدس سرہٗ۔

---

[1] غیاث الدین محمد غور و غزنین کے بادشاہ تھے ۵۶۹ھ میں غیاث الدین نے اپنے بھائی کو غزنین کی حکومت دے دی اور ۵۸۳ھ میں سلطنت ہند، ہندوستان پر حملہ آور ہو کر سبکتگین کے خاندان سے چھین لی۔ محمد غوری کی وفات کے بعد ان کے بھائی شہاب الدین غوری بادشاہِ غور و غزنین و ہند ہوئے اور ۶۰۲ھ میں وفات پائی۔

[2] بصرہ کے مصنفین میں آپ پہلے شخص شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے علم حدیث میں تصنیف کی۔ لیکن ان کی روایت حدیث میں ضعف ہے۔

[3] حسن البصری ابن ابوالحسن مولیٰ زید بن ثابت (متوفی ۱۱۰ھ) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رضیع تھے (دودھ پیا تھا) امام سیوطی نے ان کا سماع حدیث حضرت علیؓ سے ثابت کیا ہے اور ائمہ سلوک آپ کا الباس خرقہ بھی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ الباس خرقہ کو بے اصل قرار دیتے ہیں اور اس کی تردید کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جمہور صوفیہ خرقہ کے قائل ہیں مگر اس معاملہ میں اعتماد اقوال محدثین پر ہے۔ قول صوفیہ پر نہیں اور لبس خرقہ صورت معتبرہ میں بدعت ہے اس کے برعکس شیخ احمد قشاشی نے کتاب "العقد الفرید فی سلاسل اہل التوحید" میں صوفیہ کی حمایت کی ہے اور رسم خرقہ پوشی کو بہت سے طریقوں سے ثابت کیا ہے محمد یحییٰ الہ آبادی معروف بہ شاہ خوب اللہ نے بھی اپنے رسالہ میں جو شیخ عبدالکریم البصری کے لیے لکھا گیا، علامہ سیوطی سے نقل کرتے ہوئے صوفیہ کی حمایت کی ہے مگر عارف کے نزدیک یہ تمام وجوہ خطرناک ہیں۔ احسان عباسی نے ایک کتاب "حسن البصری" کے نام سے لکھی ہے حضرت مولانا شاہ فخرالدین دہلوی ۱۱۹۹ھ نے ان کے مناقب میں "فخرالحسن" کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے مولانا احسن الزماں حیدرآبادی نے اس پر شرح لکھی ہے "القول المستحسن فی شرح فخرالحسن" اس تالیف کا طویل مقدمہ ہے۔ [4] عطاء ابن ابی رباح۔ تابعی ہیں مجتہد مرتبہ کے فقیہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور سفیان[1] ثوری اور وکیع[2] اور ابن مہدی[3] ان سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ صاحب مغنی[4] کہتے ہیں کہ ارض سندھ میں سنہ ۱۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور صاحب کشف المحجوب علی بن عثمان الہجویری متوفی سنہ ۴۶۵ھ اور شیخ فخرالدین زنجانی[5] پیر ارشاد شیخ سعدالدین حموی کہ دونوں بزرگوار لاہور میں آرام فرما ہیں اور شاہ یوسف[6] گردیزی ۴۸۱ھ میں گردیز اور کابل سے ملتان آکر آباد ہو گئے تھے اور ان کے علاوہ دوسرے اولیاء اللہ میں سے سب سے پہلے جس نے ہندوستان میں سلسلہ ولایت کی ابتداء کی۔ اور طریقت و شریعت کے انوار پھیلائے۔ خواجہ معین الدین[7] چشتی اجمیری قدس سرہٗ ہیں اور کوئی شک نہیں کہ عطر آگیں سرشت رکھنے والے ان بزرگان چشت کا ملک ہند پر قدیم حق ہے سلطان محمود غزنوی نے بھی ان ہی حضرات چشتیہ کا وسیلہ اختیار کیا تھا اور ان ہی پاک عزائم حضرات سے مدد طلب کر کے ہندوستان

(بقیہ حاشیہ) مکہ کے مفتی اور محدث تھے ان کے سن وفات میں اختلاف ہے۔

[1] سفیان ثوری (۹۷ - ۱۶۱ھ) کوفی امام فقہ و اجتہاد۔ ان کی تالیفات میں کتاب جامع الکبیر و صغیر حدیث میں اور کتاب الفرائض مشہور ہیں۔ ابن جوزی نے ان کے مناقب میں ایک کتاب تصنیف کی ہے۔

[2] وکیع ابن الجراح سنہ ۱۲۹ھ - سنہ ۱۹۷ھ الرؤاسی (ان کی نسبت رؤاس کی طرف ہے) جو قیس عیلان کے مضافات میں سے ہے۔

[3] عبدالرحمٰن ابن مہدی ابن حسان اللولوی البصری (سنہ ۱۳۵ھ - ۱۹۸ھ) اکابر حفاظ حدیث میں تھے اس فن میں ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان کی نظیر ہم نہیں جانتے۔

[4] صاحب مغنی، محمد طاہر الفتنی الصدیقی (ساکن پٹنہ ہند) (سنہ ۹۱۰ھ - سنہ ۹۸۶ھ) الہندی۔ ان کی کتابوں میں مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار (چار جلدوں میں) تذکرہ موضوعات، المغنی فی اسماء الرجال حدیث۔ المغنی ایک مختصر رسالہ ہے اس میں اسماء الرجال کی تصحیح کی ہے حالات کے بیان میں بے لاگ تبصرہ ہے جو انتہائی مفید ہے۔

[5] سنہ ۶۰۶ھ لاہور میں انتقال کیا۔ لیکن ان کے شاگرد شیخ سعدالدین حموی جن کا نام محمد المؤید بن ابوبکر بن ابوالحسن بن محمد بن حمویہ تھے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ کے اصحاب میں تھے۔ شیخ حموی کی بہت سی تصنیفات ہیں جیسے کتاب محبوب الالواح اور اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں "سجنجان رصوف" "کلمات مشکل" ارقام و اشکال و دوائر کہ جن کے حل سے عقل و فکر کی نظر عاجز ہے۔ شیخ صدرالدین قونوی (سنہ ۶۳۶ھ) ان کی صحبت میں پہنچے ہیں۔ سنہ ۶۵۰ھ میں عیدالاضحیٰ کے روز وصال ہوا ان کی قبر بحر آباد میں ہے۔

[6] گردیز سے ملتان میں آکر آباد ہوئے۔ مخدوم شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی قدس سرہٗ کے ہم عصر تھے۔ (سنہ ۶۶۶ھ)۔

[7] خواجہ معین الدین اجمیری محمد حسن سجزی متوفی سنہ ۶۳۳ھ معروف بہ خواجہ چشتی شیخ عثمان ہارونی کے مرید ہیں اور بہت سے بزرگان وقت جیسے شیخ نجم الدین کبریٰؒ وغیرہم (۵۴۰ - ۶۱۸ھ) سے ملے ہیں اپنے پیر کے حکم سے ہندوستان آئے۔ خواجہ قطب الدین اوشی ان کے خلفاء میں سے ہیں۔

پر لشکر کشی کی۔ اور سومنات کی جنگ میں خواجہ محمد چشتیؒ[1] بذات خود سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور اس سرزمین کو اپنے مبارک قدموں سے عزتِ دوام بخشی اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب سلطان محمود غزنوی نے سومنات کی جنگ کا ارادہ کیا تو خواجہ کو عالمِ رویا میں بتایا گیا کہ سلطان کی مدد کے لیے ہندوستان کا سفر تم کو اختیار کرنا چاہیے۔ خواجہ ستر سال کی عمر میں ایک درویش کے ساتھ چند قدم راہ جہاد میں چلے اور میدان کارزار میں بہ نفسِ نفیس کافروں اور فاجروں کے ساتھ جنگ کی۔ اور صحرائے قتال وجدال میں پہونچ کر جب لڑے تو اس وقت غلبہ کی نشانیاں ظاہر فرمائیں۔

قریب تھا کہ لشکرِ اسلام کو کوئی نقصان پہونچے۔ حضرت خواجہ کے ایک مرید چشت میں "کاکو" نام کے آسیابان تھے۔ مغموم ہو کر خواجہ نے ان کو آواز دی کہ اے کاکو پہونچ! کاکو میدان کارزار میں فوراً پہنچ گئے لوگوں نے کاکو کو دیکھا کہ اضطراب کے عالم میں انتہائی شجاعت سے جنگ میں مصروف ہیں یہاں تک کہ فتح کی ٹھنڈی ہوائیں دین متین کے پرچم پر چلنے لگیں اور باطل پرستوں کو شکست اٹھانا پڑی۔ (یعنی مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کافروں کو شکست) اسی روز کاکو کو لوگوں نے چشت میں دیکھا تھا کہ چکی کے دونوں پاٹوں کو دیوانہ وار در و دیوار پر مار رہے ہیں جب لوگوں نے "کاکو" سے پوچھا تو انھوں نے یہ ماجرا بیان کیا (کہ میں کافروں سے لڑ رہا تھا) اسی طرح سلطان شہاب الدین غوری کو راجہ پتھورا والی دہلی پر فتح بھی خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کی ذات بابرکت سے حاصل ہوئی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت خواجہ غزنین سے آکر اجمیر میں تشریف فرما ہوئے اور پھر اس جگہ ٹھہر گئے۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کو راجہ پتھورا سے کوئی تکلیف پہونچی۔ حضرت خواجہ نے اپنی سفارش اس تک پہنچائی۔ بدبخت پتھورا نے قبول کی توفیق نہ پائی (سفارش قبول نہیں کی) اور کہا کہ یہ شخص یہاں ٹھہرا ہوا ہے اور غیب کی بہت سی باتیں بیان کرتا ہے یہ سن کر حضرت خواجہؒ کو غصہ آگیا۔ اور زبان مبارک سے فرمایا پتھورا کو ہم نے زندہ گرفتار کر کے اس کو دے دیا۔ اسی درمیان سلطان شہاب الدین غوری غزنین سے اجمیر پہنچ گئے۔ پتھورا غرور سے بھرا ہوا ان کے مقابل صف آرا ہوا۔ زبردست نیزہ زنی اور سخت جنگ برپا ہوئی سلطان نے فتح پائی اور پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے قتل تک پہنچایا (قتل کیا) اس وقت سے اس ملک ہند میں اسلام کی بنیاد مضبوط ہونا شروع ہوئی۔ اور کفر کی بنیاد روز بروز گرتی چلی گئی۔ لہذا حضرت خواجہ قدس سرہٗ کو ساتویں صدی کا "مجدد" کہتے ہیں۔ سب سے پہلے جن اکابر طریقت نے اپنی تشریف آوری سے بلگرام کو بزرگی کے شایان بنایا۔ وہ حضرت خواجہ عماد الدین اور سید محمد صغرٰی (قدس سرہم) تھے۔ اور یہ دونوں حضرات حضرت خواجہ قطب الدین دہلوی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدست اسرارہم کے مریدین میں سے تھے۔

اب میں عنانِ سخن دوسری طرف پھیرتا ہوں اور ورقِ بیان کے عارض پر زلفِ مقصود کو پریشان کرتا ہوں۔ (اصل مقصود کی طرف آتا ہوں) میر عبدالجلیل بلگرامی قدس سرہٗ "مثنوی امواج الخیال" میں فقرامِ دارالاسلام

[1] خواجہ محمد چشتی بن ابو احمد چشتی (۴۲۵ھ) اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے اپنے والد کے فرمان کے بموجب آپ زہد و ورع میں کامل تھے۔

بلگرام کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

از فرقۂ طالبان مولے　　رنگینیٔ بزم وصف اولے

مولا کی طلب کرنے والے گروہ کا بیان　　کرتا ہوں اور سب سے پہلے رنگینیٔ بزم کا ذکر کرتا ہوں

وحدت نگہبان کثرت آثار　　از بادۂ نفیٔ غیر سرشار

یہ حضرات کثرت کے نشان رکھنے والے وحدت نگاہ ہیں　　یہ حضرات نفیٔ غیر کی شراب سے بہکے ہوئے ہیں

اطوار وجود دیدہ یک رنگ　　حیرت بہ نگاہ کردہ ہم سنگ

انہوں نے وجود کے اطوار میں صرف ایک ہی رنگ دیکھا ہے　　ان کی نگاہیں حیرت سے ہم سنگ اور ہم پلہ ہیں۔

میناشکنان بزم ہستی　　مدہوش شراب حق پرستی

ان حضرات نے بزم ہستی کی مینا کو توڑ ڈالا ہے　　اور حق پرستی کی شراب پی کر مدہوش ہو گئے ہیں

دل کردہ زبہر یار خود فرش　　الرحمٰن استویٰ علے العرش

اپنا دل دوست کے لیے فرش راہ بنایا ہے　　کیونکہ رحمٰن نے عرش پر استویٰ فرمایا ہے

طے ساختہ وادیٔ شریعت　　جا کردہ بمنزل حقیقت

ان حضرات نے وادی شریعت کو طے کر لیا ہے　　تب کہیں منزل حقیقت پر ان کو جگہ ملی ہے

وا کردہ نظر بہ حسن جا وید　　از دیدہ سرمہ سائے توحید

اپنی نظریں حسن جاوید کے نظارہ کے لیے کھولی ہیں　　جن میں توحید کا سرمہ لگا ہوا تھا

سرگرم طواف کعبۂ دل　　قربانی نفس کردہ بسمل

یہ حضرات کعبہ دل کے طواف میں مصروف ہیں　　اور نفس کو ذبح کر کے بسمل بنا دیا ہے

تا یافتہ گنج کنت کنزاً　　دادہ دل ودین زکوٰۃ از کمل

تب کہیں ان کو "کنت کنزاً" کا خزانہ ملا ہے　　اور اسکی زکوٰۃ دل ودین دیکر ادا کی ہے اور مال کو پاک کیا ہے

١

خواجہ عماد الدین بلگرامی قدس سرہٗ

آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس سرہ کے مریدین میں سے ہیں۔ بلگرام کے قدیم ولی اللہ اور صاحبِ ولایت تھے۔ آپ امام عالیشان، صاحب مقامات عالیہ اور احوال سنیّہ کے مالک تھے۔ تمام عمر عالم تنزیہہ کی خاطر اپنے دامن کو پاکی اظہار کے رنگ سے بچائے رکھا۔ اور خود کو "اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم غیری" (میرے اولیاء میری قبا کے اندر ہیں میرے علاوہ ان کو دوسرا نہیں پہچانتا) اسکی نقاب میں پوشیدہ رکھا۔ یعنی اپنی ولایت وکرامت کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ سید شریف ابن سید عمر الحسینی الواسطی البلگرامی کتاب "مرآۃ المبتلین" میں لکھتے ہیں:۔

"خواجہ عماد الدین بلگرامی قطب وقت اور صاحبِ ولایت تھے انہوں نے کسی کو مرید وخلیفہ نہیں بنایا۔ وہ خود کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ متقدمین میں سے ہیں۔ بلگرام اور قنوج کے درمیان دریائے گنگا بہتا ہے آپ زمانہ طالبعلمی کالب اس پہنچ کر صبح کے وقت کہ کسی کو خبر نہیں ہونے پاتی۔ سطح آب گنگا پر چل کر قنوج پہنچ جاتے اور سبق پڑھ کر شام کو واپس آجاتے تھے اور کسی شخص کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔ وصال کے وقت وصیت فرمائی کہ فلاں ٹیلہ پر جہاں دیو اور پری رہتے ہیں ہم کو دفن کرنا تاکہ دیوؤں اور پریوں کا آسیب شہر بلگرام سے نکل جائے۔"

حضرت خضر علیہ السلام سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ بس زندگی کے آخر دنوں میں ان سے ایک کرامت کا اظہار ہو ہی گیا جس نے ان کو ظاہر کر دیا جب سلطان شمس الدین التمش (متوفی ٦٣٣ھ) نے حقیقت پر اطلاع پائی تو آپ کا اور بھی مطیع اور معتقد ہو گیا اس کے بعد حضرت خواجہ نے کچھ عرصہ بعد ہی ٢ شوال ٦٣٣ھ میں عالم جہانی سے عالم روحانی کی طرف رحلت فرمائی (وصال ہو گیا) آپ کا مزار شریف ہر چھوٹے بڑے کی زیارت گاہ ہے

واضح رہے کہ بلگرام کا طول البلد ایک سو سولہ ١١٦ درجہ اور پندرہ دقیقہ ہے اور عرض بلد چھبیس ٢٦ درجہ اڑتیس دقیقہ قبلہ کی طرف اور پانچ دقیقہ مغرب سے شمال کی جانب مکہ کے درمیان کی مسافت (یعنی دوری) اور بلد پنتیس درجہ اور تین دقیقہ اور مکہ کے درمیان کی مسافت یہ فاصلہ فرسخ کے اعتبار سے سات سو ناسی فرسخ ہوتا ہے میر سید محمد تخلص

سلہ صاحب تنقیح الکلام نے تاریخ بلگرام میں لکھا ہے کہ "خواجہ عماد الدین، خواجہ ابو محمد چشتی" کے مرید و خلیفہ تھے۔ (شرائف عثمانی بحوالہ مرآۃ الاسرار، کشف المحجوب، روضۃ الصفا) خواجہ ابو محمد، سلطان محمود غزنوی کے معرکہ سومنات میں مصاحب تھے۔ بقول الٰہی سے قاضی محمد یوسف تکی کا زروفی سے بلگرام کو فتح کیا اس لیے میر غلام علی کا بیان قیاس سے بعید ہے لہٰذا احوال وقرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ عماد الدین کی وفات پانچویں صدی ہجری میں ہوئی ہے تو پھر ان کی وفات ٦٣٣ھ قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

یہ شاعر، خلف الصدق علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرام کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

سیر باید کرد یاراں نوبہار بلگرام — بر زمرد نازد ارد سبزہ زار بلگرام
ہر نفس عطر گلستان یمن بو می کنند — خوش دماغاں از نسیم مشک بار بلگرام
عطف از فردوس میساز د جنان دیدہ را — چشم بینائے کہ میگردد دوچار بلگرام
اہل معنی کسب انوار سعادت میکنند — از سواد اعظم دولت مدار بلگرام
شش جہت تنگ است برجولان رخش ہمتش — بر فراز عرش نازد شہسوار بلگرام
خواجۂ کامل عماد الدین قطب الاولیاء — حلقۂ باب حریم او حصار بلگرام
از ورود موکب ایں خسرو عالی جناب — سرمۂ چشم ملک باشد غبار بلگرام
آستان اشرف او بوسہ گاہ آسمان — بارگاہ اقدس او افتخار بلگرام
یاد ہندوستان کجا از خاطر طوطیؔ رود — میکند شاعر بجا وصف دیار بلگرام

اس کے خاتمہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور عربی شاعر ابراہیم غزی[1] کا یہ موتیوں والا شعر بھی تحریر کر دیا جائے ؎

سقی ثراک عماد الدین ضحیً — صوب الغمام ملث القطر منہمر

(۲)

سیّد محمد صغریٰ بلگرامی قدس سرہٗ

بلگرام کے تمام سادات حسینی واسطی کے جد اعلیٰ ہیں، نسب نامہ اس طرح ہے۔

سید محمد صغریٰ بن سید علی بن سید حسین بن سید ابو الفرح ثانی بن سید ابو الطراس بن سید ابو الفرح واسطی قدس سرہٗ بن سید داؤد بن سید حسین بن سید یحییٰ بن سید زید بن سید علی بن سید بن سید حسن بن سید علی العراقی بن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن سید علیسٰی موتم الاشبال بن زید شہید بن الامام زین العابدین بن الامام حسین شہید (السبط) بن الامام الہمام اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب حضرت فاطمۃ الزہرا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوہر گرامی) سید محمد صغریٰ حضرت خواجہ قطب الدین[2] کاکی اوشی کے مرید تھے آپ ظاہری اور باطنی فضیلتوں کے مرکز آپ "اعلائے کلمۂ دین" احیائے سنت اور بدعت کے مٹانے میں بہت ہی

---

[1] ابراہیم بن عثمان بن محمد الکلبی الاشبہی الغزی۔ ابو اسحاق (۴۴۱ - ۵۲۴ھ) فلسطین کے شہر غزہ کے بزرگ شاعر تھے جن کا ایک دیوان بھی موجود ہے (ابن خلکان وابن الوردی وغیرہ)۔

[2] متوفی ۶۳۳ھ، ابن خواجہ کمال الدین موسیٰ (مفتاح التواریخ، اخبار الاخیار)

ثابت قدم تھے۔ اور سلطان شمس الدین[۱] التمش کے مصاحبین میں شامل تھے۔ اپنی باکمال حالت کو فقری کے لبادہ میں خلوق کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ حکم الٰہی کے تحت سنہ ۶۱۴ھ میں غازیان اسلام کی فوج کے ساتھ بلگرام تشریف لائے۔ اور وہاں کے راجہ "سری" نامی پر حملہ آور ہوئے۔ "سری" ایک کافر اور سخت متعصب راجہ تھا۔ خزانہ کی فراوانی، حامیوں کی کثرت اور فوج کی زیادتی نے اس کو انتہائی مغرور بنا دیا تھا۔ اس جنگ میں اس کو اور اس کے تمام خاندان اور فوج کے سرداروں کو قتل کیا۔ اور ایک عرصہ تک آب شمشیر سے آلودگی شرک کو پاک وصاف کرتے رہے اور اس طرح بلگرام کو شعارِ اسلام کا پاکیزہ مقام بنا دیا۔ اس فتح کی تاریخ لفظ "خداداد" ہے۔ فتح کے بعد آپ فرشوری اور ترکمانی شیوخ کے ساتھ وہیں مقیم ہو گئے اور سلطان شمس الدین التمش سے "فرمان عشر" حاصل کیا۔ اس وقت سے سلطان ابراہیم ابن سلطان سکندر[۲] لودھی کے زمانہ تک محصول "یک دہ" پرگنہ بلگرام میں جاری وساری رہا۔ لیکن بابر بادشاہ کے زمانہ میں یہ قدیم طریقہ خلل پذیر ہو گیا۔ محمود شاہ بن محمد[۳] شاہ بن سلطان فیروز فرمانروائے دہلی کا فرمان بلگرام کے عشر کے متعلق راقم الحروف نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اسی فرمان سے میں یہ عبارت نقل کرتا ہوں کہ:۔

"جس طرح گذشتہ سلاطین کے عہد میں لوگوں نے غلہ کا عشر دیا ہے"

اور فرمان کے آخر میں اس طرح تاریخ درج ہے (ترجمہ) "۲۷ ربیع الآخر سنہ ۸۰۸ھ"

سید محمد صغرٰی کا لقب اصل میں "صاحب الدعوۃ الصغرٰی" ہے کثرت استعمال سے آخر جزو زبان زدِ عام ہو گیا۔ جیسے شیخ[۴] نجم الدین کبرٰی۔ نفحات الانس میں تحریر ہے کہ ان کا نام کبرٰی اس لیے ہوا کہ آغاز جوانی

---

[۱] شمس الدین التمش متوفی سنہ ۶۳۳ھ، دورِ حکومت ۲۶ سال۔

[۲] سلطان ابراہیم حسن لودھی سنہ ۹۱۵ھ کے آخر میں بمقام آگرہ تخت سلطنت پر بیٹھا یہاں تک کہ بابر بادشاہ نے، ۲ ماہ رجب ۹۳۲ھ میں اس کو قتل کیا اور خود ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ (مفتاح۔ بزم صوفیہ)

[۳] ناصر الدین سلطان محمود پسر محمد شاہ لودھی اس کا اصل نام "خواجہ جہاں" ہے۔ دس سال کی عمر میں بادشاہ دہلی ہوا۔ چنانچہ اس زمانہ کے کسی شاعر نے اس کی بادشاہی کے متعلق کہا ہے:۔ ؎

ملکے گرفت کودکے دہ سالہ ای عجب — محمود بن محمد۔ فیروز بن رجب

سنہ ۷۹۷ھ میں نصرت خاں سے شکست کھا کر گجرات کی جانب بھاگ گیا۔ اس کے بعد قنوج آکر اس ملک کو اپنے تصرف میں رکھا دوبارہ سنہ ۸۰۲ھ میں امراء نے تخت دہلی پر بٹھایا۔ یہاں تک کہ سنہ ۸۱۵ھ میں انتقال ہو گیا۔ (مفتاح التواریخ)

[۴] شیخ نجم الدین کبرٰی۔ ان کا نام احمد بن عمر الخیوقی اور کنیت ابوالجناب ہے یہ کنیت خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عطا ہوئی ہے اور اسی ایک اشلوچا انہوں نے دنیا سے علیحدگی اختیار کی سنہ ۶۱۸ھ میں چنگیز خان تاتاری کے فتنہ میں شہید ہوئے حضرت محی السنۃ کے شاگرد اور شیخ عمار بن یاسر کے مرید تھے حضرت مجد الدین بغدادی ان کے خلیفہ تھے انہوں نے بھی سنہ ۶۱۶ھ سے قبل شہادت پائی (مفتاح التواریخ، نفحات الانس نیز شذرات عماد حنبلی میں ان کا حال تفصیلاً درج ہے)۔

میں تحصیل علم میں مشغول تھے۔ جس سے بھی مناظرہ کرتے اس پر غالب آجاتے تھے۔ فلقبوہ بھذا السبب الطامة الکبرٰی ثم غلب علیہ ذالک اللقب فحذفوہ الطامہ فلقبوہ بالکبرٰی (پس اس وجہ سے ان کا لقب الطامۃ الکبرٰی پڑ گیا اور کثرت استعمال سے لقب سے لفظ "تامہ" حذف ہو کر صرف "کبرٰی" رہ گیا۔ سید محمد صغرٰی نے ۶۲۷ھ میں سلطان شمس الدین کے حکم سے بلگرام کے حاکم کیلئے ایک گڑھی (چھوٹا قلعہ) شہر کے وسط میں اونچی زمین پر تعمیر کی ایک عرصہ گذر جانے کے بعد حویلی کی عمارت گرنے لگی۔ اس کا سنگ تاریخ جو سلطان شمس الدین التمش کے نام کا ہے وہاں سے نکال کر دیوار مسجد سید میاں واقع محلہ سید واڑہ میں لوگوں نے نصب کر دیا۔ تختی کی عبارت یہ ہے "حامی البلاد راعی العباد ذی الامان لاھل الایمان وارث ملک سلیمان صاحب الخاتم فی ملل العالم ظل اللہ فی الخافقین ابو المظفر ایلتمش السلطان ناصر امیر المومنین ادام اللہ تمکینہ فی مشھور سنہ ۶۲۷ھ سبع وعشرین وستمائۃ"

سید محمد صغرٰی بلگرام کے فتح کرنے اور بلگرام میں قیام کے بعد اکتیس (۳۱) سال تک حیات رہے اور ۱۴ شعبان المعظم ۶۴۵ھ کو عالم قدس میں آرام فرما ہوئے۔

مزار مبارک بلگرام میں شہر کے شمالی جانب اس باغ میں ہے جس کا تعلق اب سید مبارک کلاں دستار کی اولاد سے ہے۔ قدیم زمانہ میں اس پر پتھر کی ایک لوح مزار تھی جس پر آیت الکرسی اور آنجناب کی تاریخ وفات کندہ تھی۔ امتداد زمانہ کے باعث پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ۱۱۵۱ھ کے آغاز میں سید محمد محسن ابن سید محمد سعید نے مزار مبارک کی مرمت کی توفیق پائی۔ اور قبر مطہر کو اینٹ اور گچ کے چبوترہ کے ساتھ تعمیر کرا دیا۔ سید محمد محسن، سید ضیاء اللہ کے پوتے ہیں جن کا ذکر فضلاء کے تذکرے میں آئے گا۔ اور سید احمد بن سید بڈھا کے نواسے ہیں جن کا تذکرہ اسی فصل میں سید مربی قدس سرہٗ کے حالات کے ضمن میں آئے گا۔ سید محمد محسن نواب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری ناظم صوبہ اودھ کے معتمد رفیقوں میں تھے۔ ۱۱۵۱ھ[1] میں جب نادر شاہ ایران سے دیار ہند میں پہنچا اور فرمانروائے ہندوستان سے جنگ[2] کا آغاز ہوا تو معرکہ قتال میں مردانہ وار سید محمد محسن شہادت سے بہرہ یاب ہوئے۔

---

[1] یعنی شاہ عالم بہادر ابن خلد مکان کے عہد میں۔ اور ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہی قتل سے پہلے زہر کھا کر مر گئے۔ اور شاہ جہان آباد (دھلی) میں مدفون ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات ایک سوز یادہ کرنے سے اس طرح معلوم ہوتی ہے "بے سعادت نمک حرام بمرد"۔

[2] ہندوستان کی فتح کے لیے نادر شاہ کا ہند میں ورود ۱۱۵۱ھ میں ہوا۔ اور کرنال کی لڑائی شاہ عالم بہادر شاہ کے ساتھ ۱۱۵۱ھ میں واقع ہوئی۔ اور اسی سال دہلی میں قتل عام ہوا۔ بالآخر ۱۱۵۲ھ میں نادر شاہ اپنے وطن کو لوٹا۔ اور ۱۱۶۰ھ میں قتل کر دیا گیا۔

۳

حافظ محمود قرآن خوان بلگرامی قدس سرہٗ

آپ بزرگان قدیم اور قافلہ سالاروں کے صراطِ مستقیم میں سے تھے۔ بلگرام کے شمالی حصہ موضع قتلغ پور میں آرام فرما ہیں۔ شیخ فیضی اور شیخ ابوالفضل کے خواہرزادے شیخ عبدالصمد کتاب "اخبار الاصفیاء" میں لکھتے ہیں۔ حافظ محمود قرآن خوان اپنے زمانہ کے ممتاز اور نمایاں لوگوں میں تھے۔ کہتے ہیں کہ اس دن سے جب کہ وہ دعا ئرین میں شامل ہوئے (وصال ہوا) ہر شب جمعہ کو خدا شناس اور باریک بین حضرات ان کے مزار منور سے قرآن پڑھنے کی آواز سنتے تھے۔ میں یہ بات ان راست گو حضرات کی زبان سے جنہوں نے خود اپنے سمعِ ہوش سے یہ قرأت سنی ہے سن کر لکھ رہا ہوں آپ کی آرام گاہ بلگرام میں[1] ہے" انتہیٰ"۔

۴

پیر عبد اللہ بلگرامی قدس سرہٗ

آپ بزرگان قدیم سے ہیں اور انوار قدم سے کسب فیض کرنے والوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا مزار شریف شہر کے جنوبی جانب میدان بیل کی طرف واقع ہے۔ ہر سال ۹ ماہ محرم کو شام کے وقت لوگ ان کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ اور خاک پاک سے فیوض اور برکتیں حاصل کرتے ہیں۔ ان کے سوانح کسی کتاب میں اس حقیر کی نگاہ سے نہیں گذرے۔ مجبوراً صرف نام نامی پر اکتفا کرنا پڑا۔ مصنفین قدیم نے بھی اسی طرح ایسے حضرات کا جن کے احوال معلوم نہ ہو سکے۔ ان کے صرف اسماء ہی لکھنے کو کافی سمجھا ہے۔ مثلاً عارف جامی قدس سرہ السامی نے نفحات الانس[2] میں

---

[1] ان کی شہادت راجہ سہری سے معرکہ میں سنہ ۴۲۴ھ کو ہوئی اور اس معرکہ میں حضرت سالار سیف الدین اور حضرت غازی کمال نے بھی جام شہادت نوش کیا ان کے مزار کا محل وقوع تنقیح الکلام صـ۵۶ پر دیکھنا چاہیے۔

[2] عارف جامی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب نفحات الانس پانچ سو بیاسی بزرگ صوفیاء عظام اور چونتیس عارفات کے حالات پر مشتمل ہے سوانح شروع کرنے سے قبل تمہید اور مقدمہ بہت تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ تفصیل میں اس گروہ کی اصطلاحات، عارف کے پہچاننے کا بیان، صوفی حقیقی، معجزات، کرامات اور ان کے خوارق عادات تحریر کرنے کے بعد مقدمہ شروع کرتے ہیں اور ابو ہاشم صوفی کے ذکر سے آغاز کیا ہے اور ختم کیا ہے خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی کے ذکر پر۔ اس کے بعد عارفات کا ذکر ہے اور کتاب نفحات پر حضرت جامی کے ایک عزیز شاگرد نے (موسوم بہ رضی الدین عبد الغفور لاری بسالہ ۹۱۲ھ، جو بزرگ شاگرد اور حضرت جامی کے بڑے خلفاء میں تھے) تفصیلی حاشیہ تحریر کیا ہے اس کو خاص طور پر حضرت جامی کے صاحبزادہ ضیاء الدین کے لیے تالیف کیا تھا۔ (بقیہ حاشیہ صـ پر)

خواجہ عارف دیوگری اور خواجہ محمود الخیری[۱] نغنوی جو سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے اکابر سے ہیں کا بالکل تذکرہ نہیں لکھا اور ان کے صرف اسمائے گرامی ہی تحریر کرنا کافی سمجھا ہے ؎

مرا از زلف او موئے پسند است — فضولی مے کنم بوئے پسند است

۵

غازی کمال بلگرامی[۲] قدس سرہ

صاحبان حال وکمال کے مجموعہ تھے ان کی اصل قصبۂ بانگرمؤ مضافات لکھنؤ ہے جو بلگرام سے ۸ کوس کے فاصلہ پر ہے صاحب مرأۃ المبتدین لکھتے ہیں کہ :-

---

(بقیہ حاشیہ صـ) تاکہ وہ کتاب کے مطالعہ کے وقت کتاب کی مشکلات سمجھ لیں اور یہ حاشیہ حضرت جامیؒ کے تفصیلی حالات پر ختم ہوتا ہے اس حاشیہ کا ایک نسخہ برطانیہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

مؤلف نے ۸۸۱ھ میں امیر نظام الدین علی شیر المتخلص بہ نوائی (۸۴۴ - ۹۰۶ھ) کی استدعا پر اس کے مکمل کرنے کی نیت سے آغاز کیا اور ۸۸۳ھ میں اسے مکمل کر دیا چنانچہ اس رباعی میں فرماتے ہیں :-

این نسخہ مقتبس زانفاس کرام — کز وے نفحات انس آید بمشام
از ہجرت خیر البشر و فخر انام — در ہشت صد و ہشتاد و سوم گشت تمام

مشہور یہ ہے کہ نفحات الانس کی ترتیب میں حضرت جامی کا ماخذ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات (۴۸۱ھ) کی "امالی بر طبقات الصوفیہ" تھی اور خود حضرت جامی نے بھی نفحات کے دیباچہ میں اس کی تصریح کی ہے لیکن لطائف اشرفی کے مطالعہ کے بعد (جو سید اشرف سمنانی کی تصنیف ہے اور جسے ان کے ایک مصاحب سید عبدالرزاق نے ترتیب دیا ہے) یہ امر واضح ہوا کہ دراصل نفحات جامی کا ماخذ یہ کتاب یعنی لطائف اشرفی ہے اور دلیل یہ ہے کہ یہ کتاب نفحات سے ایک سو سال پہلے کی ہے اور نفحات کی عبارتیں اور مضامین اکثر جگہ ایک جیسے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ھذا :- [۱] یہ امر متحقق ہے کہ خواجہ عارف دیوگری (۶۱۵ھ) خواجہ عبدالخالق غجدوانی (۵۷۵ھ) کے مرید و خلیفہ ہیں اور خواجہ بہاؤالحق والدین نقشبند کا سلسلۂ ارادت اس جماعت کے ذریعہ خواجہ عارف تک پہونچتا ہے اور خواجہ فغنوی (۷۱۵ھ) خواجہ عارف کے خلفاء میں سے ہیں (نفحات ۳۴۴) اور خواجہ عبدالخالق کے پیر صحبت و پیر خرقہ خواجہ یوسف ہمدانی (۴۴۰ - ۵۳۵ھ) تھے اور وہ تصوف میں شیخ ابوعلی فارمدی سے نسبت رکھتے ہیں اور شیخ ابوعبداللہ جوینی اور شیخ حسن سمنانی سے بھی صحبت حاصل کی ہے (نفحات ۳۳۹ - ۳۴۰) ۱۲

[۲] غازی کمال بن سید عزالدین المعروف بہ لال پیر۔ ان کا نسب امام زین العابدین تک پہونچتا ہے ان کے والد سید عزالدین قریہ ساؤس سے سلطان محمود غزنوی کیساتھ ہندوستان تشریف لائے اور سید الشہداء سید سالار مسعود غازی (۱۴ رجب ۴۲۴ھ) کے حکم سے گوپامئو کے نواح میں اپنے رفقاء کیساتھ شہادت پائی مقبرہ شریف قصبہ گوپامئو میں ہے (مرأۃ مسعودی) ان کے صاحبزادہ غازی کمال راجہ سری کے معرکہ میں (بقیہ حاشیہ صـ پر)

غازی کمال بانگرمؤی انتہائی صالح اور ظاہری اور باطنی اخلاق سے آراستہ تھے۔ طلب علم کی غرض سے غزنوں کو بانگرمؤ چھوڑ کر خود بلگرام میں آگئے۔ ایک دن بلگرام کے مسلمانوں پر کافروں نے حملہ کر دیا اور تمام مسلمان جنگ کے لیے نکل آئے۔ غازی کمال بھی ان میں شامل تھے۔ کسی کافر کے ہاتھ سے ایک تلوار کی ضرب ان کی گردن پر ایسی پڑی کہ ان کا سر تن سے جدا ہو گیا ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر لے کر وہ شہر کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ کمزور لوگ جو لڑائی کا تماشہ دیکھنے کے لیے نکل آئے تھے ان میں سے ایک نے کہا تعجب ہے کہ یہ شخص سر کو ہاتھ میں پکڑ کر آرہا ہے آپ نے یہ سنتے ہی اسی جگہ نیزہ کو زمین میں گاڑ دیا اور خود گھوڑے سے اتر آئے اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی (وصال ہو گیا) ان کے نیزے کی لکڑی سے ایک ہرا درخت پیدا ہوا۔ ان کا مزار اسی جگہ ہے جو عیدگاہ کے عقب میں واقع ہے لوگ اسکی زیارت کرتے ہیں اور برکت حاصل کرتے ہیں۔

٦

قاضی عبد المنتخب بلگرامی قدس سرہٗ

شیوخ فرشوری کے خاندان سے ہیں بلگرام کے شرفاء میں سے ہیں اور وہاں کے بزرگوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کا نسب حضرت قاسم ابن محمد ابن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ سید محمد صغریٰ جدِ سادات واسطی اور شیوخ فرشوری کے جدِ اعلیٰ خراسان سے ہندوستان تشریف لائے اور بلگرام فتح ہونے کے بعد اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ شرعی عہدے، جیسے قضاۃ، عدالت اور تولیت وغیرہ قدیم زمانہ سے شیوخ فرشوری سے متعلق رہے ہیں اور زمینداری کے معاملات سادات سے متعلق رہے ہیں۔ صاحب مرآۃ المتبدین تحریر کرتے ہیں:۔

"قاضی عبد المنتخب مقتدائے وقت تھے اور شہر کے حاکم شرع بھی۔ ایک دن سبق پڑھا رہے تھے کہ شیخ ان کے مدرسہ میں آکر بیٹھ گئے اور ان کی جانب تیز تیز نگاہوں سے دیکھ کر فرمایا:۔

"سبحان اللہ! چراغ میں تیل بھی ہے اور بتی بھی مگر کوئی نہیں ہے جو بتی کو حرکت دے تاکہ روشنی تیز ہو جائے یہ بات جیسے ہی ان کے کان تک پہنچی اپنی کتابیں انہوں نے کنوئیں میں ڈال دیں، مسند قضاۃ کو چھوڑ کر شیخ قاسم کے پیچھے لگ گئے اور مرتبہ کمال تک پہنچے"۔ (انتہیٰ)

قاضی عبد المنتخب کا مزار شریف مشہور مقام "بالائے تل" پر ہے۔ ساتھ ہی ایک احاطہ اور ایک مسجد ہے جامع مسجد کے پیچھے آپ کے دوسرے اقرباء اور فرزندان گرامی کے مزارات اسی احاطہ میں واقع ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵

(۹ھ/م) شہید ہوئے۔ ان کا مزار بلگرام میں ہے۔ (تعلیم الکلام)

واضح رہے کہ قاضی عبدالمنتخب علیہ الرحمہ نے مسند قضاۃ کو چھوڑا تو قاضی یوسف عثمانی امور قضاۃ انجام دینے لگے اس وقت سے یہ منصب شیوخ عثمانیہ میں منتقل ہو گیا ۔ قاضی یوسف کی قبر درگاہ شریف پیر عبداللہ کے متصل ہے ۔

قاضی عبدالمنتخب کے پیر شیخ قاسم قدس سرہ اولیائے وقت سے تھے ۔ صاحب مرأۃ المبتدین کہتے ہیں کہ :۔

"شیخ قاسم قدس سرہٗ بزرگ شخص تھے ۔ اور عشق کی چاشنی ان کے اندر بدرجۂ کمال تھی ان کے ملفوظات بہت زیادہ لطیف اور بلند واقع ہوئے ہیں جو سالک کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے ان کا حجرہ قصبہ "باول" میں ہے جو بلگرام سے دس کوس کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ ایک دن شیخ قاسم اپنے حجرہ میں بیٹھے تھے ایک بڑا "بگولا" ظاہر ہوا ۔ خادم سے فرمایا جاؤ اور ہماری دعا پہنچاؤ اور کہو کہ ہمارا حصہ دے کر چلے جاؤ جب بگولے کا زیادہ حصہ چلا گیا تو دو رنگین پیالے ڈھکے ہوئے اس غبار سے ظاہر ہوئے ۔ شیخ کے سامنے لائے گئے شیخ نے جب ان کو کھولا تو اس میں سے بہترین میٹھا کھانا نکلا ۔ تمام دوستوں کے ساتھ انہوں نے کھایا ۔ چند دنوں بعد بگولا ادھر سے پھر گذرا اسی خادم نے مخدوم کے حکم کے بغیر جا کر کہا ہمارا حصہ دو ۔ اس طوفان سے وہ انتہائی تباہ حال اور زخمی ہو کر نکلا ۔ جب شیخ کے پاس پہونچا تو شیخ نے فرمایا اے بے وقوف ! اس روز خوش ہو کر جاتے تھے ، آج جنگ سے شکست کھا کر جاتے تھے ۔" (مرأۃ المبتدین)

۷

شیخ عبدالرحیم بلگرامی قدس سرہٗ

آپ قاضی عبدالمنتخب کے پوتے ہیں ، شیخ صفی الدین سائی پوری اور شیخ العبدیہ خیرآبادی قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے ہیں ، صاحب مرأۃ المبتدین بیان کرتے ہیں کہ :۔

"قاضی عبدالمنتخب کے وصال کے بعد ان کے تمام صاحبزادگان شیخ سعد اور شیخ صفی کے مرید و خلیفہ ہوتے جب شیخ عبدالرحیم کا زمانہ آیا تو شیخ صفی نے فرمایا میری خلافت ، پریشان ہے میں شیخ عبدالرحیم کو دیتا ہوں انہوں نے عرض کیا کہ میری والدہ زندہ ہیں میں ان سے اجازت تو لے لوں ، جب والدہ کے پاس پہنچے والدہ نے ان کو ڈانٹنا شروع کیا کہ ایسی دولت سے منہ پھیر کر واپس آگئے اس کی قدر نہیں جانتی جلدی جاؤ شاید پا جاؤ ۔ اس وقت تک پیر دنیا سے جا چکے تھے ۔ وقت وصال آہستہ سے فرمایا اگر عبدالرحیم آجائیں تو ان سے کہنا کہ تمہارا حصہ شیخ العبدیہ کے پاس ہے ۔ اسی وجہ سے شیخ عبدالرحیم شیخ العبدیہ کے پاس گئے اور اس جگہ تربیت حاصل کی ۔ پھر بزرگ اور مقتدائے وقت ہوئے ان کے بعد ان کے صاحبزادہ شیخ سعد اللہ اور ان کے بھتیجے شیخ بھیکن بھی مقتدائے

وقت ہوئے۔ کتاب کے مصنف نے ایک قبالۂ شرعیہ پر شیخ سعد اللہ کے دستخط خود دیکھے ہیں، جس کا تاریخ تحریر ۱۰۲۵ھ ہے۔

۸

سیّد اجمل بلگرامی قدس سرہٗ

خاندان پنج بہیہ کے سادات سے ہیں اور محلہ میدان پورہ کے رہنے والے ہیں ان کا نسب سید محمد صغریٰ تک اس طرح پہونچتا ہے۔ سید اجمل بن سید حسین ابن سید فضل اللہ بن سید علاؤ الدین بن سید ابراہیم بن سید ناصر بن سید... بن سید محمد صغراؔی قُدّس سرّہٗ۔

سید اجمل اپنے وقت کے بزرگ اور مرد کامل تھے عالم باعمل اور درویش کامل تھے ان کے کمالات پر سب کا اتفاق ہے اور زبان زدِ خاص و عام ہے۔ تحصیل علوم کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے سات مرتبہ مناسک حج ادا کیے اور مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام کیا اور وہیں شادی کی۔ وہیں ان کے اولاد بھی پیدا ہوئی اور اس وقت ان کی نسل مدینہ منورہ میں بھی موجود ہے اور بلگرام میں بھی۔ ان کا زمانہ ۹۷۵ھ بعض کاغذات سے معلوم ہوتا ہے۔

۹

سیّد محمود اکبر قدس سرہٗ

سادات بلگرام سے ہیں، محلہ میدان پورہ کے رہنے والے ہیں سید محمد صغریٰ کی اولاد میں ہیں ان کا نسب اسطرح ہے۔ سید محمود اکبر ولد سید خداداد عرف سید داون بن شاہ لطف اللہ بن سید سالار بن سید حسین بن سید نصیر بن سید حسین بن سید عمر بن سید محمد صغریٰ قدس سرہٗ۔

سید محمود بزرگان عصر کے مقتداء تھے۔ اور علم و عمل اور ظاہر و باطن کی صفائی میں اپنا ثانی اور نظیر نہیں رکھتے تھے، شروع جوانی میں علم حاصل کرنے کے ارادے سے وطن مالوف سے روانہ ہوئے اور دہلی کے بعض علماء کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر علوم و فنون حاصل کیے۔ تحصیل علم کی تکمیل کے بعد حجازِ مقدس کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں ارکان حج و عمرہ کی ادائیگی کے بعد مدینہ پاک (اس کے ساکن و مقیم پر درود و تحیۃ) کی زیارت کی سعادت حاصل کی چند دنوں بعد ہندوستان کی جانب مراجعت فرما ہوئے اور احمد آباد کے راستہ مندور پہنچے اور شیخ بہاؤ الدین بن ابراہیم القادری الشطاری[1]

---

[1] شیخ احمد الجیلی القادری شافعی کے مرید ہیں۔ متوفی سنہ ۹۲۱ھ تصوف میں رسالہ شطاریہ ان کی تصنیف ہے صاحب اخبار الاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اس رسالہ کا خلاصہ نقل کیا ہے۔

کی خدمت کا شرف پایا اور ان کے مرید ہوئے۔ کل تین دن شیخ کی خدمت میں مقیم رہے۔ انہی تین دنوں میں شیخ نے انہیں خلوت میں بٹھایا۔ تیسرے روز فرمایا تمہارا کام تمام ہوا"۔ اور خرقہ خلافت و اجازت سے ممتاز فرما کر وطن مالوف کی جانب رخصت فرما دیا۔

حضرت سید بلگرام تشریف لا کر درس و تدریس اور فیض رسانی میں مشغول ہو گئے۔ اپنے بعض معتقد امراء کے اصرار پر کچھ دنوں قنوج اور اس کے مضافات میں بھی مقیم رہے بالآخر بلگرام واپس آ کر یہاں مستقل طور پر مقیم ہو گئے عوام سے ملاقات بند کر دی۔ طویل عمر پائی۔ بعض پرانے کاغذات میں ان کے خط شریف سے گواہی مشاہدہ میں آئی ہے۔ کاغذ کی تاریخ تحریر ۹۲۵ھ ہے۔

وہ دستاویز قاضی محمد کافی بن قاضی عبدالرسول فرشوری کے یہاں موجود ہے۔ حضرت سید نے شب چہار شنبہ ۵، رجب المرجب ۹۳۲ھ کو وصال فرمایا۔ اسی سال دو دن کے فرق سے، رجب کو بابر بادشاہ نے سلطان ابراہیم لودھی[1] پر فتح پائی۔ کہا جاتا ہے کہ آموں کے موسم میں حاکم شہر نے اپنے آدمی حضرت سید کے باغ میں بھیجے۔ مالی نے بہت کچھ کہا کہ یہ باغ فلاں سید صاحب کا ہے۔ پہلے کے حکام اس جگہ رعایت و ادب کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ حاکم کے لوگوں نے اس کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیا اور شوخی و دست اندازی کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آسمان سے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی اور ترمیہم بحجارۃ من سجیل، کا مضمون از سر نو باعث عبرت بن گیا۔ باغ پر دست درازی کرنے والے ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے اور "کعصف ماکول" بن گئے۔ انتہائی خستہ حالت میں بھاگ کر حاکم کے پاس پہنچے اور اس کو اپنی سرگذشت سنائی۔ حاکم اس کرامت کے ظہور سے خلوص دل سے آپ کا معتقد ہو گیا، اور حاضری کا شرف حاصل کر کے بہت کچھ معذرت پیش کی۔ جب اس کرامت والے نے دعا کی۔ کہ اے اللہ! دنیا کی زندگی سے مزاج بھر گیا ہے۔ جلد مجھے دنیا والوں کے شور سے یکسو کر دے تو اللہ پاک نے ان کی دعا قبول فرمائی اور جلد ہی دنیا کے وحشت کدہ سے ان کو پاکی کے خلوت کدہ میں طلب فرما کر آرام عطا فرمایا (جلد ہی وصال ہو گیا) حضرت سید کا مزار شریف اسی باغ میں ہے جو محلہ سید واڑہ کے مشرق و شمال کے کونہ پر واقع ہے ان کا خط شریف اس وصیت نامہ میں جو اپنے بعض صاحبزادوں کے نام تحریر کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے وصیت نامہ یہ ہے جو آپ نے اپنے خط سے لکھا ہے۔

---

[1] سلطان ابراہیم پسر سکندر شاہ لودھی ۹۱۵ھ کے اواخر میں دار السلطنت آگرہ میں تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اور ہندوستان کے اکثر حصہ پر حکمرانی کی۔ یہاں تک کہ ظہیر الدین محمد بابر شاہ بادشاہ غازی نے (ولادت ۸۸۸ھ ہجری وفات ۹۳۷ھ ہجری) جو تیمور صاحب قران کی اولاد میں تھا۔ اپنی مملکت سے خروج کیا۔ اور ۹۳۲ھ میں پانی پت کے میدان میں اس کے ساتھ جنگ آرا ہو کر اس کو قتل کیا۔ اور ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ اس کے بعد ہندوستان کی سلطنت افغانوں کے ہاتھ سے نکل کر تیموری خاندان میں منتقل ہو گئی۔

وصیّت نامہ

یابنی علیك بتعمیر القلوب وتفیس الکروب فان اللّٰہ سبحانہٗ عند المنکسرۃ قلوبھم وعلیك بحفظ النسبۃ مع المحافظۃ علی الکتاب والسنۃ واعبد ربك کانك تراہ ولاتقصد فی الاولیٰ والآخرۃ الا ایاہ حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر ۔

اے فرزند! دلوں کا آباد کرنا اور غمزدوں کا چین پیدا کرنا تیرے اوپر لازم ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ٹوٹے دلوں کے قریب ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں پر وہ خاص عنایت کرتا ہے اور تیرے اوپر معنوی نسبت کا تحفظ ظاہری شریعت کی حفاظت کے ساتھ لازم ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت کر۔ اس طرح کہ گویا اس کی بارگاہ میں تو حاضر ہے اور اس کو تو اپنی ظاہری آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور دونوں جہان میں سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو نہ چاہنا۔ (ترجمہ آیت) "تمہارا رب ہمارے لیے کافی ہے بہترین وکالت کرنے والا اور بہترین مولا ہے اور وہی مدد کرنے والا ہے۔"

❁ ❁ ❁
❁ ❁
❁ ❁ ❁

اور آں جناب "علم اسماء و علم تکسیر" میں بے نظیر تھے کسی جاندار کو تکلیف نہیں پہونچاتے تھے یہ حضرات ابدال کا طریقہ ہے اس لیے کہ ابدال جاندار کو نہیں مارتے۔ یہاں تک کہ موذیوں کو بھی تکلیف نہیں پہونچاتے عارف جامی قدس سرہٗ نفحات الانس میں فرماتے ہیں کہ "امیر چہ" سفال فروش دوکان سے بچھو اٹھاتے اور قلعہ کے برجوں اور اس کی فصیل پر لے جا کر چھوڑ دیتے تھے۔ اور شیخ الاسلام[1] نے کہا کہ میرے والد کسی جاندار کو نہیں مارتے تھے یہ ابدال کا طریقہ تھا اور موصوف ابدال[2] میں سے تھے۔

ایک شخص کو دولتِ وقت ہاتھ آئی اس نے اپنے ہم زاد فرشتہ کو دیکھا اس سے دریافت کیا کہ وہ کیا طریقہ ہے جس سے کوئی شخص تم کو دیکھ سکے۔ اس نے کہا کسی جاندار کو تکلیف نہیں پہونچانا چاہیے۔ چنانچہ وہ صاحب دولت کسی جاندار کو تکلیف نہیں پہونچاتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن اس نے ایک چھوٹی چیونٹی کو مار ڈالا۔ کوئی چیز اس پر اور گرا چیونٹی مر گئی اس کے بعد سے اپنے فرشتہ کو اس نے پھر نہیں دیکھا (انتہیٰ کلمات نفحات الانس)۔

خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ملفوظات میں تحریر ہے کہ جو شخص دو گائے ذبح کرے گویا اس نے ایک خون کیا اور جو شخص چار گائے ذبح کرے تو اس نے دو خون کیے اور جو شخص دس بکریاں ذبح کرے تو گویا اس نے ایک خون کیا۔" انتہیٰ"

[1] شیخ الاسلام سے مراد خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہروی صاحب امالی طبقات الصوفیہ شیخ "سلمی" ہیں۔

[2] اسی طرح مطبوعہ ہے لیکن نفحات میں لفظ ابدال کے بعد لفظ اہل کرامات ہے۔

شیخ نصیر الدین[1] محمود قدس سرہٗ نے انکار کیا ہے کہ یہ ملفوظ خواجہ عثمان ہرونی ؒ کا نہیں ہے۔ لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ قول ابدال کے طریقہ پر صحیح ہو سکتا ہے۔

اور کتاب مشکوٰۃ شریف میں " الامارۃ والقضاۃ " کے باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ " من اتبع الصید غفل[2] " اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

" یعنی جو شخص بھی شکار کے درپے رہتا ہے اور شکار کرتا ہے بحصول کیف و مسرت اور لہو و لعب کے لیے وہ اطاعت اور جماعت کی ہمراہی سے ہمیشہ جنگل میں رہنے اور رقت و رافت کے مقام (آبادی اور لوگوں) سے دور پڑے رہنے کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے یہ تنبیہ ہے اس شخص کے لیے جس کی عادت ہی یہ ہو اور جو اسی میں مشغول رہتا ہو حلال روزی کی نیت کے بغیر۔ ورنہ ویسے تو بعض صحابہؓ نے بھی شکار کیا ہے جو بلا شک و شبہ جائز اور حلال ہے لیکن ایک شاعر نے کہا ہے ؎

بہ شرع گرچہ حلال است از مروت نیست　　　　ہلاک صید کہ او نیز چوں تو جانور است

(شریعت میں شکار کرنا حلال ہے لیکن کسی جانور کو مارنا کہ وہ بھی تمہاری طرح جاندار ہے مروت سے بہت بعید ہے)۔

اور روایت کی گئی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس خود شکار نہیں فرمایا ہے لیکن شکار کرنے سے منع بھی نہیں فرمایا (گویا شکار امر رخصت ہے)۔ (انتہی کلام الشیخ)

حدیث شریف میں آیا ہے " لا تتخذوا هذه المجازر فان لها ضراوة كضراوة الخمر " " مجزر " حیوانات کے ذبح کیے جانے کی جگہ (مذبح) کو کہتے ہیں۔ مجازر اس کی جمع ہے اور " ضراوہ " کے معنی عادت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مذبح حیوانات سے پرہیز کرو اس لیے کہ اس کی لت ایک ایسی عادت ہے۔ جو شراب کی عادت کی طرح ہے کہ دل کو پسند آنے کے بعد اس کا چھوڑنا مشکل ہوتا ہے " اس سے مراد یہ ہے کہ جانوروں کے ذبح کرنے کی کیفیت کا دیکھنا قلب میں قساوت پیدا کرتا ہے اور دل سے رحمت و رقت نکل جاتی ہے (کذا فی النہایہ لابن الاثیر)۔ مرزا ذوالفقار متخلص بہ موبد کی کتاب دبستان میں لکھا ہے کہ :۔

ایک شخص نے کسی جاندار کے تکلیف دینے سے پرہیز کیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ طالبان خدا کو اہل دل کہتے ہیں اور دل کو کعبۂ حقیقی کہتے ہیں تو جو کچھ مٹی اور پانی سے بنے ہوئے

---

[1] حضرت شیخ نصیر الدین محمود المعروف بہ چراغ دھلی، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قدس سرہٗ کے عظیم خلیفہ تھے اور اس قول کو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ نے بھی اخبار الاخیار میں خیر المجالس کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔

[2] احمد، ترمذی اور نسائی نے ان الفاظ کے اختلاف کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔ من سكن البادية جفا ومن اتبع الصيد غفل ومن اتى السلطان افتتن۔

کعبہ کے محرم پر حرام ہے کعبۂ حقیقی کے محرم پر بطریق اولیٰ ناجائز ہے۔ ؎

شنیدہ ام کہ بہ قصاب گوسفندے گفت
دراں زماں کہ سرش را بہ تیغ تیز برید
سزائے ہر خس و خارے کہ خوردہ ام انیست
کسیکہ پہلوئے چربم خورد ہمیں بجز ابد دید

۱۰

سید بُڈھ بلگرامی قدس سرہٗ

ان کا نسب دو واسطوں سے سید محمود اکبر مذکور قدس سرہٗ سے اس طریقہ پر مل جاتا ہے۔ سید بدھا ابن سید کمال الدین بن سید قاسم بن سید حسین بن سید نصیر الیٰ آخرہ۔ سید بدھ قدس سرہٗ اکابر دین اور ہادیان راہ یقین میں سے ہیں ہمیشہ اپنا قدم گوشہ نشینی میں رکھا۔ (گوشہ نشین رہے) اور بہت سے سالکان طریقت کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ ان کے صاحبزادہ سید ماہر، میر عبد الواحد اکبر کے دادا ہیں اور وہ اپنے والد کے ساتھ قصبہ باڑی چلے گئے ان کے دوسرے صاحبزادہ فتح محمد، سید نظام الدین بد صنایک کے دادا مشہور ہیں اور وہ بلگرام میں رہتے تھے۔ شیخ محمد متخلص بہ غوثی بن حسن المندوی[۱] متوفی ۱۰۲۲ھ مؤلف کتاب گلزار ابرار نے شیخ عبد الرحمٰن صوفی سرہندی کے تذکرہ میں سید بُڈھ کا نام ضمناً ذکر کیا ہے۔ اس جگہ گلزار ابرار کی عبارت بعینہٖ نقل کرتا ہوں۔

(ترجمہ) شیخ عبد الرحمٰن صوفی "ترین" قبیلے سے ہیں، عشق مشرب، ابتلا سرشت، سوختہ دل حسن پرست فراخ مشرب، دردمندوں کے طالب، بلند ہمت، پسندیدہ خصال، گوشہ نشین، مسافر نواز، نیاز آگیں، آرزو دشمن، قناعت پسند، سلطان کشف یعنی شیخ عبد الرحمٰن صوفی، سید بُڈھ سے ارادت رکھتے تھے۔ جب اپنے وطن مالوف سے دار السلطنت آگرہ تشریف لائے تو میرے مخدوم کی خانقاہ ضیاء اللہ پور میں غوث الاولیاء شیخ

---

[۱] غوثی گجراتی ان کی ولادت ۹۶۳ ہجری میں ہوئی ابتدائی کتابیں شیخ کمال الدین قریشی (۹۷۳ھ) سے پڑھیں اور علم نحو اور دوسرے علوم عربیہ حضرت برہان الدین کالپوی (۹۷۰ھ) سے حاصل کیے اصول فقہ سید محمد شاہ سے اور اکثر درسی کتابیں شیخ وجیہ الدین بن نصر اللہ گجراتی (۹۱۱ھ تا ۹۹۸ھ) سے پڑھیں، اور فنون ریاضیہ حکیم عثمان بن عیسیٰ سندھی سے حاصل کیے طریقہ شطاریہ شیخ صدر الدین محمد البروجی (۱۰۰۱ھ) اور محمود بن جلال گجراتی سے حاصل کیا۔

حضرت ابو الخیر بن مبارک ناگوری کی مرضی سے گلزار ابرار کی تصنیف شروع کی۔ اور ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۲۲ھ تک اس کتاب کی تصنیف میں مشغول رہے۔ (نزہۃ الخواطر)

محمد غوث[1] گوالیاری قدس سرہٗ کے ساتھ گوشہ نشین ہو گئے ۔ کچھ دنوں تک ان کی صحبت کی روشنی سے اپنے گلشن زندگانی کو پُر بہار بناتے رہے ۔ اچانک ایک حسینہ عائشہ نامی پر فریفتہ ہو گئے اور لطف یہ کہ وہ خود بھی فقیر اور فقیری پر والہ و شیدا ہو گئی ۔ آخر کار قاعدہ کے مطابق باہمی رضا مندی سے دونوں نے عقد کر لیا ۔ کئی سال تک دونوں ساتھ رہے ۔ سید احمد قادری جوان کے رازدان دوست تھے ۔ اس راز کا انکشاف کرتے ہیں کہ شیخ ان کے ساتھ مراقبہ شب میں صبح کر دیتے تھے ۔ اور " زین للناس حب الشہوات " سے مستثنٰی تھے ۔ (یعنی تعلقات زن و شوئی اختیار نہیں فرماتے تھے) اس لیے کہ ہمیشہ ان کی نگاہ دنیاوی رنگ آمیزی سے الگ رہی ۔ اور دل نے ہنگامۂ دہر کی کسی خصوصیت پر دھوکہ نہیں کھایا ۔ بلکہ کشادہ پیشانی کے ساتھ انتہائی خراب کھانے اور فرسودہ لباس سے بھوک مٹاتے اور تن پوشی فرماتے ۔ سنہ ۹۹۰ھ میں وصال ہوا اور وطن اصلی کو مراجعت کی ۔ (انتہٰی)

۱۱

سید محمد طاہر بلگرامی قدس سرہٗ

المعروف بہ سید طٰہٰ ابن سید قطب الدین بن سید ماہرو بن سید بڈھ (مذکور) قدس سرہٗ ، عالی نسب سید اور والا حسب تھے ۔ انتہائی پاک سرشت ایسے پاک جیسے مقدس موتی ۔ آپ کو شریعت کا پاس کامل تھا علوم ظاہر کے حصول کے بعد شیخ صفی الدین سائی پوری کے مرید ہوئے اور سلوک کے درجات طے کر کے ولایت کے بلند درجہ پر پہنچے ۔ سنہ ۹۵۵ھ میں وصال فرمایا ۔ اور اسی سال سید نوح ابن سید محمود اکبر نے بھی (جن کا ذکر شریف گزر چکا ہے) وصال فرمایا ۔ آیت کریمہ " فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاماً مُّبِین " سے آپ کا سالِ وفات نکلتا ہے اگرچہ یہ تاریخ وصال دونوں بزرگوں کی ہو سکتی ہے ۔ لیکن چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس لیے یہ سید نوح کے لیے لطف دوبالا کرتی ہے ۔ میر عبدالواحد کتاب " سنابل " کے پہلے سنبلہ میں تحریر کرتے ہیں ۔

بابر بادشاہ کے عہد میں چند مغل پیر دستگیر مخدوم شیخ صفی قدس سرہٗ کی ملاقات کے لیے آئے ۔ سیادت کی بحث میں

---

[1] شیخ محمد غوث گوالیاری ۔ ابوالموید محمد بن خطیر الدین بن عبداللطیف الملقب غوث گوالیاری (سنہ ۹۷۰ھ) ہندوستان کے مشائخ کے طبقہ متاخرین کے عظیم لوگوں میں شمار ہوتا ہے ۔ ان کا سلسلہ نسب پانچ واسطوں سے حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ سے ملتا ہے ان کے دادا مرحوم نیشاپور کے سادات عظام میں تھے ۔ سلسلہ ارادت کو حاجی حمید (حضرت شیخ حمیدالدین گوالیاری ۔ ۹۲۵ھ ۔ سنہ ۹۳۰ھ) کی خدمت میں درست کیا ۔ جو شاہ قاون (شیخ قاضی خان گجراتی سنہ ۹۲۰ھ) کے بڑے خلفاء میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ ان کی سوانح مختلف تذکروں میں موجود ہیں (خزینۃ الاصفیاء ۔ اخبار الاخیار ۔ گلزار ابرار ۔ نزہۃ الخواطر) ۔

گفتگو چل پڑی۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہندوستان میں کوئی سید نہیں ہے۔ مخدوم نے ہر طرح ان کو ثابت کرنا چاہا لیکن ان لوگوں نے کسی طرح تسلیم نہیں کیا اور کہتے رہے کہ ہمارے ملک میں بھی صحیح النسب، متقی، دیندار، پرہیز گار، عبادت گذار، سید موجود ہیں۔ اور بس۔ ان کے سید ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ان کا بال آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ نہیں جلے گا۔ مخدوم نے فرمایا کہ ہندوستان میں بھی ایسے ہی سادات ہیں۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ "شیخ" لاف زنی کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ "کسی کو بلانا چاہیے" حضرت مخدوم نے فقیر کے چچا کو جن کا نام طاہر تھا اور "سید طہٰ" کہے جاتے تھے طلب فرمایا۔ چونکہ ان کے وجود کا سراپا بھی ان کے نام کی طرح پاک تھا۔ لہٰذا ان کا ایک موئے خمیدہ کاٹ کر جلتی آگ میں کافی دیر تک پڑا رہنے دیا۔ لیکن ذرہ برابر بھی نہیں جلا۔ جب اسے آگ سے نکالا اسی طرح ٹھنڈا تھا اور گرمی کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ منکرین سادات نادم و شرمندہ ہوئے۔ کبھی مخدوم کے پیر پکڑتے تھے اور کبھی میرے چچا کے پیر پر گرتے تھے۔ اور حد درجہ معذرت کرتے تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

۱۲

میر عبد الواحد قدس سرہٗ

بن سید ابراہیم بن سید قطب الدین بن سید شاہ ماہرو بن سید شاہ بڈھ قدس سرہٗ۔ ولایت اور دائرۂ ہدایت کے مرکز تھے۔ ظاہر نشانیوں اور کھلی ہوئی کرامت والے بزرگ تھے۔ ان کے اجداد میں سید ماہرو حکومت کے تعلق سے بلگرام سے ترک اقامت کر کے قصبہ "سرہ" میں مقیم ہو گئے۔ "سرہ" چوبیس دیہات کے ساتھ بادشاہ وقت کی جانب سے ان کو انعام میں ملا تھا۔ کچھ مدت کے بعد یہاں کے زمیندار مخالفت پر آمادہ ہوئے اور ان سے جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں سید صاحب نے اپنی بعض اولاد و احفاد کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ مزار شریف قصبہ "سرہ" میں ہے۔ "ماہرو کھیڑہ" سرہ سے متصل مشہور جگہ ہے۔ اور سید صاحب کی بنائی ہوئی حویلی اس جگہ اب بھی موجود ہے۔ بقیہ اولاد دوسرے متعلقین کے ساتھ قصبہ سرہ سے گوگھاٹ آ کر مقیم ہو گئی۔ لیکن اس جگہ بھی زیادہ قیام نہ کر سکے مجبوراً اس جگہ سے نکل کر قصبہ سانڈی میں جو بلگرام سے چار میل کے فاصلہ پر ہے قیام کیا۔ سید ماہرو کی اولاد میں ایک نے تحصیل علم میں کمال حاصل کیا۔ اور فراغت کے بعد بادشاہ وقت سے قصبۂ باڑی کے عہدہ قضاء کی سند حاصل کی۔ سید ماہرو نے اپنے اخلاف میں تین لڑکے چھوڑے تھے۔ یہ فرزند اور تمام لواحقین ان کے قضاۃ کے عہدہ کی وجہ سے قصبہ باڑی میں مستقل مقیم ہو گئے۔ اور اکبر بادشاہ کے زمانہ میں قصبہ باڑی ان لوگوں کو انعام میں دے دیا گیا۔

میر عبد الواحد قدس سرہٗ تیسرے لڑکے کی اولاد میں سے ہیں۔ جو قصبہ سانڈی ہی میں رہے ان کی صاحبزادی کی شادی ہمارے جد اعلیٰ سید محمود اصغر کے ساتھ ہوئی اور وہ اس محبت کی بنا پر جو انہیں اپنے صاحبزادہ کے ساتھ تھی۔ فرماتے تھے۔ "فلاں شخص نے مجھ کو بلگرام میں جلا لیا ہے۔" آباء کرام کے وطن میں تشریف لا کر پہلے محلہ میدانپورہ میں

سید محمود کے مکان کے قریب مقیم ہوئے۔ کچھ دنوں بعد تالاب "سلہدہ" کے کنارے مستقلاً اقامت اختیار فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں بہت خیر و برکت عطا فرمائی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس اولاد سے ایک بڑا محلہ بن گیا۔ ابتداء میں مخدوم شیخ صفی الدین سائی پوری سے بیعت کی۔ مخدوم صاحب نے اپنی خاص توجہ سے نوازا۔ ابھی یہ صرف اٹھارہ سال ہی کے تھے کہ شیخ صفی الدین نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اس کے بعد شیخ حسین سکندرہ کی خدمت میں پہونچے تو انہوں نے بھرپور توجہ سے ان کی تربیت فرمائی۔ چنانچہ خود سنابل میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ فقیر مخدوم شیخ صفی کا مرید ہے۔ اور مخدوم شیخ حسینؒ کا خلیفہ۔ مخدوم شیخ حسین کو اس فقیر کے والد سے بڑی محبت تھی۔ اور دونوں کے درمیان انتہائی گہرا تعلق تھا۔ فقیر کے والد بھی مخدوم شیخ صفی کے خلیفہ تھے۔ اسی وجہ سے اس فقیر نے مخدوم شیخ حسین سے رجوع کیا۔ ان کی عنایتیں اور نوازشیں بھی میرے حال پر بہت تھیں فرماتے تھے کہ یہ ہمارے دوست کا فرزند ہے۔ انہوں نے خرقہ خلافت بھی پہنایا۔ اگرچہ اس فقیر میں ایسی لیاقت نہیں تھی لیکن باری تعالیٰ کی درگاہ میں شکرانہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی بیعت میں تو شامل ہوں۔

عہد من با لب شیریں دہناں بست خدا

ما ہمہ بندہ و ایں قوم خداوند انند

شیخ عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"شیخ عبدالواحد بلگرامی ریاضت و عبادات میں انتہائی فضیلتوں اور کمالات کے مالک ہیں۔ آپ صاحب اخلاق سنیہ اور خصائل پسندیدہ تھے۔ آپ بڑے بلند مشرب تھے۔ اس سے پہلے چند سال چہرہ کو مہندی لگا کر چھپائے رکھتے تھے۔ اور وجد و حال میں رہتے تھے۔ انہی دنوں تنہائی اختیار کرکے ایک شرح نزہۃ الارواح پر نہایت محققانہ طرز پر لکھی اور اسی طرح اصطلاحات صوفیہ میں بہت سے رسائل لکھے ہیں۔ آپ کی کتابوں میں سنابل نام کی ایک کتاب بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی بہترین تصانیف آپ کی ہیں۔ اگرچہ آپ کا سلسلہ ارادت اور سلسلہ سے ہے۔ لیکن شیخ حسین سکندرہ قدس سرہٗ کی صحبت سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر سال بلگرام سے شیخ کے عرس کے سلسلہ میں آتے ہیں اب چونکہ بصارت کمزور ہوگئی ہے لہٰذا وہاں جانا ترک کر دیا ہے آپ نے قنوج میں توطن اختیار کر لیا تھا۔ ۹۷۶ھ میں جب میں لکھنؤ سے بلگرام پہونچا ایک رات عیادت کی غرض سے آئے۔ یہ پہلی ملاقات تھی جس نے مرہم کا کام کیا فرمایا کہ یہ (امراض) تو عشق کے پھول ہیں۔ اور مخدومی شیخ عبداللہ بدایونی[1] بھی رجال الغیب کی طرح بدایوں سے اسی جگہ تشریف لے آئے تو مجھے یقین ہوا کہ اگر میں نے کبھی شب قدر پائی ہوگی۔ تو وہی شب رہی ہوگی۔ (جس میں ان حضرات سے ملاقات ہوئی) یہ شعر گوئی میں طبع بلند کے مالک تھے۔"

[1] شیخ عبداللہ بدایونی، شیخ عبدالباقی چشتی بدایونی کے مرید تھے۔ مشائخ وقت سے انہوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ (منتخب)۔

یہاں تک شیخ عبدالقادر صاحب منتخب التواریخ کی عبارت ہے اور انہوں نے میر عبدالواحد کو شیخ عبدالواحد مشیخت اور بزرگی کے اعتبار سے لکھا ہے جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ آخر میں وہ خود ہی لکھتے ہیں "میر طبع نظم بلند وارد"۔ شیخ کی یہ بات کہ وہ پہلی ملاقات تھی۔ اس پر دلالت کرتی ہے کہ میر عبدالواحد کے ساتھ ان کی ملاقات دوبارہ ہوئی ہے۔ اور شیخ عبدالقادر بدایونی ابتدائی ایام میں حسین خان کے رفیقوں میں سے تھے اور حسین خان دربارِ اکبری سے وابستہ تھے۔ لکھنؤ میں ان کی کچھ جاگیر تھی۔ اور شیخ عبدالقادر بدایونی لکھنؤ میں ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے میر عبدالواحد کے ساتھ اپنی ملاقات ۹۷۶ھ میں لکھی ہے۔ چنانچہ سنین کے ضمن میں سال مذکورہ کے واقعات میں لکھتے ہیں کہ اس سال پرگنہ لکھنؤ حسین خان کے قبضے سے نکل گیا۔ خان مذکور کسی خاص وجہ سے "اودھ کی مملکت" سے کوہِ سوالک (سوالکھیہ پہاڑ) میں آ گئے اور کفار کے ساتھ ان کو لڑنا پڑا ان کے اکثر رفقا زخمی اور شہید ہو گئے۔ اور فقیر اس سفر میں حسین خان سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایون آ گیا (خلاصۂ کلام بدایونی)۔

جو شخص بھی لکھنؤ سے بدایون کا قصد کرتا ہے بلگرام راستہ میں پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سفر میں بھی بلگرام میں میر عبدالواحد سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ ان کی یہ عبارت "کہ ایک رات عیادت کے لیے آئے" چاہتی ہے کہ کوئی بیمار ہو۔ نیز ان کی عبارت "مرہم کا کام کیا اور کہا کہ یہ سب عشق کے پھول ہیں" چاہتی ہے کہ کوئی زخمی ہو۔ لیکن حسین خان کے احوال میں ان کے کلام سے مترشح ہے۔ کہ حسین خان کے ساتھ وہ کوہستان نہیں گئے اور لکھنؤ سے حسین خان سے اجازت لے کر بدایوں واپس آ گئے اس صورت میں جنگ کوہستان کے زخمیوں سے نہیں ملے ہوں گے۔ بدایونی ۹۸۱ھ کے وقائع میں بیان کرتے ہیں کہ "فقیر" "کانت گولہ" سے حضرت بدیع الحق الدین شاہ مدار قدس سرہٗ کے مزار شریف کی زیارت کے سلسلہ میں مکن پور پہونچا۔ اور وہاں عشق کے جال میں پھنس گیا اللہ کی مرضی کہ معشوق کی قوم کے کچھ لوگ مجھ پر غالب آ گئے اور لگاتار تلوار کے نو زخم سر ہاتھ اور شانہ پر آئے۔ مال و متاع سب برباد ہو گیا۔ لیکن سر کا زخم ہڈی توڑ کر مغز تک پہنچ گیا تھا یہ بھی مغز ی رنگ لائی علاوہ ازیں بنصر (داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے بڑی) کی رگ بھی تھوڑی سی کٹ گئی تھی۔ جس کے باعث غشی طاری ہو گئی بخیریت گذری کہ ایک تجربہ کار جراح قصبہ بانگر مؤ سے آ گیا اور اس کے علاج سے ایک ہفتہ کے اندر تمام زخم مندمل ہو گئے۔ (ان کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا) پہلے کی عبارت یعنی مرہم کا کام کیا اور کہا کہ یہ سب عشق کے پھول ہیں۔ اس واقعہ سے مناسبت رکھتا ہے (اور اس کی طرف ان کا اشارہ ہے) مقام گفتگو کے مختلف ہونے کے باعث یہ مناسبت درست نہیں کہی جا سکتی۔ شیخ عبداللہ جو بدایوں سے آکر رات میں میر عبدالواحد کے شریک صحبت ہوئے ایک نسخہ میں بجائے شیخ عبداللہ کے شیخ عبدالقادر نظر آیا لیکن یہ کاتب کی غلطی ہے شیخ عبداللہ صحیح ہے۔

میر علاؤ الدولہ بن میر یحییٰ سیفی قزوینی **نفائس المآثر**[1] میں لکھتے ہیں کہ:

---

[1] نفائس المآثر میر علاؤ الدولہ متخلص بہ کامی کی تصنیف ہے جو قزوین کے معروف علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس خاندان کی شہرت ایران سے ہندوستان تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام میر یحییٰ بن عبداللطیف السیفی الحسینی قزوینی (م ۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء) ہے

میر عبدالواحد سادات قنوج کے اکابر سے ہیں اور فقر و درویشی کے عالم سے خالی نہیں ہیں اور شعر خوب کہتے ہیں شیخ محمد غوثی مشدوی نے کتاب گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ :۔

سید عبدالواحد بن سید ابراہیم قنوجی مجاہدہ اور مشاہدہ کے سلطان اور صحتِ حال اور فصیح زبان والے ہیں۔ انہوں نے نزہتہ[1] الارواح پر نہایت عمدہ شرح تحریر فرمائی ہے۔ توجیہ اور تاویل کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے اور تمام عبارتوں کے مقاصد کو حقیقت کی جانب موڑ دیا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت سید کا عقد قنوج میں ہوا۔ کچھ دنوں اس شہر میں مقیم رہے اسی بنا پر ان دونوں کتابوں میں ان کو قنوجی لکھا گیا ہے اور قنوج میں ان کا مقیم ہونا شیخ عبدالقادر بدایونی کے کلام سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ میر عبدالواحد کی تصانیف میں حقائق ہندی، شرح قصہ چہار برادر اور حل شبہات اور شرح مصطلحات دیوان خواجہ حافظ شیرازی ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف سلوک و عقائد میں کتاب "سنابل" ہے ایک مرتبہ مؤلف اوراق (مولانا آزاد بلگرامی) نے رمضان المبارک ۱۱۳۵ھ میں دارالخلافہ شاہجہان آباد میں شیخ شاہ کلیم اللہ[2] چشتی قدس سرہٗ کی زیارت کی۔ میر عبدالواحد کا تذکرہ درمیان میں آیا۔ شیخ دیر تک حضرت میرؒ کی تعریف اور ان کے حالات بیان کرتے رہے۔ اور فرمایا کہ ایک رات میں مدینہ منورہ میں سونے کے لیے لیٹا میں نے

(بقیہ حاشیہ صــــ) جو اپنے عہد کے بڑے مورخین میں سے تھے۔ ہمایوں بادشاہ (۹۳۶ تا ۹۶۲ھ) ان کی تاریخ دانی سے حیرت میں پڑ گیا تھا۔ مختلف رسائل کے علاوہ ایک تاریخ "لب التواریخ" کے نام سے ابوالفتح بہرام شاہ بن شاہ اسمٰعیل صفوی کے لیے انہوں نے تحریر کی تھی۔ ان کے صاحبزادہ علاؤالدولہ بچپن ہی سے شعر و شاعری اور خطاطی کے شوق سے تعلق رکھتے تھے۔ اس فن میں ایک رسالہ "صحیفۃ الارقام" کے نام سے تالیف کیا ہے۔ نفائس المآثر کی تالیف ۹۷۳ھ میں شروع کی۔ اس کی وجہ تالیف سلطان جلال الدین اکبر بادشاہ غازی کی فرمائش کو قرار دیا۔ چنانچہ اکبر کی تعریف میں یہ شعر بھی تحریر کیا ہے ؎

پیش رفت حکایت خوباں فسانہ ایست
معقود ذکر تست وگرہا بہانہ ایست

کتاب نفائس المآثر کی تقسیم عنوانات اور مطالب کے اعتبار سے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ مطلع، احوال شعراء، مطالب حصہ اول میں نثر پر شاعری کی قدامت اور شاعری کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں اور دوسرا حصہ شعراء (۲۹۶) کے تذکرہ پر مشتمل ہے مؤلف نے عہد اکبری کے ذکر میں ضمناً حضرت امیر خسرو کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

خوشانِ ہندوستان و رونق دیں
شریعت را کمال عز و تمکیں

اور اکبر کو کفر کا ذلیل اور گمراہی کا توڑنے والا قرار دیا ہے۔ نفائس المآثر کے نسخے رامپور اور برطانیہ وغیرہ کی لائبریریوں میں موجود ہیں لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نسخہ شاید سب سے زیادہ قدیم ہے جو ۲۷۴ اوراق پر مشتمل ہے اور جس کی کتابت ۱۰۰۵ھ کی ہے۔

حاشیہ صفحہ ھذا۔ [1] نزہتہ الارواح میر حسین حسینی غزنوی کی تصنیف علم تصوف میں ہے۔ اور اس کتاب پر بہت سے مشائخ نے شرحیں لکھی ہیں۔ جیسے شیخ تاج الدین ابن زکریا دہلوی جو عہد اکبری کے علماء میں سے ہیں اور شیخ امان اللہ پانی پتی کے شاگرد رشید ہیں (تذکرہ علمائے ہند) تذکرہ علمائے ہند میں بھی ذکر شرح بلگرامی موجود ہے شرح حسن محمد چشتی گجراتی (ثقافۃ الہند از سید عبدالحی حسنی) شیخ علی شیر احمد آبادی جو اپنے دور کے بڑے مشائخ میں تھے اور متعدد کتابوں پر انہوں نے شرحیں لکھی ہیں ان میں لوائح جامی بھی ہے۔ [2] سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ (بقیہ حاشیہ برصـ۱۲۴)

خواب میں دیکھا کہ میں اور سید صبغت اللہ بروچی ساتھ ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس اقدس میں حاضر ہوئے ہیں۔ صحابۂ کرام اور اولیائے عظام کی ایک جماعت موجود ہے انہی میں ایک ایسا شخص بھی ہے جس کے ساتھ سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا کر گفتگو فرما رہے ہیں اور سرکار پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہیں۔ جب مجلس ختم ہوئی تو میں نے سید صبغت اللہ سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کے ساتھ اس طرح متوجہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ میر عبدالواحد بلگرامی ہیں۔

ان کے مزید احترام کا سبب یہ بھی ہے کہ ان کی تصنیف "سنابل" سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مقبول ہوئی ہے حضرت میر "سنابل" میں کہتے ہیں کہ:۔

"ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال خدا کے راستہ میں صدقہ کر دیا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا" ماخلفت لعیالک "اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ تو انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، جبریل امین (علیہ السلام) فوراً آئے اور انہوں نے کہا، آپ ابوبکرؓ سے پوچھیے کہ کیا میں تنہا پسند نہیں تھا؟ کہ میرے نام کے ساتھ تم نے میرے رسول کا نام بھی لیا سبحان اللہ وبحمدہٖ! یہ کون سی منزل ہے اور یہ کیا مرتبہ اور قرابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ساتھ لینے پر غیرت فرمائی۔ عقل و فہم یہاں سب گم ہیں"۔

اس ضعیف کے حقیر خیال میں یہ بات پیدا ہوئی کہ سرزنش کی وجہ یہ ہے کہ اے ابوبکرؓ! تمہاری معرفت کا پایہ تو اتنا بلند ہے کہ تم میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے الگ نہیں سمجھتے اس لیے کہ وہ ہمارے اندر محو ہیں اور ہم ان کے اندر موجود۔ اس کے باوجود تم نے ان کا تذکرہ الگ کیوں کیا؟ کہتے ہیں کہ عرش سے فرش تک سب محبوب اللہ رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔ جب حق اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو پھر ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں؟ اور نیز یہ بات دل میں پیدا ہوئی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جواب اپنے اہل و عیال کے مقام کے مطابق دیا ہے اپنے مرتبہ کے مطابق نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ماخلفت لعیالک پوچھا تھا اور اگر ماخلفت لنفسک (تو نے اپنے لیے کیا چھوڑا؟) پوچھتے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جواب اپنی معرفت کے مطابق دیتے۔ یعنی اللّٰہ وحدہٗ (صرف اللہ کو چھوڑا) کہتے۔

اور نیز سنابل میں کہتے ہیں کہ:۔

مؤلف کے دوستوں میں ایک صاحب شیخ نظام نام کے تھے۔ ایک مغل کی لڑکی کو پڑھاتے تھے۔ لڑکی بے حد حسین تھی ایک جوان کی نگاہ اس کے حسن پر پڑی اور وہ فریفتہ ہو گیا اپنی نامرادی اور بے تابی کا حال شیخ نظام سے

(بقیہ حاشیہ صہ) ہی آپ کا مزار شریف جامع مسجد شاہجہانی دہلی کے سامنے "پریڈ گراؤنڈ" میں واقع ہے تقسیم ہند کے موقع پر ہندوؤں نے اس مزار مقدس کو منہدم کرنے کی کوشش کی تھی مگر بعض مسلمان ارباب سیاست نے وہاں کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو اور دیگر بڑے ہندو رہنماؤں کو موقع پر شرکت کرائی اور حکومت سے اس کی حفاظت کے انتظامات کرائے۔ اب عرس بھی خاصے پیمانہ پر ہوتا ہے سال وفات ۱۱۴۳ھ خزینۃ الاصفیاء میں ۱۱۴۱ھ درج ہے

اس نے کہا۔

شیخ نظام نے کہا: "تم ہر روز میرے ساتھ آیا کرو۔" میں اس کو پڑھاتا ہوں۔ تم اس جگہ بیٹھے اسے دیکھا کرو۔ اس بات کو ایک عرصہ گذر گیا۔ ایک دن اس دردمند جوان نے شیخ نظامؒ سے آہستہ سے کہا کہ اس لڑکی سے کہیے کہ ایک پیالہ پانی کا مجھے دے۔ شیخ نظام نے اس لڑکی سے کہا ایک پیالہ پانی پینے کا لاؤ۔ لڑکی پانی کا پیالہ بھرا ہوا لے آئی۔ انہوں نے فرمایا اس جوان کے ہاتھ میں دے دو۔ لڑکی پیالہ اس جوان کے پاس لے گئی۔ جوان نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور جان جانِ آفریں کے سپرد کردی (انتقال ہوگیا)۔"

ان کی بے مثل تصانیف میں ایک شرح کافیہ ابن حاجب ہے بطور حقائق کے جو مبحث غیر منصرف تک ہے اور اس جگہ ایک پارہ مختصراً اس نسخہ کی ابتداء سے تحریر کیا جاتا ہے۔ "الکلمۃ لفظ ای ملفوظہ علی التنادو ملحوظہ قلوبنا ومحفوظہ بہ بواطننا"۔ یعنی کلمہ توحید اقرار کے مرتبہ میں زبانوں پر ملفوظ ہے اور مرتبہ تصدیق میں ہمارے دلوں کو ملحوظ ہے اور ہمارے باطن کے احوال کے مرتبہ میں محفوظ ہے

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مرتبہ اقرار کا ذکر کافی سمجھا ہے اور بات کو لپیٹ کر اڑا دیا۔ اس حکم کے مطابق کہ اسلام پر حکم کرنا۔ اور تکلیفاتِ احکام جاری ہونے کا سبب ہے۔ اس بنا پر وہ مرتبہ اقرار سے مربوط و وابستہ ہے اور مفہوم کے پوشیدہ کرنے کا انداز مصنف کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں وضع لمعنی مفرد رکھا گیا ہے یعنی لازم کیا گیا ہے اس کلمہ توحید کا قبول کرنا گردنوں اور پیشانیوں پر تحصیل معنی کے سبب سے کہ کفر و نفاق اور گناہوں سے الگ ہونا لازمی ہے اس لیے مفرد لفظ کا استعمال حذف کا قرینہ بناتا ہے۔ اس لیے کہ افراد کے تین مراتب ہیں۔ ۱۔ کفر سے نکلنا ۲۔ نفاق سے نکلنا ۳۔ معاصی سے الگ ہونا۔ تو کفر سے نکلنا اقرار کے مرتبہ میں ہے اور نفاق سے نکلنا تصدیق کے مرتبہ میں ہے اور گناہوں سے الگ ہونا احوال کے مرتبہ میں ہے اس لیے کہ جو اپنے رب سے موحد ہو کر ملا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اس کو اسم کہتے ہیں اور کلمہ توحید تین طرح کا ہے ایک اسمؔ جیسے اقرار و تصدیق محض۔ اسم توحید اور اس کی صورت ہے دوسرےؔ فعل توحید و عمل اس کی شکل ہے اور وہ احوال کا معلوم کرنا ہے۔ تیسرےؔ حرف۔ توحید اس کی شکل ہے اور یہی توحید عظمیٰ ہے۔ جو انسانی استعداد سے بالاتر ہے۔ اور دونوں مذکورہ توحیدیں اثر اور کیفیت سے مبرا ہیں کہ علامتِ حرف کو اسم اور فعل کی علامتوں سے خالی رکھا گیا ہے (شرح کافیہ کا نثر پارہ ختم ہوا)۔

واضح رہے کہ دو دوسری شرحیں عربی اور فارسی عبارت میں غیر منصرف کی بحث تک بطور حقائق کے فقیر کی نظر سے گذری ہیں عربی شارح کا نام میر ابو البقاء ہے ظاہر ہے، حضرت میر کے معاصر ہیں۔ اور فارسی شارح کا نام ملا مومن بہاری ہے جو حضرت میر کے متاخرین میں سے ہیں اور جب حضرت میر کی بزرگی کا ذکر خیر اکبر بادشاہ نے سنا اپنے ایک معتمد کو حضرت میر کی خدمت میں بھیجا اور بڑی تمنا اور آرزو کے ساتھ ملاقات کی درخواست کی حضرت میرؒ نے لشکر شاہی کا قصد کیا۔ اور جب دربارِ سلطانی میں پہنچے تو بادشاہ نے انتہائی عزت و تکریم کے ساتھ استقبال کیا

اور بلگرام کی پانچ سو بیگھہ زمین مددِ معاش کے طور پر نذر کی۔ ایک رات حضرت میر کے گھر میں چور گھسا، نابینا ہوگیا، فریاد کرنے لگا تو حضرت میرؒ نے اس سے توبہ کرائی اور دعا کی اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت بصارت بحال کر دی اسی طرح کافر جنوں میں سے ایک جن نے حضرت میرؒ کے دستِ اقدس پر دولتِ اسلام حاصل کر کے بزرگی حاصل کی ہمیشہ حاضر رہتا تھا۔ اور خدمت بجالاتا تھا۔ حضرت میرؒ کی عمر شریف سو سال سے زیادہ ہوگئی تھی (آپ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی۔)

آپ کا وصال شبِ جمعہ ۳، رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ کو ہوا۔ ایک دوست نے تاریخ وفات کہی ؎

چو رفت واحد صوری و معنوی گفتم ہزار و ہفدہ و شبِ جمعہ ماہِ صوم سیوم

مصرعہ ثانی میں تاریخ صوری و معنوی ہے۔ لیکن جمل کے ..... طریقہ سے بیس عدد زیادہ کرنے ہوں گے اس کو "تعمیہ لطیف" سے خارج کر دیا ہے۔ یعنی واحد صوری جو انیس ہے اور واحد معنوی جو ایک ہے اس کا مجموعہ بیس عدد ہوا۔ آپ کا مزار شریف بلگرام میں زیارت گاہِ عوام و خواص ہے۔

حضرت میر عبدالواحدؒ کے چار صاحبزادگان ہوئے۔ اب میں اس سلسلہ میں پہلے شیخ صفی الدین سائی پوری شیخ حسین سکندرہ، شیخ عبدالقادر بدایونی، سید صبغت اللہ بروجی، شاہ کلیم اللہ چشتی دہلوی اور ملا محمد بہاری قدس سرہم کے حالات تحریر کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میر عبدالواحد کے تذکرہ کے ضمن میں ان بزرگوں کے نام مذکور ہوئے ہیں اس کے بعد حضرت میر کے صاحبزادگان اور سجادہ نشین حضرات کے احوال تحریر کروں گا۔

۱۳

شیخ صفی الدین عبد الصمد رحمۃ اللہ علیہ

آپ شیخ علم الدین سائی پوری قدس سرہٗ کے فرزند تھے۔ کامل ترین اولیاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ شیخ سعد الدین خیر آبادی کے خلفائے عظام میں سے ہیں۔ آپ مرجع خواص و عوام تھے۔ حقائق کے اظہار اور طالبانِ طریقت کی تربیت میں آپ کو کامل دستگاہ تھی۔ اپنے مرشد کی طرح تجرد کے عالم میں زندگی گذار دی۔ (غیر شادی شدہ رہے) آپ بارہ سال کی عمر میں سائی پور سے خیر آباد آئے خانقاہ شیخ سعد الدین میں قیام فرمایا۔ اور تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔ ایک دن شیخ سعد الدین کی نگاہ شیخ صفی الدین پر پڑی۔ سامنے بلایا اور حالات پوچھے۔ جب ان کے والد کا نام (شیخ علم الدین) سنا تو حد درجہ التفات فرمایا۔ اور کامل مہربانی سے پیش آئے اس سابقہ معرفت کی بنا پر جو حضرت شیخ سعد الدینؒ کو شیخ علم الدینؒ سے تھی۔ بڑی شفقت کے ساتھ بذاتِ خود ان کی تربیت فرمائی شیخ صفی عرصہ تک حضرت شیخ کی خدمت میں استفادہ کے لیے حاضر رہے۔ اور سعادت ارادت سے مشرف ہوئے (آپ کے مرید ہوئے) اور بہت سی شائستہ خدمات بجالائے۔

ایک رات شیخؒ نے ان سے مولی کی فرمائش کی، کہ اس وقت کسی جگہ سے مولی لاؤ۔ شیخ صفی نے کوئی عذر نہیں کیا، کہ آدھی رات ہے اور مولی کا کوئی موسم بھی نہیں ہے۔ عرض کیا جاتا ہوں اور تلاش کر کے لاتا ہوں خیر آباد میں گلی گلی تلاش کیا اور محلہ محلہ دوڑے پھرے اس وقت لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے سو رہے تھے اس آدھی رات کو مولی کے بارے میں کس سے معلوم کریں۔ حیران و پریشان ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگے۔ ایک شخص اپنے گھر میں جاگ اٹھا اور کہا کہ کوئی مصیبت زدہ رو رہا ہے۔ اس کی خبر لینی چاہیے۔ صاحب خانہ باہر دوڑ کر آیا اور پوچھا تم کون ہو؟ اور کیوں روتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھ کو مولی کی ضرورت ہے اس شخص نے کہا مولی کا یہ زمانہ تو ہے نہیں اتنے میں دو اور شخص بھی آ گئے۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا کہ میں نے فلاں شخص کے گھر میں دیکھا ہے کہ مولی لگی ہوئی ہے۔ سب لوگ ان کے ساتھ اس جگہ پہنچے اور اس گھر کے مالک کو جگایا اور مولی کی درخواست کی۔ صاحب خانہ نے دو مولیاں پانی سے دھو کر شیخ صفیؒ کے حوالہ کر دیں۔ شیخ صفیؒ نے یہ دونوں مولیاں شیخ کے سامنے پیش کیں۔ شیخ بہت مسرور ہوئے اور دعا فرمائی کہ تمہارا جو بھی مشکل کام ہو گا یا جو بھی سخت معاملہ تم کو پیش آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آسان ہو جائے گا۔ اس کے بعد شیخؒ نے ان کو چلہ میں بٹھایا۔ تیسرے ہی دن کامیاب ہو گئے اور علویات اور سفلیات سب ان کے سامنے ظاہر ہو گئے۔ خرقہ خلافت کی خلعت سے نوازے گئے۔ اور شیخؒ کے تمام خلفاء سے مقام معرفت میں آگے بڑھ گئے۔ آپ سالہا سال تک مسند ارشاد پر متمکن رہے۔ اور سالکین طریقت و ہدایت کو منزل مقصود تک پہونچاتے تھے میر عبد الواحد بلگرامی کی کتاب "حل شبہات" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ابتدائے حال میں علم شریعت و طریقت کی بعض مشکلات میں نے بڑے بڑے علماء و مشائخ کے سامنے بغرض حل پیش کیں لیکن کسی سے مجھے تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ میں نے دل میں یہ طے کیا کہ ساری دنیا میں پھروں گا تاکہ کسی ایسے شخص سے ملاقات ہو جائے جو میری ان مشکلات کو حل کر دے جب میں روانہ ہوا تو پہلی ہی منزل پر قیلولہ کے وقت پیر دستگیر یعنی مخدوم شیخ صفیؒ کو میں نے خواب میں دیکھا اور اپنی طرف بکمال لطف و کرم متوجہ پایا فقیر کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس وقت چونکہ حضرت مخدوم موجود ہیں۔ لہذا اب مسافرت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر مخدوم کے حضور میں جانے کی نیت سے وضو کرنے کے لیے اٹھا۔ قاضی اللہ داد قدوائی جو مخدوم کے مریدوں میں سے تھے میرے عقب سے آئے۔ اور مجھ سے کہا کہ تم کو حضرت مخدومؒ طلب فرماتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میرا دل نہیں چاہتا کہ فلاں شخص (یعنی تم) کسی اور جگہ جائے۔ فقیر فوراً واپس ہوا اور حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا دریافت کیا کہ قاضی اللہ داد نے یہ بات زبان مبارک سے سن کر مجھ تک پہنچائی ہے ؟ ارشاد فرمایا "ہاں ایسا ہی ہے"۔ جب میں خواب سے بیدار ہوا تو قیام اور سفر کے بارے میں متردد تھا۔ (یعنی سفر کروں یا قیام کروں) بالآخر میں نے خود ہی طے کیا کہ اگر دوسری مرتبہ ایسا ہی خواب دیکھوں گا تو سفر سے باز رہوں گا۔ دوسری مرتبہ بھی میں نے وہی خواب دیکھا جو پہلے دیکھا تھا۔ لہذا فوراً واپس ہوا۔ اور خانقاہ میں مزار پاک کے پائیں کم و بیش چالیس روز تک معتکف رہا۔ اور ان تمام علمی مشکلات کے اطمینان بخش جوابات مجھے مل گئے اور اس نسخہ میں

وہ تمام سوال وجواب میں نے تحریر کیے ہیں (یعنی سنابل میں)۔

نیز میر عبدالواحدؒ "سنابل" میں لکھتے ہیں:۔

"کہ خانقاہ شیخ سعد قدس سرہٗ میں "صفیا" نام کا ایک غلام زادہ تھا، جب کوئی شخص اس کو بلاتا شیخ صفی قدس سرہٗ اس کا جواب دیتے، اور وہاں حاضر ہو جاتے اور کبھی بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں گذرا کہ مجھ کو کوئی شخص "صفیا" نہیں کہے گا۔ ؎

ہر کہ در خود دید روئے کس ندید　　　مرد از خود رستہ راحق برگزید

شیخ صفیؒ قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ کہ درویشی کا راستہ موت کا راستہ ہے یعنی موتوا قبل ان تموتوا (اپنی موت سے پہلے مرجاؤ) اور لوگ سامانِ زندگی کے ساتھ اس راہ میں قدم رکھتے ہیں۔ اور اکثر لوگ فقیری کے سکر کو حصولِ رزق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور مخلوق کی پسندیدگی اور ان کی آمد کے متوالے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ فاضل دانشمند ایک بادشاہ کے پاس گئے تھے۔ مگر دربان نے جانے نہ دیا تب انہوں نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

سرو را سوہنگ رافی مان بدھ　　　دست دربان بشکند یا پائے من

شیخ صفی قدس سرہٗ نے دوسرے مصرعہ کو اس طرح دہرایا:۔

دست دربان نیشکند جز پائے من

شیخ صفی قدس سرہٗ کی وفات ۱۹ ر محرم ۹۳۳ھ ہجری کو ہوئی۔ میر عبدالواحد نے تاریخ وفات اس طرح نکالی:۔ "شیخ پاکؒ"

آپ کی آرام گاہ سائی پور میں ہے۔

۱۴

شیخ حسین ساکن سکندرہ قدس سرہٗ

آپ شیخ صفی الدین سائی پوری کے اعاظم خلفاء میں سے ہیں، پہلے بڑے سرمایہ دار تھے۔ اور سخاوت کا جوہر کامل ان کے اندر موجود تھا۔ (بڑے سخی تھے) تیر اندازی، گھوڑ دوڑ، چوگان بازی اور فنونِ سپہ گری میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ آپ کے ان کمالات سے بادشاہِ وقت اور امراؤ عمائدین آگاہ تھے اچانک عنایت الٰہی کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہوا اور ان کو دنیا کی آلائش سے پاک کر دیا۔ تمام دنیاوی مال و متاع سے

لہ شیخ صفی سے بڑے بڑے مشائخ اور علماء نے استفادہ کیا ہے۔ منجملہ ان کے شیخ فضل اللہ جونپوری (۹۱۱ھ) بھی ہیں۔ جو برہان پور میں مرجع انام تھے۔ دوسرے شیخ نظام الدین رضوی خیرآبادی (۹۹۳ھ) ہیں جو سید محمود حسینی شیورانی کی نسل سے ہیں۔

دست بردار ہو گئے۔ ان پر ایک دہشت طاری ہو گئی۔ اور اس حالت میں ایک دن اور ایک رات ایک درخت پر گذاری۔ اور پرندہ کی طرح جو اپنے سر کو پروں میں چھپا لیتا ہے۔ استغراق کے عالم میں سرفگندہ بیٹھے رہے۔ اسی حالت میں کشش محبت کی کمند نے حرمین شریفین کی جانب انہیں کھینچا۔ اور وہ اس سعادتِ عظمٰی کے حصول میں کامیاب ہوئے (شرفِ حج سے بہرہ مند ہوئے) ایک رات سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عالم خواب میں زیارت ہوئی۔ سرکارِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"ہندوستان واپس جانا چاہیے اور سائی پور... میں تمہیں شیخ صفی الدین کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیے شیخ حسین کہتے ہیں کہ جب میں سائی پور پہونچا۔ میرے دل میں یہ خیال گذرا کہ کیا اچھا ہو کہ شیخ مجھے خود خلوت میں طلب فرمائیں۔ اور بغیر میرے عرض کیے ہوئے سر مبارک سے کلاہ اتار کر مجھے عنایت فرمائیں۔ اور کوئی جگہ میری عبادت کے لیے مخصوص فرما دیں۔ جب میں سعادت کی دہلیز تک پہنچا تو شیخ نے خادم سے فرمایا۔ شیخ حسین نامی ایک شخص دروازہ پر کھڑا ہے۔ اس سے کہو کہ اندر آ جائے۔ خادم باہر آیا اس نے آواز لگائی کہ شیخ حسین کون ہے؟ میں قلندروں کی طرح فقراء کا بستر اٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ میرا نام حسین ہے لیکن میں شیخ نہیں ہوں۔ خادم واپس چلا گیا اور اس نے عرض کیا۔ ارشاد فرمایا وہی ہے خادم واپس آیا اور مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گیا۔ شیخ انتہائی مہربانی کے ساتھ متوجہ ہوئے۔ اور کلاہ خاص پہنائی اور خانقاہ علانگ پناہ میں جگہ دی۔ میں نے خانقاہ میں دو چلے کھینچے۔ اس کے بعد حکم ہوا۔ کہ سکندرہ میں جاؤ۔ اور وہاں خلقِ خدا کی رہنمائی کرو۔ آپ پچاس سال تک گوشہ نشین رہے۔ اور کسی مخلوق کے دروازہ پر فقر کی آبرو نہیں گنوائی۔ (یعنی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا)، راقم الحروف آزاد بلگرامی مولف مآثر الکرام، شیخ صفی قدس سرہٗ کے ساتھ "شیخ حسین" کی ملاقات کا حال، صاحب "گلزار ابرار" کی روایت کے مطابق عبارت کی تبدیلی اور معنی کے تحفظ کے ساتھ یعنی بعینہٖ تحریر کرتا ہے۔ میر عبدالواحد "سنابل" میں کہتے ہیں:۔"

حضرت مخدومی قدس سرہٗ کو جب ہدایت الٰہی کے جذبہ اور بے پایاں الطاف کی کشش نے دستگیری کی تو ان کی باطنی خواہشات اور دنیاوی لذات سرد پڑ گئیں۔ امارت و ثروت اور دنیا کی دولت سب کو ٹھکرا دیا۔ اور حضرت ابراہیم ادہم[1] رحمہ اللہ علیہ کی طرح فقر و فاقہ کو اپنا رفیق بنا لیا۔ اور اس فقر پر جو امیری کے بعد حاصل ہوا

---

[1] ابراہیم ابن ادہم ابن منصور ابو اسحاق (سنہ ۱۶۱ھ - ۷۷۷ء) التمیمی و بلخی بڑے دیندار لوگوں میں سے تھے۔ ان کے حالات اور علماء کبار سے اخذ علم کے واقعات مشہور ہیں۔ ان کے حالات میں اختلاف ہے کسی نے کچھ کہا ہے اور کسی نے کچھ کہا ہے۔ مکتبہ ظاہریہ دمشق کی "سیرۃ السلطان ابراہیم ابن ادہم" میں قصیدہ عامیہ" اور سلمی کی "طبقات الصوفیہ" میں سعید ﷺ کو دعماعہ والی حدیث جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے ان سے روایت کی گئی ہے ملاحظہ کیجیے انکے حالات کے لیے (حلیۃ الاولیاء، طبقات شعرانی، رسالہ قشیریہ صفوۃ الصفوہ، شذرات، فوات الوفیات، مرآۃ الجنان، تاریخ کبیر، تہذیب البدایہ والنہایہ، نفحات الانس)۔

اسی طرح راضی اور شکر گذار رہے جیسے دوسرے اپنی اس امارت پر مطمئن اور مسرور ہوتے ہیں جو فقر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے ان کو امیری کی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ لوگ جب حالتِ فقر و بے سامانی پر ان کی مسرت دیکھتے تو تعجب کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ وہ امیری اور دولت اور وہ رعب و شوکت اور وہ پہلوانی اور بہادری، تیراندازی کی صفت اور میدان بازی کا پیشہ اور وہ بذل و عطا ان سب کو ٹھکرا کر (چھوڑ کر) یہ شخص اس بے سرو سامانی پر خوش ہے حضرت مخدوم بعض لوگوں کو جواب دیتے تھے۔ کہ اگر خدا غریب نوازنہ ہوتا تو ان تلخیوں سے مجھے کون نجات دلاتا۔ اور صبر و قناعت کے درجہ تک کون پہونچاتا۔ اور بعض کو جواب دیتے کہ اے دوستو! اللہ تعالیٰ کا شکر اس حالت میں مجھ پر بہت زیادہ واجب ہے کہ میرا نام امیروں کی کتاب سے نکال کر فقیروں اور مسکینوں کے رسالہ میں لکھ دیا ہے۔ اور پیران طریقت کے سلسلہ میں شامل کر دیا ہے کہ الدنیا ملعونۃ وما فیھا الا ذکر اللہ (دنیا اور اس میں جو کچھ ہے سوائے ذکر الٰہی کے سب ملعون ہے)۔ غرضیکہ مرد کو چاہیے کہ فقر کے راستہ میں قدم کو مضبوط رکھے اور فاقہ اور بے سرو سامانی کی سختی سے نہ گھبرائے ؎

چیست دنیا خاکدانِ کہنہ و ویرانۂ
غفلہ جائے محنت آبادیٔ ملامت خانۂ
سر بلندی نا سزائے ترک دنیا کے کند
سرفرازی را رسد دریا دلی مردانۂ

حضرت مخدوم کی عمر شریف جب اختتام کو پہونچنے والی ہوئی تو آخری دنوں میں کبھی کبھی ارشاد فرماتے تھے کہ میری یہ تمنا ہے کہ موت کے وقت کوئی "خوش الحان" اس آیت کریمہ کو "گودی" اور "جت سوی" راگوں میں جو ہندی راگوں میں سے ہیں پڑھے۔ آیت کریمہ یہ ہے۔

"رب قد اٰتیتنی من الملک وعلمتنی من تاویل الاحادیث فاطر السموات و الارض انت ولیی فی الدنیا و الاٰخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین"

یہاں تک کہ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین پر میرا دم نکل جائے۔ (مولف گلزار ابرار کا بیان ختم ہوا) اور یہ بھی اسی سلسلہ کی بات ہے کہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ کو "راگ پوربی" بہت پسند تھا۔ ایک مرتبہ حاضرین مجلس میں سے کسی نے پوچھا کہ حضور پوربی کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں؟ فرمایا ہاں! میثاق کے دن اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کی صدا میں نے اسی راگ میں سُنی تھی۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب شیخ مخدوم کی وفات کا وقت قریب آیا تو "مسجد کوری" کے میدان میں قیام فرما ہوئے۔ اور وہاں عمارت کی بنیاد ڈالی۔ دوستوں کے ساتھ رخصتی گفتگو فرمائی۔ لوگ حیرت زدہ ہوئے۔ جب تعمیر مکمل ہو چکی تو کشادہ پیشانی کے ساتھ جان شیریں جان آفرین کے سپرد کر دی۔ (وصال فرمایا)

یہ واقعہ ۹۷۶ھ کا ہے۔

۱۵

شیخ عبدالقادر بدایونیؒ

آپ مجموعۂ فضائل وکمالات تھے۔ اور اپنے معاصرین اور اقران کے مقتدا و پیشوا تھے۔ شیخ مبارک ناگوری[۱] اور دوسرے فضلائے عصر سے کمالات حاصل کیے۔ اس علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ فارسی اور عربی انشاء پر دسترس کامل حاصل تھی۔ ہندی نجوم سے بھی وقوف حاصل تھا۔ ہندی اور عجمی راگ راگنیوں سے بھی کسی قدر واقف تھے۔ شطرنج صغیر وکبیر کا بھی علم تھا۔ بین نوازی میں بھی کسی حد تک درک رکھتے تھے۔ خیر و درستی اور شیوۂ قناعت میں ممتاز تھے۔ اپنے زمانہ کے علماء اور اکثر مشائخ سے ملاقات اور ان کی ہم نشینی اور مصاحبت سے شرف یاب تھے۔

آخر میں جلال خاں قورچی[۲] کے ذریعہ سے میر فتح اللہ شیرازی کی مدحت طرازی کے وسیلے سے اکبر بادشاہ کی پیش امامی کا منصب حاصل کیا۔ چالیس سال تک شیخ فیضی اور ابوالفضل[۳] کے ساتھ مصاحبت رہی لیکن اپنی تاریخ میں

---

[۱] ولادت ۹۱۱ھ وفات ۱۰۰۱ھ علمائے وقت میں سے تھے۔ ابتداءً ابوالفضل گازرونیؒ اور مولانا عماد الدین محمد طاری سے گجرات میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد علوم دینیہ کے درس میں مشغول ہوگئے۔ خاص کر علم تصوف کی خوب اشاعت کی۔ اور آخر عمر میں ایک تفسیر قرآن "منبع نفائس العیون" کے نام سے چار بڑی جلدوں میں تالیف کی اس کے باوجود "نغمہ" سے ایسا خصوصی تعلق تھا۔ کہ بغیر سماع و ساز کے آرام نہیں ملتا تھا۔ اور قرأت قرآن کے بجائے شیخ فارضؒ کے "قصیدہ تائیہ" اور امام بوصیری کے قصیدہ بردہ کا ورد ضرور کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ شیخ اطوار مختلف کے سالک اور رنگارنگ طبیعت کے مالک تھے (منتخب التواریخ، تذکرہ علماءِ ہند، بزم تیموریہ، دربار اکبری، حدائق الحنفیہ، بوستان اخیار، نزہۃ الخواطر وغیرہا)۔

[۲] مصاحبت پیشہ تھے۔ عہد اکبری میں ہزاری منصب تک پہنچے تھے۔ "ذخیرۃ الخوانین میں" ان کا نام "جمال خان قورچی" مذکور تحریر ہے۔

[۳] ملک الشعراء شیخ فیضی کے حالات ذکر فضلا رقم ۱۷ میں ہیں اور ان کے برادر بزرگ علامۂ عصر شیخ ابوالفضل علامی شیخ مبارک ناگوری کے دوسرے صاحبزادہ، عہد اکبری میں وزارت کے عہدہ تک سرفراز ہوگئے اور امیروں اور شہزادوں کے محسود ہوگئے۔ (لوگ ان سے حسد کرتے تھے) بدایونی نے ان کو الحاد اور زندقہ کا الزام دیا ہے۔ ان کے پسندیدہ کاموں میں یہ کتابیں مشہور ہیں۔ ۱۔ مکتوبات ابوالفضل جس کو شیخ عبدالصمد بن افضل محمد اکبرآبادی نے جمع و مرتب کیا ہے ۲۔ ترجمہ فارسی حیاۃ الحیوان الکبری للدمیری ۳۔ فارسی میں انجیل کا ترجمہ ۴۔ عیار دانش ۵۔ ترجمہ کلیلہ و دمنہ ۶۔ آئین اکبری ۷۔ اکبر نامہ۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ان دونوں کتابوں کو ایک ہی شمار کیا ہے۔

ان کے خلاف کیا کچھ نہیں کہا ہے ۔ اور شیخ فیضی کے ذکر میں تو ان کی بہت زیادہ مذمت کی ہے آخر میں یہ معذرت پیش کی کہ میں مجبور تھا (جو یہ سب کچھ مجھے لکھنا پڑا) کہ دین کا حق اور عہد کی پاس داری تمام حقوق سے بالاتر ہے الحب للّٰہ والبغض للّٰہ (اللہ کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے نفرت) اگرچہ پورے چالیس سال کا عرصہ ان کی مصاحبت میں گذارا ۔ لیکن فیضی کے فساد مزاج اور اوضاع میں تغیر راہ پا لینے کے بعد . . . .

. . . . خصوصاً مرض موت میں ان کی طبیعت کے انقلاب کے باعث وہ خصوصیت جو مجھے ان سے تھی وہ ختم ہو گئی اور نفاق و شقاق کا یہ رنگ پیدا ہو گیا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے چھٹکارا پا لیا اب ایسی بارگاہ والا کی طرف متوجہ ہیں کہ داوری اور سروری کی نہیں بلکہ اس کے فضل کی ضرورت ہے الاخلاء یومئذ بعضہم لبعض عدو الا المتقون (آج کے دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے ان کے جو متقی اور پرہیزگار ہیں) مولانا عبد القادر کی راست مزاجی اور انصاف پسندی کی ایک مثال یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کی چالیس سالہ تاریخ خوب مکمل کر لکھی ہے ۔ اور سچائی کے اظہار میں ایسے باسطوت بادشاہ کی مخالفت کا بالکل خیال نہیں کیا ہے اور اس سچی آیت " اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ " (کیا اللہ اپنے بندے کیلیے کافی نہیں ہے) کے مضمون پر عمل کیا ہے ۔

آپ شیخ حاتم[1] سنبھلی کے مرید تھے ۔ حضرت شیخ داؤد[2] جھنی وال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ۔ ان کی وفات ۱۰۰۰ھ[3] میں ہوئی ۔

(۱۶)

سید صبغت اللہ بن سید روح اللہ بروجی قدس سرہٗ

بروچ[4] (بھروچ) صوبہ گجرات ضلع احمد آباد کے مضافات میں ہے ۔ شیخ وجیہ الدین گجراتی کے اکمل ترین خلفاءؒ

---

[1] شیخ حاتم سنبھلی، شیخ عزیز اللہ سنبھلی تلمبنی کے شاگرد اور مرید تھے ۔ (م ۹۶۸ھ) بحیثیت عمر اپنے زمانہ میں بے مثل اور ستر سال کی عمر تک درس و ہدایت کی مسند پر متمکن رہے ۹۶۸ھ میں وصال ہوا (منتخب التواریخ، مفتاح التواریخ) ۔

[2] جھنی لاہور کا ایک قصبہ ہے بچپن میں لاہور آکر مولانا اسمٰعیل اچھے کے (جو مولانا جامیؒ کے شاگرد تھے) حلقہ ارادت میں داخل ہوئے بڑی محنت کے بعد درجہ کمال تک پہنچے اور سلسلہ قادریہ چشتیہ کو رواج دیا ۹۸۲ھ میں وفات پائی ۔

[3] مولانا عبد القادر بدایونی کی یادگار منتخب التواریخ ہے جو ان کے فضل و کمال اور خدا شناسی و حق گوئی کی روشن دلیل ہے میر صاحب نے بلا سبب اتنی کھل کر تنقید کی ہے ۔ یہ کتاب ۱۰۰۴ھ میں مکمل ہوئی ۔ اور اس کی تاریخ بطور تعمیہ اس طرح کہی :۔

سال تاریخ نزول جستم گفت ۔۔ انتخابے کہ ندارد ثانی (مفتاح التواریخ) ۔

[4] بروج (بھروچ) سورت اور بڑودہ کے درمیان ایک قصبہ کا نام ہے ۔

میں سے تھے۔ اپنے مرشد کی مرضی سے چند سال اپنے وطن میں لوگوں کو فائدہ پہونچانے اور امر المعروف اور نہی عن المنکر میں مشغول رہے اچانک حرمین شریفین (اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے) کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ اور اس عظیم دولت کی سعادت حاصل کی۔ اقربا پروری اور محبت زن و فرزندان کے باعث وطن مالوف کی جانب متوجہ ہوئے اور وطن میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ ۹۹۹ھ میں دل دنیاوی رشتوں کی محبت سے خالی کر کے یکہ و تنہا مالوہ پہنچے۔ انہی ایام میں مدینہ مصطفوی (ان پر صلوٰۃ وسلام) کی زیارت کے شوق نے دل میں جوش مارا بعجلت تمام خاندیس کے راستہ احمد نگر (دکن) پہنچے وہاں کے والی برہان الملک کے اصرار پر ایک سال سے کچھ کم وقفہ وہاں قیام فرمایا دوسرے سال بحری سفر کا ارادہ کیا اور اس غرض سے شہر بیجاپور پہونچے والی بیجاپور نے بھی کچھ دنوں خاطر مدارت کی۔ اور بعد میں سامان سفر مہیا کرایا۔ اور ایک بہت عمدہ جہاز فراہم کیا گیا تاکہ تمام صوفیاء اور فقراء اطمینان کے ساتھ منزل مقصود کی جانب روانہ ہو سکیں۔ سید صاحب نے مقامات مقدسہ پہونچنے اور شرف زیارت حاصل ہونے کے بعد کوہ "اُحد" کے دامن ہی میں قیام فرمالیا۔ اور ظاہری اور باطنی طالبوں کے مرکز بن گئے۔ کتاب "جواہر خمسہ" پر اعراب لگائے ان کے ایک شاگرد احمد شناوی[۱] نے اس پر حاشیہ لکھا۔ (شناوی، شین کے زیر اور نون کی تشدید کے ساتھ ایک مقام ہے جس کی جانب نسبت کی گئی ہے) آج کل "جواہر خمسہ[۲]" اعراب اور حاشیہ کے ساتھ دیار عرب میں رائج ہے۔ بہت سے لوگ سید صاحب کے سلسلہ کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے اور بڑے مقامات پر فائز ہوئے شیخ محمد عقلیہ[۳] مکی قدس سرہٗ کتاب "لسان الزمان" میں ان کا تذکرہ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ (ترجمہ از عربی) شیخ کبیر مشہور عالم سید صبغت اللہ[۴] بن سید روح اللہ الحسینی طریقہ شطاریہ عشقیہ کے شیخ المشائخ ہیں۔ (اللہ ان پر رحمت کرے) وہ مختلف علوم کے جامع اور صاحب معارف عظیمہ تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے نفع حاصل کیا۔ اور علوم میں ان سے استفادہ کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاک باز بندوں میں سے تھے۔ اور دور دور تک ان کی شہرت تھی۔ آپ نے شیخ سید وجیہ الدین قدس سرہٗ سے شطاریہ کا یہ طریقہ اور مسلک حاصل کیا تھا۔ اور انہوں نے غوث زماں سید ہی

۱؎ احمد بن علی بن عبد القدوس بن محمد شناوی مصری مدنی۔ شناوی نے جواہر پر دو حاشیے لکھے ہیں۔ (تجلیۃ البصائر علی کتاب الجواہر، ومضار السرائر الالہیہ بجواہر آیات جواہر الغوثیہ (۹۷۵ تا ۱۰۲۸ھ) شمس الدین رملی کے شاگرد تھے۔ اور شیخ محمد ابن ابی الحسن بکری سے بھی روایت کی ہے ان کی تالیفات بہت مشہور ہیں (خلاصۃ الاثر، ہدیۃ العارفین، انسان العین فی مشائخ الحرمین، تاج العروس)۔

۲؎ جواہر خمسہ تالیف حضرت خواجہ محمد غوث گوالیاری (۹۷۰ھ) (خزینۃ الاصفیاء)۔

۳؎ محمد ابن احمد بن سعید الحنفی المکی، شمس الدین معروف بہ عقلیہ، اپنے والد کی طرح ان علمائے تاریخ میں سے ہیں جو حدیث میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کی کتاب لسان الزمان (تاریخ میں) ۱۱۳۳ھ تک کے واقعات و حوادث پر مشتمل ہے اور اسی طرح المواہب الجزیلہ فی مرویات ابن عقیلہ اور ہدایۃ الطلاق الی العرفیہ فی السائر الدقاق، عقد الجواہر فی سلاسل الاکابر علم تصوف میں ان کی یادگار ہیں۔ اسی طرح فتاوی القلوب و طریق الغیب وغیرہ ان کی کتابیں مشہور ہیں۔ وفات ۱۱۵۰ھ، ۱۷۳۰ء ہے (رسالۃ المستطرفہ، فہرس الفہارس، تاج الزبیدی، بروکلمن، زرکلی)۔

۴؎ سید صبغت اللہ کے حالات کے لیے دیکھیے لطف السمر و قطف الثمر للغزی اور خلاصۃ الاثر للمحبی)۔

محمد غوث[1] صاحب جو ابر خمسہ سے اس طریقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان سے بہت سے لوگوں نے فیض حاصل کیا ان میں سے سید اسعد البلخی متوفی مدینہ منورہ شیخ کبیر احمد الشناوی اور سید صبغت اللہ بہت مشہور ہیں جن کی بہت سی تصنیفات ہیں ان میں سے ایک "کتاب الوحدة" اور رسالہ ارادة الدقائق شرح مرأة الحقائق[2] اور مالا یسع المرید ترکہ کل یوم من سنن القوم ہیں) آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ۱۰۱۵ھ / ۱۶۰۷ء میں ہوئی (رضی اللہ عنہ) آپ کا مزار زیارت گاہ عوام و خاص ہے لوگ اس سے برکت حاصل کرتے ہیں۔

۱۷

شاہ کلیم اللہ چشتی دہلوی قدس سرہٗ

مشہور متاخرین مشائخ میں سے ہیں، علوم عقلی و نقلی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اور حقائق و معارف میں مرتبہ بلند پر فائز تھے آپ کے بزرگ معماری کا مشغلہ رکھتے تھے[3] (اسلافش بکسب معماری اشتغال داشتند) اللہ تعالیٰ نے ان کو دلوں کے معمار کی خصوصیت سے نوازا اور دلوں کے دنیا کی نقاشی اور ان کے سنوارنے کے اعلیٰ کام پر مامور فرمایا۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد حرمین شریفین (اللہ تعالیٰ ان کی عظمت و شان اور زیادہ کرے) کی زیارت کو گئے اور ایک عرصہ تک اس مقام برکت نشان میں قیام فرمایا۔ وہاں حضرت شیخ یحییٰ مدنی[3] کے ہاتھ پر بیعت کی اور بہت سی نعمتوں کو ساتھ لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اور شاہ جہان آباد (دہلی) کے بازار خانم میں اقامت اختیار کی۔ اور کتب حقائق و معرفت کی تدریس اور مریدوں کی تربیت میں مشغول ہو گئے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی تحریر فرمائی۔ امراء و فقراء سب ہی آپ کے معتقدین میں داخل تھے۔ اور دینی اور دنیاوی معاملات میں آپ سے کامیابیاں حاصل کرتے تھے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ کو عالم قدس میں آرام فرما ہوئے اور اپنی حویلی ہی میں[4] دفن کیے گئے

---

[1] ابو المؤید محمد بن خطیر الدین بن عبد اللطیف بن معین الدین بن خطیر الدین بن ابی یزید بن شیخ فرید الدین عطار شطاری گوالیاری ملقب بہ غوث مشائخ متاخرین ہندوستان میں بڑے صاحب مرتبہ تھے۔ آپ نیشاپور کے سادات عظام میں سے تھے بسلسلہ ارادت شیخ حمید الدین گوالیاری (۸۲۵ تا ۹۳۰ھ) سے جو شاہ قاضن (شیخ قاضی خان گجراتی ۹۲۰ھ) کے بڑے خلفاء میں تھے۔ ان کے حالات مختلف تذکروں میں موجود ہیں۔

[2] مراۃ الحقائق، شیخ علاؤ الدین علی بن احمد المہائمی (۸۳۵ھ) نے رسالہ جام جہاں نما کو عربی میں منتقل کیا اور اس کا نام مراۃ الحقائق رکھا۔ اس کے بعد اس کی شرح تحریر کی۔ ارادۃ الدقائق فی شرح مراۃ الحقائق کے نام سے لیکن سید صبغت اللہ کی شرح اور ہی ہے صاحب ابجد العلوم کو شبہ ہو گیا ہے اور ارادۃ الدقائق کو انہوں نے سید صبغت اللہ کے نام سے منسوب کر دیا ہے (الثقافۃ الہندیہ لسید عبد الحی حسنی)۔

[3] شیخ محمد اعظم کے خلفاء عظام میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ چند واسطوں سے چراغ دہلی سے ملتا ہے ان کے اکثر مریدین صاحب کمال گذرے ہیں ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی (خزینۃ الاولیاء)۔

[4] تاریخ وصال "ہادی دہر" ہے۔

۱۸

مُلّا موہن بہاری قدس سرہٗ

آپ کا اصلی نام محی الدین ہے اور مولد و منشاء شہر "بہار" ہے نو سال کی عمر میں قرآنِ حکیم حفظ کر لیا اور اپنے والد مُلّا عبد اللہ کی خدمت میں رہ کر دیگر علوم متداولہ حاصل کیے۔ سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر کچھ دن اپنے وطن میں درس و تدریس اور افادۂ خلق میں مشغول رہے اس کے بعد شاہ جہان بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ اور شاہزادہ محمد اورنگ زیب کی اتالیقی کا منصب آپ کے سپرد کیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد شیخ وجیہہ الدین گجراتی قدس سرہٗ کے پوتے شاہ حیدرؒ کی خدمت میں پہنچ کر ان کے حلقہ مریدین میں داخل ہو گئے۔ بالآخر دربار شاہی سے رخصت لے کر وطن واپس آ گئے اور ہمہ وقت ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہنے لگے۔ اسّی سال کی عمر میں (۱۰۶۸ھ) میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔

۱۹

میر عبد الجلیل بن میر عبد الواحد قدس سرہٗ

میر عبد الواحد نے دو شادیاں کیں۔ جن سے چار صاحبزادگان اور تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں پہلی زوجہ محترمہ سے میر عبد الجلیل اور ایک صاحبزادی اور دوسری حرم سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی زوجہ محترمہ کے بطن سے پیدا ہونے والے میر عبد الجلیل کو میں نے دیکھا ہے۔ میر عبد الجلیل کی ولادت اول وقت ظہر میں پنجشنبہ کے دن ۲۰ رجب ۹۷۲ھ کو ہوئی۔

میر عبد الجلیل، قوی جذبہ اور اعلیٰ کیفیات کے حامل تھے۔ عنفوان شباب ہی میں وحشت دل نے دامنِ دل پکڑ لیا۔ سب سے بے تعلق ہو کر ویرانہ میں چلے گئے۔ اور بارہ سال تک درویشی کے لباس میں دنیا کی سیر کرتے رہے اکثر اوقات جنگل اور وادی میں بسر کرتے تھے۔ جنگلی گھاس اور پتے کھا کر گذارہ کرتے تھے۔ مخلوق سے بالکل بے تعلق تھے۔ اس دہ سالہ مدت میں کہیں سے بھی ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اقرباء مایوس ہو گئے جب بارہ سال گذر گئے تو اس زمانہ میں جب کہ حضرت بدیع الدین شاہ مدار قدس سرہ کا عرس ہوتا ہے۔ اور لوگ دور دراز سے زیارت کے لیے آتے ہیں تو آپ بھی زائرین کی جماعت کے ساتھ بلگرام پہنچے کیونکہ حضرت شاہ مدارؒ کا مزار شریف بلگرام سے بارہ میل پر ہے۔ جب بلگرام میں داخل ہوئے تو اتفاق سے ان کا گذر ان کی حقیقی بہن کے مکان کے قریب سے ہوا۔ میر صاحب اس زمانہ میں اکثر بحالت بے خودی نعرے لگایا کرتے تھے۔ اتفاق سے بہن کے گھر کے

سامنے انہوں نے نعرہ لگایا۔ ان کی بہن نے اتنی مدت کی جدائی اور بھائی کی زندگی سے مایوس ہونے کے بادجود آواز پہچان لی۔ اور کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبدالجلیل کی آواز ہے اور بے اختیار دوڑتی ہوئی دروازہ تک آگئیں اور بھائی کو لپٹا کر زار زار رونے لگیں۔ میر صاحب نے نہ پہچانتے ہوئے بہت چاہا کہ ان کو اپنے سے الگ کریں لیکن محبت اور خون نے جوش مارا اور ان کی وحشت محبت میں بدل گئی۔ وہ پرہیزگار بی بی، میر صاحب کے گھر میں لے گئیں۔ اور رفتہ رفتہ کپڑے پہننے کا ان کو عادی بنایا۔ کچھ عرصہ بعد میر صاحب کی شادی ہو گئی۔ اور متاہلی زندگی بسر کرنے لگے۔ آخر عمر میں بلگرام سے مضافات آگرہ کے قصبہ مارہرہ تشریف لے گئے۔ اور وہیں مقیم ہو گئے اور وہیں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ (وصال فرما گئے) ان کی وفات ۸ ربیع الاول ۱۰۵۷ھ دوشنبہ کے دن واقع ہوئی مارہرہ میں آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ عوام ہے۔ میر عبدالجلیل کے تین صاحبزادے ہوئے ان میں چھوٹے صاحبزادے سید اویس قدس سرہٗ نے اپنے والد ماجد کے بعد ہدایت کا مصلیٰ بچھایا۔ (جانشین ہوئے) جناب اویس ایمان کے یمن اور فلکِ عرفان کے سہیل تھے۔ انہوں نے ابدال کے طریقہ کو اختیار کیا۔ (مرتبہ ابدال پر فائز ہوئے) کسی ذی روح کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ یہاں تک کہ کسی موذی کو بھی تکلیف نہیں پہنچائی۔ تمام فضائل اخلاق سے آراستہ تھے۔ اگر کسی مزدور سے بھی کوئی کام لیتے تو موسم گرما میں گرمی کی شدت کے وقت اور جاڑے کے موسم میں شدید سردی کی صورت میں اپنی شفقت کے باعث مزدور سے کام نہیں لیتے۔ اور لطف و کرم سے پیش آتے۔ باایں ہمہ مزدور کو پوری پوری اجرت دیتے۔

۲۰ رجب ۱۰۹۷ھ کو سبزہ زار قدس کی جانب خراماں ہوئے۔ ان کی خواب گاہ وادی بلگرام میں سر راہ واقع ہے۔ اور غریبانہ صورت سے اس میں آرام فرما ہیں یعنی مزار شان و شوکت سے عاری ہے شاہ جلال بدخشی نے جو خرد تخلص کرتے تھے۔ آپ کی تاریخ وصال اس طرح کہی۔

مقبولِ خدا اویس ثانی ۔۔۔ از دارِ ملال بست محمل

تاریخ وصال او خرد گفت ۔۔۔ بر اوج سپہر یافت منزل ۱۰۹۷

۲۰

میر سید فیروز رحمۃ اللہ علیہ

آپ میر عبدالواحدؒ کے دوسرے صاحبزادہ ہیں، مرجع الخلائق تھے۔ بڑی بزرگی اور شان والے تھے بذل و سخاوت اور حاجت مندوں کی حاجت روائی میں منفرد تھے۔ جب میر عبدالواحد قدس سرہٗ نے اس عالم سے رحلت فرمائی تو سجادگی کے لیے لوگوں کی نگاہِ انتخاب سید فیروز پر پڑی لیکن سید فیروز نے اپنے چھوٹے بھائی میر سید طیب کو سجادہ نشینی پر بٹھادیا۔ اور فرمایا کہ سجادہ کو تم سنبھالو میں فقیروں اور اہلِ خانقاہ کی خدمت بجالاؤں گا۔

چنانچہ سید فیروز مہمانوں اور مسافروں کے لیے سامان خورد و نوش ہمہ وقت باورچی خانہ میں موجود رکھتے تھے ایسے غریبوں اور لاچاروں کی چار سو لڑکیوں کی جو شادی کرانے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ہر شخص کے مرتبہ کی مناسبت سے اپنی طرف سے نقد اور جنس فراہم کرکے شادی کرادی۔ تقریباً ایک سو سال بھرپور عظمت اور اقتدار کے ساتھ زندگی بسر کی۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود ایک نفس بھی یادِ الٰہی سے غافل نہیں رہے۔ آپ شب زندہ دار تھے اور مراقبہ اور اوراد و وظائف میں مستغرق رہتے تھے۔ ۵ محرم ۱۰۲۶ھ کو سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ اور میر عبدالواحد کی قبر کے پہلو میں مشرق جانب دفن ہوئے۔

میر سید طیب قدس سرہٗ ایسے باکمال بھائی کے انتقال کے بعد بہت غمزدہ تھے۔ جب ان کو قبر میں لٹا کر باہر آئے تو انتہائی مسرور اور شادمان تھے۔ لوگ بہت تعجب کرنے لگے۔ اور سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرے بھائی صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ غم نہ کرو، ساٹھ دن کے بعد تم مجھ سے آملو گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ساٹھ دن کے بعد میر سید طیب نے بھی اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

رحمۃ اللہ علیہ

۲۱

میر سید یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ

آپ میر عبدالواحد کے تیسرے صاحبزادہ تھے۔ ایک کتاب کے گوشہ میں خاص میر عبدالواحد کے ہاتھ کا نوشتہ میں نے دیکھا ہے لکھا ہے کہ میرے فرزند یحییٰ کی تاریخ ولادت ماہ ذیقعدہ کی دوسری تاریخ جب کہ اس کے پہلے ہفتہ کی رات تھی۔ بوقت سحر ۹۸۵ھ میں ہوئی ہے۔ سید یحییٰ انسان کی صورت میں ایک فرشتہ تھے۔ اور آیتِ کریمہ سلام علیہ یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیا کا مصداق تھے۔ آپ ایک عالم کامل تھے۔ اول سے آخر تک والد ماجد کے ہی شاگرد رہے۔ قرآن مجید حفظ کیا۔ اپنی دل موہ لینے والی آواز سے قراءت سننے والے کو بے خود کر دیتے تھے۔ دنیا اور ما فیہا سے ہمیشہ اپنا دامن پاک رکھا۔ اور رات و دن ریاضت و ادائے فرض اور طلباءِ ظاہر و باطن کے افادہ میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے تبرکاتِ قلم سے نسخہ میزان الاعمال اور سلوک میں معیار الاحوال ہے۔ ان کی قبر میر عبدالواحد کی قبر کے چبوترہ سے علیحدہ مشرق کی جانب ایک چبوترہ پر ہے۔

قدس اللہ اسرارہم

۲۲

میر سیّد طیّب قدس سرہٗ

آپ میر عبد الواحدؒ کے چوتھے صاحبزادہ اور سجادہ نشین تھے۔ (قدس سرہم) میر عبد الواحد کے ایک نوشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید طیب کی ولادت یکشنبہ کے روز تقریباً ڈیڑھ پہر گذرنے کے بعد ۹ ربیع الآخر ۹۸۶ھ کو ہوئی۔ وہ ایسی ذات مقدس تھی کہ اگر جن وانس اس پر ناز کریں تو زیب دیتا ہے۔ اور اگر زمین و زمان اپنی ذات پر فخر کریں تو بجا ہے۔

صاحب مرآۃ المبتدین جو حضرت میر کے ہم عصر تھے تحریر کرتے ہیں:۔

میر سید طیب (اللہ ان کی عمر دراز کرے اور ان کی دولت زیادہ کرے) آج دنیا کا نظام اور بنی آدم کی برکت ان کے ہی دم سے ہے اور قطبیت، ابدالیت، غوثیت، اوتادیت اور جو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں ان کی ذات میں موجود ہے سب کمالات اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت میں ودیعت فرما دیے تھے۔ کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا امام زین العابدینؓ سینکڑوں کرامات کے ساتھ پھر ظاہر ہو گئے ہیں۔ آپ نے جس دن سے شہود کی حد میں قدم رکھا کوئی نماز قضا نہیں کی۔ اگر ان کا وجود اس دور سے قبل ہوتا تو مجتہدین اور سلف صالحین میں شمار ہوتا اور اگر آج کوئی شخص ائمہ سلف کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ میر سید طیب کو دیکھ لے۔ اور میری (مؤلف مرآۃ المبتدین) کی کیا مجال کہ ان کے مقامات اور احوال کو بیان کر سکوں، اس کے لیے تو خاص زبان، خاص دل اور مخصوص فہم چاہیے۔ آج ایسی زبان جو ان کی تعریف و توصیف کر سکے کہاں ہے؟ اور وہ دل جو انکی حقیقت کو پا سکے اور وہ فہم جو ان کے حال سے واقف ہو کہاں؟ یہ مدعی تو بس اسی قدر جانتا ہے کہ دنیا کا نظام انہی کی ذات سے ہے اور وہ جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر سو سال بعد ایک شخص پیدا ہو گا جو ہماری سنت کو تازہ کرے گا۔ آج ایسا وجود میر سید طیب ہی کا ہے۔ ؎

ہم بریں نکتہ ختم شد مقصود   للہ الحمد ذی العلاء والجود

(مرآۃ المبتدین)

آنجناب نے تمام ظاہری و باطنی کمالات اپنے والد ماجد سے حاصل کیے اور ان کے وصال کے بعد استحقاق ذاتی کے ساتھ ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ اور طالبان الٰہی کو سلوک کی ابتداء سے وصول کی انتہا تک پہنچایا۔ سیرت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی اتباع اپنی تمام حرکات و سکنات میں پیش نظر رکھتے تھے۔ تا بحد امکان تمام عمر کوئی سنت نبوی ترک نہیں کی۔ علوم رسمی میں تبحر توان کے دریائے کمال کی ذرا سی نمی تھی۔ ہمیشہ محصلین کے افادہ میں مشغول رہتے تھے۔ اکثر لوگوں کو اپنی تربیت کی برکات سے استادی کے بلند مقام

پہونچا دیا۔ بعض درسی کتابیں جیسے ہدایہ (فقہ) تفسیر بیضاوی وغیرہا ان کے دستِ خاص سے محشّٰی آج بھی موجود و محفوظ ہیں۔ جو ان کے کمال تبحر اور ان کی جودتِ فکر کی دلیل ہے۔ سید العارفین میر شاہ لدھا قدس سرہٗ کے صاحبزادہ سید کرم اللہ ارشاد فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص روئے زمین پر فرشتہ دیکھنا چاہتا ہے تو میر سید طیب کو دیکھ لے۔ سید العارفین نے آنجناب سے استفادہ فرمایا ہے۔ اور آپ کو "مرشدی" کے لفظ سے یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے:۔

ایک دن ایک عزیز میر سید طیب کی زیارت کا مشتاق ہوا اور میر سید طیب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے توحید کا ایک مشکل مسئلہ دریافت کیا حضرت میرؒ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اسے جواب دیا کہ مجھے یہ مسئلہ نہیں معلوم اور لوگوں کی نگاہ میں اپنے قصورِ علمی اور مسائل کے وقوف میں کمی کی مطلق پرواہ نہیں کی جب مجلس ختم ہوئی اور تنہائی کا موقع ملا۔ تو حضرت میرؒ نے سائل سے فرمایا گھر کی بات بازار میں نہیں کھینچی جاتی ہے اب جو کچھ تم چاہو پوچھو!

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ اور حضرت میر مجتبیٰ کے درمیان بڑی محبت تھی۔ شیخ عبدالحق ان کی بزرگی کے سبب ان کو شیخ طیب کہتے تھے۔ زمانہ پیری میں ایک مرتبہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ درس دے رہے تھے۔ کتاب میں ایک جگہ شبہ میں پڑ گئے اس وقت میر سید طیب کو انہوں نے یاد کیا اور فرمایا کہ اگر شیخ طیب اس وقت موجود ہوتے تو بآسانی اس مقام کو حل کر دیتے۔ میر سید طیب جو دہلی کے لیے اپنے وطن سے نکلے تھے اچانک اسی وقت کمر بستہ سیدھے شیخ عبدالحق محدث علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پہونچے۔ شیخ محدث بہت ہی مسرور ہوئے۔ فرمایا مرحبا! مرحبا! ہم اس وقت آپ ہی کو یاد کر رہے تھے۔ اور درس کے اس مشکل مقام کا ذکر کیا اور بتایا اور اس تقریب سے آپ کو یاد کیا تھا۔ کتاب آپکے سامنے لے آئے۔ میر سید طیب نے کتاب ہاتھ میں لے کر کچھ دیر تامل کیا اور عبارت کو کچھ اس طرح پڑھا۔ کہ بغیر کچھ مزید کہے خود بخود مطلب واضح ہو گیا حضرت شیخ محدث نے اس وقت موجود لوگوں سے کہا کہ میں نہ کہتا تھا کہ شیخ طیب اس مقام کو بآسانی حل کر دیں گے ان ہی دنوں شیخ عبدالحق کے صاحبزادہ شیخ نورالحق بادشاہ وقت کے حکم سے دارالسلطنت آگرہ میں قضاۃ کے عہدے پر متمکن تھے شیخ عبدالحق نے میر سید طیب سے پوچھا! کس راستہ سے آنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے فرمایا آگرہ کے راستہ فرمایا نورالحق سے ملاقات ہوئی تھی۔؟ میر صاحب نے کہا کہ سفر کی مصروفیت نے ملاقات کی فرصت نہیں دی۔ شیخ نے فرمایا کہ ظاہر میں یہ وجہ ہے کہ اس نے چونکہ قضاۃ (جج کے عہدہ) کا عہدہ قبول کر لیا ہے۔ اس لیے آپ سے یہ عدم توجہی ظہور میں آئی۔ پھر چند جملے اپنے صاحبزادہ کی تعریف میں زبان مبارک سے ارشاد فرمائے اور فرمایا کہ اگرچہ وہ میرا بیٹا ہے مگر باپ کی جگہ ہے۔ اگرچہ میرا شاگرد ہے۔ مگر استاد کی جگہ اور اگرچہ میرا مرید ہے مگر میں اس کو پیر سمجھتا ہوں۔ میر سید طیب شیخ کے سامنے سے اس طرح اٹھے۔ گویا کمر کھولنے کے ارادہ سے اٹھ رہے ہوں اور بغیر شیخ کی اطلاع کے اسی طرح کمر بستہ واپس آگرہ کی جانب چل پڑے۔ اور شیخ نورالحق سے ملاقات

کر کے لوٹے۔ شیخ عبدالحق میر صاحب کے اس حسنِ خلق سے بہت خوش ہوئے اور بڑی معذرت کا اظہار فرمایا (کہ میرے چند جملے کہنے کی وجہ سے آپ کو یہ زحمت گوارا کرنا پڑی)۔

سید ضیاء اللہ بلگرامی نے جن کا ذکر فصلِ ثانی میں آئے گا ایک دن میر سید طیب سے ملنے کا ارادہ کیا اور یہ خیال کیا کہ اگر آج میر صاحب اپنے ہاتھ سے مجھ کو ایک بیڑا پان کا کھلائیں گے تو میں ان کی ولایت کا قائل ہو جاؤنگا جب وہ مجلسِ منورّ کی حضوری میں کامیاب ہوئے تو حضرت میر صاحب کو یہ بات روشن ہوگئی اپنے "بلبو" نامی خادم کو حکم دیا کہ پان کے بیڑے لائے۔ خادم بیڑے لے آیا۔ حضرت میرؒ نے بیڑوں کو تمام حاضرینِ محفل میں تقسیم فرمادیا اور سید ضیاء اللہ کو نہیں دیا جب مجلس ختم ہوئی اور سید ضیاء اللہ تنہا رہ گئے تو حضرت میر نے اپنا دستِ مبارک بڑھا کر ایک بیڑہ سید ضیاء اللہ کے حوالہ کیا۔ سید صاحب انتہائی شرمندہ ہوئے۔ حضرت میر صاحب نے بطور زجر فرمایا کہ "فقیروں کا امتحان نہیں لیا کرتے"۔ کہیں ایسا نہ ہو ان کا غصہ حرکت میں آجائے۔ ایک دن وضو فرما رہے تھے اچانک مٹی کا لوٹا جو آپ کے ہاتھ میں تھا دیوار پر دے مارا۔ لوگ اس خلافِ عادت حرکت پر تعجب کرنے لگے جب کچھ دنوں کے بعد ایک خادم جس کو کسی جگہ بھیجا تھا۔ واپس آیا تو اس نے بتایا کہ میں ایک جنگل میں جا رہا تھا ایک شیر میرے سامنے آیا اور اس نے چاہا کہ مجھ پر حملہ کرے۔ اس وقت میں نے حضرت پیر دستگیر یعنی میر سید طیب کو یاد کیا۔ اسی دم ہوا سے ایک لوٹا ظاہر ہوا اور وہ شیر کے کلّہ پر پڑا۔ شیر نے اپنا منہ پھیر کر جنگل کی راہ لی اور میں نے اس ورطۂ ہلاکت سے نجات حاصل کی۔ جب لوگوں نے دونوں تاریخوں کا حساب لگایا تو یہ دونوں واقعے ایک ہی وقت میں واقع ہوئے تھے۔

حضرت میر ۵ ربیع الاوّل شریف ۱۰۶۶ھ کو انجمنِ قدس میں جلوہ افروز ہوئے (انتقال فرمایا) اتباعِ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال یہ ہے کہ وصال بھی ماہ ربیع الاوّل شریف میں ہوا اور یہ سنت بھی جو بے اختیاری تھی ان کو حاصل ہوگئی۔ عمر شریف اطہر ۶۳ سال اور چار دن کم گیارہ ماہ ہوئی مزار شریف میر عبدالواحد کے مزار کے قریب ایک الگ احاطہ میں واقع ہے۔ تاریخ وصال ستون دین افتاد (۱۰۶۶ ہجری) ہے۔ انھی ایام میں میر محمد یوسفؒ نے جو اس فقیر کے ہم درس بھی تھے۔ اور جن کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا اس قدیم تاریخ کو خوب نظم کیا ہے ؎

پنجم شہر انتقال نبی ہجرت	رفت طیب ز دہرِ بے بنیاد
از پئے ضبط سال تاریخش	گفت ہاتف ستون دیں افتاد

۱۰۶۶ھ

۲۳

میر عبد الواحد اصغر رحمۃ اللہ علیہ

آپ میر سید طیب بن میر عبد الواحد کے صاحبزادے اور سجادہ نشین تھے۔ (قدس سرہم)
جدِّ اعلیٰ کی نسبت سے ان کو اصغر کہتے ہیں۔ آپ اپنے آباؤ اجداد کے تمام کمالات اور اوصاف سے متصف تھے۔ طالبانِ حق کے آئینہ ہائے دل سے زنگار دور فرمایا کرتے تھے (اور سالکوں کی رہنمائی فرماتے تھے)

اُن کی وفات سنہ ۱۱۰۰ھ کے دوسرے عشرہ میں ہوئی۔ مزار شریف میر سید طیب قدس سرہٗ کے پہلو میں واقع ہے۔

۲۴

میر سید نعمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

میر سید نعمت اللہ ابن میر سید محمد زاہد ابن میر عبد الواحد (قدس اللہ سرہم) جب سید محمد زاہد سجادہ نشینی کا بار نہ اٹھا سکے تو اس دولت کا قرعہ سید نعمت اللہ کے نام نکلا (سجادہ نشین ہو گئے م) ظاہری عقل و دانش میں بلند پایہ تھے۔ اور حقائق و معارف میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ابتدائے حال میں اپنے عمِ محترم میر عبد الباقی بن میر عبد الواحد اصغر کے (جن کا ذکر آخر الکرام کی فصل ثانی میں آئے گا) شاگرد ہوئے اس کے بعد ملا قطب الدین سہالوی شہید کے حلقۂ درس میں پہونچے اور کامل استعداد کے ساتھ تکمیل درس کر کے فاتحہ فراغت پڑھی اور وطن مالوف آکر آباؤ کرام کے سجادہ پر رونق افروز ہوئے اور اس مسندِ ارشاد کی تعلیم و تعلّم کے اضافہ کے ساتھ رونق کو دو گنا کر دیا۔ راقم الحروف اکثر حاضرِ خدمت ہو کر سعادت اندوز ہوتا تھا آپ بڑے صاحب باطنت مرشد نورانی، فضائلِ اخلاق کے مالک اور اخلاقِ کریمانہ کے حامل تھے۔ برکات کے آثار روشن پیشانی مبارک سے ظاہر ہوتے تھے۔ اس حقیر پر خاص مہربانی فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فقیر سے بیان فرمایا کہ قطب المحدثین سید مبارک بلگرامی قدس سرہٗ کے حلقۂ درس میں (جن کا ذکر شریف اسی فصل میں آئے گا) ایک روز میں حاضر ہوا کلام اللہ کی ایک آیت کا ذکر تھا سید مبارک نے مکمل آیت پڑھے جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے فوراً اس آیت کو آخر تک پڑھ دیا۔ سید مبارک نے دریافت فرمایا کہ تم حافظ ہو؟ میں نے اپنی طبیعت کے مطابق جواب دیا کہ حافظ تو نہیں ہوں۔ مگر حافظ کا باپ ضرور ہوں۔ ان کے ایک صاحبزادہ کا نام حافظ تھا

سید نعمت اللہ ۵ رمضان المبارک ۱۱۴۰ھ کو جنت رضوان میں آرام فرما ہوئے میر سید طیب کے مزار کے پائیں احاطہ کے باہر دروازہ کے داہنی جانب مدفون ہوئے۔ مولف اوراق (میر غلام علی آزاد) نے اس طرح تاریخ کہی۔

نعمت اللہ سید العرفام   درگلستان قدس آرامید
ہاتفے گفت سال تاریخش   صاحب نعمت ارم گردید ۱۱۴۰ھ

۲۵

شاہ طیب قدس سرہٗ

آپ اسی درخت کے ثمر (اس خاندان کے ایک فرزند) اور اپنے اسلاف کے علم کے وارث ہیں۔ ظاہری و باطنی تمام فضائل میں صاحب استعداد تھے۔ کچھ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں اس کے بعد میر عبدالہادی بن میر عبدالواحد اصغرؒ کی شاگردی اختیار کی۔ اور باقی درسی کتابیں انہی سے ختم کیں۔ اور قطب المحدثین سید[1] مبارک قدس سرہٗ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کا خط نسخ و نستعلیق اگرچہ طبعی ہے لیکن بہت عمدہ، پختہ اور حسین واقع ہوا ہے جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو جلاء حاصل ہوتی ہے۔ ان کے خط کی تیزی سے عقلیں حیران تھیں۔

شرح ملا جامی کو اول سے آخر تک ایک ہفتہ میں تحریر کر دیا۔ اور بہجۃ المحافل جو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک ضخیم کتاب ہے اور یحییٰ ابن[2] ابی بکر عامری یمنی کی تصنیف ہے صرف "۲۳" دن میں لکھ دی ایک بڑا کتب خانہ اپنی خوش خطی کا یادگار چھوڑا ہے۔ ایام جوانی میں کچھ دن ملازمت کے عالم میں گذارے دنیاوی کاموں کے باوجود باطن کی صفائی وجلاء اور کتابت کے شغل سے خود کو باز نہیں رکھا والد کے انتقال کے وقت گجرات (احمد آباد) میں تھے اس خبر کے سنتے ہی نوکری چھوڑ کر وطن واپس آ گئے۔ اور اپنے بزرگوں کے سجادہ پر متمکن ہوئے۔ اطاعت و ریاضت اور درس و تدریس میں مشغول ہو کر زندگی اچھی طرح بسر کی، رجب

---

[1] ابن فخر الدین حسینی واسطی بلگرامی۔ کتب متداولہ خواجہ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی سے پڑھیں۔ اور حدیث شیخ نور الحق بن شیخ عبدالحق محدث بخاری دہلوی سے شیخ ابوالرضا بن اسمٰعیل سبط حضرت شیخ عبدالحق محدث مذکور سے بھی استفادہ کیا اپنی عمر عزیز علوم دینیہ خصوصاً حدیث اور طلباء کی تعلیم میں صرف فرمائی ۱۱۱۵ھ میں عشق کے پرندے نے قفس عنصری سے پرواز کر کے باغ رضوان کے شاخسار میں آشیانہ بنایا (استقال فرمایا) (مآثر الکرام)

[2] شافعی متوفی (۸۱۶ تا ۸۹۳ھ) یمن کے محدث و شیخ تھے۔ مکہ مکرمہ میں ابوالفتح مراغی سے حدیث سنی ان کے بہت سے شیوخ ہیں ابن فہد مکی (سید محمد بن محمد فہد المتقی الہاشمی (۷۸۷ تا ۸۷۱ھ) صاحب تحفۃ الاشراف و ذیل تذکرہ ذہبی) بھی ان کے شیخ تھے بہت سی اہم تصانیف یادگار چھوڑی ہیں منجملہ ان کے غربال الزمان، الریاض المستطابۃ فی معرفۃ من روی فی الصحیحین من الصحابۃ، التحفۃ الجامعۃ لمفردات الطیب ان کے علاوہ بھی ان کی اتنی تعداد ہے کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کتاب بہجۃ المحافل سیرۃ و معجزات اور شمائل نبوی میں طبع ہو چکی ہے۔ (بحوالہ تحفۃ الاخوان معجم المطبوعات، فہرس الفہارس وغیرہ)

۱۱۵۲ھ چہار شنبہ کے دن آخرت کے پاکیزہ گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان کی قبر میر عبدالواحد اکبر قدس سرہٗ کی قبر کے چبوترہ کے پائیں ایک چبوترہ پر ہے۔ جو میر سید طیب کے احاطہ کی مشرقی دیوار سے ملا ہوا ہے۔ راقم الحروف نے آیت کریمہ "وَهُمْ مُكْرَمُونَ فِي جَنّٰتِ النَّعِيْمِ" سے تاریخ وفات نکالی۔

شیخ حسن بن علی عجیمی[1] نے شیخ ابن فارض[2] مصری کے قصیدہ لامیہ کی شرح میں لکھا ہے کہ شیخ علامہ سیدی شہاب الدین احمد میورقی[3] طائفی کی ایک تحریر میں یہ بات موجود ہے کہ مَنْ اَرّخ وفات شیخ کان فی شفاعتہٖ یعنی جس شخص نے کسی بزرگ کی تاریخ وفات کہی وہ کل قیامت میں اس کی شفاعت کرے گا۔ اسی بنیاد پر اس فقیر نے اکثر بزرگوں کی تاریخیں آیات قرآنی سے نکالی اور نظم و نثر میں لکھی ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ پاک اور مقدس روحوں کی برکتیں اس شکستہ پر و بال کی مددگار ہوں گی۔

---

[1] حسن بن علی عجیمی (۱۰۴۹ تا ۱۱۱۳ھ) ولادت مکہ میں اور وفات طائف میں ہوئی۔ ان کے آثار میں خبایا الزوایا اور اہداء اللطائف اور علم فرائض اور تصوف میں بہت سے رسائل ہیں ان کو شیخ تاج الدین الدہان نے جمع کیا ہے۔ اس میں ان کے شیوخ اور ان کی مسموعات کا بیان ہے ابوطاہر مدنی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے استاد ان کے شاگردوں میں ہیں (تقصار۔ الاعلام)۔

[2] ابن فارض مصری (۵۷۶ تا ۶۳۲ھ و ۱۱۸۱ تا ۱۲۳۵ء) ان کی کنیت ابوحفص اور ابوالقاسم ہے ان کا نام عمر ہے۔ مرضعِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حلیمہ سعدیہ کے قبیلہ بنی سعد سے ہیں۔ ان کے والد علی بن مرشد بن علی الحموی مصر کے علمائے عظام میں سے تھے حماۃ (یہ شام کا ایک شہر ہے) سے مصر پہنچے اور حکام کے سامنے عورتوں کے فرائض مردوں پر ثابت کیے۔ اور اسی وجہ سے ان کا لقب فارض پڑ گیا۔ ابن الفارض نے پہلے مسلک شافعیہ اختیار کیا اور ابن عساکر سے حدیث اخذ کی۔ علامہ منذری صاحب "الترغیب والترہیب" حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔ اس کے بعد صوفیہ کا طریقہ اختیار کیا۔ اور زندگی کے بقیہ دن غریبہ اشعار اور ہجر کی واردات نظم کرنے میں گذار دی۔ پندرہ سال مکہ معظمہ میں رہے اکثر اشعار وہیں کہے ہیں ان کو حسن سے عشق تھا اور سماع سے محبت تھی۔ مناوی نے کہا ہے کہ ان کا سماع فاسقوں کے سماع کی طرح نہیں تھا۔ ذہبی نے کہا کہ وہ سید مصر تھے اور شیخ اتحادیہ تھے۔ شیخ ابن عربی اور شیخ قونوی کی طرح شیخ ابن فارض کے بارے میں دو فریق متحارب ہیں عیون و معارف اور فنون لطائف پر مشتمل ابن فارض کا ایک دیوان بھی ہے جس کے مقاصد میں ایک قصیدہ "تائیہ" بھی ہے جو سات سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی طرح لوائح الجنان اور روائح الجنان بھی اس کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلف کو خواب میں اشارہ فرمایا کہ اس قصیدہ کا نام "نظم السلوک" رکھو تو مؤلف نے اس کا یہی نام رکھا۔ اور یہ قصیدہ مشائخ صوفیہ اور ان کے علاوہ فضلاء علماء اور اہل حقیقت میں بہت مشہور ہے ابن فارض کا دیوان طبع ہو چکا ہے اور اس پر چند علماء نے شرحیں بھی لکھی ہیں منجملہ ان کے شرح عبدالغنی نابلسی ہے جو "کشف السر الغامض فی شرح دیوان ابن فارض" کے نام سے معروف ہے اور دوسری شرح شاید حسن بن محمد البورینی (۹۶۳ھ تا ۱۰۲۴ھ) کی طبع ہو چکی ہے مصطفیٰ حلمی نے "ابن الفارض والحب الالٰہی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے نیز "ابن الفارض" مؤلفہ رضا قمیر بھی طبع ہو چکی ہے (وفیات الاعیان، میزان الاعتدال، شذرات، مفتاح السعادۃ التاج)۔

[3] میورقہ۔ اٹلی کے نزدیک بحر روم میں ایک جزیرہ ہے۔

۲۶

سید دین محمد سلمہ اللہ تعالیٰ

سید دین محمد، ابن شاہ طیب بن سید نعمت اللہ قدس اللہ سرہم۔ آج کل صاحب کرامت اجداد کے مسند پر متمکن ہیں۔ آپ محمود اوصاف کے مالک اور اپنے اسلاف ستودہ کے طریقہ پر گامزن ہیں۔ "اے اللہ تو اس کی مدد فرما جو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی مدد کرے اور ہم کو اپنے نیک بندوں کی اور اپنے قریبی دوستوں کی محبت عطا فرما۔ اے ہمارے رب ہماری دعاؤں کو قبول فرما بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

۲۷

سید محمود اصغر رحمۃ اللہ علیہ

سید محمود اصغرؒ ابن سید حسین بن سید نوح بن سید محمود اکبر قدس سرہم۔ آپ کے دادا سید محمود اکبر کی نسبت سے ان کو اصغر کہتے ہیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اور ان کے والد سید حسینؒ کا تذکرہ فضلاء کے ذکر میں آئے گا۔ سید محمود کا عنصر لطیف ملکی تھا۔ وہ انسانی شکل میں ایک پاکباز، عبادت گذار، صفائے باطن اور کمالات ظاہری کے مالک تھے۔ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل فرماتے ہیں ؎

"محمود در فضائل کسبی و موہبی — ہمتائے او نزادہ ز ارحام عنصری"

ابتدائے حال میں تحصیل علم کے ارادہ سے قنوج گئے اور وہاں کے علماء سے درسی کتابیں پڑھیں اور استعداد تام حاصل کرلی۔ طالب علمی کے زمانہ میں باوجودیکہ وطن قریب تھا لیکن کبھی وطن کی جانب توجہ نہ کی۔ بلگرام اور قنوج کا درمیانی فاصلہ صرف پانچ میل ہے علوم وفنون کے حصول پر کمربستہ رہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں فراغت حاصل کرلی اور ظاہر و باطن کی تکمیل کرلی۔ اس کے بعد وطن میں قیام کے لیے مراجعت کی۔ اس زمانہ میں میر عبدالواحد قدس سرہٗ قصبہ سانڈی میں مقیم تھے۔ حضرت میر کی خدمت میں پہنچ کر حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے۔ اور سخت ریاضتیں کیں۔ حضرت میرؒ نے ان کو اپنی خاص عنایتوں سے نوازا۔ اور اپنی صاحبزادی کو ان کی زوجیت میں دیدیا اس محبت کی بنا پر جو ان کو اپنی صاحبزادی سے تھی۔ اہل وعیال کے ساتھ بلگرام میں تشریف لاکر اپنے وطن کی حیثیت سے اس مقام کو زیب وزینت بخشی۔ سید محمود آخری عمر تک یہیں گوشہ نشین رہے۔ اور گوشہ عبادت سے پھر باہر قدم نہیں نکالا۔ کسی جگہ کا سفر نہیں کیا، صرف ایک مرتبہ مزارات مشائخ کی زیارت کیلئے دہلی کا سفر اختیار کیا اور سب آسودگان حضرت دہلی کی خاک پاک کی زیارت سے مشرف ہوکر گوناگوں برکتوں کے انوار حاصل کیے وہاں شیخ

عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے اکابر کی صحبت میں رہے پھر وطن واپس آگئے۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اپنے اوقات کو معمور بنائے رکھا۔

۲۱ رمضان سنہ ۱۰۲۴ھ کو رہگذارِ عالم روحانی ہو گئے۔ میر سید طیب قدس سرہٗ نے یہ مصرعہ تاریخ کہا: ؎

ولی عاقبت محمود باشد

۱۰۲۴ھ

باغِ کنار کے شمالی مشرقی گوشہ میں آپ کا مزار ہے۔ اور "باغِ محمود" اسی باغ کو کہتے ہیں جو ان کے نام نامی سے منسوب ہے اور ان کی انگشت ہائے بابرکت کے نشانات آج بھی کلام الٰہی کے اس نسخہ سے نمایاں ہیں۔ جو صحت کے لحاظ سے امام کا درجہ رکھتا ہے۔ (یعنی بہت ہی زیادہ صحیح نسخہ ہے) کتابت قرآن مکمل (تحریر) ہونے کی تاریخ یکم ذی الحجہ سنہ ۱۰۱۹ھ تحریر فرمائی ہے جبیبۂ میر عبدالواحد کے بطن سے ان کے چار صاحبزادے پیدا ہوئے سید عبداللہ، سید عبداللطیف، سید امان اللہ اور سید محمد اعظم مؤلف اوراق (میر غلام علی آزاد) کا نسب تین واسطوں سے سید امان اللہ تک پہنچتا ہے۔

۲۸

میر سید حسن دہلی وال بلگرامی قدس سرہٗ

سید السادات آپ کا لقب تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ میر سید حسن ابن سید ابراہیم بن سید نظام الدین بن سید محمد ماہ بن سید میران عرف سید ماہ میر بن سید بڈھ بن سید جلال الدین بن سید ابراہیم بن سید ناصر بن سید مسعود بن سید سالار بن سید محمد صغریٰ قدس سرہم۔

آپ خلاصہ خاندان سیادت اور مجموعہ اہل علم و عبادت تھے۔ بچپن میں تحصیل علم کی غرض سے وطنِ مالوف سے ہجرت اختیار کی۔ ان کے طالع کی رسائی نے ان کو شیخ عبدالعزیز بن حسن کمال الحق قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچادیا شیخ کی صحبت کے سایہ میں جگہ لے کر ان کی شاگردی اختیار کی۔ معقولات اور منقولات کی کتابیں استعداد کے ساتھ پڑھیں اور کمالات عظیم کی بلندیوں کو سر کیا۔ اسی زمانہ میں شیخ نے ان کو خلعت خلافت عطا فرما کر ممتاز بنایا

لہ بن طاہر عباسی دہلوی اکابر مشائخ چشتیہ میں سے ہیں۔ ولادت سنہ ۸۹۸ھ بمقام جونپور ہوئی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب حسینی بخاری نیز شیخ ابراہیم بن معین الحسینی ایرجی کے شاگرد تھے۔ اور آخر میں شیخ قاضی خان بن یوسف ناصحی کی صحبت پائی۔ اور انہیں کی خدمت میں رہ گئے۔ شیخ تاج محمود جونپوری کے سلسلۂ چشتیہ میں مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ ان کی بالمیس تصنیفات یادگار زمانہ ہیں!

(نزہۃ الخواطر۔ مفتاح التواریخ، تقصار)۔

اور اپنی دامادی کے شرف سے بھی نوازا ۔ ایک خاص ضرورت سے ملک دکن کا سفر اختیار کیا اور عرصہ دراز تک وہاں مقیم رہے ۔ کچھ عرصہ کے بعد دہلی تشریف لائے ۔ اور گوشہ نشین ہو گئے ۔ آخر میں شیخ کے حکم سے بلگرام آئے اور معتدبہ زمانہ ہوئے اور بلگرام کو اپنے ظاہری و باطنی فیوض سے معمور فرمایا ۔ آپ نے طویل عمر پائی اور بلگرام ہی میں ۱۰۰۰ھ کے بعد عالم علوی کی جانب رخت سفر باندھا ۔ (انتقال کیا) مزار شریف محلہ سید واڑہ میں مقام فیض و برکت ہے ۔ ان کے "دہلی وال" لقب کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ جب میر سید حسین دوسری مرتبہ بلگرام تشریف لائے تو "ہیچ ہیچ" کے قبیلہ میں شیخ عبد العزیز کی صاحبزادی سے جو خاندان ہی کی لڑکی تھیں عقد فرمایا ، صاحب مرآۃ المبتدین لکھتے ہیں کہ :۔

"وہ بڑے والا شان بزرگ گذرے ہیں مجتبوی نورانیت اور مرتضوی نشانیاں انکی پیشانی سے ظاہر تھیں لوگ ان کو وقت کا سید السادات کہتے ہیں :"

جامع علوم اصول و فروع تھے اور شیخ عبد العزیز دہلوی کے شاگرد و مرید اور داماد تھے ۔ شیخ نے متعدد بار منبر پر برسر عام فرمایا ! اے میرے آقا ! وہ تمام امانتیں جو ہم کو آپ کے دادا سے ملی تھیں ہم نے آپ کی خدمت میں سلامتی کے ساتھ پیش کر دی ہیں "۔ اکثر اساتذہ اور طلباء حضرت میر کے درس میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے لوگ انہیں مجتہد زمانہ سمجھتے تھے ۔ آپ کہتے تھے کہ "اس شخص کا حال کیا ہوگا کہ جس کا دین اس کے نفس کی ہوس ہو اور جس کی فکر دنیا کا جمع کرنا ہو ۔ نہ نیک کردار ہے کہ مخلوق میں منتخب ہو اور نہ عارف جو مخلوق سے کنارہ گیر ہو"۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت میر تحصیل علوم اور تکمیل نفس کے بعد اپنے پیر کی مرضی سے وطن واپس آئے اور اپنے خاندانی مکان کو ہمسایوں سے طلب کیا ۔ تو انہوں نے کہا کہ میر جہاں تک نشان لگا دیں وہاں تک ان کے مکان کی حد ہے چونکہ میر بچپن ہی سے وطن سے چلے گئے تھے ۔ لہٰذا ان کے تمام ہمسایوں نے زمین کو اپنے اپنے مکانوں میں داخل کر لیا تھا ۔ اس وجہ سے مکان کی حدود کا صحیح پتہ نہ چل سکا ۔ حضرت میر نے وہ جگہ ہی چھوڑ دی ۔ اور دوسری جگہ مکان بنایا ۔ کہ مبادا دوسرے کی زمین قبضہ میں آجائے اور دیانت میں فرق آئے ۔ وہ کلمہ حق کہنے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے ۔ کسی کو اچھا لگے یا برا ان کو اس کی پروانہ تھی ۔ وہ بڑی بے باکی کے ساتھ لوگوں کے سامنے کلمہ حق ادا کر دیتے تھے اگرچہ ان کے صاحبزادگان اور خدام اس بات سے منع کرتے تھے مگر ان کا منع کرنا کچھ اثر نہیں کرتا تھا ۔ میر صاحب کی یہ عادت تھی کہ شہر اور خاندان میں اگر کسی مرد کا انتقال ہوتا تھا تو تیسرے دن اس کے گھر جاتے تھے ۔ اور اس کی بیوی سے کہتے تھے کہ رونا دھونا کم کرو ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت ہے دوسرا شوہر ڈھونڈھو تاکہ روٹی کپڑے اور دوسرے اخراجات سے مطمئن ہو جاؤ ۔ چونکہ ہندوستان میں دوسرا شوہر نہیں کرتے ہیں مردوں اور عورتوں کو یہ بات بری معلوم ہوتی تھی اور وہ ان کو سخت جواب دیتے تھے میر صاحب کو برا نہیں معلوم ہوتا تھا ۔ میر صاحب کے مکان کے چاروں طرف انہی کی قوم اور عزیز و اقارب سادات کے مکانات تھے ۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی لڑکا بھی ان کے سامنے سے گذر جاتا تو میر صاحب سرو قد

کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اگر سادات کا کوئی دودھ پیتا بچہ ان کی خدمت میں لایا جاتا تاکہ اس کے لیے دعا کریں اور اس پر دم کریں تو میر صاحب کھڑے ہو جاتے اور کھڑے کھڑے ہی اس پر دم کرتے تھے۔ آپ نے بڑی عمر پائی اور جب تک زندہ رہے یہی حالت رہی۔ نیز ہر مجلس خاص و عام میں فرماتے تھے کہ حضرت فاطمہؓ کی تمام اولاد جنت کی بشارت[1] یافتہ ہے لوگ بہت منع کرتے تھے کہ سادات بہت سے ایسے بھی ہیں جو عبادت نہیں کرتے ہیں۔ ایسی بات کہنی مصلحت کے خلاف ہے۔ تو آپ جواب دیتے تھے اگر مصلحت نہیں ہے تو نہیں ہوگی ہم تو ان کے نوشتہ کو نقل کرتے ہیں۔

آخر وقت تک ان کی زبان سے یہی کلمہ نکلتا رہا۔" (مرآۃ المبتدین کا کلام ختم ہوا) واضح رہے کہ میر سید حسین قدس سرہٗ کا قول کہ اولاد فاطمہؓ "ہمہ مبشر بہ جنت اند" (اولاد فاطمہؓ سب کے سب جنتی ہیں) شیخ محی الدینؒ ابن عربی کے مذہب کے مطابق ہے (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو اپنے انوار سے معمور فرمائے) جو انہوں نے فتوحات مکیہ کے انتیسویں باب میں بیان فرمایا ہے اور شیخ ابن حجر مکی (اللہ ان کی روح کو آسائش عطا فرمائے) نے صواعق محرقہ میں بھی چند احادیث نبوی اور علماء کے اقوال اس سلسلہ میں منقول ہیں۔ قاضی شہاب الدین ملک العلماء (اللہ ان کی قبر کو معطر فرمائے) کا بھی مذہب یہی ہے۔ جو انہوں نے اپنی تصنیف "مناقب السادات"[2] میں بیان کیا ہے۔ اِنْ شِئْتَ ذٰلِکَ فَاطْلُبْ ھُنَاکَ (اگر تم چاہتے ہو تو وہاں دیکھو) اس فقیر نے بھی اس مبحث کو رسالہ "سند السادات" میں تفصیل سے تحریر کیا ہے۔

اب اس فقیر کا عندلیب ناطقہ شیخ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہٗ کے حالات برکت کے لیے تحریر کرتا ہے اور اس وسیلہ سے سعادت دوام حاصل کرتا ہے۔

شیخ عبدالعزیزؒ دہلوی قدس سرہٗ کے گرامی قدر صاحبزادہ اور سجادہ نشین شیخ قطب عالمؒ نے اپنے آباءِ کرام کے حالات تحریر فرمائے ہیں ان میں سے منتخب حالات میسر آ گئے ہیں۔ اس کتاب سے یہاں مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

"شیخ عبدالعزیز[3] قدس سرہٗ کے دادا شیخ طاہرؒ حصول علم کے لیے ولایت ملتان سے دیارِ شرق کی طرف آئے۔ چلتے چلتے شہر بہار میں پہنچے۔ اور یہاں پر اور راستہ میں جگہ جگہ اس زمانہ کے فضلاء سے علم حاصل کرتے رہے۔ قاضی بہار نے اپنی لڑکی ان کے حبالۂ عقد میں دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا فرمائی۔

---

[1] ایک چھوٹا گروہ اس جانب گیا ہے لیکن دلائل صحیحہ اور براہین قاطعہ اس کے خلاف پکار پکار کر کہہ رہے ہیں علماء و مشائخ کی جانب سے اس طرح دعووں کا صادر ہونا اہل بیت نبویؐ کے ساتھ ان کی انتہائی محبت کی وجہ سے ہے کہ حبک الشیئ یعمی ویصم (کسی چیز سے تمہاری محبت تم کو گونگا اور بہرہ کر دیتی ہے) [2] شیخ کمال الدین ابن فخرالدین نے ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری کے زمانہ میں دلاور خان کے حکم سے ۹۹۲ھ میں "براہین قاطعہ" کے نام سے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔

[3] یہ شیخ عبدالعزیز ولی اللہ دہلویؒ کے فرزند نہیں ہیں ان کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔

کچھ مدت کے بعد شیخ یہاں سے اہل وعیال کے ساتھ جونپور منتقل ہو گئے۔ اور اسی جگہ جوارِ رحمت میں آرام فرما ہوئے ان کا مزار شریف جونپور میں زیارت گاہِ عوام ہے۔

شیخ طاہر قدس سرہٗ کے صاحبزادہ شیخ حسن نے نو سال کی عمر میں کلامِ الٰہی حفظ کیا۔ اور اٹھارہ سال کی عمر میں اکثر درسی کتابیں پڑھ لیں۔ اور اسی عمر سے "حق" کے ساتھ مشغول ہو گئے۔ پچیس سال کی عمر میں معرفت میں صاحب کمال ہو گئے۔ اس وقت راجی سید حامد شاہ کے مرید ہوئے۔ آپ سے خرقہ خلافت اور کمال الحق کا خطاب پایا۔ راجی سید حامد شاہ فرماتے تھے کہ اگر کل قیامت کے دن پوچھیں گے کہ ہماری درگاہ عالم پناہ میں تو کیا تحفہ لایا ہے؟ میں کہہ دوں گا یہ فرزند یعنی شیخ حسن۔ اور اکثر فرماتے تھے۔ کہ شیخ حسن ہماری پسندیدہ دلیل ہے۔

سلطان سکندر لودھی شیخ کے ساتھ غائبانہ اعتقاد رکھتا تھا۔ اس نے تشریف لانے کی استدعا کی اس وقت سلطان کا لشکر آگرہ میں تھا۔ شیخ حسن جونپور سے آگرہ پہنچے۔ سلطان نے خدمت کا "زین پوش" کاندھے پر رکھا (سلطان نے ازراہِ عقیدت بڑی خدمت کی) شیخ کچھ دنوں آگرہ میں مقیم رہے آخرکار دہلی جانے کیلئے تیاری کی۔ دہلی پہونچ کر بدیع منزل میں مقیم ہو گئے۔ بدیع منزل سلطان تغلق کے بنائے ہوئے حصار کا ایک برج ہے زبان کی تبدیلی سے اس کو "بجی منزل" کہتے ہیں۔

ایک دن ایک قوال نے یہ رباعی پڑھی:۔ ؎

لے ساقی از آن مے کہ دل و دین من است
پر کن قدح کہ جانِ شیرین من است
گر ہست شراب خوردن آئین کسے
معشوقہ بجام خوردن آئین من است

شیخ کو عجیب ذوق پیدا ہوا۔ برابر تین دن تک بغیر کچھ کھائے پیے وجد کرتے رہے تیسرے روز اسی شوق کی حالت میں جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی وفات جمعہ کے دن ۴ ربیع الاول شریف ۹۰۹ھ کو ہوئی۔ مدفن مبارک اسی بدیع منزل میں ہے۔

شیخ کی تصنیفات سے "مفتاح الفیض" ہے جو ترسیٹھ رسالوں پر مشتمل ہے۔ شیخ حسن کے چار صاحبزادگان تھے۔ شیخ عبد العزیز سب سے چھوٹے لیکن مرتبہ میں سب سے بڑے ہیں ان کے والد نے عالمِ طفلی ہی میں ان کو مرید کر لیا تھا۔ اور خرقہ خلافت عطا فرما دیا تھا۔ ان کو ڈھائی سال کا چھوڑ کر دنیا سے رحلت فرمائی۔ اس کے بعد ان کی تربیت خواجہ جلال الحق قاضی خان ظفرآبادی نے کی۔

شیخ عبد العزیز جب سن تمیز کو پہنچے تو حاجی عبد الوہاب بخاری کے صاحبزادہ میر سید محمد کی شاگردی اختیار کی اور جناب حاجی سے کتاب فصوص الحکم پڑھی۔ اور دوسرے فوائد علمی اکتساب کیے۔ حضرت حاجی صاحب آپ کے

بڑی توجہ رکھتے تھے۔ اپنی زبان گوہر بار سے ان کو عبدالعزیز عاشق کہتے تھے۔ خانوادہ سہروردیہ کا خرقہ خلافت پہنایا اور فرمایا میں دنیا سے اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک کہ عبدالعزیز کو اپنی طرح نہ کر لوں گا اس کے بعد ظفرآباد گئے اور والد بزرگوار کی امانت قاضی خان قدس سرہٗ سے حاصل کی۔ اور تین سال سخت ریاضت کرنے کے بعد کہ اپنے مس وجود کو کندن بنا لیا تب خرقہ خلافت پہنا۔ اس کے بعد میر سید ابراہیم ایرجی کی خدمت میں پہونچے اور بعض کتابیں ان سے پڑھیں۔ اور خرقہ خلافت قادریہ کے حصول سے مفتخر ہوئے۔ اسی طرح شیخ تاج محمود سے سلسلہ چشتیہ کی خلافت حاصل کی اور سجادہ ارشاد پر بیٹھے۔ تمام عمر مخلوق کو حقائق کی طرف متوجہ کرتے رہے انتقال کے وقت ذوق وشوق کی حالت میں اس عالم سے رخصت ہوئے۔ حافظ محمد صادق مغل نامی شخص بہت اچھے خوش الحان قاری تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ قرآن پڑھو۔ انہوں نے سورۂ "ق" کی تلاوت شروع کی جب آیت "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" پر پہونچے تو حالتِ شوق میں افزونی ہوئی۔ تین مرتبہ ٹوپی سرِ مبارک سے اتار کر رقص کرنے لگے۔ پھر حافظ صاحب نے آیت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ پڑھی تو شیخ میں ایک نیا ذوق اور نئی حالت پیدا ہوئی۔ جب حافظ صاحب نے تلاوت قرآن تمام کی اور آیت سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين والحمد لله رب العلمين پڑھی تو حضرت شیخ دونوں ہاتھ چہرہ مشک بو پر رکھ لیے پھر سینۂ فیض معمور پر لے گئے۔ اور جانِ جاں آفرین کے سپرد کر دی۔

آپ کی تصانیف میں تئیس رسالے ہیں۔ صاحب مرآۃ المبتدین کہتے ہیں "شیخ عبدالعزیزؒ دہلوی اپنے وقت کے بڑے بزرگ تھے لوگ ان کو "بحر مواج" کہتے ہیں ان کی عقل ان کے علم پر غالب تھی اسی وجہ سے حفظ مراتب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اور پائے مبارک کبھی ادب کے راستہ سے باہر نہیں رکھا۔ اپنے حال کو چھپانا اپنے لیے فرض سمجھتے تھے۔ اور اکثر ارشاد فرماتے تھے کہ جس طرح پیغمبروں (علیہم الصلوٰۃ والسلام) پر واجب ہے کہ معجزات کو ظاہر کریں اسی طرح امت پر کرامات کا چھپانا فرض ہے۔ جامع فروع واصول شیخ متعدد مرتبہ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے عالمِ خواب میں مشرف ہوئے۔ اور فوائد گوناگوں حاصل کیے ہیں۔ بزرگانِ دہلی کی روحانیت سے بھی آپ نے استفادہ کیا تھا۔ چنانچہ نفس الامر میں انہیں "اویسی" کہنا چاہیے نفس کی شکستگی اس حد تک تھی کہ اپنا اعتبار ہرگز نہ کرتے۔ اور دوسروں پر اعتراض بھی نہ کرتے۔ مگر جب دینی غیرت کا معاملہ ہوتا تو ضرور اعتراض فرماتے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہر چیز کا ایک خدمت گار چاہیے۔ تاکہ اس کی حفاظت کرے "دین کا حافظ" ادب ہے اور یہ بھی فرماتے کہ بندہ کو حق تک پہونچنے کے لیے ایک کام کرنا چاہیے وہ یہ کہ "خود کو ترک کر دے"۔

آپ نے اپنی پوری ذات سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گم کر دی تھی۔ خاندان نبوت کے ساتھ اعتقاد و اخلاص ہر چیز سے زیادہ رکھتے تھے۔ یعنی اس حد تک کہ محلہ شیخ میں بعض اہلِ حرفہ رہتے تھے۔ وہ لوگ خود کو سید کہتے تھے۔ جب شیخ درس کے لیے باہر آتے اور طلبہ کا مجمع ہوتا اس اثنا میں اگر ان کا کوئی چھوٹا بچہ کھیلتا ہوا ان کو

نظر آتا تو بغیر توقف کے درس کو روک دیتے اور کھڑے ہو جاتے اور جب تک وہ بچہ کھیلتا رہتا وہ پورے ادب کے ساتھ کھڑے رہتے اور انھیں اس سے اس کو نہیں ہٹاتے تھے۔ جب اس بات سے طلباء بہت پریشان ہوئے تو چوکیدار گلی کے سرے پر متعین کر دیا۔ تاکہ درس کے وقت کوئی بچہ ادھر نہ آئے۔ حضرت شیخ کو جب اس کا علم ہوا تو طالب علموں پر خفا ہوئے۔ جب تک بقید حیات رہے آپ کی یہی حالت رہی۔ ان کے تمام خلفاء صاحب حال و کرامات ہوئے ہیں۔ (مرآۃ المبتدین کا کلام ختم ہوا)۔

مولانا عالم کابلی کہتے ہیں کہ میں ۹۶۷ھ میں بمقام دہلی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے چاہا، کہ عارف جامی قدس سرہٗ کے ان دو اشعار کے معنی آپ سے دریافت کروں۔ ؎

عاشقم بے دلم اسیر و غریب — کارم از دست رفتہ و دستم گیر
ما بہ یاد تو زندہ می مانیم — ورنہ ہجراں نمی کند تقصیر

قبل اس کے کہ میں پوچھوں ان ابیات کے مناسب معنی اور ایسے معارف بیان فرمائے جس کے بعد مجھے پوچھنے کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہی۔

دربار اکبری کے امراء و اعیان شیخ کی خدمت میں حاضری دیتے اور آپ سے برکتیں حاصل کرتے تھے خصوصًا بیرام خان خانِ خاناں جب کوئی عرس شیخ کرتے تو ضرور حاضر ہوتا اور انتہائی عقیدت سے پیش آتا شیخ عبدالقادر بدایونی کہتے ہیں:۔

بیرام خان کی معزولی کے زمانہ میں دہلی گیا وہ ہر روز تصوف کی بعض کتابوں سے فائدہ اٹھانے اور فیض حاصل کرنے کے لیے شیخ کے پاس جاتا تھا۔ کچھ مجھے بھی اوقات آپ کی خدمت میں ایسے حاصل ہوئے جن کو میں زبانِ ذوق سے کس طرح بیان کروں۔

ان کے معجز بیان کلمات سے میں نے اس طرح لطف اٹھایا ہے کہ آج ایک زمانہ گزر گیا اور ابھی تک اسکی مٹھاس دل میں موجود ہے۔ ان کی وفات دو شنبہ کے دن ۱۷ جمادی الثانی ۹۷۵ھ کو واقع ہوئی "مقتضی نحبہ" تاریخ ہے، مزار شریف خانقاہ اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے صحن میں ہے۔
۹۷۵ھ

۱؎ ابن عارف المفتی ممتاز علماء میں سے تھے۔ بدایونی نے ان کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے صاحب تصنیفات تھے اپنی کشکول میں شرح مقاصد پر تعلیقات خود تحریر فرمائی ہیں۔ اور مطول پر حاشیہ لکھا ہے اور اولیاء اللہ کے حالات میں فواتح الولایۃ کے نام سے بھی مجموعہ تالیف کیا ہے ۹۹۳ھ میں وفات پائی (مرتبہ)

۲؎ ہمایوں بادشاہ کے بڑے امراء میں سے ایک تھا۔ اکبر بادشاہ کے جلوس کی ابتداء سے پانچ سال تک وکالت اور وزارت کے جلیل القدر عہدہ پر سرفراز رہا۔ اس کے بعد معزول ہوا آخر میں ۹۶۸ھ میں بمقام گجرات مبارک خان افغان کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔

(۲۹)

سید ابراہیمؒ عرف سید میاںؒ

آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے سید ابراہیم بن سید غلام محمد بن سید عبدالحق بن سید حسین دہلی وال بلگرامی قدس سرہم بلگرام کے مشائخ کبار سے تھے۔ فقر کی حیات کو بلند کرنے والے تھے۔ خدا پرستی اور عزلت نشینی اختیار کر لی تھی۔ میر سید حسین سید السادات کے مزار شریف کے جوار میں ایک مسجد اور اس کے ساتھ ہی ایک خانقاہ بنائی تھی۔ مہمان نوازی اور فقراء کی خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا۔ شہر میں آنے جانے والے مسافر اکثر آپ کی خانقاہ میں اترتے تھے۔ ان کی خدمت گاری میں کوئی دقیقہ حتی المقدور اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ۲۰ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ کو رحمت حق سے مل گئے ان کی خواب گاہ بلگرام میں ہے۔

(۳۰)

شیخ ادھنؒ معروف بہ شیخ الاسلام بلگرامی قدس سرہٗ

آپ حاجی سالار قنوجی کے صاحبزادوں میں سے ہیں اپنے زمانہ کے ولی کامل تھے۔ حاجی سالار کا نسب نامہ خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی قدس سرہٗ کے پیرومرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہٗ تک پہونچتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے خاندان والوں کو عثمانی کہتے ہیں۔ شیخ ادھن شیخ مبارک سندیلوی[له] کے خلفائے کبار میں سے ہیں۔ مقتدائے عصر اور مفتی شہر تھے۔ زہد و تقویٰ، شریعت کی حفاظت ظاہری و باطنی طالبوں کی مشکلات کے حل میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ شیخ محمد غوثی منڈوی کتاب "گلزار ابرار" میں شیخ سالار بدھ کے حالات کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں[له]:۔

"سید صفی جہتی، شیخ بدرالدین کھندی اور شیخ ادھن بلگرامی شیخ مبارک سندیلوی کے خلفاء میں سے تھے۔ یہ سب حضرات بلند مرتبت اور بلند احوال تھے۔ ابنائے زمانہ دین اور خداشناسی کے معاملات میں

سلہ بن حسین بن معین الدین حسینی نقوی شاگرد شیخ سعدالدین خیرآبادی شیخ سالار بن بہجت الدین کوروی سے خرقہ پہنا۔ اور شیخ نظام الدین امیٹھوی اور دوسرے شیوخ سے استفادہ کیا ۹۰۲ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر)

سلہ بن مٹھو خلیفہ شیخ بہاءالدین، سید عبدالغنی۔ فتحپور ہنسوہ والے اور شیخ مبارک سندیلوی ان کے مرید تھے۔ (اذکار ابرار)

ہمیشہ ان سے رجوع کرتے اور انکے ارشادات سے دونوں جہان کی مشکلات کو حل کرتے تھے۔

صاحب مرآۃ المبتدین شیخ ادھنؒ کی نسبت رقم طراز ہیں کہ

"شیخ ادھن استادِ شہر تھے۔ اور اکثر مدرسین اور طلباء استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے یہاں تک کہ ملا محمد خرازی جو ملا احمد جنیدی کے شاگردِ رشید تھے جس وقت ہندوستان آئے تو شیخ کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ درویش کا خلاف شرع وہ کام ہے جس کے کرنے کے بعد وہ شرمندہ ہو یعنی کیوں ایسا کام کیا۔"

ایک شخص نے شیخ سے پوچھا کہ بہترین اطاعت کیا ہے؟ فرمایا تمام اوقات میں ادب کا خیال رکھنا سوائے عیدین کی نماز کے خانقاہ کے صحن سے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ اور آج کل بھی ان کے سلسلہ میں یہی طریقہ رائج ہے کہ جانشین مسجد و خانقاہ کے صحن سے باہر نہیں جاتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن شہر کا معزول حاکم رخصت ہونے کے لیے شیخ کی خدمت میں آیا دیکھا کہ اپنے ہاتھ سے مسجد کے لیے اینٹیں بنا رہے ہیں۔ حاکم نے عرض کیا کہ اگر میں بحال ہو جاؤں تو اس کو میں درست کرا دوں گا۔ تاکہ یہ دردِ سر نہ رہے۔ فرمایا چونکہ تو ایک اچھا خیال دل میں لایا ہے بحال ہو جائے گا اور دعا کی۔ اسی روز اس کے افسرِ اعلیٰ کی مجلس میں کسی نے اس کے کام کی تعریف کی اور بحالی کا پروانہ اس کے نام جاری کر دیا گیا۔ جب اس کے پاس پہونچا لوگوں نے دیکھا کہ وہی تاریخ اور وہی وقت تھا جب کہ شیخ نے دعا کی تھی۔

آپ کے وصال کے وقت آپ کے بڑے صاحبزادے جن کا نام عبدالجلیل تھا آپ کے جانشین ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ان کا بھی وصال ہو گیا خلفاء نے ان کے والد ماجد کی قبر کے پہلو میں ان کی قبر بنائی وہ قبر انکی والد ماجد کی قبر کے رخ پر قدرے کج ہو گئی۔ جیسا کہ کوئی کسی بزرگ کے سامنے انکساری کرتا ہو۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شیخ ابوالمعالی جانشین ہوئے جب ان کا انتقال ہوا تو وہ بھی وہیں دفن کیے گئے۔ ان کی قبر بھی قدرے کج ہے۔ جب جب بھی سیدھی کرتے اسی طرح کج ہو جاتی" (مرآۃ المبتدین کا کلام ختم ہوا) شیخ ابوالمعالی کے انتقال کے بعد شیخ ابوالمعالی ملقب بہ شیخ الاسلام ثانی سجادۂ خلافت پر فائز ہوئے۔ آپ ایک اعلیٰ مرتبت بزرگ تھے۔ ظاہری اور باطنی دولت سے انہیں بھرپور حصہ ملا تھا۔ ایک عرصہ تک مسندِ ارشاد پر رونق افروز رہے اور ولایت کے دروازے طالبانِ خدا پر کھولتے رہے۔ بالآخر اپنے فرزند شیخ صوفی کو اپنی زندگی ہی میں اپنی جگہ سجادہ نشین کر دیا۔ آباؤ کرام کا خرقۂ خلافت ان کو پہنا دیا۔ اور خود دار الخلافہ شاہ جہان آباد روانہ ہو گئے۔ آسودگان خاک دہلی (اللہ ان کی قبروں کو اپنے نور سے معمور فرمائے) کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ عبادت کے لیے ایک حجرہ مسجد آدینہ میں مخصوص کر لیا۔ ایک عرصہ تک وہیں گوشہ نشین رہے۔ آپ حافظِ قرآن تھے اور اپنی خوش الحانی سے سننے والوں کے دلوں میں سوز و گداز پیدا کرتے تھے آپ کے ایک معتقد امیر نے آپ کی تعریف صاحبقران شاہ جہان کے سامنے کی اور بادشاہ کی صحبت میں یہ باریاب ہو گئے۔ اتفاقاً رمضان کا مہینہ تھا بادشاہ نے کہا کوئی

آیت رمضان کی فضیلت میں پڑھیے۔ انھوں نے آیت کریمہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ شروع کی اور ایسی خوش الحانی سے پڑھی کہ بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اور دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ دوسری مرتبہ بھی آیت آپ نے دوسری قرأت میں پڑھی۔ بادشاہ سلامت بہت محظوظ ہوئے اور بلگرام کے توابع میں "کرولی" نام کا ایک بڑا موضع شیخ کے حسب خواہش بطور مدد معاش آپ کو شاہ جہان نے مرحمت فرما دیا عطائے موضع مذکور کے فرمان کی تاریخ تحریر سنہ ۱۰۶۰ھ ہے۔

شیخ ابوالمعانی اپنے خاندان کے نمائندہ اور بقائے نام کا سرمایہ ہیں ان کے اسلاف کی سکونت کا علاقہ ان ہی کے نام سے مشہور ہے یعنی "محلہ شیخ معانی" محلہ سید واڑہ کے مشرق میں یہ محلہ واقع ہے واضح رہے کہ ایک مسجد جو شیخ اوحسن قدس سرہٗ نے بنائی تھی اس کے دروازہ کے بالائی پتھر پر منقش ہے۔ جس پر یہ تحریر ہے:۔

در ایام جلال الدین محمد اکبر غازی	کہ از معمار عدل او عمارت یافتہ دوران
بنا از میرزا حاجی محمد او ز نیک گشتہ	عجب دروازۂ خوش خم چو طاق ابروئے خوبان
گذشتہ نہصد و ہفتاد و ہشت از ہجرت مرسل	کہ گشتہ از درِ رحمت تمام اندر مہ شعبان

اور جب وہ مسجد شکستہ ہو گئی تو شیخ ابوالمعانی کے عہد میں مسجد کی جدید عمارت بنائی گئی اور جدید عمارت کا کتبہ جسے وسطی محراب کی پیشانی میں پتھر کی لوح پر منقش کیا گیا تھا یہ ہے:۔

در زمان شریف شاہ جہاں	منبع الجود مطلع الاحسان
ساخت مرزا حسن علی دانا	مسجد اسس علی التقوٰی
از پئے سال ایں خجستہ بنا	کردم از پیر عقل استملاء
عقل سے فی الفور در پاک بسفت	وادخلوا المسجد الحرام بگفت سنہ ۱۰۶۶ھ

کچھ مدت گذرنے کے بعد مسجد کی وہ عمارت بھی جو مرزا حسن علی دانا نے بنائی تھی شکستہ ہو گئی سنہ ۱۱۶۴ھ میں احمد شاہ[1] فرمانروائے ہندوستان کے وزیر اعظم نواب ابوالمنصور خان صفدر جنگ[2] کو مسجد کی تجدید عمارت کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے مؤلف نے شیخ غلام حسن صاحب سجادہ کی استدعا پر یہ قطعۂ تاریخ نظم کیا۔

در زمانِ جلوس احمد شاہ	زیر فرمان او ملوک جہات

---

[1] مجاہد الدین محمد ابوالنصر احمد شاہ بہادر بن محمد بادشاہ۔ رسمی ولادت سنہ ۱۱۴۰ھ۔ تخت نشینی سنہ ۱۱۶۱ھ عزل اور قید سنہ ۱۱۶۷ھ۔ قید ہی میں موت سنہ ۱۱۸۸ھ مدت حبس ۲۱ سال۔ کل عمر ۴۸ سال اور چند ماہ۔ مدت سلطنت ۶ سال کچھ مہینے۔ (مفتاح التواریخ)۔

[2] منصور علی خان متوفی سنہ ۱۱۶۷ھ۔

رکن عالی جناب صفدر جنگ | آصف عہد بانیٔ خیرات
کرد تعمیر خانۂ ایزد | یافت ازغیب حسنِ توفیقات
صاحب ایں مکان غلام حسن | زیب افزائے مسند برکات
گفت تاریخ ایں بنا آزاد | مسجد تازہ منزلِ حسنات

۱۱۶۶ھ

شیخ صوفی قدس سرہٗ صاحبِ عظمت وجلالت تھے اور اپنے سلسلہ عالیہ کے قواعد کے سختی سے پابند تھے۔ منقول ہے کہ ایک افغانی نے شیخ پر ایک جھوٹا دعویٰ کیا۔ کہ تم نے پانچ سو روپیہ نقد مجھ سے قرض لیا ہے۔ شیخ نے گواہ طلب کیے اس نے کہا میرے پاس کوئی گواہ نہیں ہے۔ تمہیں قسم کھانی چاہیے شیخ خاموش ہو گئے اور اٹھ کر گھر میں گئے بیوی کے زیورات اور گھر کا سامان فروخت کر کے پانچسو روپے اسے ادا کر دیے۔ افغان روپیہ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ کچھ مدت کے بعد واپس آیا اور شیخ کے قدموں میں گر گیا۔ اور عرض کی کہ میں ایک مفلس تھا۔ میرا نفس یہی گواہی دیتا تھا کہ آپ قسم نہیں کھائیں گے اور روپیہ دے دیں گے میں نے خلاف واقعہ روپیہ کا دعویٰ کر کے آپ سے روپیہ لے لیا۔ اور اس کو اپنا نفع اور فائدہ کا سرمایہ بنا کر تجارت میں لگا دیا۔ زمانہ نے میرا ساتھ دیا مجھے بہت زیادہ منافع حاصل ہوا اور اس پانچ سو روپیہ کی وجہ سے میں مالدار ہو گیا ہوں۔ مبلغ ایک ہزار روپیہ نقد اور کچھ عمدہ کپڑے اور اشیاء شیخ کے سامنے پیش کیں۔ شیخ نے ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور ارشاد فرمایا جو چیز میں دے چکا ہوں واپس نہیں لوں گا اس مرتبہ پہلے سے زیادہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ فرمایا۔ بلگرام کے برہمن بلبھدر نے ایک کتاب "درنورس سنگار" شیخ کے نام سے معنون لکھی اور اس کا "صوفی" نام رکھا۔ کتاب کے شروع میں چند دوہے شیخ کی تعریف میں تحریر کیے یہ دوہہ اسی جگہ سے لیا گیا ہے۔

جھلی جنگم سادھو رکھ راجا رانا رائے
تے لیکھے سون سہت کریں سو یہ دیت لٹائے

دیگر:۔

کرے کاسناں کوت کوئی کہے اپنو حال
بروے سوئے پلک میں صوفی کلپ مثال

ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند شیخ عبد الجلیل قدس سرہٗ ان کے قائم مقام ہوئے اس رسالہ کے تحریر کرنے والے (میر غلام علی آزاد) نے ان سے ملاقات کی ہے ازسرتاپا مجسم شریعت و طریقت تھے۔ ۱۱۵۰ھ کے بعد تیسرے عشرہ میں جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے ان کے بعد ان کے صاحبزادہ شیخ غلام مشائخ قدس سرہٗ ان کے جانشین ہوئے اور اپنے اسلافِ کرام کے طور طریقہ پر اور ان کے اخلاق کریمانہ

اقتدا میں پوری زندگی گذاردی۔ ان تمام بزرگوں کے مزارات شیخ اد ھن قدس سرہ کے مقبرہ میں ہیں۔ (اللہ ان کی ارواح کو آرام عطا فرمائے۔) شیخ غلام مشائخ کے صاحبزادہ شیخ حسن آباء کرام اور اجداد عظام کے جانشین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مرتبہ اور عمر میں زیادتی عطا فرمائے۔

۲۱

مخدوم محمد رکن الدین بلگرامی قدس سرہٗ

آپ حقائق الٰہیہ کے دانا اور بیدار دلی کے رموز کے شناسا تھے۔ باطنی کمالات کا علم ظاہری بزرگی کے ساتھ آپ کو حاصل تھا۔ درد طلب کے شکستہ دلوں کا علاج وصل کی مومیائی سے فرمایا کرتے تھے۔ (شکستہ دلانِ معرفت کو منزل وصل مطلوب تک پہونچاتے تھے) شیخ العبدیہ خیرآبادیؒ کے (جن کے محامد اوصاف مورخان روزگار نے مختصراً اور تفصیلاً بیان کیے ہیں) مرید، خلیفہ اور برادر زادہ حقیقی تھے۔ مخدوم محمد رکن الدین کے دادا میر میرانؒ کے دو صاحبزادگان تھے۔ میر نصیر الدین اور میر نظام الدین عرف شیخ العبدیہ قدس سرہم یہ دونوں بزرگ بھائی، مخدوم سید علاؤ الدینؒ صاحب ولایت قصبہ سندیلہ کے والد میر سید جان کی صاحبزادی کے بطن سے ہیں (یعنی مخدوم سید علاؤ الدین کے ہمشیرہ زادے ہیں)۔ میر نصیر الدین کے فرزند ارجمند مخدوم محمد رکن الدین تھے جن کے حالات معرض تحریر میں لائے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت باسعادت دارالارشاد خیرآباد میں ہوئی۔ اور اسی جگہ پرورش پائی۔ عم محترم میر نظام الدین معروف بہ (شیخ العبدیہ) کے دست حق پرست پر بیعت کی اور بلند درجات اور گرامی قدر مراتب حاصل کیے۔ خطۂ بلگرام میں ان کی تشریف آوری کا سبب یہ ہوا کہ چونکہ محلہ سید واڑہ میں آباد چار خاندانوں میں سے ایک خاندان کے "جد القبیلہ" سید بدر الدین کے صاحبزادہ سید عمر، شیخ العبدیہ کے صاحبزادہ شیخ ابوالفتح قدس سرہم کے مرید ہوئے اور اس خاندان کرامت نشان سے انہوں نے باطنی تعلق درست کیا تو جیسا کہ مرآۃ المبتدئین سے جو سید شریف ابن سید عمر مذکور کی تصنیف ہے معلوم ہوتا ہے سید عمر نے جناب شیخ ابوالفتح کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے وطن بلگرام کے ضعیف اور کمسن سال حضرات بُعد مسافت کے باعث حضور سے اکتساب فیض سے محروم رہتے ہیں لہٰذا مخدوم زادوں میں سے کسی ایک کو بلگرام بھیجنا چاہیے تاکہ وہاں کے لوگ انوار سعادت حاصل کر سکیں۔ شیخ ابوالفتح نے شیخ العبدیہ کی روحانیت سے رجوع کیا۔ وہاں سے محمد رکن الدینؒ بلگرام کے سفر پر مامور کیے گئے۔ لہٰذا حضرت مخدوم قدس سرہٗ خیرآباد سے بلگرام تشریف لائے اور اس خطہ کو اپنے قدوم کی برکات نامتناہی سے معمور فرمایا۔

آپ میر عبدالواحد اکبر" صاحب سنابل" کے ہم عصر ہیں ایک قبالہ شرعی میری نظر سے گذرا ہے جس میں آپ نے یہ عبارت خود اپنے مبارک خط سے تحریر فرمائی ہے:۔

"اقر المشرون المذکورون بالقسمة المسطورۃ فی الصدر عندی ۔ کتبہٗ خدیم العلماء محمد رکن الدین بخطہٖ" تاریخ تحریر قبالہ ۱۹ محرم الحرام ۱۰۰۸ھ ہے ۔ آپ کا مکان محلہ میدان پورہ کے قریب میں شمال مغرب کے گوشہ میں ہے ۔ اور مرقد منور مسجد شریف کے مقابل میں ہے جو زیارت گاہ خواص وعوام ہے اور اس سے برکات حاصل کی جاتی ہیں ۔ آنجناب کے صاحبزادہ ارشد حضرت شیخ محمد قدس سرہٗ جامع علوم شریعت وطریقت تھے ۔ طالبان سلوک وطریقت کی دلی مرادیں آپ سے پوری ہوتی تھیں ۔

بچپن سے ہی والد ماجد کی محبت کے سایہ میں آپ نے تربیت پائی اور ارادت کا شرف اور خلافت کی سعادت آپ ہی سے حاصل کی ۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد سجادۂ کرامت کو آپ نے رونق بخشی (سجادہ نشین ہوئے) ۔ ایک رات خواب میں غوث صمدانی حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ارشاد فرمایا کہ قطع بہتہ "جا کر میرے فرزند عبداللہ جیلانی سے خرقہ خلافت حاصل کرو ۔ اور اس معاملہ میں جناب شیخ عبداللہ کو بھی حکم ہوا (کہ شیخ محمد کو خرقہ عطا کرو) حضرت شیخ محمد قدس سرہٗ حسب الارشاد بلگرام سے موضع بہتہ پہونچے اور شیخ عبداللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اور خرقہ خلافت حاصل کیا ۔ شیخ عبداللہ جیلانی کی مخصوص مہربانیوں سے سربلند ہوئے ۔ کچھ دنوں بعد وطنِ مالوف کو واپس ہوئے اور بقیہ عمر ہدایتِ خلق اور تبلیغ میں گذار دی ۔ اور بہت سے طالبوں کو مطلوب تک پہونچایا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر شیخ عبداللہ بہتی قدس سرہٗ کا بھی کچھ ذکر تحریر کیا جائے ۔

شیخ عبداللہ بن سید عمر بن سید حسین حلبی قدس سرہٗ ۔ ان کا سلسلہ نسب بارہ واسطوں سے غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے ۔ اپنے والد بزرگوار سے خرقہ پہنا ۔ اور ہندوستان کے اکثر بڑے مشائخ سے شرف ملاقات حاصل کیا ۔ موضع بہتہ میں جو مضافاتِ دہلی میں سے ہے ۔ قیام فرمایا ۔ حضرت شیخ سلیم چشتی (رحمۃ اللہ علیہ) فتح پوری کے ساتھ ایک سفر میں شریک رہے ۔ زیارت حرمین شریفین (اللہ ان کی بزرگی میں اضافہ فرمائے) کی سعادت حاصل کی ۔ اور ہندوستان واپس لوٹے ۔ اجمیر مقدس میں حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری قدس اللہ سرہٗ کے روضہ کے قریب پیر ومرشد کے اشارہ سے چالیس دن کا چلہ کھینچا ۔ کچھ دن اس مقام مقدس میں مقیم رہ کر برکتیں حاصل کیں ۔ حضرت خواجہ قدس سرہٗ کے اشارہ سے دوبارہ موضع بہتہ واپس ہوئے ۔ اور یہاں مستقل قیام فرمایا ۔ یہاں رہ کر بہت سے لوگوں کو ہدایت اور ارادت کے شرف سے مشرف ومخصوص فرمایا ۔ آپ ہر وقت "یا ہُو" ذکر اور مراقبہ میں مستغرق رہتے تھے ۔ بعض حاسدوں کی سخن چینی کی وجہ سے جہانگیر بادشاہ نے ناراض ہو کر ان کو اپنے دربار میں طلب کیا ۔ جب سامنے پہونچے تو آپ نے دعا پڑھی اور چند کنکریاں شہنشاہ کی طرف پھینکیں ۔ شہنشاہ نے پوچھا یہ کیا تھا ۔ فرمایا بلاؤں کے دفع کرنے کے لیے میں نے کچھ پڑھا ہے ۔ حضرت سید کی یہ بات سن کر بادشاہ جہانگیر

دل نرم پڑ گیا۔ اور پوری تعظیم و توقیر کے ساتھ ان کو دربار سے رخصت کیا۔ عمر گرامی سو سال سے زیادہ ہوئی بدھ کے دن ۱۰ ربیع الاول ۱۱۳۲ھ کو آخرت کی عمدہ جگہ تفرج فرما ہوئے۔ آرام گاہ بہتہ میں ہے۔ عرس شریف کے موقع پر بڑا مجمع ہوتا ہے۔

اب میں اصل مطلب کی جانب آتا ہوں۔ حضرت شیخ محمد قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند مخدوم تاج معین الدین قدس سرہٗ نے مقام ارشاد و ہدایت کو زیب و زینت بخشی وہ بڑے صاحب مرتبہ تھے بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ روح مرتبۂ احدیت کی جانب مائل تھے۔ اور سبک روحی اس حد تک ہے کہ عالم قدسیت کی بلندیوں کی جانب محو پرواز تھے۔ طریقہ تقویٰ میں کھوٹ اور غل و غش سے پاک ورمبرا میں دعوت اسماء الٰہی میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جب انہوں نے ملک بقا کی جانب انتقال فرمایا تو اس آسمان تقویٰ کے ستارے یعنی آپ کے فرزند شاہ امام الدین قدس سرہٗ آباء کرام کی مسند پر متمکن ہوئے اور اپنی عمر گرانقدر کو یاد الٰہی اور اصحاب و احباب کی تلقین میں صرف کر دیا۔ آپ کا وصال ۱۱۰۰ھ کے دوسرے عشرہ میں واقع ہوا۔ ان بزرگوں کی نورانی قبور مخدوم محمد رکن الدین کے مزار کے جوار میں ہیں۔

شاہ لیٰسین (قدس سرہٗ) بستان شاہ امام الدین کے شجر ثمردار ہیں۔ اپنے آباء کرام کی مسند کے رونق افروز اور اجداد عظام کے چراغ معرفت کو روشن رکھنے والے تھے۔ نور باطنی آپ کی پیشانی سے نمایاں تھا زمانہ ان کے وجود سے معزز و مفتخر تھا آپ کا مزاج مبارک تکلف سے قطعًا نا آشنا اور آپ ہر کہ و مہ کے ساتھ ایک ہی انداز سے پیش آتے تھے۔ (کوئی تفریق نہیں تھی) بیشک سراپا اخلاق تھے۔ اور اپنے مقصود کی لطافت کے آئینہ دار تھے۔ اتنے بلند ہمت تھے کہ فتوح کا ذخیرہ نہیں فرماتے تھے۔ اور اس کو فقراء کی خبر گیری اور شہر کے صادر و وارد پر خرچ کر دیتے تھے۔ شہر کے تمام اصاغر و اکابر آپ سے خصوصی نیازمندی کا تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے وجود کی دولت سعادت کے ختم ہونے سے پہلے شہر اور اطراف و اکناف کے لوگ آپ کی ارادت سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے۔ (وصال سے پہلے مرید ہو گئے) ۴ رجمادی الاول ۱۱۶۶ھ کو آرام گاہ قدس کی جانب تشریف لے گئے۔ (آپ نے وصال فرمایا)۔ مخدوم محمد رکن الدین قدس سرہٗ کے احاطہ کے باہر زینہ کے قریب دفن کیے گئے۔

راقم اوراق یعنی مؤلف مآثر الکرام نے یہ تاریخ لکھی ؎

شاہ لیٰسین آیت عرفان	از جہان رفت آں بزرگ سرشت
دوش پروانہ در انجمنے	گفت تاریخ "شمع بزم بہشت"

۱۱۶۶ھ

آپ کے صاحبزادہ شاہ محمد حافظ سلمہ اللہ تعالیٰ والد ماجد کے مقام پر متمکن ہوئے اور اپنے آباء کرام کے سجادہ کو آپ نے رونق تازہ بخشی ہے۔ مبدء فیاض (اللہ تعالیٰ جل شانہٗ) اس

ذات کو جو دلوں کی محبوب ہے روز قیامت تک اس مقام کا زینت فزا بنائے رکھے۔ شاہ محمد حافظ عرف حافظ میاںؒ نے ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۷۳ھ کو اس دنیا کے خارزار سے دامن چھڑا لیا۔ اور اپنے باغیچہ میں جو پورہ حیدر آباد سے متصل محلہ میدانپورہ کے شمال میں ہے۔ مدفون ہوئے۔

مولف کتاب نے قطعہ تاریخ وفات اس طرح کہا ہے

وداعِ جہاں کرد حافظ میاں　　چراغ بزرگان عرفان سرشت

شبے ہاتفِ غیب تاریخ او　　بفرمود "او شمع بزم بہشت"

۱۱۷۳ھ

۳۲

شاہ رکن الدین عرف شاہ آتا ولی رحمۃ اللہ علیہ

سلسلۂ نسب شاہ رکن الدین ابن مخدوم تاج معین الدین بن مخدوم محمد بن مخدوم محمد رکن الدین بلگرامی قدس سرہٗ تعقل مندو یوانوں میں سے تھے۔ (مجذوب تھے) ایسے قوی جذبہ کے مالک اور نفس کو زیر کرنے والے تھے کہ جو کچھ آپ کی زبان سے نکلتا جاتا تھا وہ قطعی فیصلہ کا حکم رکھتا تھا۔ آپ ہمیشہ جنگل میں گدڑی پہنے مستی کی حالت میں گھومتے رہتے تھے۔ ان سے بہت سے خوارق عادات (کرامتیں) ظہور میں آئیں ہیں۔ آپ کی وفات ۱۱۰۰ھ کے بعد واقع ہوئی۔ قبر شریف مخدوم محمد رکن الدین کے مزار کے احاطہ کے باہر دیوار شرقی سے متصل ہے۔

۳۳

سیّد تاج الدین حجرہ نشین قدس سرہٗ

بلگرام کے حسینی واسطی سادات میں ہیں لقب "بچہ بھیّہ" تھا۔ میدان پورہ محلہ میں سکونت رکھتے تھے ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ سیّد تاج الدین حجرہ نشین بن سیّد طیب بن سیّد بدلی بن سیّد حسین بن سیّد فضل اللہ بن سیّد محمد بن سیّد فضل اللہ بن سیّد علاؤالدین بن سیّد ابراہیم بن سیّد ناصر بن سیّد المسعود بن سیّد سالار بن سیّد محمد صغریٰ قدس سرہٗ، مراتب فقر میں بے مثل تھے یادِ الٰہی میں اس طرح مستغرق کہ اپنے حجرہ سے باہر قدم کم نکالتے تھے۔ اسی لیے ان کو حجرہ نشین کہتے ہیں۔ صاحب مرآۃ المبتدین لکھتے ہیں "ابتداءِ حال میں وہ پڑھنے میں مقید تھے۔ (ان کا شغل صرف پڑھنا تھا) کتاب کے مطالعہ کی غرض

ایک باغ میں جو شہر سے بہت دور ہے چلے جاتے تھے۔ اور مطالعہ میں مشغول رہتے اس باغ میں ایک آزاد فقیر سے جن کا نام شیخ پیارے[1] تھا اتفاقاً ان کی ملاقات ہوگئی اس فقیر نے ان کو اپنی طرف جذب کرلیا اور سید صاحب نے درس و تدریس کو ترک کر دیا اور رندلائے خوار بن گئے بہت سے اور لوگ اس آزاد فقیر کے معتقد تھے۔ آزاد رو اور رندلائے خوار تھے۔ بظاہر ملامتی ہو چکے تھے ایک روز اس آزاد فقیر نے ان سے کہا کہ اگر پیر ایک دفعہ تم کو کسی جگہ بٹھا دے اور بھول جائے تو کیا ہو؟ انہوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے تنہائی کی وحشت اپنے دوستوں سے اٹھالی ہے۔ (تنہائی میں ان کو وحشت نہیں ہوتی)، جب اس نے یہ کلمہ سنا تو اس نے کہا تمہارا کام پورا ہو چکا (تم درویش کامل بن گئے)۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک رات "لُو" چل رہی تھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کے باہر نکل آئے ہوا بہت گرم تھی۔ دوستوں سے فرمایا شاید اس بڑے درخت کی نوک پر ایسی ہوا ہو جو اس تپش کو دور کر دے یہ کہہ کر فوراً اوپر اڑ گئے اور اس درخت کی "پھننگی" (پھنگی) پر جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے پھر واپس آگئے۔ یہ دیکھ کر ان کے اکثر دوست حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ اپنے یاران طریقت کے باعث کئی مرتبہ مختلف جگہوں پر قید ہے قریب تھا کہ علماء ان کے قتل کا فتویٰ دے دیتے ایک عرصہ تک عوام ان کے بارے میں بہت مبالغہ آمیز باتیں کرتے رہے۔ اور ان کی کرامات کا بہت چرچا عوام میں ہو گیا تھا لیکن حضرات خواص ان کی نسبت گمراہی سے کرتے تھے۔ (ان کو گمراہ کہتے تھے) رفتہ رفتہ لوگوں کا یہ شور و غوغا ختم ہو گیا اور وہ اس حالت ملامت سے نکل آئے اس کے بعد ان کے مرشد آزاد رو کو بہت تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں نہیں ملا"

(مرآۃ المبتدین کے الفاظ ختم ہوئے۔)

سید تاج الدین کی قبر محلہ میدان پورہ کے شمالی باغ میں شہیدوں کے مزارات کی طرف حیدرآباد کی آبادی کے پاس ہے۔

۳۴

سید قاسم اسرار قدس سرہٗ

آپ سید تاج الدین حجرہ نشیں قدس سرہٗ کے مریدوں میں بلگرام کے بخاری الاصل خاندان سے ہیں جن کا محلہ "محلہ سید واڑہ" کے مشرقی جانب واقع ہے آپ مے خانہ عرفان کے پیر روشن ضمیر تھے ارادت کے راستہ اور شراب توحید کے پلانے میں مشغول رہتے تھے۔ بہت سے مست ان کے جام کی گردش سے اعلیٰ دماغ بنے اور خودی کے غبار سے اپنے دامن کو انہوں نے پاک و صاف کر لیا۔ سید تاج الدین نے

[1] میر سید محمد گیسو دراز کے پوتے۔ میر سید ید اللہ کے مرید اور سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ (۸۸۰ھ اخبار الاخیار)

آپ کی نسبت فرمایا کہ "مقاسم اسرار اس ملک کے آئینہ ہیں"۔ راقم الحروف کہتا ہے سید تاج الدین کا یہ ارشاد سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ کے اس قول کے مثل ہے جو انھوں نے شیخ سراج دین عثمان رحمۃ اللہ علیہ اودھی بنگالی کے متعلق ارشاد فرمایا تھا۔ کہ "عثمان آئینہ ہندوستان ہے" فرق صرف اتنا ہے کہ سلطان المشائخ قدس سرہٗ کی زبان سے لفظ ہندوستان ادا ہوا ہے ہندوستان، ہند کے تمام ممالک کو شامل ہے اور سید تاج الدین قدس سرہٗ کی زبان پر "ایں ملک" جاری ہوا۔ لفظ "ایں ملک" سے مراد پورا ہندوستان ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ملک کا بعض حصہ ہو جو قائل کے وطن سے قرب کی نسبت رکھتا ہے اس کلمہ کا قرینہ بتاتا ہے کہ اس "ایں" سے مقام قریب کا اشارہ ہے ظاہر ہے کہ اس سے دوسرا ہی حصہ مراد لیا جائے گا۔ (یعنی اشارہ قریب) کیونکہ شیخ عثمان کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عالم ملک وملکوت کے اسرار کا اظہار ہندوستان میں شیخ عثمان کے صاف اور نورانی وجود کی وجہ سے ہوتا ہو جیسے جام جم۔ اور آئینہ سکندر جس سے اس دنیا کے بہت سے راز ظاہر ہوتے تھے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے اولیاء ہر ملک اور ہر ولایت میں اس کے آئینہ ہیں۔ جن میں وہ اپنے جمال باکمال کا مشاہدہ فرماتا ہے۔ اور ان مظاہر میں اپنی تجلیات خاص کے جلوے دکھاتا ہے اور ملک ہندوستان میں ایسا آئینہ شیخ عثمان کا وجود ہے۔ واللہ اعلم۔ صاحب مرأۃ المعبدین کہتے ہیں کہ:۔

"سید تاج الدین اکثر طالبان حق کو سید قاسم ابرار کے حوالہ کرتے تھے۔ جو شخص دنیا یا دین کی ضرورت ان سے ظاہر کرتا تھا۔ سید قاسم کی جانب اشارہ فرما دیتے تھے۔ مرض موت میں ان سے کہا تھا کہ "تمہاری جگہ شمس آباد کے غربی جانب جو بلندی ہے۔ خدا کی جانب سے مقرر کر دی گئی ہے۔ خوف نہ کرو غیب سے اور توکل کی چیزیں مہیا ہو جائیں گی۔ ان کے انتقال کے بعد سید قاسم اس جگہ جا کر بیٹھ گئے۔ دو تین ماہ نہیں گذرے تھے کہ ایک صاحب ثروت کا ادھر سے گذر ہوا۔ اور اس نے مسجد، خانقاہ، کنواں، روضہ اور باغ اس جگہ بنا دیا۔ اور خانقاہ کے لیے وظیفہ بھی مقرر کر دیا"۔ (مرأۃ المعبدین)۔

سید العارفین میر شاہ لدھا فرماتے تھے سید قاسم کی مٹی سے "عرفان" کی خوشبو آتی ہے

سلہ متوفی ۷۵۸ھ۔ آپ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء دہلوی قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ درسی کتابیں شیخ فخر الدین زرادی (۷۴۸ھ) سے پڑھیں۔ اور بعض صرف اور فقہ کی کتابیں مولانا رکن الدین سے پڑھیں رسالہ عثمانیہ جو "زرادی" کے نام سے علم صرف میں مشہور ہے۔ شیخ فخر الدین نے اسے شیخ عثمان کے لیے تحریر کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ کتاب "میزان الصرف" جو علم صرف کا ایک رسالہ ہے یہ شیخ عثمان اودھی کی تصنیف ہے مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی نے "ذیل الفوائد البہیہ" میں ذکر کیا ہے کہ یہ رسالہ محمد بن مصطفیٰ بن الحاج حسن (۹۱۱ھ) کی تالیف ہے واللہ اعلم۔ (اخبار الاخیار۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند)۔

اور علامہ مرحوم میر عبدالجلیل فرماتے تھے سید قاسم اسرار صاحب سخن تھے۔ گویا سید قاسم انوار[۵۱] کو نے ان کے احوال کو منور بنا کر ان کو قاسم اسرار بنا دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ان کا دیوان دارالخلافہ آگرہ میں میں نے دیکھا تھا۔ لیکن بلگرام میں نسخۂ دیوان کھو گیا۔ ان کی آرام گاہ ضلع قنوج کے مقبرہ شمس آباد میں ہے۔

۳۵

سید عمر بلگرامی قدس سرہٗ

آپ سید محمد صغریٰ کے نسب سے ہیں سلسلہ نسب یہ ہے سید عمر بن سید بدرالدین عرف سید بدلے بن سید ابراہیم بن سید بیارہ بن سید حسن بن سید محمود عرف بڈھن بن سید بدھ بن سید جمال الدین بن سید ابراہیم بن سید ناصر بن سید مسعود بن سید سالار بن سید محمد صغریٰ قدس سرہم۔ سید عمر کے والد سید بدرالدین عرف سید بدلے محلہ سید واڑہ کے چاروں خاندانوں میں سے ایک خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ۹۸۰ھ میں دامن وجود سے زندگی کی گرد کو جھاڑ دیا۔ (انتقال فرمایا) سید حسین دہلی وال بلگرامی کے سید عمر خاص شاگرد تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں ایک عرصہ تک بحیثیت شاگرد کے بیٹھے۔ اور ظاہری و باطنی دولت حاصل کی۔ شیخ الہدیہ قدس سرہٗ کے صاحب زادہ اور سجادہ نشین شیخ ابوالفتح[۵۲] کی بیعت میں اپنا ہاتھ دیا۔ (مرید ہوئے) ایک مدت تک شیخ کی خدمت میں رہے اور ریاضتوں میں مصروف و مشغول رہے پھر وطن مالوف کو واپس آئے اور یہاں ساری عمر خدا پرستی کے گوشہ میں گذار دی۔ ان کی قبر موضع چاند پور میں شہر کے مشرقی جانب واقع ہے۔ مزار شریف پر خوب صورت گنبد بنایا گیا ہے۔

---

۵۱ سید قاسم انوار بن سید معین الدین علی بن نصیر ہارون بن ابوالقاسم حسین سرابی تبریزی معروف بہ شاہ قاسم قاسمی یا قاسم انوار (۸۳۵ھ ۔ ۱۳۵۶ء) اُن کا سلسلہ شیخ صدرالدین اردبیلی تک پہونچتا ہے اُن کی اصل آذربائیجان سے ان کی قبر شہر جام میں ہے۔ تاریخ اس طرح لکھی ہوئی ہے۔

سال ترحیل آں ملازم خُلد گفت قاسم بخلد قاسم خُلد

(مقدمہ کلیات قاسم انوار از آقائے سعیدی نفیسی تہران ۱۳۳۷ھ ۔ مفتاح التواریخ)

۵۲ رضوی خیر آبادی، امام موسیٰ الرضا کی اولاد میں ہیں (۹۷۶ھ) اپنے والد نظام الدین عرف شیخ الہدیہ (۹۹۳ھ) کے شاگرد، شیخ حاتم سنبھلی (۹۶۸ - ۹۶۹ھ) سے بھی تحصیل علم کی۔ شیخ کی تالیفات ان کے علم کی کاوشوں اور وجد کی گواہ ہیں۔ وفات ۱۰۰۷ھ (نزہۃ الخواطر)۔

۳۶

سیّد شریف رحمۃ اللہ علیہ

آپ سید طہٰ قدس سرہٗ کے صاحبزادہ ہیں (جن کا ذکر اس سے قبل کیا جاچکا ہے) اپنے والد کی خدمت میں تحصیل علم کی۔ اور والد ماجد کی طرح شیخ ابو الفتح قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے۔ اور خرقۂ خلافت حاصل کیا حقائق و معارف میں بھرپور طریقہ پر بہرہ ور ہوئے۔ شیخ قدس سرہٗ سے واپسی کی اجازت حاصل کرکے وطن مالوف میں آکر گوشہ نشین ہوگئے۔ اور یاد حق میں محو و مستغرق ہوگئے۔ اکثر اوقات سلوک کی کتابیں اور صوفیہ کے اقوال اور احوال کے مطالعہ سے شغل رکھتے تھے اور ہندوستان کے مشائخ کے حالات میں ایک اوسط درجہ کی مفید کتاب "مرآۃ المبتدین" تحریر فرمائی اور مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کے کلمات و ملفوظات کے جمع کرنے میں انتہائی کوشش کی اور اپنے نفس کی شکستگی کے لیے کتاب کا نام "مرآۃ المبتدین" رکھا (اللہ ان کی کوششوں کو مشکور فرمائے)۔

۳۷

سیّد کرم اللہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ سید محمود اکبرؒ بلگرامی کی (جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے) اولاد میں سے ہیں سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ سید کرم اللہ بن سید لطف اللہ بن سید حسن بن سید نوح عرف سید پیارہ بن سید محمود اکبرؒ قدس سرہٗ۔ (ہم سید حسنؒ کا ذکر فضلاء کے سلسلہ میں کریں گے)۔ آپ سید کرم اللہؒ اپنے زمانہ کے بزرگ و منتخب عصر اور اخلاق الٰہیہ سے متصف تھے۔ ۱۰۵۱ھ میں سہارن پور بوریا کی حکومت پر سید محمد کی جانب سے (جو سادات بارہہ سے تھے اور ملازمین شاہ جہان میں داخل تھے) مامور تھے۔ آخر میں شاہزادہ محمد شجاع بن شاہ جہان بادشاہ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ شاہزادہ آپ کے ساتھ انتہائی عزت اور احترام کے ساتھ پیش آتا تھا شاہزادہ محمد شجاع کی تباہی و بربادی کے بعد بلگرام آکر گوشہ نشین ہوگئے آپ اطاعت الٰہی و ریاضت نفس کے معمولات سے اپنے اوقات کو معمور رکھتے تھے۔ ۱۲ رجب المرجب ۱۰۷۳ھ کو جہانِ فانی سے دل کا تعلق منقطع کرلیا۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی قبر زمین کے برابر رکھی گئی۔ آپ کی یادگار ایک مسجد ہے جو محلہ میدان پورہ کے وسط میں واقع ہے۔ ایک مدت کے بعد اس کا سالِ تعمیر سید کرم اللہؒ کی خاص تحریر میں قدیم کاغذات میں سے ۱۱۰۱ھ کے درمیان برآمد ہوا۔ اور محرر نے سالِ تعمیر کے تحفظ کے لیے

یہ قطعہ تاریخ نظم کیا ہے ؎

محرم اللہ سید عالی	زبدۂ دودمانِ آل عبا
عالی نسب شیخ کرم اللہ نے	جو آل عبا (سادات) کے خاندان میں منتخب فرد تھے
مسجدے ساخت از صفا معمور	کرد بنیاد او علی التقویٰ
صفا سے معمور ایک مسجد تعمیر کی	جس کی بنیاد انہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری پر رکھی ہے
من بنیٰ مسجداً لوجہہ اللہ	کان مثواہ جنت الماویٰ
جس کسی نے محض اللہ تعالیٰ (کی رضا) کے لیے مسجد تعمیر کی	اس کا گھر (عاقبت میں) جنت الماویٰ میں ہوگا
ہاتفے گفت سال تاریخش	کرد تعمیر مسجد زیبا
ہاتف نے اس کی بنا کی تاریخ کا سال اس طرح کہا	کیا خوب اور اچھی مسجد تعمیر کی ہے

۳۸

سید عبد النبی رحمۃ اللہ علیہ

سید عبد النبی بن سید میر طیب بن میر عبد الواحد اکبر بلگرامی قدس سرہٗ۔ آپ اپنے والد ماجد اور جد گرامی کے کمالات کے وارث اور دنیا و آخرت کی فضیلتوں کے جامع تھے۔ خاص کر مسائل حنفیہ میں "ید طولیٰ" رکھتے تھے قال کے فوائد پہنچانے اور حال کے فیوض پہنچانے میں آپ کا خاص شغل تھا۔ آپ نے اپنے والد ماجد سے فوائد حاصل کیے اور خلافت (قطب الاقطاب) حضرت میر سید محمد کالپوی قدس سرہٗ سے بھی حاصل کی جب ان کی ملاقات اورنگ زیب عالمگیر (اللہ ان کی دلیل کو روشن کرے) سے ہوئی تو سلطان نے آپ کی انتہائی عزت و تکریم کی اور تقریباً ایک سو بیگھ زمین مدد معاش کے طور پر بلگرام میں مقرر فرمائی آپ کی وفات سنہ ۱۰۹۴ھ میں ہوئی۔ اور آرام گاہ بلگرام میں ہے۔ "مرشد مجتہد زمان" تاریخ وفات ہے۔ ان کے فرزند ارجمند میر سید مرتبی کا ذکر بعد میں حسب موقع آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ میر سید عبد النبیؒ کے تذکرہ میں میر سید محمد قدس سرہ کا نام نامی آچکا ہے (کہ سید عبد النبی نے آپ سے بھی خلافت حاصل کی ہے) پس مجھ مخمور پر مستی کی ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ کیونکہ فقیر کا سلسلہ طریقت حضرت میر سید محمد قدس سرہٗ کے صاحبزادہ حضرت سید العارفین میر سید احمد قدس سرہٗ تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اس مقدس خاندان کے مناقب مختصراً عقیدت کے صفحہ پر لکھ رہا ہوں اور آپ کا ذکر شریف کر کے کام و دہن پر احسان عظیم کر رہا ہوں۔

۳۹

حضرت میر سیّد محمد الترمذی کالپوی قدس سرہٗ

ان کی اصل ترمذ کے صحیح النسب سادات سے ہے۔ آبا ؤ کرام نے جالندھر میں جو لاہور کے مضافات میں ہے سکونت اختیار فرمائی تھی۔ حضرت میر صاحب کے والد ماجد حضرت میر سیّد ابو سعید[1] قدس سرہٗ نے نقل مکانی فرمائی وطن مالوف سے کالپی منتقل ہو گئے۔ حضرت میر سیّد محمد قدس سرہٗ نے ابتدائی تعلیم عالم باعمل اور محدث عصر حضرت شیخ یونس[2] (اللہ ان کی قبر کو اپنے نور سے معمور فرمائے) سے حاصل کی۔ اور علامہ تفتازانی کی مطول تک شیخ یونسؒ کی خدمت میں متداولہ علوم میں پڑھی۔ اور ان ہی سے اجازت حدیث بھی حاصل کی۔ شیخ یونسؒ شریعت مطہرہ کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اس کا اثر میر سیّد محمد قدس سرہٗ پر بھی ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار ان کے ہر قول اور فعل سے ہوتا تھا۔ درسیات کی آخری کتابیں کچھ تو حضرت مولانا عمر[3] جاجموی سے (رحمۃ اللہ علیہ) اور زیادہ تر حضرت شیخ جمال اولیاء[4] (قدس سرہٗ) کوروی کے حلقہ درس میں پڑھیں۔ سند تکمیل بھی ان ہی سے حاصل کی حضرت شیخ جمال اولیاءؒ کوروی سے درسیات کی تکمیل کے بعد سلسلہ عالیہ چشتیہ میں بیعت کی اور سلاسل قادریہ سہروردیہ اور مداریہ میں بھی اذن و اجازت حاصل کی۔ حضرت شیخ جمال اولیاءؒ نے اپنی عنایات خاص الخاص سے ان کو نوازا اور وہ تمام امانتیں اور تبرکات جو انہیں اپنے مشائخ سلاسل اربعہ سے حاصل ہوئے تھے۔ حضرت میر صاحب

---

[1] ابن سید ابو الحسینی کالپوی آپ کا شمار شعر گوئی اور انشا پردازی میں مشاہیر میں کیا جاتا تھا۔ آپ ساکنان بلدہ "چندیری" میں سے تھے۔ نقل مکانی کر کے کالپی میں قیام فرمایا۔ آپ نے مخمسات بہت کثرت سے لکھے ہیں اور بہت مشہور ہیں۔ ۹۶۶ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر جلد چہارم)۔

[2] ابن ابی یونس الحسینی کوروی۔ ممتاز علمائے ہند میں سے تھے ساری زندگی فقہ و حدیث کی تدریس میں صرف کی۔ وطن مالوف چھوڑ کر کالپی میں اقامت فرمائی تھی (نزہۃ الخواطر)۔

[3] ابن ابو عمر الحنفی علم فقہ و اصول میں بہت ممتاز تھے حضرت میر سید محمد ترمذی اور دیگر شیوخ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

[4] ابن مخدوم جہانیاں بن بہاؤ الدین بن سالار عالم (ابن ہیبۃ الدین ۹۳۶ھ) فقہ اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ممتاز و مشاہیر علماء میں سے تھے پہلے اپنے والد گرامی سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد قاضی ضیاء الدین عرف "قاضی جیا" بن سلیمان متوفی ۹۸۹ھ عثمانی نیوتنوی، شاگرد رشید قاضی وجیہہ الدین گجراتی (د ۹۹۸ھ، ۱۵۸۹ء) کی درسگاہ میں پہنچے اور وہیں سے سند فراغت حاصل فرما کر وطن واپس آئے۔ حضرت میر سید محمد ترمذی اور بڑے بڑے مشائخ ان کے شاگرد ہیں۔ ۱۰۴۷ھ میں وفات پائی اور ان کے جد اعلیٰ یعنی شیخ سالار قدس سرہٗ حضرت شیخ یعقوب السنوسی اور شیخ شمس الحق (م ۹۵۰ھ) کے شاگرد تھے حضرت شیخ سالار نے شیخ بہاؤ الدین جونپوری سے خلافت حاصل کی۔ (۹۱۱ھ) (نزہۃ الخواطر۔ مکتوبات حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی)۔

عطا فرما دیے۔ حضرت میر صاحب حسب فرمان شیخ کوڑہ سے کالپی تشریف لے آئے اور وہیں قیام فرمایا۔ اور یہاں ذکر الٰہی اور تلقین و ارشاد میں معروف ہو گئے متعدد بار کالپی سے باہر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ جالندھر کا بھی سفر فرمایا تاکہ وہاں اپنے اعزہ میں پہنچ کر کسی جگہ نیک اختر سے رشتہ مناکحت قائم کریں۔ راستہ میں جب اکبر آباد (آگرہ) پہنچے تو حضرت سیدنا امیر ابوالعلاء احراری قدس سرہٗ سے شرف ملاقات کیلئے خدمت میں حاضر ہوئے[1] ان کی مجلس میں ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گئے حضرت امیر کی عادت شریفہ تھی کہ آپ اکثر قہقہہ سرزد ہو جایا کرتا تھا حضرت میر صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ درویش ہیں اور درویش کو قہقہہ سے کیا کام؟ حضرت امیر نے ان کی جانب نگاہ کی اور ارشاد فرمایا کہ سنو! مولانائے روم نے ارشاد فرمایا ہے۔ ؎

بر بجیبۂ دل باش ہاں مانند مرغ پاسباں کز بجیبۂ دل زایدت مستی و شور و قہقہہ

---

[1] ابن ابوالوفا بن عبدالسلام بن عبدالملک بن عبدالباسط بن امیر تقی الدین کرمانی حسینی اکبرآبادی، ہندوستان کے عظیم مشائخ میں تھے۔ والد ماجد کی جانب سے نسب حضرت امام زین العابدینؓ تک پہنچتا ہے۔ والدہ ماجدہ بنت خواجہ محمد فیضؒ بن میر عبدالسلام بن خواجہ محمد عبیداللہ معروف بہ خواجہ احرار (رحمہم اللہ علیہم) ہیں اسی لیے احراری کہلاتے۔ جب حضرت کے جدِ امجد میر عبدالسلام سمرقند سے ہندوستان تشریف لائے، تو اس وقت بادشاہ اکبر فتح پور سیکری میں فروکش تھے وہیں میر عبدالسلام سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر حرمین شریفین کی جانب سفر فرمایا۔ آپ کے سفر سے پہلے ہی سیدنا کے والد ماجد میر ابوالوفا نے بمرض درد قولنج فتح پور سیکری میں انتقال فرمایا۔ نعش مبارک نعل دروازہ دہلی کے قریب دفن کی گئی۔ چنانچہ سیدنا امیر ابوالعلا نے اپنے نانا خواجہ محمد فیض کے آغوشِ عنایت میں پرورش پائی اور بادشاہ اکبر کے عہد میں تین ہزاری منصب اور دیگر اعزازات حاصل کیے حضرت سیدنا کے نانا خواجہ محمد فیض اس زمانہ میں بردوان کی فوج کے افسر تھے۔ راجہ مان سنگھ والیٔ بنگال ان کا بڑا احترام کرتا تھا ان کے انتقال کے بعد راجہ نے ان کی جگہ حضرت سیدنا کو فوج کا افسر مقرر کیا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں ملازمت ترک فرما دی امیر عبداللہ احراریؒ آپ کے چچا تھے۔ جنہوں نے پانچ صدی منصب ایک سو سوار اکبری اور "سوتھ" کی جاگیر کو اپنے لیے پردۂ کمال بنا رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ پر سیدنا نے بیعت کی۔ آخر میں خواجہ خواجگان غریب نواز معین الدین حسن چشتی قدس سرہٗ (۶۳۳ھ) کے مزار مقدس پر معتکف ہو گئے۔ ایک دن غریب نواز کے مزار مقدس سے آواز آئی۔ یہ نعمتیں جو تم کو ملی ہیں وہ تین سو برس بعد کسی کو ملتی ہیں اس کا شکر بجالاؤ۔ ایک روز مزار شریف کا طواف کرتے ہوئے قلب مبارک میں خدشہ پیدا ہوا کہ مزار کے گرد پھرنے سے کیا فائدہ؟ ادھر سے ارشاد ہوا کہ بیمار کے گرد اس لیے پھرتے ہیں کہ اس کو شفا ہو جائے اور اس کی بیماری اس پھرنے والے کو ہو جائے اولیاء اللہ کے مزار کے گرد اس لیے پھرتے ہیں کہ صاحب مزار کے انوار و برکات اس شخص میں سرایت کر جائیں۔ حضرت سیدنا کے مشہور ترین خلفاء میں صاحبزادگان میر سید نور العلاء میر سید فیض العلاء اور سید دوست محمد دکنی اور حضرت میر سید محمد ترمذی کالپوی قدست اسرارہم بہت مشہور ہیں۔ تیسرے مرید و خلیفہ شاہ عبدالرحیم صاحب تھے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی اپنی کتاب انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت میر ابوالعلاء قدس سرہٗ کی تعلیم دین کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ آپ کا سلسلہ ابوالعلائیہ کہلاتا ہے حضرت سیدنا نے ۱۰۶۱ھ میں ۹ صفر کو وصال فرمایا۔ اور شہر آگرہ کے شمال میں مدفون ہوئے ہر سال عرس کی مجلس منعقد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد فرمایا ہمارا قہقہہ یہاں سے ہے۔ قریب تھا کہ حضرت میر صاحب کے بدن میں رعشہ کی کیفیت پیدا ہو جائے مگر تشرع (شریعت پر عمل) کے زور سے خود پر قابو رکھا۔ اور بغیر رجوع کیے ہوئے جالندھر تشریف لے گئے۔ جالندھر سے واپسی میں ہر ہر منزل پر سیدنا کی زیارت ہوتی تھی۔ اور دیکھتے تھے کہ وہ پالکی (حضرت میر صاحب کی سواری) کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں۔ اکبر آباد دوبارہ واپس آکر حضرت سیدنا سے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کی اجازت حاصل کی۔ حضرت سیدنا نے آپ کو اس سلسلہ مبارکہ کی تعلیم پوری توجہ سے دی۔ کالپی واپس آکر حضرت میر صاحب نے تعلیمات نقشبندیہ سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اور کئی سال تک سلسلۂ نقشبندیہ کے اذکار و اعمال میں مشغول رہے دس سال کے بعد دوسری مرتبہ حضرت سیدنا کے پاس حاضر ہوئے اور چار ماہ تک خدمتِ اقدس میں مقیم رہ کر فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ایک سفر اجمیر مقدس کا بھی فرمایا۔ اس سفر میں صاحبزادہ والا مرتبت حضرت سید احمد قدس سرہٗ بھی ہم رکاب تھے۔

ناظم شہر بہادر خاں کنبوہ[1] نے شہر سے باہر نکل کر عقیدت و احترام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اجمیر میں حضرت میر صاحب نے آٹھ یوم قیام فرمایا۔ دن میں دو مرتبہ صبح و شام صوفیاءِ کرام کے ساتھ مزار مقدس پر حاضری دیتے اور مراقبہ فرماتے تھے صاحب معارج الولایت[2] نے حضرت کے تذکرہ میں تحریر کیا ہے جب ان کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی زیارت نصیب ہوئی تو اس وقت حضرت میر صاحب پر مدہوشی کا غلبہ تھا حضرت غریب نوازؒ نے دو بڑے پان کے ان کو عطا فرمائے جب اس کیفیت میں کمی آئی تو انہوں نے دیکھا ان کے ہاتھ میں دو بڑے پان کے ہیں آپ نے روضہ مبارکہ کے اندر شب باشی بھی فرمائی۔ اور حضرت غریب نواز کی روح پر فتوح سے ملاقات کا شرف حاصل فرمایا۔ اور بہت سے انوار اور اسرار سے بہرہ اندوز ہوئے"۔

حضرت میر صاحب ہمیشہ با دلِ بریاں ــــــ اور ــــــ دیدۂ گریاں رہتے تھے۔ ہر مجلس میں ایک یا دو رومال آپ کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے تھے۔ عمر شریف کے آخری چھبیس سال مسلسل صائم الدہر رہے۔ اگر کوئی عارضہ لاحق ہو جاتا اور دوا کا استعمال ضروری ہوتا تو رات کو استعمال فرماتے۔ ہر چند اطبا اصرار کرتے کہ صبح کے وقت دوا کا استعمال زیادہ نفع بخش ہے

(بقیہ حاشیہ) ہوتی ہے ملک کے طول و عرض سے وابستگان سلسلہ اور مشائخ عظام شرکت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں (حجۃ العارفین، مفتاح التواریخ، نزہۃ الخواطر، تذکرۂ اولیاء، انفاس العارفین، مکتوبات حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی)

[1] بہادر خاں کنبوہ منصب داران عالمگیری میں سے تھے۔ شاہجہان کے عہد میں پانچ صدی منصب اور پانچ سو سوار کا اعزاز حاصل تھا (شاہجہاں نامہ)

[2] مشائخ ہندوستان کے بارے میں ایک تذکرہ ہے۔ جو عبداللہ خویشگی کی تالیف ہے۔

(تذکرہ نویسی بحوالہ اسٹوری)

آپ ان کو جواب دیتے کہ صحت اور بیماری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اگر وہ صحت چاہے گا تو رات کی وقت دوا کا استعمال بھی فائدہ پہنچائے گا۔ اس لیے روزہ کی لذت کو میں کیوں برباد کروں۔ جن ایام میں شرعاً روزہ ممنوع ہے ان دنوں میں ایک بڑہ پان سے زیادہ نہیں کھاتے تھے حضرت میر صاحب قدس سرہٗ کا معمول تھا کہ وعظ کی محفل میں لفظ "اللہ" کا بڑے کیف اور جذب کے عالم میں ذکر فرماتے تھے۔ حضرت کے ایک صاحبزادہ جنکی عمر شریف ۴ - ۵ سال کی تھی۔ اور آپ کو ان سے بہت انس تھا۔ فوت ہوئے تو تین روز تک حضرت نے یہ کلمہ شریفہ زبان سے ادا نہیں فرمایا کہ کہیں صاحبزادہ کا غم محبت الٰہی میں شامل نہ ہو جائے۔ حضرت میر صاحب قدس سرہٗ آخر میں "عیسوی المشہد" ہو گئے تھے۔ اور قطبیت کبریٰ کے منصب پر فائز تھے "عیسوی المشہد" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اسی طرح حضرت بھی احیاء قلوب فرمایا کرتے تھے۔ شیخ کمال الفری قدس سرہٗ نے جو حضرت میر صاحب قدس سرہٗ کے خلفائے خاص میں سے تھے۔ اور جن کا شمار عظیم علمائے دین میں ہوتا ہے۔ اور بختاور خان[۱] نے آپ کا نام نامی اپنی تصنیف تاریخ مرآۃ العالم میں تذکرہ شعراء کے ضمن میں تحریر کیا ہے۔ مثنوی "راح و ریحان" میں ان اشعار میں آپ ہی طرف اشارہ کیا ہے ؎

دم عیسیٰ اگر احیائے گل کرد	دم جاں بخش او احیائے دل کرد
بود ہر صبح روشن کار ایں دم	کہ استادان ایں کار است او ہم

تفسیر سورۂ فاتحہ اور "روائح" عربی زبان میں رسالہ تحقیق روح، اسرار التوحید، ارشاد السالکین رسالہ الفنا، عقائد صوفیہ، رسالہ عمل و معمول، اور رسالہ واردات (فارسی زبان میں) آپ کی تصانیف ہیں رسالہ تسویہ مصنفہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی نور اللہ مرقدہٗ پر جب علماء ظاہر نے ہنگامہ برپا کیا اور بات سلطان عالمگیر اورنگ زیب تک پہونچائی۔ کہ یہ رسالہ شریعت مطہرہ کے خلاف ہے اور سلطان نے حکم دیا

---

[۱] بختاور خان عالمگیری، دربار عالمگیری میں خاص مقام رکھتے تھے۔ بادشاہ عالمگیر نے خدمت گذاری میں ایک ہزاری منصب کا درجہ عطا کیا تھا۔ فن و تاریخ و سیر و انشاء میں ماہر و ممتاز تھے۔ ان کی تصنیف تاریخ مرآۃ العالم بہت مشہور ہے اس کے علاوہ منتخب نام کا ایک مجموعہ ہے۔ جس میں "حدیقہ سنائی" (حکیم سنائی ۵۳۵ھ) کلیات عطار (شیخ فرید الدین عطار ۶۲۷ھ) اور منتخبات مثنوی معنوی (مولانا روم ۶۷۱ھ) سے انتخابات کو جمع کیا گیا ہے۔ نیز "مختصر ہزاری" (تصنیف احمد بن نصر اللہ ٹھٹھوی) و ریاض الاولیاء فی تاریخ المشائخ اور ایک بیاض جس میں نادرات روزگار درج ہیں ان کی یادگار ہیں۔ درحقیقت بختاور خاں ان فضلاء میں سے تھے۔ جن کے نام سے بعض علماء و مشائخ نے اپنی کتابیں منسوب کی ہیں۔ جیسے کتاب فی فقۃ الحنفیہ مصنفہ قاضی ابوبکر اکبر آبادی خلاصۃ الخانیہ مصنفہ ملا محمد نافع اکبر آبادی "ہمدم بخت" مؤلفہ حکیم عبد اللہ اکبر آبادی جس کا سن تالیف ۱۰۹۳ھ ہے بختاور خان نے ۱۰۹۶ھ میں سرزمین دکن میں وفات پائی بادشاہ عالمگیر نے اپنے کاندھے پر جنازہ اٹھایا۔ (نزہۃ الخواطر، بحوالہ مآثر عالمگیری)۔

کہ اس کی قلمرو میں جتنے فقراء ہیں وہ سب دار السلطنت میں جمع کیے جائیں۔ اور وہ سب اس رسالہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں تو اس وقت شیخ محمد افضل الہ آبادیؒ[1] کو "رسالہ واردات" کے متعلق تشویش پیدا ہوئی کہ یہ رسالہ بھی عالم جذب میں تحریر ہوا تھا اگرچہ شیخ محمد افضل قدس سرہٗ دل سے نہیں چاہتے تھے

---

[1] شیخ محمد افضل الہ آبادی ابن شیخ عبد الرحمٰن سید پوری (ضلع غازی پور۔ یو۔ پی) حضرت عبد اللہ بن عباس عم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں تھے یہ الخلفاء سے ہیں خلفائے بنی عباس کے مظالم سے تنگ ہو کر خاندان کا ایک بڑا حصہ مختلف مقامات پر ہجرت کر گیا کچھ لوگ وہ تھے جو ماوراء النہر کے راستہ ہندوستان کی جانب آگئے تھے۔ یہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہوئے۔ امارت و خلافت پر قابض خلفائے بنی عباس نے اپنے نسب ناموں کا کوئی تحفظ نہیں کیا۔ لیکن اس کے برعکس ہجرت کر جانے والے حضرات عباسیان خواہ وہ مشائخ میں ہوں یا حکام میں ان کا شمار ہوتا ہو اور یا پھر وہ ایک عام سپاہی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہوں اپنے انساب کا تحفظ کرتے رہے اور ان میں ابھی تک یہ طریقہ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے معمول رہا ہے شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بزرگوں میں بھی ایک بزرگ قاضی حمد تھے۔ جو قلعہ ٹھٹھہ (سندھ) کے حاکم تھے۔ جو شیخ محمد افضلؒ کے سلف میں گیارھویں کرسی میں ہیں۔ ان کی اولاد میں مخدوم شیخ تاج الدین (شیخ کے سلف میں چودہویں پشت ہیں) اپنے بھائی مخدوم سراج الدین کے ساتھ اس وقت جبکہ محمد شاہ تغلق نے ٹھٹھہ فتح کیا تھا۔ نواحی بغداد سے ہجرت فرما کر خراسان اور ماوراء النہر کے راستہ یہاں پہنچے اور بادشاہ تغلق کے ایما پر صرف پچاس افراد کی جمعیت کے ساتھ علاقہ پرگنہ نندی (موجودہ سید پور ضلع غازی پور یو پی) کو فتح کیا بادشاہ نے یہ علاقہ ان ہی حضرات کو دے دیا۔ مخدوم تاج الدین وہیں مقیم ہو گئے آپ بڑے بزرگوں میں گزرے ہیں ان کے نام کا ایک ریلوے اسٹیشن بھی "تاج پور" کے نام سے موسوم ہے مخدوم سراج الدین "ریاست گور" علاقہ بنگال میں جا کر مقیم ہو گئے۔ شیخ محمد افضل مخدوم شیخ تاج الدین کی اولاد میں ہیں۔ اوائل عمر میں جونپور آکر ملا نور الدین جونپوری کی درس گاہ میں داخل ہوئے۔ وہیں سے تکمیل کی۔ اور بعد تکمیل چھ ماہ تک اسی درس گاہ میں خود بھی درس دیا۔ والد ماجد سے کسی مرشد کی تلاش کی اجازت پا کر کالپی ضلع جالون پہونچے ایک مسجد میں قیام کیا۔ پھر قطب الاقطاب میر سید محمد ترمذیؒ سے بیعت کی۔ پیر و مرشد نے اپنے صاحبزادہ کا اتالیق مقرر فرمایا۔ کچھ دنوں بعد حسب الارشاد پیر و مرشد الہ آباد آئے۔ اور شاہجہان بادشاہ کی ۱۰۴۵ھ میں تعمیر کردہ جامع مسجد میں قیام فرمایا۔ نشیب میں آباد ہونے کی وجہ سے ہر سال سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کیلیے بادشاہ اورنگ زیب نے الہ آباد کو از سر نو آباد کیا اور حضرت شیخ محمد افضل کے لیے ایک بالائی قطعہ زمین پر مکان سکونہ موسومہ "محل" ایک خانقاہ اور ایک مسجد تعمیر کی۔ خانقاہ کی تاریخ مقام افضل اور تاریخ مسجد بقعۂ افضل سے نکلتی ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی میں مولوی لیاقت علی نے قلعہ کے سامنے واقع شاہ بھائی والی مسجد سے منجنیق کے ذریعہ قلعہ پر سنگباری کی تھی۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد مسجد منہدم کر دی گئی کھنڈرات موجود ہیں۔ شیخ مرتبہ قطبیت پر فائز تھے۔ ولادت کا سن ۱۰۳۶ھ اور سن وفات ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ ہے خانقاہ کے احاطہ میں مزار مقدس واقع ہے درگاہ شریف تعمیر شدہ ہے شرح الفصوص علی ذوق النصوص، شرح مثنوی معنوی، شرح رسالہ تسویہ مصنفہ شیخ محب اللہ الہ آبادی (۱۰۵۸ھ) شرح رسالہ الفنا مصنفہ حضرت میر سید محمد ترمذی آپ کی تصانیف میں مشہور ہیں ایسے مکاتیب در سلوک میں معروف ہیں شیخ کمال الدین آپ کے فرزند ہیں (مفتاح التواریخ۔ تذکرہ علمائے ہند۔ مرتبہ انوار الحق گور۔ اولیاء نوٹ) یہ تفصیلی حالات حاشیہ میں ہیں اس خادم الفقراء یعنی خالد فاخری الہ آبادی نے جو آپ کے اخلاف میں ایک فقیر ہے صرف قارئین کے استفادہ کے لیے تحریر کیے ہیں۔

کہ رسالہ ضائع کر دیا جائے لیکن اس کا محفوظ رکھنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ کیونکہ فتنہ کی آگ بہت بھڑک چکی تھی مجبوراً انہوں نے لکڑی کے ایک پیالہ میں پانی بھر کر اس چہار ورقی رسالہ کو اس میں ڈبو دیا کہ جب یہ کاغذ پانی میں زیادہ دیر تک رہے گا تو خود بخود صاف ہو جائے گا اس لیے کہ شیخ محمد افضل اپنے ہاتھ سے خود اس کی کتابت کو مٹانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ رسالہ رات بھر پانی میں پڑا رہا مگر کسی ورق کی ایک سطر بھی نہیں مٹ سکی صبح کے وقت یہ حال دیکھا تو دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حضرت میر صاحب کی خواہش یہ ہے کہ یہ رسالہ باقی رہے خشک کر کے محفوظ کر لیا شیخ محمد یحییٰ[1] الہ آبادی کتاب "اعلام الانام" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

میں نے اس رسالہ کو بالکل اسی طرح حضرت میر صاحب کی دیگر تصانیف کے ساتھ مجلد کرا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا ہے۔

بروز شنبہ (سنیچر) ۲۶ شعبان ۱۰۷۱ھ حضرت میر سید محمد ترمذی کالپوی قدس سرہٗ نے وصال فرمایا راقم الحروف آزاد کہتا ہے:۔

غوث عالم یگانۂ آفاق — میر سید محمد ذیشان
گفت تاریخ رحلتش آزاد — رفت قطب زماں بسوئے جناں

۱۰۷۱ھ

---

[1] شاہ محمد یحییٰ عرف شاہ خوب اللہ بن شیخ محمد امین عباسی، شیخ محمد افضل کے برادر زادہ، مرید، داماد، خلیفہ اور سجادہ نشین تھے حضرت شیخ محمد افضل کے وصال کے بعد سجادہ نشینی کے مسئلہ میں شیخ کے صاحبزادہ ملا کمال الدین محمد شارح کتاب سلم الثبوت سے اختلاف پیدا ہوا تو بادشاہ عالمگیر نے حضرت شاہ خوب اللہ قدس سرہٗ کے حق میں فیصلہ کیا۔ مرتبۂ قطبیت پر فائز تھے آپ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرمایا۔ متعدد بار حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی۔ فجر سے قبل ایک روز خاص کیفیت میں مکیف تھے، کہ گریہ طاری ہوا۔ فجر کے بعد جب دامن پر نگاہ گئی تو دیکھا کہ جتنے قطرات اشک دامن پر گرے تھے۔ اتنی جگہ لفظ "اللہ" بن گیا تھا۔ ایک فرمان کے ذریعہ بادشاہ فرخ سیر نے ایک لاکھ چالیس ہزار چار سو چالیس روپے چار آنے کی سالانہ نذر بطور معافی آپ کو دی تھی آپ کے تین صاحبزادہ ہوئے شاہ محمد طاہر صاحب نے اٹھائیس سال کی عمر میں استاذ العلماء کی حیثیت سے لاولد وصال فرمایا دوسرے صاحبزادہ علامہ شاہ محمد فاخر زائر محدث اور تیسرے صاحبزادہ شاہ محمد ناصر افضل جو صدر خانقاہ میں مدفون ہیں ان حضرات کی نسل آج تک موجود ہے شاہ محمد فاخر زائر سجادہ نشین ہوئے اور ان سے سلسلۂ فاخریہ کی بنیاد پڑی سلسلۂ فاخریہ کے سرخیل شاہ محمد فاخر زائر ہیں۔ حضرت شاہ خوب اللہ قدس سرہٗ صاحب تصانیف ہیں۔ (۱) مکتوبات شریف (حقیقت تصوف کے اظہار میں) (۲) مآثر الاعتقاد (فضائل صحابہ عربی زبان میں) (۳) افاضۃ القاری فی شرح ثلاثیات بخاری (عربی) (۴) اخراج الخبایا فی شرح وصایا (یعنی شیخ عبدالخالق غجدوانی کا وصیت نامہ) (۵) بسط الکلام فی وفیات الاعلام (۶) شرح رسالہ مکیہ، ان کی تصانیف میں بہت مشہور ہیں۔ (تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر، ذیل الوفیات، مفتاح التواریخ)

۴۰

میر سیّد احمد بن میر سیّد محمد کالپوی قدس سرہٗ

آپ ولایت محمدیہ کے وارث اور علم احمدیہ کے اٹھانے والے ہیں۔ زمانہ طفلی ہی سے راہنمائی کا اظہار ہوتا تھا۔ اور جبین مبارک پر ولایت کا نور چمکتا نظر آتا تھا۔ پروردگار عالم نے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں ہی ذریعے سے بھرپور طریقہ پر نوازا تھا۔ اور تمام اعلیٰ صفات خصوصاً عطا و بخشش اور ایثار و مروّت کے اوصاف پورے پورے آپ کے اندر موجود تھے۔ علم ظاہر کے حصول میں ابتدا ہی سے کوشش کی۔ کچھ دنوں والد ماجد کی درس گاہ میں بھی شامل رہے۔ پھر حسامی سے تفسیر بیضاوی تک شیخ محمد افضل الہ آبادیؒ سے پڑھیں۔ والد ماجد سے بیعت کی اور طریقہ محمدیہ پر مکمل طور پر گامزن ہو گئے۔ ۲۴ سال کی عمر میں حضرت والد ماجد قدس سرہ کی جگہ تبلیغ و ارشاد کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی شہرت عطا فرمائی اور آپ کی طرف کثرت سے خلائق کا رجوع تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو منارۂ نور اور لوگوں کے لیے قبلۂ حاجات بنا دیا تھا۔ باوجود اس اعلیٰ مرتبہ کے فقر و انکساری نہیں چھوڑی۔ اور آفتاب عالمتاب کی طرح بلا امتیاز ہر ایک سے مساویانہ طریقہ پر پیش آتے تھے۔ حضرت والد ماجد ان پر خصوصی طور پر مہربانی اور توجہ فرماتے تھے ارشاد فرماتے تھے کہ محمد اور احمد ایک ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی قدس سرہٗ کے مزار مقدس سے رخصت ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ حضرت خواجہ قدس سرہٗ نے ہم کو رخصت کر دیا اور سید احمد کے سر پر دستار باندھ دی۔ اور فرمایا کہ مجلس چشت منعقد کرو۔ (محفل سماع)۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جناب والا کو سماع سے کافی رغبت تھی۔ باوجودیکہ آپ کے والد محترم (قدس اللہ سرہٗ) کو سماع سے رغبت نہ تھی۔ جب بھی ان کی حیات طیبہ ہی میں علانیہ مجلس سماع منعقد فرماتے تھے۔ والد ماجد کے وصال کے بعد بھی بموقع عرس مجلس سماع منعقد فرماتے تھے۔ شیخ محمد افضل الہ آبادی قدس سرہٗ نے یہ خبر سن کر آپ کو الہ آباد سے خط بھی لکھا۔ اور پیغام بھی بھجوایا۔ کہ عرس کے ایام میں میرا آنا محال ہے کیونکہ نہ تو دوستوں کی موافقت کر سکتا ہوں اور نہ ان کی مخالفت (یعنی نہ تو میں سماع میں شریک ہو سکتا ہوں اور نہ ہی آپ کو منع کر سکتا ہوں)۔ حضرت قدس سرہ نے جواب میں یکے بعد دیگرے دو خطوط تحریر فرمائے اور تاکید فرمائی کہ آپ ضرور تشریف لائیے۔ شیخ محمد افضل الہ آبادی دوسرا خط ملنے کے بعد کالپی حاضر ہوئے حضرت نے ان کے آنے کے بعد محفل سماع موقوف کر دی۔ لیکن تین دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ان تین دنوں میں جتنی مرتبہ بھی شیخ سے ملاقات ہوئی۔ ان لوگوں کی جو والد ماجد کے مریدین میں تھے اور سماع کے سلسلہ میں نصیحت کرنے والوں اور ملامت کرنے والوں کے ساتھ ان کے اس رویہ کی شکایت فرماتے جو ان لوگوں نے ان اصحاب کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ آخر تیسرے دن جب سید صاحب نے شکایت فرمائی تو حضرت شیخ نے حضرت کو

کافی اطمینان دلایا یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت ہوگیا نماز کے بعد پھر گفتگو شروع ہوئی اور بعد نماز مغرب بھی جب گفتگو کا سلسلہ ختم نہ ہوسکا تو شیخ نے بھی اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ دریافت فرمایا قوال کہاں ہیں؟ قوالوں نے کہا ہم حاضر ہیں شیخ نے فرمایا تم اپنا کام کیوں نہیں شروع کرتے۔ اجازت پاتے ہی قوالوں نے اپنا کام شروع کر دیا حضرت خوش ہوگئے۔ فرمایا میاں جیو[1]! میں بھی گاتا ہوں۔ رومال اور تسبیح ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوگئے اور لفظ مبارک اللہ کا ذکر فرمانے لگے۔ حاضرین مجلس پر زبردست اثر ہوا۔ اور سب پر بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت شیخ قوالوں کو اجازت دے کر خود مجلس سے باہر آگئے۔

واضح رہے کہ حضرت میر سید احمد قدس سرہٗ شیخ محمد افضل الٰہ آبادی کو "بچپن" ہی سے میاں جیو کہتے تھے حضرت قدس سرہٗ کی توجہ کے اثرات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ہر معتقد اور غیر معتقد جس پر بھی توجہ فرماتے۔ اسی وقت بے خود ہوجاتا۔ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس نے کہا کہ میرا دل ایسا سخت ہے کہ اپنے والدین کے انتقال پر بھی میں نہیں رویا۔ میری بیوی اور بچوں کا انتقال ہوا۔ میں اس پر بھی نہیں رویا۔ لوگوں نے آپ کے متعلق بتایا ہے کہ آپ لوگوں کو رُلا دیتے ہیں۔ مجھ پر بھی توجہ کیجیے۔ حضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ مضبوط پکڑ لیے۔ اور اسے ہلانا شروع کیا۔ اور آخر میں بے خودی کے عالم میں فرمایا۔ تو نہیں روئے گا؟ تین بار تم فرمایا اور تیسری بار اسے پٹک دیا وہ شخص زمین پر پڑا ہائے ہائے کرتا تھا۔ اور زار زار روتا تھا کافی دیر کے بعد افاقہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے حضرت سے بیعت کی۔

ایک مخلص پہننے کے لیے کپڑے سی کر نیازمندانہ طور پر خدمت میں لایا اور خوشامد کی کہ حضور! اس کو زیب تن کریں۔ اور مجھ پر احسان فرمائیں۔ جمعہ کی نماز کے وقت وہ کپڑے پہن کر نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ ادائگی نماز کے بعد ایک شخص نے جو شریعت مطہرہ پر عمل کا مدعی تھا عرض کیا کہ آستین زیادہ ہے حضرت نے اپنی آستین اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اور اس کی آستین خود پکڑ لی۔ اس کی آستین کی لمبائی بہت ہی زیادہ ہوگئی۔ اور وہ بہت شرمندہ و نادم ہوا۔ اور حضرت کی آستین کوتاہ ہوکر کلائیوں تک آگئی۔ طبقات شعرانی[2] میں ہے۔ کان علی

---

[1] میاں جیو! قدیم اردو تہذیب میں استاد کو کہتے ہیں چونکہ پیر و مرشد حضرت میر سید احمد قدس سرہٗ نے حضرت شیخ محمد افضل الٰہ آبادی کا نام معتبر فرمایا تھا۔ اور سطور بالا میں گذر چکا کہ حضرت سید احمد قدس سرہٗ نے بیضاوی تک شیخ محمد افضل الٰہ آبادی سے پڑھا تھا وہ اللہ و احترام ان کو میاں جیو کہہ کر مخاطب فرماتے تھے اور آج تک یہی رسم قدیم باقی ہے (مترجم)۔

[2] شعرانی دسویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں ان کا اسم گرامی تہامہ ابوالمواہب عبدالوہاب بن احمد بن علی انصاری شافعی مصری ہے۔ (۸۹۸ھ تا ۹۷۳ھ) اور ان کو ساقیہ ابی شعرہ مصر کی نسبت سے شعرانی کہتے ہیں۔ علمائے متصوفین میں سے ہیں علم تصوف اور تراجم صوفیہ میں متعدد کتابیں تالیف کی ہیں۔ تصوف اور اہل تصوف کی حمایت کرتے تھے۔ طبقات میں انہوں نے دو کتابیں "کبریٰ اور وسطیٰ" تصنیف کی ہیں۔ پہلی کا نام "لواقح الانوار فی طبقات الاخیار" اور دوسری کا نام "لواقح الانوار القدسیہ فی مناقب العلماء والصوفیہ" ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رضی اللہ عنہ یقطع من کم قمیصہ ما ذاد علی رؤس الاصابع وکذلک عمر رضی اللہ عنہ (حضرت علیؓ آستین کا وہ حصہ کاٹ دیا کرتے تھے۔ جو انگلیوں کی پوروں سے آگے نکلا ہوتا تھا۔ اور اسی طرح حضرت عمرؓ بھی کرتے تھے)۔

جس وقت اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہٗ نے رسالہ تسویہ کے سلسلہ میں پورے ملک کے فقراء کو اپنے دربار میں طلب کیا اور تمام ہندوستان کے فقراء کے اسماء گرامی کی فہرست ان کے سامنے پیش کی گئی اس میں حضرت میر سید احمد کا نام نامی بھی تھا۔ سلطان اورنگ زیب نے حضرت کے نام پر خاص اپنے خط سے برحمت حق پیوست تحریر کر دیا۔ (یعنی حضرت کا وصال ہو گیا) سلطان کو اس کا علم تھا لیکن فہرست لکھنے والے کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔ اس فہرست میں حضرت شیخ محمد افضلؒ الہ آبادی کا نام بھی تھا۔ ان کے نام پر سلطان نے دائرہ بنایا اور حاجی محمد ولی قلی کے نام پر تحریر فرمایا کہ یہ شیخ محمد افضل کے برادر دینی ہیں۔ یہ خاندان صاحبانِ تقویٰ کا ہے۔ یہ امور عقیدہ باطلہ کے خیال سے مبرا ہے۔ (اس خاندان کے متعلق خیال فاسد نہیں قائم کیا جا سکتا) نتیجہ کے طور پر تمام فقراء کی طلبی روک دی گئی۔ حضرت سید احمدؒ اپنے والد ماجد کی اتباع میں خود ایک مرتبہ حضرت غریب نواز کی بارگاہ اجمیر شریف میں حاضر ہوئے۔ اور خواجہ خواجگان کی روح پاک سے بھرپور فیض حاصل کیا۔ حضرت کا وصال ۱۹ صفر ۱۱۱۲ھ بمقام کالپی شریف ہوا۔ اور وہیں مدفون ہیں۔ حضرت کے تین صاحبزادگان ہوئے۔ شاہ فضل اللہؒ، سید سلطان معشوق، سید سلطان مسعود، ان میں شاہ فضل اللہ قدس سرہٗ صاحبِ کمالات ظاہری و باطنی تھے۔ والد ماجد اور جدِ امجد کے طریقہ پر ثابت قدم اور کاربند رہے۔ شیخ محمد افضل الہ آبادی فرماتے ہیں۔ ؎

عیانِ فضلِ سید فضل اللہ آنکہ ہست ۔۔۔ برشانِ فقرش از عمل و علم دو گواہ

سید صاحب کے چہرۂ انور سے ولایت کا اظہار ہوتا تھا اور ہر ایک بُنِ مو سے ذوق و شوقِ الٰہی کا اظہار ہوتا تھا بخشش و عطا اور تمام اوصاف حمیدہ بدرجہ اتم ان کے اندر موجود تھے۔ ایک زمانہ میں شدید قحط پڑا۔ پورا سال اسی قحط میں گذر گیا۔ کافی لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس وقت شاہ فضل اللہ رات دن میں صرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر) شعرانی شیخ اکبر علامہ محی الدین ابن عربی کے حامیوں میں سے تھے۔ شیخ کی حمایت میں الکبریت الاحمر فی علوم الشیخ الاکبر نامی کتاب تصنیف کی نیز کتاب "الیواقیت والجواہر فی العقائد الاکابر" قابل مطالعہ ہے۔ علاوہ کتب مندرجہ بالا کے شعرانی کی مندرجہ ذیل کتابیں بہت معروف ہیں "کشف الغمہ عن جمیع الامہ" "میزان الکبریٰ" "الانوار القدسیہ فی آداب الصوفیہ" یہ تمام کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور مشہور ہیں بعض کتابیں قلمی غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ "الاجوبۃ المرضیہ عن الائمۃ الفقہاء والصوفیہ" "آداب القضاۃ" "ارشاد الطالبین الی مراتب العلماء العاملین" علامہ شعرانی سے متعلق تفصیلات کے لیے مطالعہ کیجیے (تاج العروس، الخزانۃ التیموریہ، معجم المطبوعات، مادہ شعرہ، آداب اللغۃ)۔ بقیہ حاشیہ ختم ہوا۔

سلہ متوفی ۱۱۱۱ھ ، ۱۷۰۰ء

سلہ متوفی ۱۱۲۳ھ ، ۱۷۱۱ء۔

سلہ متوفی ۱۱۵۲ھ ۱۷۳۹ء ولادت ۱۰۷۳ھ، ۱۶۶۲ء، رسالہ شرائط مجدان کی تصنیف ہے۔

ایک بار تھوڑی سی غذا برائے نام استعمال فرماتے تھے۔ اور باقی جہاں تک ہو سکتا تھا ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۱۱ھ کو وصال فرمایا۔ حضرت شاہ فضل اللہؒ کے فرزند اور جانشین حضرت سلطان ابوسعید[1] کا شمار جلیل القدر اولیاء میں ہوتا ہے جو حضوری اور ذوق و سرور کی کیفیت کے حامل تھے۔ جس وقت حضرت شاہ فضل اللہؒ نے وصال فرمایا ان کے صاحبزادہ سلطان ابوسعید اور برادر عزیز سید سلطان معصود (رحمہا اللہ تعالیٰ) ہر دو حضرات نے حضرت سلطان العارفین میر شاہ لدھا بلگرامی قدس سرہٗ کو خط لکھ کر کالپی بلایا۔ سید العارفین ہر دو صاحبزادگان کی طلبی پر فوراً کالپی شریف پہونچے یہاں اس خاندان کے تمام خلفاء جیسے شاہ محمد افضل الہ آبادی و شیخ عبد الحکیم[2] مرہانی موجود تھے۔ سجادہ نشینی کے مسئلہ میں اختلاف ہوا اگرچہ جمہور اس پر متفق تھے کہ سجادہ نشینی میر سید سلطان معصود کو ملنی چاہیے کیونکہ وہ میر سید احمد کے صاحبزادہ ہیں۔ اور میر سید ابوسعید نبیرہ (پوتے) ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ سید سلطان معصود صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ خاندان میں سب سے معمر ہیں۔ لیکن سید العارفین کہتے تھے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ باپ کی سجادگی بیٹے کا حق ہو۔ علم باطن کا انحصار علم ظاہر پر نہیں ہے اس کا تعلق زبان سے اور اس کا دل سے ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو بزرگان خاندان کی برکتوں سے یہ بھی خاندان کے مضبوط ستون اور طالبان حق کے لیے ایک مرکز ہوں گے اس کے بعد حضرت سید سلطان معصودؒ نے سید العارفین کو خلوت میں بلا کر انکساری کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ آپ میرے لیے حضرت سید احمد کی جگہ ہیں اگر باپ کا حق بیٹے کو ملتا ہے تو یہ ہونا چاہیے اور حضرت میر سید محمد کی دستار مبارک میرے سر پر باندھی جائے اور حضرت شاہ فضل اللہ کی دستار مبارک سلطان ابوسعیدؒ کے سر پر۔ سید العارفین نے عرض کیا کہ حضرت میر سید محمد جو دستار اپنے سر پر باندھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل کی بزرگی کی شکل میں عطا فرما دی آپ ایسا کریں کہ دوسرے آپ کی دستار اپنے سر پر باندھیں نہ کہ آپ دوسروں کے محتاج ہوں اشارہ اس جانب تھا کہ یہ حق دوسروں کو عطا کر دیجیے اس طرح سید العارفین کی کوششوں سے صاحب سجادہ حضرت سلطان ابوسعید قرار پائے اور جلد ہی اس سلسلہ میں سید العارفین کی کرامت بھی ظاہر ہو گئی۔ وہ یہ کہ بہت تھوڑی مدت میں مرضی الٰہی سے سید سلطان معصود کی نسل ہی منقطع ہو گئی۔ حضرت سید سلطان معصودؒ کے صرف ایک صاحبزادہ تھے جن کا نام سلطان محمد اعظم تھا۔ جو ایام طفلی ہی میں آسودۂ لحد ہو گئے تھے۔ اس طرح کوئی وارث باقی نہیں رہا۔ (اور یہ سلسلہ تناسل ہی ختم ہو گیا) انا للہ وانا الیہ راجعون حضرت سلطان ابوسعید قدس سرہٗ ۱۱۳۶ھ میں سید العارفین سے ملاقات کے لیے بلگرام تشریف لائے اور اپنے ارادت مندوں کے کاشانوں کو اپنے جمال مقدس کے آفتاب سے نورانی بنایا۔ حضرت سلطان ابوسعید اکثر رموز معرفت اشعار میں فرما دیتے تھے۔ اور عرفانؔ تخلص فرماتے تھے۔

---

[1] متوفی ۱۱۲۷ھ ، ۱۷۱۴ء۔ نواب غضنفر جنگ متوفی ۱۱۵۶ھ ، ۱۷۴۳ء ان کے مرید تھے۔

[2] صوفی حنفی، ولادت بمقام قصبہ مرہان ضلع بارہ بنکی۔ حضرت میر سید محمد کالپوی قدس سرہٗ سے تحصیل علم کی۔ اور خلافت کی فضیلت حاصل کر کے وطن واپس لوٹے۔ ۱۱۳۵ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)۔

ذیل کی رباعی ملاحظہ فرمائیں ؎

دیروز کہ دل رفتہ زکاشانۂ ما — لیلی گویاں جنوں شد از خانۂ ما
امروز شنیدم انا لیلی میگفت — گلبانگ دگر شنوز دیوانۂ ما

حضرت کا وصال ۱۱۴۷ھ میں ہوا۔ مؤلف ماثر الکرام آزاد نے اس طرح تاریخ وصال کہی ؎

آں شاہ ابوسعید قطب عرفاں — شد منزل آں سعید درون فردوس
دریاب کہ از آیۂ قرآن مجید — تاریخ نوشتم یرثون الفردوس

۱۱۴۷ھ

حضرت شاہ ابوسعید کے فرزند ارجمند سید احمد سلمہ اللہ آج کل آباؤ کرام کے سجادہ کی زینت ہیں۔ اور سالکان راہ طریقت کے لیے خضر راہ کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ جب فقیر (میر غلام علی آزاد بلگرامی) حجازِ مقدس کے سفر کے لئے بلگرام سے نکلا موضع چورہ جو دریائے جمنا کے اسی جانب ہے (موجودہ ضلع کانپور) پہنچا تو ان کی صحبت بابرکت میں بھی حاضر ہوا۔ جہاں تک حضرت میر سید احمد قدس سرہٗ کے دوسرے صاحبزادہ حضرت سید سلطان معصوم قدس سرہٗ کا تعلق ہے تو وہ ابتداءً ایک عرصہ تک تحصیل علم میں مشغول رہے۔ سید سعد اللہ بن سید مرتضیٰ جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا) کی درس گاہ سے اکثر فنون درسی کی تکمیل کی۔ بلگرام میں قیام کے دوران سرور سید العارفین کی خدمت میں پہنچتے تھے۔ اور طریقہ احمدیہ کے بعض اشغال کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تحصیل علم و فراغت کے بعد کالپی شریف واپس تشریف لے گئے۔ ہر قسم کے علم و فن کی کتابوں کا مشکل ترین درس دیتے تھے۔ اکثر درسی کتابوں پر حاشیے بھی تحریر فرمائے۔ اور شرح ہدایت الحکمۃ[1]، میبذی، شرح قصیدۂ بردہ پر جو ملک العلماء قاضی شہاب الدین کی تصنیف ہے حواشی تحریر فرمائے ہیں۔ لیکن اجل نے فرصت نہ دی کہ وہ تمام حاشیے جمع کر کے ان کی شیرازہ بندی کر لیتے۔ پس ماندگان کی بے احتیاطی کی بنا پر اکثر مسودے ضائع ہو گئے ان کا انتقال ماہ صفر ۱۱۲۳ھ میں ہوا۔

---

[1] ہدایۃ الحکمۃ تالیف اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری (م ۶۶۳ھ، ۱۲۶۴ء) اپنے عہد میں محقق، فاضل اور جید عالم تھے یہ کتاب فن حکمت نظری پر تحریر کی ہے اس فن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (۱) طبیعات (۲) ہیئات، اور یہ متن (ہدایۃ الحکمۃ) فن فلسفہ میں مشہور شامل درس ہے۔ متعدد علماء و فضلاء نے اس پر شرحیں لکھی ہیں شرح صدر الدین شیرازی (۹۲۳ھ) معروف بہ ملا صدرا اور دوسری شرح حسین بن معین الدین میبذی سے علماء و طلباء درس نظامی بخوبی واقف ہیں اور ان دونوں شرحوں پر فضلائے فن نے حاشیے اور شرحیں لکھی ہیں۔ شرح عین القضاۃ شاگرد مولانا عبد الحی فرنگی محلی لکھنوی مشہور و معروف ہے شرح میبذی کیلیے صاحب ترجمہ نے حاشیہ لکھا ہے علامہ ابہری نے بہت سی کتابیں اور رسائل لکھے ہیں (ایساغوجی) علم ہیئت میں مختصر رسالہ فی الاسطرلاب تنزیل الافکار فی تعدیل الانکار (فن منطق) جامع الدقائق فی کشف الحقائق، زبدۃ الاسرار، رایات الافلاک، الزیج الشامل، الزیج الاختیاری معروف بہ تلخیص الزیج ان کی تصانیف میں شامل ہیں ایساغوجی اور شرح ہدایۃ الحکمۃ کے علاوہ کوئی کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے (آداب اللغۃ، ہدایت العارفین)۔

حضرت میر سید احمدؒ کے تیسرے صاحبزادہ سید سلطان مسعود عرف میاں صاحب کی ولادت ۱۰۸۲ھ میں ہوئی۔ "نیک بخت" جو مسعود کا ترجمہ ہے ان کی تاریخ ولادت ہے دو سال کے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا جب سن تمیز کو پہنچے تو والد ماجد اور جد بزرگوار کے بہت سے خلفاء سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جیسے شیخ محمد افضل الہ آبادیؒ شیخ عبدالحلیم مرہانی، سید العارفین میر شاہ لدھا بلگرامی وغیرہم قدست اسرارہم لیکن رہنمائی کی اجازت شیخ محمد افضل الہ آبادیؒ سے حاصل کی۔ اور جب ان کے بڑے بھائی شاہ فضل اللہ قدس سرہٗ نے رحلت کی تو حضرت سید سلطان مسعود نے بمقام سکندرہ جو کالپی شریف سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے اور دریائے جمنا سے اس طرف ہے سکونت اختیار فرمائی اور ہمیشہ طالبانِ حق کو دعوتِ حق دیتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۱۵۳ھ میں داعیٔ حق کو لبیک کہا۔ فقیر نے دو مرتبہ ان کو دیکھا ہے اور ان سے فیوض حاصل کیے ہیں۔ پہلی مرتبہ مکن پور میں جب کہ حضرت شاہ[1] بدیع الدین قطب المدار قدس سرہٗ کے عرس میں شرکت کے لیے حضرت تشریف لائے تھے اور فقیر بھی زیارت مزار مقدس کی غرض سے وہاں گیا تھا۔ یہ واقعہ ماہ جمادی الاول ۱۱۳۲ھ کا ہے۔ اور دوسری مرتبہ سکندرہ میں جب فقیر سفر سندھ سے واپس ہوا تھا۔ یہ واقعہ ماہ شعبان ۱۱۳۷ھ کا ہے۔

شجرۃ النسب

سید محمد ترمذی
(۱۰۷۱ھ ، ۱۶۶۱ء)

میر سید احمد
(۱۰۸۳ھ ، ۱۶۷۳ء)

سلطان مسعود (۱۱۵۳ھ ، ۱۷۴۱ء)

شاہ فضل اللہ (۱۱۱۲ھ ، ۱۷۰۰ء)

سلطان مقصود (۱۱۲۳ھ ، ۱۷۱۱ء)

شاہ ابو سعید (۱۱۴۷ھ ، ۱۷۳۴ء)

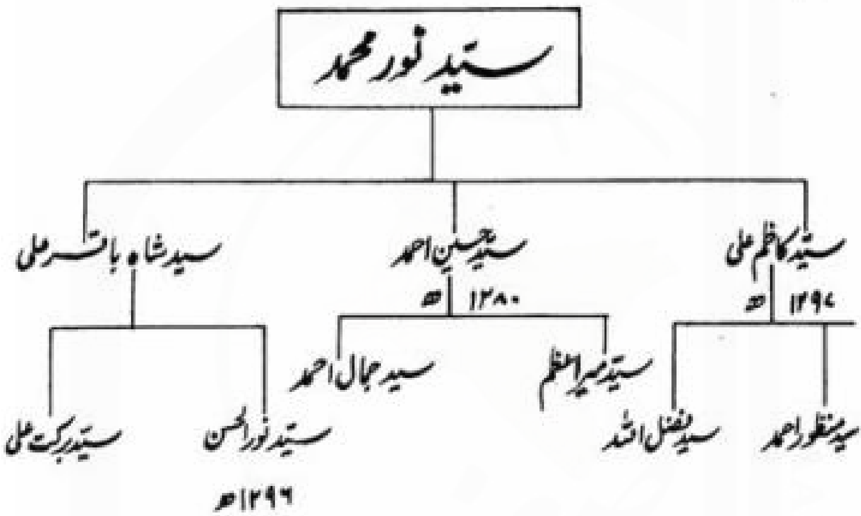
سید احمد سعید (۱۱۷۰ھ ، ۱۷۵۶ء)

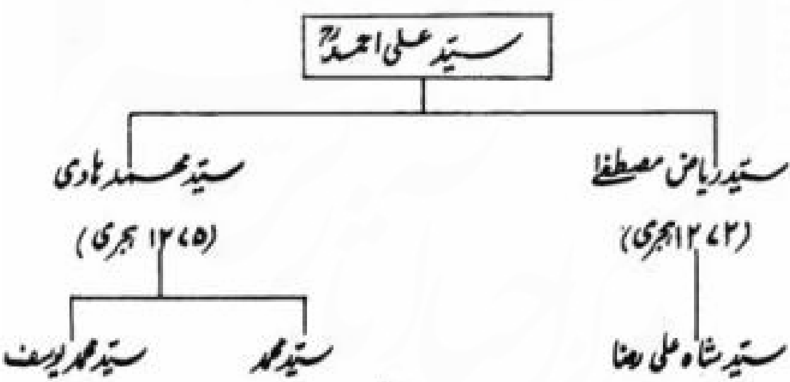
سید خیرات علی (۱۲۳۷ھ)

---

[1] آپ ہندوستان کے مشہور اولیاء کرام میں سے ہیں آپ کا سلسلہ طریقت چھ واسطوں سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت امیر قنوجی نے " تقصار " میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت سید خیرات علی کا وصال ۱۲۴۷ھ میں ہوا حضرت سے اور میرے والد مرحوم سے اچھے تعلقات تھے اور باہمی رشتہ اور محبت تھا۔ حضرت کے پانچ صاحبزادگان تھے۔ (۱) سید نور محمد (۲) سید شاہ ظہور احمد ۱۲۸۸ھ (۳) سید سلطان احمد ۱۲۶۴ھ ۔ (۴) سید علی احمد (۵) سید تراب علی (۱۲۸۱ھ) اس کے بعد شجرات مختلف شعوب میں منقسم ہو گئے۔





(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر)
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے قاضی محمد لکھنوی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی آپ کے مریدوں میں سے ہیں حضرت شاہ مدار نے طویل عمر پائی اور ۸۳۸ھ میں وصال فرمایا۔ موضع مکن پور (ضلع کانپور) آپ کا مدفن ہے (نزہۃ الخواطر)۔

(۴۱)

شیخ عبدالحفیظ فرشوری بلگرامی قدس سرہ

شہر بلگرام کے متوطنوں کے خاندان سے ہیں۔ ایام شباب ہی میں خداطلبی کے درد میں اپنے وطن مالوف سے نکل کر کالپی میں حضرت میر سید محمد کالپوی کی روشن بارگاہ سے رابطہ پیدا کرلیا۔ حضرت میر صاحب کے وصال سے چار ماہ پہلے ان سے مرید ہوئے اکثر اوقات شیخ عبدالحکیم موہانی کی صحبت میں رہ کران سے کافی فائدہ حاصل کیا۔ شیخ عبدالحکیم موہانی، حضرت میر سید محمد کالپوی قدس سرہٗ کے جلیل القدر خلفا میں سے تھے، ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۵ھ کو موہان میں وصال فرمایا۔ شیخ عبدالحفیظ اگرچہ میر سید محمد کالپوی قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ لیکن حضرت میر سید احمد قدس سرہٗ سے کافی نعمتیں حاصل کیں۔ اوران کے فیوض سے بہرہ ور ہوئے اور آپ ہی سے خلافت واجازت بھی حاصل کی۔ اجازت نامہ کے الفاظ جو حضرت میر سید احمد قدس سرہٗ نے اپنے دست حق پرست سے تحریر فرمائے یہ ہیں۔

جب فقیر حقیر احمد بن محمد نے مشیخت پناہ، حقائق دستگاہ، شیخ عبدالحفیظ کو دیکھا کہ وہ ہر طرح مکمل ہیں، اور شریعت مطہرہ پر عامل ہیں اور سلوک وطریقت کے تمام منازل طے کرچکے ہیں تو میں نے ان کو اس بات کا مجاز بنایا کہ جو شخص چاہے کہ توبہ کرے یا راہ حق پر چلنا چاہے اوران کی طرف رجوع کرے، بغیر کسی تکلف کے کرسکتا ہے اس کو نفع حاصل ہوگا، جیسا کہ عارف شیرازؒ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں بر خاک　　در آں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

اللہ تعالیٰ مشارٌ الیہ کو اپنا اور خلائق کا مقبول بنائے۔" بالنون والصاد۔

(۴۲)

سید درگاہی بلگرامی قدس سرہ

سید درگاہی بلگرامی بن سید عبدالخیر المعروف بہ سید گھاسی بن سید درویش بن سید حاتم بن سید بدرالدین عرف سید بدلی محلہ سید واڑہ کے چار خانوادوں میں سے ایک خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں طلب علم کے لیے بلگرام کے گردو نواح اور قصبہ جات میں کافی تگ ودو کی اور علمائے وقت سے بھی درسیات پڑھیں آخر میں قاضی علیم اللہ کچندوی سے درسیات کی تکمیل کی۔ پھر مراتب قال سے منازل حال کی جانب مراجعت کی (یعنی تصوف وطریقت کی جانب توجہ فرمائی) اور مذکورہ الصدر قاضی علیم اللہ کے حقیقی چچا شیخ عبدالرسولؒ مرید وخلیفہ شیخ مجا ساکن لاہر پور ضلع خیرآباد کے مرید ہوئے۔ اور باطنی تربیت حاصل کرنے کے بعد وطن مالوف کو معاودت کی

اور آخر دم تک درس و تدریس اور یادِ الٰہی میں مشغول رہے [illegible] کے دوسرے عشرہ میں دارِ فانی سے دارِ بقا کی جانب تشریف لے گئے۔ ان کی آرام گاہ بلگرام میں ہے۔

شجرۂ نسب

سید بدرالدین عرف سید بدلی

- سید حاتمؒ
  - سید درویش
    - سید عبدالخیر عرف سید گھاسی
      - سید درگاہی
- سید پیارہ
  - سید بہار
    - سید فخرالدین
      - سید مبارکؒ (ولادت ۱۰۴۳ھ وفات ۱۱۱۵ہجری)
        - میر سجادؒ

(۴۳)

میر سید مبارک محدث بلگرامی قدس سرہٗ

صحیح النسب سید تھے۔ سنت کے احیاء اور بدعت کے خاتمہ کے لیے ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے۔ علومِ ظاہری و باطنی میں یکتا اور تقویٰ و طہارت میں ممتازِ زمانہ تھے آپ کا نسب نامہ اس طرح ہے سید مبارک بن سید فخرالدینؒ بن سید بہار بن سید پیارہ بن سید بدرالدینؒ جو جدِّ قبیلہ یعنی (مورث اعلیٰ ہیں) آپ کی ولادت ۶ شعبان ۱۰۴۳ھ کو ہوئی عنفوانِ شباب ہی سے تحصیلِ علم کی جدوجہد کرنے لگے۔ اور مروجہ طریقہ پہ ابتداء سے انتہا تک علوم کی تحصیل و تکمیل کی۔ ابتدائی درسی کتابیں میر سید طیب بن میر عبدالواحدؒ قدس سرہم اور دیگر فضلائے بلگرام اور علمائے اطرافِ بلگرام سے پڑھیں۔ [illegible] میں حصولِ علم کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔

علامہ تفتازانی کی مطول[۱] خواجہ عبد اللہ مشہور بخواجہ خوردؒ بن خواجہ باقی باللہؒ نقشبندی قدس سرہما[۲] سے پڑھیں۔ قیام دہلی کے دوران شیخ نورالحقؒ بن شیخ عبد الحقؒ کے مکان میں مقیم رہے۔ اور انہیں سے علم حدیث حاصل کیا اور اس اعلیٰ ترین فن میں مہارت تامہ حاصل کی۔ تمام عمر کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مصروف رہے اور محدث کے لقب سے مشہور ہوئے اسی لیے اس کتاب میں ہم نے ان کو قطب المحدثین کے لقب سے یاد کیا ہے ۶ رجب المرجب ۱۰۶۴ھ کو شیخ نورالحق قدس سرہٗ کی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور دہلی ہی میں اتوار کے دن ۱۴ شوال ۱۰۶۴ھ کو جناب میر سید عبد الفتاح عسکری احمد آبادی قدس سرہٗ سے سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت کی ان تمام برکات وفیوض کے حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے۔ اور توکل وقناعت کے ساتھ بقیہ عمر درس وتدریس، ریاضت ویادِ الٰہی خصوصاً حدیث شریف کی تعلیم میں صرف کی۔ امر معروف اور نہی عن المنکر پر شدت سے قائم رہتے۔ کسی کی مجال نہیں تھی۔ کہ حضرت کی موجودگی میں جادۂ شرع متین سے سر مو بھی انحراف کر سکے حضرت کی موجودگی ہی میں بعض صاحبزادگان کا انتقال ہوا لیکن کوئی رسم یا کوئی فعل ذرہ برابر خلاف شرع عمل میں نہیں آیا ایک مرتبہ حاکم لکھنؤ غیرت خان[۳] خدمت میں حاضر ہوا۔ خان نے زیر جامہ چوڑی دار لانبے پائینچہ کا (مشروع) پہن رکھا تھا حضرت میر نے اعتراض کیا غیرت خاں نے حضرت میرؒ کا یہ احتساب قبول کیا اور اپنے ہاتھ سے پائینچہ اسی وقت کاٹ دیا۔ حضرت میر انتہائی پاکیزہ طبیعت نکتہ سنج اور لطیفہ گو تھے۔ اس کے باوجود اس درجہ بارعب اور با ہیبت تھے کہ

---

[۱] علامہ سعد تفتازانی (۷۱۲، تا ۷۹۲ھ) مسعود ابن عمر ائمہ عربیہ میں کامل اور منطق وفلسفہ کے اساتذہ میں آپ ممتاز تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اور شروح وحواشی تحریر کیے۔ انہیں میں ایک کتاب تہذیب المنطق بھی ہے۔ المطول المختصر، تلخیص المفتاح کی شرح جو محمد بن عبد الرحمٰن قزوینی کی تصنیف ہے ان پر حواشی لکھے۔ المقاصد اور اس کی شرح، علم کلام میں آپ کی یادگار ہیں اور شرح عقائد نسفی ابن حاجب مختصر کی شرح قاضی العضد پر حاشیہ اور توضیح علی التوضیح پر حاشیہ مشہور کتابیں ہیں۔ کتاب تلخیص المفتاح جو تلخیص مفتاح العلوم سکاکی (ابو یعقوب یوسف بن محمد متوفی ۶۲۶، ولادت ۵۵۵ھ) پر بھی آپ کا حاشیہ ہے۔ کتاب مفتاح بارہ علوم پر مشتمل ہے علامہ قزوینی نے صرف قسم ثالث کی تلخیص کی ہے اور اس کا نام تلخیص المفتاح رکھ دیا ہے علماء نے اس پر متعدد شرحیں لکھی ہیں انہیں میں دو شرحیں علامہ تفتازانی کی ہیں اور دونوں درسیات میں ہیں۔ (علامہ تفتازانی کے حالات کے لیے، مفتاح السعادہ وغیرہ البدر الطالع (از شوکانی) میں ان کا سال ولادت ۷۲۲ھ لکھا ہے۔

[۲] رضی الدین احمد عبد الباقی بن عبد السلام البدخشی عرف باقی باللہ کابلی ثم دہلوی ولادت ۹۷۱ھ بمقام کابل مولانا محمد صادق حلوائی سے درسیات کی تکمیل کی۔ خواجہ محمد امکنگی (م ۱۰۰۸ھ) خلیفہ درویش محمد (م ۹۷۰ھ) سے مرید ہو کے باطنی کمالات کی تکمیل کے بعد خرقۂ خلافت پایا اور دہلی میں قیام فرمایا تدریس اور تلقین خلائق میں ساری عمر گزار دی ان کے جلیل القدر خلفاء میں مولانا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۱۰۳۴ھ ہیں ۱۰۱۲ھ میں دہلی میں ہی وفات پائی بمقام گنج ننگ گیراں میں متصل قدم رسول مدفون ہوئے بہت سے رسائل مکتوبات اور سلسلۃ الاحرار ان کی تصنیفات ہیں (تذکرہ علمائے ہند، خلاصۃ الاثر، نزہۃ الخواطر، مفتاح التواریخ، حدائق حنفیہ، انوار العارفین، آثار الصنادید، رود کوثر)۔

[۳] عبد اللہ خان فیروز جنگ کا برادرزادہ والد کا نام سیداد خان تھا ۱۰۵۰ھ بعہد شاہ جہان بادشاہ وفات پائی (مفتاح التواریخ، عمل صالح)۔

ان کے سامنے لوگوں کا پتہ پانی ہوجاتا تھا۔ معاش میں صفا اور نزاکت ولطافت کا خاص خیال رکھتے تھے اپنے بیٹھنے کی جگہ اور مسجد کے سامنے کا حصہ ایسا پاک وصاف رکھتے تھے کہ وہ سینۂ صاف دلان ودیدۂ پاک بینان معلوم ہوتا تھا۔ راقم الحروف نے گویا یہ شعر حضرت میرؒ کی زبان سے کہا ہے ؎

جباب خوش نشم می زیم بہ وضع صفا　　　زآب صرف بنا کردہ اند منزل من

استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی طاب ثراہ فرماتے تھے کہ ایک دن میں حضرت میرؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت وضو کرنے کے ارادہ سے اٹھے تھے۔ کہ اچانک زمین پر گر پڑے۔ میں جلدی سے دوڑ کر نزدیک پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد سکون ہوا تو میں نے کیفیت پوچھی۔ میرے انتہائی اصرار کے بعد ارشاد فرمایا کہ تین روز ہوگئے ہیں کہ غذا کا ایک دانہ بھی میسر نہیں آیا ہے اور ان تین دنوں میں کسی کے سامنے اظہار کے لیے زبان بھی نہیں کھولی ہے اور نہ کہیں سے کچھ فتوح ہوئی ہے یہ سن کر مجھ کو انتہائی رقت پیدا ہوئی۔ فوراً وہاں سے اپنے مکان تیز گامی کیساتھ واپس آیا۔ اور کھانے کی کچھ میٹھی چیزیں جو حضرت کو بہت پسند تھیں فراہم کرکے حاضر ہوا۔ پہلے تو انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا اور بہت سی دعائیں دیں اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہارے دل پر گراں نہ گذرے تو میں ایک بات کہوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور فرمائیں! ارشاد فرمایا کہ فقراء کی اصطلاح میں ایسے کھانے کو "اشراف" کہتے ہیں۔ اگرچہ فقہاء کے نزدیک اس کا کھانا جائز ہے اور شریعت میں تین دن کے بعد مردار بھی حلال ہے لیکن فقراء کے نزدیک "اشراف" کا کھانا جائز نہیں ہے۔ جب میں نے یہ سنا تو بغیر کچھ کہے سنے اٹھ گیا۔ اور وہ مطعومات لیکر باہر آگیا باہر تھوڑی دیر ٹھہرا اور دوبارہ ان چیزوں کو لے کر واپس آیا اور میں نے عرض کیا کہ جب میں کھانا لے کر واپس چلا گیا تھا تو کیا حضرت کو یہ توقع تھی کہ میں وہ کھانا واپس لے کر آؤں گا؟ فرمایا نہیں! میں نے عرض کیا کہ تو اس وقت یہ کھانا حضرت کی توقع کے خلاف لے کر حاضر ہوا ہوں۔ یہ طعام "اشراف" نہیں ہے حضرت میرؒ نے اس تاویل کا کافی لطف اٹھایا۔ اور فرمایا تم نے عجیب فہم ودانائی سے کام لیا ہے پھر وہ کھانا پوری رغبت سے نوش فرمایا۔" اسی طرح استاد المحققین فرماتے تھے کہ جب علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرامی گجرات کی بخشی گری اور تاریخ نویسی کے لیے سلطان اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کی جانب سے مقرر کیے گئے اور دکن سے بلگرام تشریف لائے۔ اور پھر بلگرام سے گجرات کا ارادہ فرمایا تو مجھے ساتھ لے جانا چاہا۔ میں نے قبول کرلیا اور حضرت میرؒ کی خدمت میں اپنے ارادہ کا اظہار کیا فرمایا کہ میری عمر آخر ہوچکی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس وقت جدا نہ ہو۔ اور میرے جنازہ پر موجود رہو۔ میں غور کرنے لگا۔ کیونکہ علامہ مرحوم کے ساتھ مجھے جانا ضروری تھا۔ حضرت میرؒ نے مراقبہ فرمایا کچھ دیر کے بعد سر اٹھا کر فرمایا جاؤ! امید ہے کہ ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوگی۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ جس سال حضرت میرؒ نے انتقال فرمایا۔ علامہ مرحوم کو ایسی ضرورت پیش آئی کہ انہوں نے مجھے گجرات سے بلگرام بھیج دیا بلگرام پہنچنے کے کچھ دنوں کے بعد حضرت میرؒ نے انتقال فرمایا۔ نماز جنازہ کی امامت کے لیے مجھ کو وصیت فرمائی ملک بدھی بلگرامی ساکن محلہ سکنت جو حضرت میرؒ کے معتقدین میں سے تھے اکثر اوقات حاضر خدمت رہتے تھے۔ حضرت میرؒ نے

ایک دن فرمایا فلاں شخص میرے پاس ہمیشہ موجود رہتا ہے لیکن میرے جنازہ پر موجود نہ ہوگا۔ جب حضرت مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ ملک بدھیؒ اس دن موجود تھے۔ اس وقت حضرت میرؒ کے گھر کے لوگ سخت تنگ حالی میں تھے۔ عین وفات کے دن ملک بدھیؒ حضرت میرؒ کے گھر کے لیے کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے کسی گاؤں میں گئے۔ اور ان کی غیبت میں وفات کا سانحہ واقع ہوا۔ جس وقت قبر برابر کی جا رہی تھی اس وقت ملک بدھیؒ واپس آئے۔ اور سخت افسوس کرنے لگے۔

نواب مکرم[له] خان بن نواب شیخ میر عالمگیریؒ حضرت میرؒ کے بہت معتقد تھے۔ اور خدمت میں ادب سے حاضر ہوا کرتے تھے۔

حضرت میرؒ نے اپنے کنبہ اور قبیلے سے الگ ہو کر محلہ سید واڑہ سے باہر ایک میدان میں جو شہر کے مشرق جانب واقع تھا۔ قیام فرمایا۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی وہاں آباد کیا ایک مسجد اور اپنی رہائش کے لیے مکان تعمیر فرمایا اور آبادی کے گرد پختہ اینٹ اور گچ سے ایک مضبوط سرخ رنگ کی دیوار بنوائی۔ تاکہ چوروں جنگلی جانوروں اور درندوں سے وہ علاقہ محفوظ رہے آپ نے اس علاقہ میں زیادہ تر جولاہوں کو آباد کیا تھا۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر دیندار نمازی ہوتے ہیں اور یہ طے کیا کہ مسلمان رعایا پنج وقتہ مسجد میں حاضری دیا کریں اور نماز جماعت سے ادا کریں ایک جولاہہ نے معذرت کی حضرت میرؒ نے سبب پوچھا اس نے کہا کہ میں جب نماز کے لیے آتا ہوں تو کام نہیں کر سکتا اور میری مزدوری کا نقصان ہوتا ہے حضرت میرؒ نے پوچھا کہ روزانہ نماز میں صرف ہونے والے وقت کے حساب سے کتنا نقصان ہوتا ہے اس نے کہا ایک پیسہ۔ حضرت میرؒ نے کہا ایک پیسہ ہم سے لے لیا کرو اور نماز پڑھا کرو۔ ایک دن یہی جولاہا مسجد میں آیا اور بغیر وضو کے نماز پڑھنے لگا۔ حضرت میرؒ نے اس سے پوچھا کہ بغیر طہارت کے نماز پڑھتے ہو؟ اس نے کہا میں ایک پیسہ میں دو کام نہیں کر سکتا۔ حضرت میر بے اختیار ہنس پڑے ایک پیسہ مزید وضو کے لیے اضافہ فرما دیا۔ رفتہ رفتہ جولاہہ کو نماز میں رغبت ہونے لگی اور اجرت کے تقاضہ سے باز آ گیا۔ مسجد کی عمارت حضرت میر کی زندگی میں کچی تھی اپنے انتقال سے قبل وصیت فرمائی کہ میری کتابیں فروخت کر کے مسجد پختہ بنا دی جائے۔ موجودہ مسجد حضرت میرؒ کی وفات کے بعد سید محمد فیض بن سید محمد صادق کے اہتمام میں جن کا ذکر فضلاء بلگرام کے سلسلہ میں آئے گا ۱۱۱۸ھ میں تعمیر ہوئی۔ وصال مبارک دوشنبہ کے دن

له میر اسحاق، شیخ میر عالمگیری کے دوسرے صاحبزادہ تھے۔ مشہور ہے کہ ان کو بادشاہ صاحبزادہ کہتے تھے عالمگیر کے زمانہ میں عمدہ منصب اور مکرم خان کے خطاب سے نوازے گئے تھے اور حضور شاہی کے علاوہ میں رہنے والے ملازمین کے داروغہ کی حیثیت دیکر عزت افزائی فرمائی گئی تھی تینتیسویں سال شر پسندوں کی سرکوبی کے لیے اجمیر بھیجے گئے۔ اور چھبیسویں سال حکومت لاہور میں کسی منصب پر تقرر ہوا۔ اور اڑتیسویں سال شیخ مدت سے معزول کر دیے گئے مستعفی ہو کر دار الخلافہ میں مقیم ہو گئے اور وہیں وظیفہ لیتے رہے نواب مکرم خان صاحب کمال لوگوں میں سے تھے۔ جزو کو صرف کہتے تھے بعہد بادشاہ محمد فرخ سیر وفات پائی لاولد تھے عبید اللہ خان نامی ان کے متبنیٰ مشہور ہیں کے لڑکے سید عصمت اللہ خان ہیں چونکہ مکرم خان کے دماغ میں سودا بنا لیا کاسہ و لا ابالی تھا سارا مال اسی میں صرف کر دی اور کیمیا کی طلب میں مشہور زمانہ ہو گئے
(مآثر الامرا)

"دن چڑھے" ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ کو ہوا۔ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرامی نے اس طرح تاریخ وفات کہی

مقدس گہر میر سید مبارک — چو فرمود در بحر رحلت شناہ
پئے رحلتِ آں مطہر سرشت — خرد گفت تاریخ رضوان پناہ

۱۱۱۵ھ

حضرت میرؒ کے صاحبزادہ اور سجادہ نشین میر سجاد (خطاب مشاہ) ایک عالم و فاضل بزرگ تھے۔ درسیات اپنے والد ماجد اور استاذ المحققین میر طفیل محمد قدس سرہ سے پڑھیں نہایت خلیق اور ملنسار تھے مزاج میں انکسار اور تواضع تھی اور بہت نیک سیرت تھے۔ ۲۵ رمضان ۱۱۶۱ھ کو وصال فرمایا۔ مؤلف مآثر الکرام (میر غلام علی آزاد) نے اس طرح تاریخ وفات کہی۔

آں ثمرۂ شجرۂ مبارک — از دست زمانہ حیف افتاد
تاریخ وصال او خرد گفت — "مہمان بہشت میر سجاد"

۱۱۶۱ھ

حضرت سید مبارکؒ کے تذکرہ میں تین گرامی قدر اساتذہ کا نام آیا ہے۔ تینوں حضرات قابلِ اعتماد اور ظاہری و باطنی فضیلتوں سے ممتاز تھے۔ پہلے استاد کا ذکر گذر چکا ہے اور تیسرے استاد کا ذکر فضلاء کے ذکر میں آئے گا۔ پس یہاں دوسرے استاد اور پیر و مرشد خواجہ عبیداللہ مشہور بہ خواجہ کلاںؒ ذکر برکت کے لیے اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت خواجہ محمد باقی باللہ کے دریائے ولایت کے دو موتی تھے۔ (یعنی دو صاحبزادگان تھے)۔

۴۴

(۱) خواجہ عبیداللہ عرف خواجہ کلاں قدس سرہ

آپ کی ولادت باسعادت یکم ماہ ربیع الاول شریف ۱۰۱۰ھ کو ہوئی والد ماجد (حضرت خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ) کی عمر شریف کے آخری زمانہ میں دونوں صاحبزادگان کی ولادت ہوئی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی[۱] سے ارشاد فرمایا زندگی کی امید اب کم رہ گئی ہے۔ تم ان بچوں کے حالات سے خبردار رہنا۔ دونوں بچوں کو شیر خوارگی کے زمانہ میں اپنے پاس طلب فرمایا اور فرمایا۔ ان پر توجہ کرو حضرت مجدد نے

[۱] شیخ احمد سرہندی بن شیخ عبدالاحد فاروقی۔ ولادت ۹۷۱ھ، ۱۵۶۳ء وفات ۱۰۳۴ھ، ۱۶۲۴ء تفصیلی حالات کے لیے۔ مفتاح التواریخ، حدائق حنفیہ، نزہۃ الخواطر، خزینۃ الاصفیاء، سبحۃ المرجان، الیانع الجنی، رود کوثر، شاندار ماضی، تزک جہانگیری، مجدد الف ثانی، تذکرہ علمائے ہند۔

حسب الحکم توجہ فرمائی یہاں تک کہ اس کے اثرات ان بچوں کی پیشانی سے ظاہر ہونے لگے خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہٗ نے ۲۵ر جمادی الثانی ۱۰۱۲ھ کو وصال فرمایا۔ خواجہ کلاں نے سن شعور کو پہنچ کر ظاہری اور باطنی فضائل حاصل کیے اور کمال کی حد تک پہنچے۔ ایک لاکھ اشعار پر مشتمل "تذکرۂ مشائخ" نام کی ایک کتاب بھی تصنیف کی ۱۸ر جمادی الاول ۱۰۷۴ھ کو وصال فرمایا۔ اور اپنے والد ماجد کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔

۴۵

خواجہ عبداللہ عرف خواجہ خورد قدس سرہٗ

ان کی ولادت بڑے بھائی خواجہ کلاں کی ولادت کے صرف چار ماہ بعد ۶ر رجب ۱۰۱۰ھ کو حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کی دوسری زوجہ محترمہ کے بطن سے ہوئی یہ صورت وسیرت دونوں میں اپنے والد ماجد کے مشابہ تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ علوم عقلی و نقلی میں مکمل استعداد رکھتے تھے اور درس وتدریس پر پورا پورا عبور اور دسترس رکھتے تھے۔ بعض درسی کتب پر متعدد حاشیے بھی لکھے ہیں۔ بمقام سرہند حضرت مجدد الف ثانی کے سایہ میں تربیت حاصل کی اور ان کے معارف خاص سے پورے طور پر بہرہ ور ہوئے اور خلافت وارشاد کا مقام حاصل کیا آزادی اور فارغ بالی کے ساتھ ساری زندگی بسر کی۔ عین اس تاریخ و مہینہ میں جس میں والد ماجد نے وصال فرمایا تھا۔ (یعنی ۲۵ر جمادی الثانی ۱۰۷۳ھ بدھ کے روز آپ نے بھی وصال فرمایا۔ اور پدر بزرگوار کے مقبرہ میں آرام فرما ہوئے۔

۴۶

میر عبدالفتاح عسکری احمد آبادی قدس سرہٗ

اولیائے کرام میں بڑے صاحب مرتبہ گذرے ہیں۔ ظاہری و باطنی عقل وشعور کے جامع تھے اور آپ کا فیض عام تھا۔ اور عوام وخواص میں بہت مقبول تھے۔ ان کی خلافت کا سلسلہ طویل عمر رکھنے والے مشائخ کی وجہ سے چند ہی واسطوں سے حضور غوث الثقلین رضی اللہ عنہ تک پہنچ جاتا ہے جس اس طرح ہے کہ میر عبدالفتاح نے شاہ الہ داد سے خلافت حاصل کی۔ اور انہوں نے شاہ عزیب اللہ سے اور انھوں نے شیخ تاج الدین سے اور انھوں نے شیخ سعید سے اور انھوں نے سید عبدالرزاق سے اور انہوں نے اپنے والد ماجد غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت حاصل کی تھی۔ جب میر عبدالفتاح کا ذکر خیر سلطان اورنگ زیب (انار اللہ برہانہٗ) تک پہونچا تو انہوں نے تشریف آوری کی استدعا کی اور پورے اعزاز واکرام کے ساتھ احمد آباد

گجرات سے دارالخلافہ دہلی بلایا اور ان کی صحبت خاص میں رہ کر بے حد برکتیں حاصل کیں۔ حضرت میر صاحب کچھ بعدہٗ سلطان بحکم رخصت ہو کر وطن مالوف چلے گئے اور ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۱۰۱۰ھ کو نوے سال کی عمر میں وصال فرمایا آرام گاہ احمد آباد میں ہے[1] مولانائے روم کی مثنوی سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ ہمیشہ اس کا درس دیتے رہے مثنوی کی شرح بھی تصنیف فرمائی جو لوگوں میں مشہور ہے۔

شجرۂ سلسلہ

- حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ (۵۶۱-۶۲ھ)
  - شیخ عبد الرزاق قادریؒ
    - شیخ سعیدؒ
      - شیخ تاج الدینؒ
        - شاہ غریب اللہؒ
          - شاہ الہدادؒ
            - میر عبد الفتاحؒ
    - تاج الدینؒ (۵۹۵ھ)

(۴۷)

سید مرتضیٰ قدس سرہٗ ۱۱۱۱ھ

سید مرتضیٰ بن سید عبد النبی بن میر سید طیب بن میر عبد الواحد بلگرامی۔ آپ اپنے والد ماجد کے مرید تھے

[1] میر عبد الفتاح العسکری احمد آبادی قدس سرہٗ کا تذکرہ بضمن سید محمد مبارک بلگرامیؒ کیا گیا تھا اس لیے ان کے سوانح حضرت آزاد ضبط تحریر میں لائے ہیں (مترجم)۔

آپ عالی شان بزرگ اور مقدس ذات وصفات کے مالک تھے آپ کا چہرہ بہت ہی نورانی تھا۔ اعلیٰ اور پاکیزہ خصائل سے بہرہ مند تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے کتب مختصرات، حاشیہ علامہ دوانی تک جو "تہذیب المنطق" پر ہے۔ سید اسمٰعیل بلگرامی سے پڑھیں۔ اس کے بعد شیخ یٰسین[1] قنوجی کے شاگرد ہوئے۔ باقی درسیات کا تکملہ ملا ابوالواعظ[2] ہرگامی کے حلقۂ درس میں کیا اور وہیں سے فراغت کی سند لے کر وطن واپس ہوئے اور اسم مبارک کی مناسبت سے طالبانِ ظاہری و باطنی کی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ شیخ محمد عاقل اترولوی ایک صاحب کمال آدمی تھے۔ میں نے ان کو دیکھا تھا۔ شیخ نے علوم ظاہری جناب سید مربی قدس سرہٗ سے حاصل کیے تھے۔ تحصیل علوم کے بعد امیر ابوالعلاء[3] اکبرآبادی نقشبندی قدس سرہ کے سلسلہ کے ایک بزرگ کے مرید ہو گئے۔ اور ان سے حالِ قوی حاصل کیا۔ ایک مرتبہ سید مربی کسی تقریب کے سلسلہ میں قصبہ مارہرہ تشریف لے گئے اور وہاں سے اترولی گئے۔ شیخ محمد عاقل نے سید مربی کا خیر مقدم و استقبال کر کے اپنے گھر لے گئے۔ اپنی دستار گھر کے صحن میں بچھا دی۔ اور عرض کیا کہ حضور قدم مبارک اس دستار پر رکھ کر گذریں اور صحن خانہ طے فرمائیں۔ جب اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو حضرت سید نے اس کو قبول فرما لیا دورانِ قیام میں ایک دن فرمایا کہ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ تمہاری توجہ بہت اثر رکھتی ہے اور اس سے بیخودی پیدا ہو جاتی ہے۔ علوم ظاہری میں جو کچھ ہمارا سرمایہ تھا وہ ہم نے اٹھا نہیں رکھا۔ (سب تمہیں دے دیا) تم کو یہ چاہیے کہ اپنی باطنی توجہ کو ہم سے دریغ نہ رکھو۔ شیخ نے استاد کے ادب کے باعث ... عذر کیا۔ حضرت سید نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ شیخ نے حسب الحکم مراقبہ فرمایا۔ حضرت میر کو احساس ہوا کہ اگر ان کی توجہ کو رد نہ کیا تو شیخ کی توجہ پوری طرح اثر کر جائے گی۔ فوراً اس کو دفع کرنے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ شیخ نے سر اٹھایا اور تبسم فرماتے ہوئے استاد گرامی سے عرض کیا میں نے پہلے ہی معذرت طلب کر لی تھی۔ حضرت میرؒ نے ۱۴ر شعبان ۱۱۰۱ھ دوشنبہ کے دن وصال فرمایا۔ اور اسی سال ۲۵ر جمادی الآخر کو میر سید احمد بلگرامی نے بھی وفات پائی۔ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرامی نے ہر دو حضرات کی تاریخ رحلت اس طرح کہی۔ ؎

میر سید احمد آں بحر سخا   مولوی سید مربی دین پناہ

---

[1] اپنے فن کے استادوں میں مشہور اور بزرگان وقت میں تھے۔ (ابجد العلوم)

[2] بن صدر الدین بن محمد اسمٰعیل بن قاضی عماد الدین احمد عمری مشہور عالم تھے۔ بادشاہ عالمگیر ان کے شاگرد تھے۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی ان کے برادر عم زاد تھے۔ اور ان کی کتب کے مترجم بھی تھے۔ ملا ابوالواعظ فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالمگیری) کی مصنفین کی جماعت میں شامل تھے۔ (نزہۃ الخواطر • آمد نامہ خیرآبادی بحوالہ "برہان" دہلی، جنوری ۱۹۳۹ء)

[3] حضرت میر سید محمد ترمذی کالپوی کے سلسلہ میں سیدنا امیر ابوالعلاء اکبرآبادی قدس سرہٗ کے حالات قدرے تفصیل سے تحریر کیے جا چکے ہیں مزید تفصیلات کیلئے نزہۃ الخواطر، مفتاح التواریخ اور تذکار اولیاء (مصنفہ مترجم) ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

ہر دو زیں گلشن سرائے بے بقا	جانب فردوس سر کردند راہ
عالم اندر دیدہ ہا تاریک شد	مردمک پوشید زیں ماتم سیاہ
تا قیامت از دل پرسوز خلق	بر مزار ہر دو سوزد شمع آہ
خواستم از بہر شاں تاریخ سال	گفت ہاتف "ہر دو خلد آرام گاہ"

۱۱۱۷ھ

اور یہ سید احمد مذکور، سید محمود اکبر کی اولاد سے تھے۔ جن کا ذکر میں نے تفصیل کے ساتھ اس طرح کیا ہے کہ سید احمد بن سید بدھ بن سید عبد الفتاح بن سید عبد القادر بن سید ابو القاسم بن سید خان محمد بن سید محمود اکبر قدس سرہٗ۔ سید احمدؒ کا سلطان اورنگ زیب کے فرزند شاہزادہ محمد اعظم شاہ[له] کے قابلِ اعتماد ملازمین میں شمار ہوتا تھا اور شاہ جہان پور مالوہ کی حکومت اور دوسرے مواضع کا انتظام شہزادہ کی جانب سے کرتے تھے۔ اپنی امارت کے زمانہ میں آپ اپنے اور بیگانہ ہر ایک کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ شاہ جہانپور مالوہ میں طبعی موت سے انتقال ہوا اور اسی جگہ مدفون ہوئے۔ محلہ میدان پورہ کے مغرب و جنوب میں واقع ایک حویلی ان کی یادگار ہے ۱۱۶۲ھ میں کتاب "گلزار ابرار" کا ایک نسخہ بمقام اورنگ آباد اس فقیر کے ہاتھ لگا جسے شیخ محمد فاضل نام کے ایک صاحب نے اس کو سید احمد مرحوم کے لیے لکھا تھا۔ کتاب کے آخر میں ایک عبارت تحریر تھی۔ اس جگہ وہ عبارت بعینہٖ نقل کی جاتی ہے۔ جس سے سید احمدؒ کے حالات مختصراً معلوم ہوتے ہیں:۔ (ترجمہ)۔

بندہ عاجز و قاصر شیخ محمد فاضل بن اسمٰعیل چشتی لکھنوی مندوی نے مرکز دائرۂ جوانمردی، آسمان بزرگی و شرافت کے آفتاب تاباں، سیادت و سروری کے دریا کے گوہر بے بہا، بلندی و شرافت کے سمندر کے یاقوت، ملک و ملت کے مراسم کے رواج دینے والے، نبوت و ولایت کے چراغ کو فروزاں کرنے والے سید احمد بن سید بدھ بن سید عبد الفتاح ساکن قصبہ بلگرام جو محمد اعظم کی درگاہ و بلند اقبال کے بڑے منصب دار ہیں۔ اور جو دیپالپور وغیرہ کی امینی اور فوجداری کی خدمت کے سلسلہ میں علاقہ صوبۂ مالوہ میں تشریف رکھتے ہیں کے لیے میں نے یہ کتاب تحریر کی ہے چونکہ ۱۱۰۸ھ کے شروع سال سے علاقہ مندو کی سالانہ آمدنی دربار امارت و خلافت سے خان ذی شان افتخار خان کی جاگیر میں دیدی گئی تھی، خان مذکور نے اپنی امانت اور ملکی اور مالی معاملات کے بندوبست کے لیے اس حاتم زمانہ کو" جن کا "خوان براہیمی ہر شخص کے لیے بچھا رہتا ہے۔ بڑی تمناؤں اور خواہشوں کے ساتھ" دیپالپور سے مندو" بلالیا۔ چونکہ میلان

[له] یہ عالم گیر بادشاہ کے تیسرے فرزند تھے۔ ۱۲ ر شعبان ۱۰۶۳ھ کو شاہ نواز خان کی لڑکی بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد بارہویں روز ۱۱۱۸ھ میں بمقام احمد نگر تخت سلطنت پر بیٹھے۔ دھولپور کے میدان میں اپنے بھائی، دو لڑکے اور بہت سے امراء کے ساتھ مقابلہ میں جنگ کے درمیان مارے گئے سلطنت کی مدت تین ماہ اور بیس دن ہے (مفتاح التواریخ)۔

شجاعت کا یہ شہسوار ہر شخص کے ساتھ خوش گوار تعلق استوار رکھتا تھا۔ لہٰذا یہ درخواست آپ نے قبول فرمائی اور خان موصوف کے دیکھنے کا ارادہ فرمایا اسی سال قصبہ "بلگچہ" تشریف لائے۔ اس وقت سیادت و شرافت دستگاہ سید محمد اشرف بن سید عبدالدائم اسی مقدس قصبہ کے رہنے والے، خان مذکور کے ساتھ رہ کر ظاہری و باطنی نعمتوں کی لذت حاصل کر رہے تھے اور یہ احقر بھی ان کی صحبت اور دولت کی برکتوں سے ظاہری اور باطنی فیض حاصل کر رہا تھا۔ (خان ذیشان کے ساتھ وابستہ تھا) جب بندہ نے سنا کہ فصاحت و بلاغت کے جوہر شناس یعنی حضرت سید احمدؒ سید محمد اشرف کے دائرہ میں مقیم ہیں تو ہزاروں تمناؤں اور مسرتوں کے ساتھ اپنے مکان سے قدم بوسی کے لیے روانہ ہوا۔ حاضری کے بعد پہلی ہی گفتگو میں زبان گوہر نشاں سے ارشاد فرمایا کہ اے جناب! اتفاق ایسا ہوا کہ آپ کا تحریر کیا ہوا "گلزار ابرار" کا وہ نسخہ جو ہمارے کتب خانہ میں موجود تھا شیخ احمد[1] لکھنوی انتہائی خواہش کے ساتھ مجھ سے لے گئے ہیں۔ اگر فرصت ہو تو ایک اور نسخہ لکھنے میں تساہل نہ کریں (میرے لیے ایک نسخہ اور لکھ دیں) اسی وقت میں نے یہ ارادہ پختہ کر لیا اور یکم رجب روز جمعہ سال مذکور کتاب لکھنی شروع کی۔ سید صاحب مذکور دو تین روز خان مذکور کی صحبت میں رہ کر دیبالپور واپس تشریف لے گئے۔ احقر نے کتاب مطلوبہ کو سیادت پناہ سید محمد اشرف کے اہتمام میں ان ہی کی دوستی اور مدد سے بتاریخ ۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۱۵۰ھ جمعہ کے دن بوقت ظہر ختم کیا۔ (اللہ کے کرم اور احسان سے) (کتاب کی عبارت ختم ہوئی)۔

میر سید محمد بن میر سید احمد مذکور اپنے دور کے بہترین لوگوں اور نواب مبارز الملک سربلند خان التونی کے قابل اعتماد دوستوں میں سے تھے۔ اور نواب صفدر جنگ ابوالمنصور خان نیشاپوری (جو احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وزارت کے مرتبہ تک پہونچے) کی سرکار میں بھی باعزت اور صاحب فیل و نشان تھے۔ شعر خوب سمجھتے تھے۔ پسندیدہ اخلاق کے مالک اور مروت و احسان میں ممتاز اقران تھے۔ جمعہ کے دن ۸ صفر سنہ ۱۱۶۱ھ کو دار الخلافہ دہلی میں وصال فرمایا۔ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے جوار میں نواب مبارز الملک کے پہلو میں دفن ہوئے۔ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرامی کے صاحبزادہ میر سید محمد سلمہ اللہ شاعر تخلص نے جو موصوف کے ہم نام ہیں اور میرے اور ان کے مابین بے حد محبت تھی۔ ان کی وفات کی تاریخ میں ایک عجیب مصرعہ تلاش کیا ہے اور یہ قطعہ نظم میں تحریر کیا ہے ؎

میر سید محمد احمد	ذات او راتواں یگانہ شمرد
در سخاوت نظیر حاتم طے	در شجاعت عدیل رستم گرد
زیں جہاں رفت و نام او باقی است	کہ تواں گفت زندہ را کہ بمرد

---

[1] بن غلام نقشبند بن عطاء اللہ عثمانی لکھنوی، فقہ اور اصول فقہ اور علوم عربیہ میں بہت ممتاز تھے کتب درسیہ شیخ نظام الدین بن قطب الدین سہالوی سے پڑھیں۔ متعدد علماء نے ان سے استفادہ کیا ہے ان کے صاحبزادہ قطب الہدیٰ بھی ممتاز ترین علماء میں سے تھے شیخ احمد نے سنہ ۱۱۵۹ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)۔

سال تاریخ رحلتش سعدیؔ | زادہ طبع خود بہ بندہ سپرد
بشنو اکنوں ز شاعر ایں مصراع | "خنک آنکس کہ گوی نیکی برد" ۱۱۵۸ھ

مصراع سعدی شیرازی

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے اور سرسری طور پر اس کو نہیں چھوڑنا چاہیے کہ فقیروں کے ساتھ نسبت کس قدر عالی شان نسبت ہے کہ جو معمولی شخص بھی اس گروہ والامرتبت سے اپنی نسبت پیدا کر لیتا ہے اس کو خاک سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس کو عوام کی انجمن سے نکال سے خواص کی خلوت میں پہونچا دیا جاتا ہے چنانچہ اس کی مثال سید احمد کا معاملہ ہے کہ دونوں کے درمیان ایک معمولی سی نسبت ہے یعنی سید مرتضیٰ قدس سرہٗ کی وفات، پہلی بات تو یہ کہ بقول علامہ مرحوم ایک ہی سال میں دونوں کا وصال ہوا۔ جیسے دو موتی ایک رشتہ میں پرو دیے گئے ہوں۔ دوسرے یہ کہ بارگاہ خداوندی سے قربت رکھنے والوں کے پاس بیٹھنے سے یہ بلند مقام ملا کہ اس کتاب کے صفحات میں ان کو جگہ ملی اور بیٹا باپ کے طفیل میں کامیاب ہوا۔ سبحان اللہ! موافقتِ سال نے تو یہ کرشمہ ظاہر کیا موافقتِ حال کا کیا کرشمہ ہوگا۔ (یعنی ایک ہی سال میں دونوں حضرات کے وصال سے تو یہ مقام ظاہر ہوا باطن میں اگر دونوں کا حال یکساں رہا تو کیا مرتبہ ہوگا؟) حضرت موسیٰ کی صورت کی مشابہت نے کفر کے باوجود ایک کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ اور اصحاب کہف کے ساتھ رہنے کے فیض نے قطمیر نامی سگ کی حقیقت بدل دی اور بندگی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ مبارک ہیں وہ اچھی قسمت والے جنہوں نے اپنا سر فقیروں کے شکار بند سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور بادشاہوں کے تاج کے مقابلہ میں اس فتراک پر فخر کرتے ہیں۔ ؎

آنچہ زر میشود از پرتو آں قلب سیاہ | کیمیائیست کہ در صحبت درویشاں است

۴۹

سیّد سعد اللہ قدس سرہٗ

سیّد سعد اللہ بن سیّد مرتضیٰ بن سیّد فیروز بن میر عبد الواحد بلگرامی قدس سرہٗ فقر اور بخشش کے سنگم تھے بچپن ہی میں جدِ امجد سیّد فیروز قدس سرہٗ سے مرید ہونے کی سعادت حاصل کی ابتدائی عمر میں شیخ یٰسین[^1] قنوجی کے شاگرد ملا فیض اللہ[^2] ساکن امروہہ سے تعلیم حاصل کی۔ اور آخر میں مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی کے شاگرد رشید عالم کامل

[^1]: بن عبد الرشید بہاری مرادآبادی اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں تھے۔ سات سال کامل مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کی صحبت میں فائدہ حاصل کرتے رہے (نزہۃ الخواطر)۔

[^2]: شیخ فیض اللہ بن المعروف بن خداوند امروہوی جو محمد بن حنفیہ کی نسل سے تھے آپ نے اپنے بڑے بھائی شیخ عبد المجید سے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ (نزہۃ الخواطر)۔

اور قاضی مرادآباد (جو سنبھل کے قریب ہے) ملا عبدالرحیم[1] کے زیرِ تعلیم رہے اور ملا عبدالرحیم کی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ وطن واپس آکر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اور عرصہ تک یہ شغل جاری رہا۔ اچانک ان کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ایک مرتبہ لوگوں سے رخصت ہو کر حرمین شریفین کی زیارت کے لیے چلے گئے اور بیت اللہ کے طواف اور مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر کے زادِ آخرت حاصل کیا۔ کچھ مدت کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اور احمد آباد گجرات میں گوشہ نشین ہو گئے۔ سید سعد اللہ کے شاگردوں میں ایک عمر رسیدہ عالم شیخ محمد طاہر احمد آبادی نے حیدرآباد دکن میں اس فقیر سے ملاقات کی۔ کہتے تھے کہ میں سید سعد اللہ کا خاص شاگرد ہوں۔ حضرت سید گجرات میں تشریف لائے اور مولانا نور الدین نور اللہ مرقدہٗ کے مدرسہ میں قیام فرمایا۔ اپنے حجرہ سے کم نکلتے تھے۔ تمام رات ذکرِ الٰہی میں گذارتے تھے۔ اور دن درس و تدریس اور افادۂ خلق میں بسر فرماتے تھے۔ مولانا نور الدین ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور اکثر ان کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔ حضرت سید کے وصال کے وقت میں موجود تھا۔ نہایت خندہ پیشانی سے عالمِ روحانی کی جانب تشریف لے گئے اور شاہ عالم[2] بخاری کے پوتے شاہ بھیکنؒ کے روضہ میں آرام فرما ہوئے (آپ کو دفن کیا گیا)۔ وصال شریف صبح کے وقت بروز چہارشنبہ ۱۷ شوال ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء کو ہوا۔ اس فقیر کے برادر ہم درس میر محمد یوسف ؒ نے اس آیتِ کریمہ سے تاریخ وصال نکالی۔ یَشْرَبُ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا ؕ (۱۱۱۹ھ)۔

۴۹

میر سید لطف اللہ المعروف بہ شاہ لدّھا بلگرامیؒ

آپ کے والد ماجد سید کرم اللہ بانی مسجد جامع محلہ کا تذکرہ اس سے پہلے گذر چکا ہے یہ بلگرام کے صاحبِ کمال اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ اور اپنے اسلاف اور اخلاف کے لیے عزت و احترام کا موجب ہیں۔ ان کا لقب سید العارفین اور سید الاولیاء ہے۔ مقابلِ ذکر بات یہ ہے کہ محبتِ الٰہی کا شوق و ذوق خلقی طور پر ان کی فطرت میں ودیعت تھا۔ عنفوانِ شباب ہی سے حق شناسوں کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے۔ اور جب شعور و آگہی کا زمانہ آیا۔

---

[1] بن عبدالرشید بہاری متوفی تقریباً ۱۱۰۰ھ۔

[2] شاہ عالم بن قطب عالم، مخدوم جہانیاں جلال بخاری کے پوتے تھے۔ قطب عالم نے ۸۵۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر احمد آباد کے قریب موضع قطب آباد میں ہے اور شاہ عالم احمد آباد میں آرام فرما ہیں۔ انھوں نے ۸۸۰ھ میں وفات پائی۔ جناب نواب نے انتصار میں لکھا ہے کہ راقم السطور انکی اولاد سے ہے۔ اور جب دفعل میں احمد آباد میں تھا قطب عالم اور شاہ عالمؒ کے مزارات اور خانقاہ و مدرسہ کی زیارت کی سعادت میں نے حاصل کی ہے (انتصار۔ اخبار الاخیار)۔

قرابت سے خداشناسوں کی صحبت سے استفادہ کیا۔ ان کے اوّلین مرشد شاہ اعظم قدس سرّہ ہیں۔ نوجوانی میں والد بزرگوار کے ساتھ بنگال تشریف لے گئے۔ اور وہاں شاہ اعظم مذکور کی خدمت میں رہ کر بہت کچھ نفس کشی کی۔ اور مراتب بلند و درجات والا طے کئے۔ اس کے بعد کسب معاش کے لیے نواب نجابت[1] خان کی ملازمت اختیار کی۔ اور ان چالیس بہادروں کی اس جماعت میں جسے نواب مذکور سب سے زیادہ نمایاں ممتاز اور فائق سمجھتے تھے۔ شامل ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد بائیس سال کی عمر میں ظاہری تکلفات سے دل کا تعلق بالکل منقطع کر لیا اور ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیاحت کی اور دار السرور برہان پور میں پہنچ کر برہان[2] راز الٰہی شاہ برہان الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کچھ دنوں شیخ کی خانقاہ میں قیام فرمارہے اور ان کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ لیکن بمشیت الٰہی کچھ عرصہ بعد ہی جدائی کی شکل پیدا ہو گئی۔ (یعنی شیخ کا وصال ہو گیا) شیخ کی صحبت سے محروم ہو جانے سے حضرت میر سخت متاسف تھے۔ اسی عالم میں ایک روز خواب میں دیکھا کہ شیخ ان کی جانب توجہ فرما ہیں۔ اور اپنے دونوں مبارک ہاتھوں سے ان کے کپڑوں میں خوشبو لگا رہے ہیں اور اس سے پہلے ہی وہ ان للّٰہ فی ایام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لہا (تمہارے زمانہ کے دنوں میں خوشبوئیں اللہ کی ہی ہیں۔ تو انہیں پیش کیا کرو) کی روح پرور خوش بو سے معطر ہو چکے تھے۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد ہی میر عبد الجلیل قدس سرّہ کی صحبت میں پہنچے اور ان سے کافی فیض اٹھایا۔ اور خوشبو کو خواب میں دیکھنا، حضرت میر کی ملاقات پر محمول کیا۔ حضرت میر شاہ برہان الدین کے کامل ترین مریدوں میں سے تھے۔ اور ملازمت کے لباس میں مخلوق کی نظر سے دور رہتے تھے۔ حضرت شاہ برہان راز الٰہی برہان پوری متوفی سنہ ۱۰۸۳ھ سید لشکر محمد عارف[3] متوفی سنہ ۹۹۳ھ کے مرید تھے

---

[1] بادشاہ عالمگیر کے سپہ سالاروں میں ایک خان خاناں بھی تھے ان کا نام مرزا شجاع اور ان کے والد کا نام شاہ رخ مرزا تھا مرزا سلیمان (۹۹۷ھ) والی بدخشاں کے پوتے الغ خان مرزا ابن سلطان محمود امیر تیمور صاحب قران کی اولاد سے تھے۔ مرزا شاہرخ بھی اکبری اور عالمگیری منصب داروں میں تھے بادشاہ عالمگیر نجابت خان کو یار وفادار اور خان جہاں کے خطاب سے مخاطب فرمایا کرتے تھے بمقام اجین سنہ ۱۰۷۵ھ میں وفات پائی (مفتاح التواریخ، مآثر الامرا)۔

[2] شیخ برہان الدین برہانپوری ہندوستان کے مشہور اولیاء میں تھے ان کا نسب والد کی جانب سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے لیکن والدہ کی جانب سے سیدنا حسن السبط سے ملتا ہے۔ شیخ کی ولادت سنہ ۹۹۸ھ اور وفات سنہ ۱۰۸۳ھ میں ہوئی مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ جند اللہ (سنہ ۱۰۳۱ھ) بن شیخ قاسم سندھی (سنہ ۹۸۱ھ) کے مرید و خلیفہ تھے شیخ برہان کی متعدد تالیفات یادگار ہیں ان میں شرح اسماء اللہ الحسنیٰ اور شرح آمنت باللہ مشہور ہیں عاقل خان رازی نے اپنی کتاب موسوم ثمرات الحیات میں شیخ کے ملفوظات تحریر کیے ہیں تفصیلات کے لیے راشد برہان پوری کی کتاب "برہان پور کے سندھی اولیاء" اور نزہۃ الخواطر ملاحظہ فرمایئے۔

[3] بن ملک داجن جاپانیری گجراتی برہان پوری حنفیہ شطاریہ کے مشائخ سے تھے۔ سال ولادت سنہ ۹۰۹ھ ہے آغاز جوانی فنون جنگ اور سپہ گری سیکھنے میں صرف کیا اس کے بعد تمام مشاغل سے کنارہ کش ہو کر شیخ قاضی محمود بیر پوری (سنہ ۹۴۱ھ) اور شیخ قطب الدین ذاکر عرف قطب جہاں (صاحب مکتوبات) سے استفادہ کیا۔ اور آخر میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور وہ محمد غوث گوالیاری سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ (قدس اللہ اسرارہم) یہ تمام اکابر، راہ ولایت کے قافلۂ سالار اور قافلۂ شہرت کے حدی خواں ہیں (یعنی اکابر ارباب طریقت و مشاہیر اولیاء کرام میں سے ہیں) اس فقیر کو برہان پور سے گذرنے کا متعدد بار اتفاق ہوا، اور ان بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ شہر برہان پور میں گرد و غبار کی اس قدر کثرت ہے کہ کوئی دوسرا شہر اس معاملہ میں اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔

سید لشکر محمد عارف کی روحانیت کے فیض سے ایک انوکھا خیال فقیر کے دل میں پیدا ہوا، اور اس نے نظم کا اسلامی لباس پہنا، (میں نے اس کو اس طرح نظم کیا) ؎

فتاد بسکہ گذر لشکر محمدؐ را　　غبار خیز بود کوچہ ہائے برہان پور

مختصر یہ کہ حضرت سید العارفینؒ چند دنوں بعد کالپی آئے، اور میر سید احمدؒ بن میر سید محمدؒ قدس سرہٗ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ارادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ایک مضبوط حلقہ کو اپنی گرفت میں لے لیا (یعنی حضرت میر سید احمد کے مرید ہو گئے) حضرت میر سید محمد سید العارفین کی جانب خاص نظر و توجہ فرماتے تھے بیعت کے وقت ارشاد فرمایا ہم دونوں ایک ذات ہیں۔ اور یہ بیت ارشاد فرمایا ؎

ای جاز فیض پیر مغاں بزم وحدت است　　در پردہ دار دیدۂ کثرت نمائے را

اور یہ عنایت اس عنایت کے مشابہ ہے جو میر سید محمدؒ نے میر سید احمدؒ پر فرمائی اور فرمایا، کہ محمدؐ و احمدؐ ایک ہیں۔

میر سید احمدؒ کے خلف الصدق شاہ فضل اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سید نے اپنے وصال کے وقت اپنے صاحبزادوں کو وصیت فرمائی تھی کہ تمہارے والد اور دادا کے خلفاء بہت ہیں اگر فقر میں عوام کی درویشی چاہتے ہو تو سب سے حاصل کر سکتے ہو۔ اور اگر خواص کی درویشی چاہتے ہو تو میر سید لطف اللہ کی صحبت کو غنیمت جانو۔ شاہ فضل اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت سید احمد کے میخانہ کی صاف و شفاف اور بغیر تلچھٹ کی شراب تو شاہ لدھا نے پی ہے اور دوسروں نے صرف اس کی تلچھٹ پی ہے۔ حضرت شاہ لدھا کو خرقہ ہائے خلافت پانچوں سلاسل یعنی چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور مداریہ سے حاصل تھا اور ان سلاسل خمسہ میں مرید کرنے کی اجازت حاصل تھی آپ بہت سی باطنی امانتوں کے ساتھ واپسی کی اجازت حاصل کر کے بلگرام واپس تشریف لے آئے، تقریباً ستر سال گوشہ نشین رہے۔ اور انوار باطنی کی ضوفشانیوں سے شہر بلگرام میں جاناں کرتے رہے طالبان طریقت کی تربیت میں آپ کا طریقہ عجیب تھا کبھی تو ایک اشارہ ابروہی سے طالب کا مقصد پورا کر دیتے تھے اور کبھی اس کو نفس کشی اور مشقت و محنت میں مبتلا رکھتے تھے، لیکن ایسی سخت نفس کشی کا جس سے آدمی بیمار پڑ جائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر　) شیخ سید محمد غوث گوالیاری کی صحبت اختیار کی۔ گجرات میں مکمل تیس سال تک لوگوں کو رشد و ہدایت اور تلقین فرماتے رہے۔ اس کے بعد برہان پور میں سکونت اختیار کر لی۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے فیض اٹھایا ہے۔ (نزہۃ الخواطر، اذکار ابرار)۔

حکم نہیں دیتے تھے۔ اگر چلہ میں بٹھاتے تھے تو اس کو اچھی غذائیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ انسان کی زندگی کا مدار غذا پر ہے۔ اگر تندرست رہے گا۔ تو نفس سے جہاد اس سے اچھی طرح کر سکے گا اور اگر کمزور ہے تو پھر اس میں نقصان واقع ہوگا۔

گدڑی پہننے اور گدڑی سینے میں مصروف رہنے اور لوگوں کی نگاہوں میں خود کو نمایاں کرنے سے منع فرماتے تھے اور تاہل (شادی بیاہ) اور کسب (محنت مزدوری) سے جو انبیاء کرام کی روشن سنت ہے کبھی نہیں روکتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مرد وہ شخص ہے جس کا ظاہر تو لوگوں کے ساتھ معاملات میں مصروف ہو اور باطن یادِ الٰہی میں مستغرق ہو۔ فتوح سے جو کچھ حاصل ہوتا اس کو جمع نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ غیب سے حاصل ہوتا فراخدلی سے اس کو خرچ کرتے تھے۔ فقراء کے علاوہ شہر کے ہر صادر و وارد کی خدمت کیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات خصوصاً رات کے آخر حصہ میں جنگل کی طرف نکل جاتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ جنگل کی سیر سے کشود قلب ہوتی ہے اس کا راز یہ ہے کہ صحرا کو مرتبہ اطلاق سے نسبت ہے۔ اور شہر مرتبہ تقیید سے نسبت رکھتا ہے۔ گفتگو انتہائی خوبی، خوش اسلوبی اور تمکنت کے ساتھ فرماتے تھے۔ جب کبھی حقائق و معارف سے متعلق گفتگو فرماتے تو انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ فرماتے جس سے سننے والے کو ایک حال اور کیف حاصل ہوتا۔ وہ اصحاب کمال جنہوں نے حضرت کی مجلس پُر نور سے فیض اٹھایا ہے اس پر متفق ہیں کہ جو کیف اور جو ذوق حضرت کی مجلس میں ہم نے پایا دوسری جگہوں پر کم ہی پایا۔ باوجودیکہ عمر شریف سو سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ مگر ذوق و شوق کی کیفیت آپ میں اسی طرح تازہ تھی۔ سلطان ابوسعیدؒ بن شاہ فضل اللہ بن میر سید احمدؒ فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ میں نے میر شاہ لدھا سے پوچھا کہ کیا تہجد کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا کئی سال ہو گئے کہ رات ملکوں تک نہیں پہونچتی (نیند نہیں آتی) لیکن دل کی بے چینی سے تہجد کی نماز میسر نہیں آتی۔ لیکن فرض نماز بے اختیارانہ ادا فرماتے تھے۔ حضرت کی یہ ایک عجیب بات تھی کہ جب کوئی بیماری لاحق ہوتی تو چاہے وہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو۔ لیکن پرہیز بالکل نہیں کرتے تھے۔ اور دوسرے دنوں کے مقابلہ میں ان دنوں میں پر تکلف کھانوں کا اہتمام کرتے تھے۔ اطبا ہر چند منع کرتے تھے۔ لیکن حضرت ان کے منع کرنے پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر اس انتہائی توکل کا پتہ دیتی ہے جو بزرگوں کو اس ذات پر ہوتا ہے۔ آپ کے ملفوظات قدسیہ میں سے ہے کہ "خداوند تعالیٰ کی دید سے زیادہ مشکل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دید ہے۔ اسی طرح فرماتے تھے کہ لیلیٰ کے لیے محمل ضروری ہے یعنی بہتر یہ ہے کہ حقیقت کی پوشیدہ باتیں مجاز کے پردہ میں کہی جائیں تاکہ بدخواہوں کے ضرر اور تکلیف سے محفوظ رہیں۔ فرماتے تھے کہ اپنے وجود کی نفی اور حق تعالیٰ کے وجود کا اثبات اسلام ہے۔ فرماتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسم تشبیہ ہے اور اللہ اسم تنزیہہ ہے۔ فرماتے تھے کہ شریعت جوانمردوں کا آخری مقصد ہے۔ شریعت رنگ ہے اور حقیقت بُو ہے۔ جیسے گلاب نے اپنی خوبیوں کے سبب دوسرے تمام پھولوں پر امتیاز پایا ہے اور لالہ و یاسمن اپنی نمایاں حیثیت کے باوجود وہ مرتبہ نہیں پا سکے۔ کہ ان میں گلاب جیسی خوشبو نہیں

صرف رنگ ہی رنگ ہے ؂

کنارہ گیر خطرہائے بیکراں دارد میانہ رَو ز دو جانب نگاہباں دارد

ایک دن مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کسی ایسی بات پر جس کی نسبت شاہ لدھا سے کی جاتی تھی ۔ ناجائز گرفت کی ۔ میں ان کا مخاطب تھا ۔ میں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا اسی روز ان بزرگ کی تحریر آئی ، ان بزرگ کے ایک قابلِ اعتماد دوست نے ہی ان کے اعتراض کا رد کر دیا ۔ وہ بزرگ اس سے سخت متاثر ہوئے اور وہ تحریر ان بزرگ کی موجودگی ہی میں ان کے اشارہ پر میں نے پھاڑ ڈالی ۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار) حضرت شاہ لدھا کا وصال ۱۴ ر جمادی الاول ۱۱۴۳ھ کو ہوا ۔ کاتب الحروف (میر غلام علی آزاد) نے ان دو آیاتِ قرآنی سے تاریخ وفات نکالی ۔

فی جنت النعیم + ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیا (۱۹ - ۶۲)(۵۶-۱۲)

آپ کا مزار مبارک میر نوازش علی سلمہ اللہ کے مکانِ مسکونہ کے قریب واقع ہے ۔ مزار مقدس پر صاحب سجادہ نے ایک عمارت ساتھ ہی ایک مسجد بھی تعمیر کرائی ہے ۔ راقم الحروف (میر غلام علی آزاد) نے ماہ جمادی الاول ۱۱۴۲ھ سلسلہ چشتیہ میں ان سے بیعت کی تھی ۔ اور ان کی ذات قدسی نشان سے بہت سی برکتیں حاصل کیں ہیں ۔

(۵۰) میر عظمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

سید العارفین کے فرزند اور گروہ صوفیہ میں بلند مقام کے حامل تھے ۔ وحدت الوجود سے خاص چاشنی رکھتے تھے ۔ اگرچہ امیروں اور رئیسوں کی ملازمت میں عمر گذار دی ۔ لیکن ہر وقت آئینہ رنگ میں بے رنگی کا حسن مشاہدہ کیا کرتے تھے ۔ اور شاخسار تفرقہ سے جمعیت کا پھول حاصل کر لیا تھا ۔ سید العارفین کا اصل طریقہ یہی تھا کہ ظاہر عوام کے مشابہ ہوتا اور باطن ان مخصوص انبیاء کرام کی طرح ہوتا تھا جو اخص الخواص ہیں (ان پر درود و سلام ہو) وہ حضرات عوام سے بہت زیادہ قریب ہوتے تھے ۔ عام لوگوں کی طرح زندگی گذارتے وہ حضرات جو مکمل اتباع کے راستہ پر قدم رکھنا چاہتے ہیں ۔ ان کو یہی سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہیے اللہ کے خاص بندوں کی پہچان ہر شخص کا کام نہیں ہے آنکھ والوں کو چاہیے کہ محقق کو مقلد کے لباس میں پہچانیں عوام اس ادراک کی کمی کے باعث غلطی میں مبتلا ہو گئے ۔ اور محققین کو اپنی ہی جنس سے سمجھ لیا ۔ ہاں عوام کے اعتقاد کی بنیاد صرف وضع کے امتیاز پر ہے ، جس کو دیکھتے ہیں کہ عام لوگوں سے انداز الگ رکھتا ہے اس کو ولی سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں (اس کے معتقد ہو جاتے ہیں) مال ھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق (اس رسول کو کیا ہو گا ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے) کا طعنہ اس کا گواہ ہے (جو کافروں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا گویا کہ رسول کو مافوق الانسانیت کوئی چیز ہونا چاہیے ۔ جسے ضروریات انسانی کی کوئی حاجت نہ ہو ۔) اور آیت او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء کا خطاب بھی ہمارے اس قول کا مصداق ہے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ

مکتوب ۲۶۲ جلد اوّل میں تحریر فرماتے ہیں کہ انبیاءِ کرام (ان پر صلوٰۃ وسلام ہو) اکثر احکام میں عوامی انداز سے زندگی گذارتے ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں لوگوں کے ساتھ اور گھر والوں کے ساتھ ان ہی کی طرح معاملہ فرماتے ہیں حضور خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے گھر والوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کی حدیثیں بہت مشہور ہیں منقول ہے کہ ایکدن سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم حضرات حسنین کے بوسے لے رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ انتہائی محبت کا اظہار فرما رہے تھے حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے گیارہ بیٹے ہیں میں نے کبھی کسی ایک کا بھی بوسہ نہیں لیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ رحمتِ الٰہی ہے۔ جو اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے[۱] پس چونکہ خاص لوگوں میں بھی جو ممتاز ہیں وہ بھی بعض صفتوں میں باعتبار صورت ظاہری عوام کے ساتھ شامل ہیں۔ لیکن عوام اپنی نارسائی فہم کی وجہ سے ان کے کمالات سے بہت کم بہرہ مند ہیں اس لیے وہ ان حضرات کو بھی اپنے ہی رنگ میں دیکھتے اور خیال کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جو اپنی عادات و شمائل میں ان لوگوں سے الگ تھلگ ہیں۔ انہیں بزرگ و عظیم خیال کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اولیاءِ کرام کے اخلاق و عادات انبیاءِ کرام کے اخلاق و عادات کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اخلاق انبیاء علیہم السلام کے اندر موجود بالذات ہوتے ہیں۔

سنو! لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب مخدوم شیخ فرید گنج شکر[۲] کے ایک بچہ کا انتقال ہوا اور اس کے انتقال کی خبر ان کو پہنچی تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور فرمایا کہ کتے کا بچہ مر گیا ہے اسے باہر پھینک دو۔[۳] جبکہ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا۔ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر رو دیئے۔ اور ارشاد فرمایا "انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون" (اے ابراہیم تمہاری جدائی سے ہم غمگین ہیں) اس طرح اپنے انتہائی رنج والم کا اظہار فرمایا۔ اب بتاؤ گنج شکر بہتر ہیں یا سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم؟ عوام کالانعام (عوام جو مثل جانوروں کے ہیں) کے نزدیک پہلا معاملہ بظاہر بہتر ہوگا۔ عوام معاملہ اوّل کو قطعی بے تعلقی سمجھیں گے۔ اور دوسرے معاملہ کو عین تعلق خیال کریں گے۔ ہم اللہ پاک سے پناہ مانگتے ہیں لوگوں کے اس بُرے اعتقاد سے۔ چونکہ یہ گھر آزمائش اور امتحان کا گھر ہے۔ عوام کو مشتبہ بنانا اور شبہ میں ڈالنا

---

[۱] بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے اس کو اخراج کیا ہے ایک شخص سائل کا نام اقرع بن حابس یا عیینہ بن حصن نام لیا ہے۔

[۲] عظیم اولیائے کرام میں آپ کا شمار ہوتا ہے، قطب الموحدین، قطب الزاھدین اور گنج شکر کے القاب سے مشہور ہیں۔ ان کی ولادت ۵۶۹ھ میں ہوئی۔ اور وفات ۶۶۴ھ میں۔ پاک پٹن شریف میں آرام فرما ہیں۔ (تقصار)۔

[۳] حضرت امیر قنوجی نے تقصار میں یہ واقعہ نقل کر کے کہا ہے کہ یہ مرتبہ تسلیم ورضا کی انتہا ہے اس سے آگے کا خیال بھی نہیں ہو سکتا۔

مابین حکمت و مصلحت سب ہے۔ اے اللہ! ہمیں حق کو حق کر کے دکھا دے اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل کر کے دکھا دے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا کر۔ بہ طفیل سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں۔ اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

میر عظمت اللہ بہت اعلیٰ معاشرت و سنجیدہ صحبت کے مالک تھے۔ آپ کی وضع بہت ہی مقبول اور دلوں کو پسند آنے والی تھی۔ انتہائی عمدہ اخلاق و شائستگی اور آداب سے بہرہ ور تھے۔ تصوف میں کئی دلچسپ رسالے تحریر فرمائے ہیں۔ شعر بھی کہتے تھے لیکن آپ کے اشعار زیادہ تر توحید باری تعالیٰ میں ہوتے تھے۔ تخلص بے خبر ہے۔ لیکن ایسے بے خبر کہ واقعی باخبر تھے۔ اور حضرت لسان الغیب قدس سرہٗ کے اس قول پر عمل پیرا تھے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ان کے کچھ اشعار حصہ شعراء کے تذکرہ میں لکھے جائیں گے[۱] ان کی وفات دوشنبہ کے دن ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ کو دہلی میں واقع ہوئی۔ آخر وقت میں لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر حکم ہو تو ہم لوگ آپ کی نعش بلگرام روانہ کر دیں۔ اور اگر اسی شہر میں دفن ہونے کا خیال ہو تو اشارہ فرما دیں جواب میں فرمایا اس مٹھی بھر خاک کو جہاں چاہو پھینک دو۔ کہتے ہیں کہ اسی عالم میں ایک شخص نے جس کو مسئلہ وحدت الوجود میں حضرت سے کچھ اختلاف تھا حضرت سے پوچھا کہ کہیے اب آپ اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ مردوں کی ایک ہی بات ہوتی ہے۔ قبر مبارک حضرت سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی محبوب الٰہی قدس سرہٗ کے مزار مقدس کے قریب سر راہ متصل دیوار مشرقی باغ دریاخان قریب اعظم شاہ بن سلطان اورنگ زیب واقع ہے اور سید درویش کی قبر بھی ان کے برابر ہی واقع ہے۔ میر عظمت اللہ کی قبر مغرب کی جانب ہے اور سید درویش کی قبر مشرق رویہ ہے یہ سید درویش، شاہ رحمت اللہ کے سوتیلے بھائی ہیں۔ جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ آپ میر عظمت اللہ بے خبر اسم باسمّٰی کے ہم عمر اور شریک تھے ان میں فقر کا درجہ بہت قوی تھا۔ باوجود صاحب عیال ہونے کے بے حد آزادی اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی گذارتے تھے۔ آخر کار سب کچھ چھوڑ کر شاہ جہان آباد میں قیام فرمایا اور باقی عمر گوشہ نشینی کے ساتھ بسر کی یہانتک کہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے[۲]

[ع] مکتوبات کی عبارت ختم ہوئی۔

[۱] اور شمع انجمن میں حضرت نواب نے کہا ہے کہ ان کا ایک تذکرہ بھی ہے جس کا نام "سفینہ بے خبر" ہے جس میں مرزا بیدل کے ساتھ اپنی محبت کا ذکر کیا ہے ان کی کلیات تقریباً سات ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

[۲] ملاحظہ فرمائیے سرو آزاد۔ اور شمع انجمن۔

[۳] آپ کی تالیفات میں: ۱۔ توحید و تصوف میں چند رسائل ۲۔ کلیات جو چندرہ ہزار ابیات قصیدہ، غزل، رباعی اور مثنوی پر مشتمل ہے (سفینہ خوشگو) لیکن نشتر عشق میں سات ہزار ابیات اور سرو آزاد میں قریب سات ہزار ابیات بیان کیے گئے ہیں اسی طرح شمع انجمن مؤلفہ صدیق حسن خان میں ہے ۳۔ سفینہ بے خبر۔ اس تذکرہ میں ان شعرائے متاخرین (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۵۱

میر نوازش علی سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ سید العارفین قدس سرہٗ کے پوتے اور ان کے سجادہ نشین تھے ۱۹ رمضان المبارک سنہ ۱۱۳۲ھ کو ان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائے شعور سے اپنی جوانی تک جدِ بزرگوار کی آغوش میں تربیت پائی۔ اور ان کے فیض و برکت سے بہرہ وافر حاصل کیا۔ ۹ سال کی عمر شریف ہی میں بیعت سے سرفراز ہو گئے تھے۔ سید العارفینؒ رشتۂ فرزندی کے تعلق سے انتہائی عنایت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ چونکہ ان کے والد میر عظمت اللہ بیخبر سید العارفینؒ کے وصال سے ۹ ماہ پیشتر ہی فوت ہو چکے تھے۔ لہٰذا سید العارفین نے اپنے وصال سے قبل ہی میر نوازش علی کو اپنی خلافت و اجازت عطا فرما دی اور وہ خرقۂ خلافت جو مرشد برحق میر سید احمد قدس سرہٗ سے سید العارفین نے پہنا تھا اپنے دستِ مبارک سے میر نوازش علی کو پہنایا۔ میر صاحب اپنے والد کے کمالات کے وارث ہیں اور صاحبِ بلند مشرب ہیں۔ اور اہلِ علم و فضل میں امتیازِ خاص رکھتے ہیں۔ اپنے اوقات ہمیشہ یادِ الٰہی میں بسر فرماتے اور طالبانِ حقیقت کی رہنمائی فرماتے تھے۔

۵۲

میر سید نور الحق سلمہ اللہ تعالیٰ

سید العارفین کے دوسرے صاحبزادہ اور صاحب البرکات سید برکت اللہ بلگرامی کے داماد ہیں جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ ان کی ولادت سنہ ۱۰۹۶ھ میں ہوئی اور علامہ مرحوم میر عبد الجلیل نے "بخت مند" تاریخ ولادت نکالی۔ ابتدائے شعور سے اپنے والد سید العارفین کے دم آخر تک ان کی تربیت میں رہے اور مقصد اعلیٰ کے راستہ پر گامزن ہو گئے۔ بلگرام سے بہت کم باہر گئے۔ ہمیشہ بلگرام ہی میں مقیم رہے۔ کبھی کبھی یہ

(بقیہ حاشیہ صہ) اشعار ہیں جو جہانگیر بادشاہ اور شاہ عباس صفوی کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور عرفی اور ثنائی کے بعد سے مولف کے زمانہ تک کے تھے۔ جو محمد شاہ اور محمود شاہ افغان کا زمانہ ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۱۴۲ھ میں تالیف ہوئی مؤلف کے والد مخلص احمدی سے شروع ہوتی اور احمد یار خان یکتا پر ختم ہوتی۔ یہ سفینہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور تفصیلی حالات بہت کم ہیں اکثر شعراء کے حالات نہایت مختصر ہیں تحریر سادہ اور تصنع سے خالی ہے اس کتاب کا یہ انداز بحیثیت مجموعی اس دور کے شعراء کے اشعار کا مجموعہ ہے جو بہت اہم اور گرانقدر ہے۔ چونکہ شعراء کے سوانح حالات اس میں موجود نہیں ہیں لہٰذا تذکروں کے سلسلہ میں کوئی عمدہ اور فائدہ بخش اضافہ نہ کر سکا۔ (دیکھیے خزانۂ عامرہ (مقدمہ)، سفینۂ خوشگو، شمع انجمن۔

بسلسلۂ قرابت قصبہ مارہرہ جہاں صاحب البرکات قدس سرہٗ کی قیام گاہ ہے تشریف لے جاتے ہیں سید العارفین نے اپنے وصال سے پہلے ہی طالبانِ خدا کی ہدایت کا ان کو مجاز بنا دیا تھا۔ والد ماجد کے وصال کے بعد مزار شریف کے پائیں آپ کا قیام ہے۔ اور ہر وقت خدا پرستی اور پرہیز گاری کے راستہ پر قائم ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے۔!!

۵۳

سیّد نور اللہ قدس سرہٗ

سید العارفین شاہ لدھا بلگرامی قدس سرہٗ کے حقیقی برادر صغیر تھے بڑے دل سوختہ تھے خشیت الٰہی سے ہر وقت اشک بار رہتے خدا دوست اور دنیا سے نفور تھے۔ حصول علم کی ابتداء شیخ ابوالفتح[1] ساکن نیوتنی اودھ کی شاگردی سے کی۔ اور ان ہی سے فراغت حاصل کی۔ آپ مُلّا ابوالفتح قاضی ضیاء الدین کی اولاد سے ہیں جن کا شمار نیوتنی کے ممتاز لوگوں میں ہوتا ہے احمد آباد جا کر شیخ وجیہہ الدین علوی[2] کی صحبت میں مرتبہ کمال کو پہنچے، اور مقام فضیلت حاصل کیا۔ شیخ ان کے ساتھ خاص عنایت سے پیش آئے اور اپنی صاحبزادی کے ساتھ عقد فرما دیا۔ قاضی ضیاء الدین کچھ دنوں بعد اپنی بیوی کے ہمراہ اپنے وطن اصلی لوٹ کر آگئے۔ ملا ابوالفتح جوانی کے دنوں میں تحصیل علم کے شوق میں قصبہ قصبہ پریشان پھرتے تھے۔ ملا محمد زمان[3] ساکن کاکوری اور دیگر علمائے وقت سے انہوں نے پڑھا۔ اس کے بعد میر سید حسین شاگرد رشید میر زاہد کی خدمت میں گئے۔ کچھ دنوں ان سے بھی پڑھا۔ اور پھر آخر میں میر زاہد ہی کی خدمت میں پہنچ کر آخر تک تحصیل علم کیا۔ (فارغ التحصیل ہوتے) پھر وطن اصلی لوٹے اور شیخ پیر محمد لکھنوی[4] سے بیعت کی۔ اور آخر عمر تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ بہت سے لوگ آپ سے

---

[1] ابن سلیمان بن فضل بن قاضی ضیاء الدین معروف بہ قاضی جیا، عثمانی نیوتنی اودھی، (نزہتہ الخواطر) ابن سلیمان علوانی اعتما

[2] علمائے وقت میں ممتاز تھے۔ قاضی وجیہہ الدین گجراتی کے شاگرد و داماد تھے۔ طریقہ قادریہ شیخ محمد بن یوسف قرشی برہان پوری (سنہ ۹۷۲ھ) سے حاصل کیا۔ شاہ جمال اولیاء کوروی (سنہ ۱۰۴۷ھ) ان کے شاگرد تھے قاضی وجیہہ الدین۔ سنہ ۹۸۹ھ میں وصال فرمایا۔ (نزہتہ الخواطر)۔

[3] بن محمد رضا بن محمد اشرف بن عبد القدوس بن شہاب الدین بن نظام الدین بھیکہ علوی کاکوروی بڑے علماء میں تھے قاضی عبد القادر عمری لکھنوی (سنہ ۱۰۸۰ھ) کے شاگرد تھے۔ طریقت کی سند شیخ پیر محمد لکھنوی سے حاصل کی۔ شیخ عبد الغفور اشرفی جہانگیری و شیخ علی اصغر قنوجی (سنہ ۱۱۴۰ھ) و شیخ محمد غوث کاکوروی (سنہ ۱۱۲۱ھ) ان کے شاگردوں میں سے تھے (نزہتہ الخواطر)۔

[4] بن اولیاء جونپوری بڑے قابل آدمی تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں اور فضل و کمال میں بہت مشہور تھے۔ عمدہ اور لطیف تصنیفات اور سوز عشق سے بھری ہوئی تالیفات والے۔ درسی کتابیں جون پور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فیض یاب ہوئے۔ مختصر یہ کہ سید نور اللہ ملاقی سے فارغ ہو کر دلی چلے گئے۔ اور وہیں سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے مزار مقدس کے نزدیک مقیم ہو گئے۔ قیام کے دوران بعض امراء نے روزمرہ کے اخراجات اور مدد معاش کے لیے اراضی کی سند پیش کی تو سید صاحب نے اپنے منہ پر طمانچے مارے اور سند کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ سید العارفین کی خدمت میں پہنچ کر ان سے بیعت کی۔ اور سخت ریاضتیں کیں۔ آپ کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ راتوں کو بہت کم آرام کرتے زیادہ تر روتے رہتے۔ کبھی رکوع اور کبھی سجدہ کی حالت میں صبح کر دیتے۔ اور حدیث کریمہ حتیٰ تورمت قدماہ[1] (یہاں تک کہ آپ کے پائے مبارک متورم ہو جاتے) کے مطابق اکثر دیکھا جاتا کہ پاؤں متورم ہیں۔ ایک مرتبہ تو ایسی حالت ہو گئی کہ گیارہ روز تک نہ کچھ کھایا اور نہ پیا۔ ایک روز کھڑے ہوئے تھے۔ آفتابہ سے وضو کے لیے پانی لینے کو جھکے تو کیفیت ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اسی طرح رکوع کی حالت میں تین دن تک جھکے رہے۔ اکثر دیوانگی کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ضعف و ناتوانی میں پڑے رہتے تھے۔ گریبان چاک رہتے تھے۔ سونا چاندی ہاتھ میں نہیں لیتے تھے فرماتے تھے یہ مردار ہے اس سے ہاتھ ملانا جائز نہیں ہے۔ خلاف شریعت کاموں پر سخت گرفت فرماتے تھے ایک روز آزاد قلندروں کے گروہ کا ایک شخص سید العارفین کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے کان میں ساز کی آواز آئی وہ قلندر گستاخی کے ساتھ حضرت سید العارفین سے گفتگو کرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ جہاں ساز ہوں وہاں سے چلا جانا چاہیے۔ سید نور اللہ نے اس سے سختی سے کہا کہ یہاں تو ساز ہے اور وہاں کیا ہے؟ قلندر نے کہا وہاں "اللہ" ہے۔ سید نور اللہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور قلندر سے کہا کہ اٹھو اور اللہ کو دکھاؤ۔ اس نے کہا کہ پہلے اپنے بدن سے نجاست کو دور کرو۔ انہوں نے کہا کہ نجاست کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ دنیوی لباس، جو تمہارے اوپر ہے سید نور اللہ نے عمامہ زمین پر پھینک دیا۔ اور کپڑے پھاڑ دیے۔ اور کہا کہ آؤ اور اللہ کو دکھاؤ، قلندر کو سخت تعجب ہوا اور عاجزی و انکساری کرنے لگا۔ سید نور اللہ نے سختی کی۔ بالآخر سید العارفین نے درمیان میں پڑ کر قلندر کو ان کے ہاتھ سے رہائی دلائی۔ ایک رات نماز تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ رہے تھے جب امام اس آیت پر پہنچا "فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا" (تو تم کو چاہیے کہ کم ہنسو اور زیادہ روؤ) عین نماز کی حالت میں گر کر بے ہوش ہو گئے۔ اور کئی دن تک روتے رہے۔ ایک باران کو راہ سلوک میں

(بقیہ حاشیہ صــــ) حرمین شریفین اور دوسرے شہروں میں پڑھ کر لکھنؤ آئے اور قاضی عبدالقادر لکھنوی (م ۱۱۰۰ھ) کی درسگاہ سے فارغ ہوئے۔ شاہ عبداللہ سیاح کے مرید ہوئے اور انہیں سے خلافت بھی حاصل کی۔ (متوفی ۱۱۳۸ھ) دریائے گومتی کے کنارے (ایک ٹیلہ پر جواب وسط لکھنؤ میں ہے)۔ مزار مقدس زیارت گاہ عوام ہے اور ٹیلہ شاہ پیر محمد کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تالیفات میں سراج الحکم، حاشیہ شرح صدرا، فتاویٰ فقہیہ، کتاب المنازل الاربعہ مشہور ہیں (تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر، خزینۃ الاصفیاء)۔

[1] حدیث مغیرہ بن شعبہ (مشکوٰۃ شریف)۔

ایک مشکل پیش آئی۔ سید العارفین کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ حضرت ہمہ وقت مصروف رہتے تھے اس وقت بھی ذکر میں مشغول تھے اور سید نور اللہ کی مشکل حل نہ ہوئی۔ قلبِ ذاکر اسی وقت خاموش ہو گیا۔ سید العارفین نے ان سے فرمایا جاؤ قرآن مجید حفظ کرو۔ چند پارے حفظ کیے تھے۔ کہ دل کی گرہ کھل گئی۔ حضرت سید العارفین کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوس ہوئے اور باقی قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ پچیس پارے یاد کیے تھے کہ راتوں کو قیام کی وجہ سے دونوں پیر متورم ہو گئے۔ اور اسی پیروں کے ورم کے عارضہ میں انتقال فرمایا۔ وقت آخر لوگوں نے عرض کیا کہ اپنی کوئی خواہش بیان فرمائیں فرمایا یہ تمنا ہے۔ کہ قرآن کے باقی پانچ پارے اور یاد کر لیتا مگر یاد کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کی وفات ۱۳ر شعبان سنہ ۱۱۰۷ھ کو ہوئی۔ کاتب الحروف (میر غلام علی آزاد بلگرامی) نے آیت "بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ" سے تاریخ وصال نکالی۔ ان کے انتقال کے بعد قرآن مجید کا وہ نسخہ جس میں تلاوت فرماتے تھے گم ہو گیا۔ گھر والے سخت پریشان اور افسردہ خاطر تھے۔ کہ سید نور اللہ مرحوم نے گھر کے لوگوں میں سے کسی شخص کو خواب میں بتلا دیا کہ فلاں شخص کے گھر میں فلاں جگہ وہ قرآن رکھا ہے گھر والوں کو جب پتہ چلا تو اسی جگہ رکھا ہوا وہ قرآن ان کو مل گیا (رحمۃ اللہ علیہ)۔

۵۴

سید محمدی قدس سرہٗ

سنہ ۱۱۲۳ھ

سید محمدی بن سید بدیع الدین عرف سید منجھا بن سید تاج الدین حجرہ نشین سید العارفین قدس سرہٗ کے خلفاء میں سب سے ممتاز تھے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اور مولوی عبد الغفور متولی بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ اور تمام کتب درسیہ ترتیب کے ساتھ پڑھیں۔ سید العارفین کی ارادت حاصل کی۔ اور سلوک کا راستہ علم کے قدم سے طے کیا۔ ابتداء سے نکل کر انتہا تک جا پہنچے۔ سید العارفین سے خرقۂ خلافت پہنا۔ اور اجازت (مرید کرنے کی) حاصل کی۔ آپ نے خلوت نشینی میں خود کو مقید نہیں کیا۔

شاہ عالم[1] بہادر شاہ کے ہم نشین تھے۔ بادشاہ انتہائی ادب و احترام سے پیش آتا تھا۔ ایک دن خلوت میں بادشاہ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ دوران گفتگو بادشاہ کے زانو پر ہاتھ رکھ دیا۔ ناظر نے ٹوکا اور کہا کہ

[1] قطب الدین نام تھا عالمگیر بادشاہ غازی کے دوسرے لڑکے ہیں سنہ ۱۰۵۳ھ میں ایک ہندو عورت نواب بائی کے بطن سے برہان پور میں پیدا ہوئے۔ اور محمد معظم کے نام سے مشہور ہوئے شاہزادگی کے دنوں میں بہادر کے خطاب سے بھی سرفراز کیے گئے سنہ ۱۱۱۹ھ میں بمقام آگرہ تخت سلطنت پر بیٹھے اور شاہ عالم سے ملقب ہوئے سنہ ۱۱۲۴ھ میں بمقام لاہور بیمار ہو کر انتقال کیا ایام حکومت پانچ سال ایک ماہ اور بائیس روز ہے۔

ادب کے طریقوں کا خیال رکھنا چاہیے بادشاہ نے ناظر کو منع کیا اور فرمایا اللہ والوں سے کسی حال میں بھی تعرض نہیں کرنا چاہیے۔ سید صاحب بہت عالی مشرب اور بلند حوصلہ تھے۔ آپ میں قوت باطن بدرجہ کمال موجود تھی جو صاحب دل بھی ان سے ملتا وہ ان کا مطیع اور اطاعت گذار ہوجاتا۔ ایک دن مشائخ میں سے کسی سے ملاقات ہوئی مسئلہ توحید پر گفتگو ہونے لگی۔ شیخ پر رقت طاری ہوگئی۔ سید صاحب نے فرمایا سقائی کرنے لگے۔ شیخ نے کہا اس بات کو ہم جانتے ہیں، سید نے کہا یہ نفس کی بات ہے توحید میں من و تو کی کوئی گنجائش نہیں ہے ان کی وفات ۱۱۲۳ھ میں ہوئی۔ آرام گاہ محلہ میدان پورہ کے شمالی باغ میں حیدر آباد کی آکلیہ کے رُخ پر مزارات شہداء کے قریب ہے۔ اسی سال قاضی محمد حافظ کا بھی انتقال ہوا جن کا آئندہ ذکر کیا جائے گا۔ میر عبدالجلیل فرماتے ہیں

چوں میر محمد و قاضی حافظ	بردند بیک سال سوئے جنت راہ
گشتند بہ رضوان الٰہی واصل	ہاتف تاریخ گفت رضوان اللہ

۵۵

سید برکت اللہ ملقب بہ صاحب البرکات قدس سرہٗ

سید برکت اللہ بن سید اویس بن سید عبدالجلیل بن میر عبدالواحد بلگرامی قدس سرہم، ایک ایسے شہباز ہیں جن کا آشیانہ "سدرۃ المنتہٰی" ہے اور ایسے شہسوار ہیں جن کی جولان گاہ سات آسمان ہیں۔ طلوع ولایت ان کی پیشانی پر تاباں اور فقراء کی سطوت ان کے چہرہ پر نمایاں ہیں۔ تمام عمر آستانہ خالق پر جبیں سائی کرتے رہے اور کسی مخلوق کے در پر قدم نہیں رکھا۔ بلکہ امراء و فقراء ہی ان کے در پر جبیں سائی کرتے رہتے تھے۔ اور اس طرح عالم سفلی اور عالم علوی کا میدان انہوں نے مار لیا۔ اگرچہ ابتدائی عمر میں جناب سید مربی بن سید عبدالنبی بلگرامی قدس سرہٗ سے بیعت تھے لیکن شباب سے پیری تک سید العارفین قدس سرہٗ ہی کی خدمت میں رہے اور ان کی خدمت ہی میں ان کی صلاحیتوں نے کمال کا رنگ قبول کیا۔ (باطنی اعتبار سے مرتبہ کمال کو پہنچے) آں جناب کی عنایات خاص سے بدرجہ غایت بہرہ ور ہوئے۔ اور سند خلافت و اجازت حاصل کی۔ سید العارفین ان کی جانب خاص توجہ فرماتے تھے۔ اور اکثر ان کو ایسے خطوط تحریر فرماتے۔ جن میں حقیقت و معرفت کے اسرار ہوتے آپ کے ان خطوط میں اکثر خطوط انیس المحققین[1] میں درج ہیں۔ طالبان حقیقت کو ان کے مطالعہ سے روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ صاحب البرکات، دارالولایت کالپی تشریف لے گئے۔ اور مخدوم زادہ[2] قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچ کر آپ کی توجہات و عنایات سے بہرہ اندوز ہوئے انھوں نے رداء خلافت عطا فرما کر آپ کو مرتبہ کی

---

[1] حقائق تصوف میں یہ ایک رسالہ ہے جو مصنف کتاب "میر غلام علی آزاد" بلگرامی کی تصنیف ہے۔

[2] شاہ فضل اللہ بن میر سید احمد بن میر سید محمد کالپوی قدس سرہٗ۔

بلندی تک پہنچا دیا۔ اور بے حد عزت واحترام سے رخصت فرمایا، صاحب البرکات نے اسی سلسلہ کو جاری کیا اور اپنے بزرگوار سید عبد الجلیل قدس سرہ کے مزار کے قریب واقع قصبہ مارہرہ جو مضافات دار الخلافہ اکبر آباد (آگرہ) میں سے ہے۔ تشریف لے گئے۔ اور یہاں مستقل طور پر مقیم ہو گئے یہاں ان کی شہرت درجہ کمال کو پہونچ گئی (بہت زیادہ شہرت ہوئی) نزدیک اور دور کی بے شمار مخلوق ان کی تربیت سے مستفیض ہو کر بلند مقصد تک پہنچی، آپ نے اس طرح بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی فرمادی۔ آپ ہمیشہ دست سخاوت کشادہ رکھتے۔ اور سامان آخرت کا ذخیرہ فرماتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں رسالہ "سوال وجواب" حقائق کے معانی کے حل میں اور رسالہ "چہار انواع" آداب سلوک میں" رسالہ عوارف ہندی" جس میں ہندی زبان کی امثلہ کو حقائق معرفت کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ اور آپنے اس سلسلہ میں بڑی لطافت (طبع) سے کام لیا ہے۔ ایک مختصر سا دیوان ایک چھوٹی سی مثنوی موسومہ "ریاض عشق" ایک رسالہ نثر میں "پیم پرکاش" جو ہندی اشعار اور کچھ فارسی اشعار پر مشتمل ہے آپ سے یادگار ہیں۔ میں دفتر ثانی کی دو آخری فصلوں میں ان کو پیش کروں گا۔ انشاء اللہ۔ آنجناب کی ولادت سنہ ۱۰۷۰ھ میں واقع ہوئی۔ اور وفات عاشورہ کے دن سنہ ۱۱۴۲ھ میں (امام علیہ السلام کی روح مقدس کے ساتھ فردوس بریں میں آرام فرما ہیں۔)

عظیم الہدیٰ تاریخ وفات ہے۔ عمر شریف بہتر ۷۲ سال کی ہوئی۔ قبر شریف مارہرہ میں ہے (جس کی زیارت کرتے ہیں اور برکت حاصل کرتے ہیں) چونکہ روز عاشورہ حضرت امام علیہ السلام کی شہادت کا دن ہے اس لیے پندرہ محرم کی تاریخ عرس مقرر کی گئی ہے راقم الحروف نے یہ قطعہ تاریخ کہا ہے ؎

بیدار دلے رفت سوئے محفل قدس — برلبت ز صحرائے جہاں محمل قدس
تاریخ وصال او خرد کرد رقم — صاحب برکات وصل منزل قدس

۱۱۴۲ھ

(۵۶)

سید آل محمد رحمۃ اللہ علیہ

سید برکت اللہ قدس سرہٗ مذکور کے صاحبزادے ہیں۔ جمعرات کے دن ۱۹ رمضان المبارک سنہ ۱۱۱۱ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ اور اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں باطنی تربیت حاصل کی اور خرقہ خلافت پہنا اور سلاسل خمسہ (میں بیعت لینے) کی اجازت کی سعادت حاصل کی۔ والد ماجد کے وصال کے بعد سجادہ نشین ہوئے سید العارفین قدس سرہٗ سے خلافت کی بھی استدعا کی۔ حضرت قدس سرہٗ نے خلافت نامہ اور دستار مبارک بھیج کر ان کو سر بلند اور معزز فرمایا۔ سید آل محمد رحمہ اللہ علیہ مارہرہ میں مشیخیت کی مسند پر فروکش رہے۔ شریعت کی

انتہائی نگہداشت کرتے تھے۔ امراض قلبی کے ازالہ میں آپ مسیحائی فرماتے تھے اور ویران وادئ شوق کو مقام "تلوین" پر پہونچا کر قرار و تسکین بخشتے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سنیہ کی اتباع میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ اور ان کے دست و بازو ترویج شریعت میں مصروف عمل رہتے تھے۔ اکثر اوقات گرامی تصوف کی کتابوں خصوصاً اپنے والد ماجد کی تالیفات کے مطالعہ میں بسر فرماتے۔ اور ان میں مصروف رہتے مارہرہ کے اطراف و اکناف ان کے شرف ارادت سے بہرہ ور ہو کر کامیاب ہوئے۔ سید صاحب نے بتاریخ ۱۵ ۔۔۔۔۔ ۱۱۶۴ھ وصال فرمایا اور مارہرہ میں مدفون ہوئے مؤلف اوراق نے یہ تاریخ لکھی ہے۔

چراغ آل عبا دودمان علا | فزود جلوہ او رونق حریم بہشت
افادہ کرد بمن سال رحلتش ہاتف | نصیب آل محمد بود نعیم بہشت

۱۱۶۴ ہجری

۵۷

سید نجات اللہ عرف شاہ میاں سلمہ اللہ تعالیٰ

سید برکت اللہ مذکور قدس سرہ کے فرزند ہیں۔ صاحب کمالات و فضائل ہیں۔ بزرگان کرام کے اخلاق اور ان کے جود و سخا کے جامع ہیں۔ ان کی ولادت ۱۱۱۵ھ میں بلگرام میں ہوئی۔ اور وہیں آپ نے نشو و نما پائی۔ ابتدائی زندگی سے آخر عمر تک ذی مرتبت والد ماجد کے کمالات معنوی و روحانی سے استفادہ کرتے رہے۔ اور روحانی لذتوں سے کافی و وافی طور پر بہرہ ور ہوئے۔ والد بزرگوار کے انتقال کے بعد سجادہ رہنمائی پر متمکن ہوئے اور اس کو رونق تازہ بخشی۔ اور سید العارفین قدس سرہ کی خدمت میں خلافت عطا فرمانے کے لیے ایک عریضہ تحریر کیا۔ آنجناب قدس سرہ نے درخواست قبول فرماتے ہوئے فرمان خلافت اور دستار فیض آثار کمال مہربانی عطا فرمائی۔ تادم تحریر مارہرہ میں آپ کا علم ہدایت سر بلند ہے۔ آپ متعدد سلاسل سے وابستہ حضرات کو اپنے طریقہ خاص میں داخل فرما رہے ہیں۔ احیائے قلوب مردہ کے لیے مسیحائی کا اثر رکھتے ہیں۔ آپ کا لطف و کرم دل شکستہ لوگوں کے حق میں مومیائی کا اثر رکھتا ہے۔ باوقار مزاج اور پاکیزہ ذہن کے مالک ہیں۔ شعر بھی بہت عمدہ کہتے ہیں۔ اپنے اوقات گرامی کو قرآن کی تلاوت، حدیث و تصوف کی کتابوں کے مطالعہ اور حق پرستی میں صرف فرماتے ہیں۔ اس علاقہ کے بہت سے لوگ آپ کے مرید ہیں آپ سے اکتساب فیض کرتے ہیں صاحب البرکات قدس سرہ نے اپنے ایک رسالہ میں اپنے دونوں صاحب مرتبہ صاحبزادوں کے لیے نصیحت تحریر فرمائی ہے۔ ان دونوں بزرگ بھائیوں نے آیت کریمہ وتعیہا اذن واعیۃ کے مصداق اس پر عمل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی تائید سے اس میں کامیاب ہوئے۔ نصیحت پر مشتمل عبارت یہ ہے۔

(ترجمہ) آل محمد اور نجات اللہ سلامت رہیں ان کے لیے یہ نصیحت لکھی جاتی ہے وہ اس پر عمل کریں اور اس رسالہ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ انہیں چاہیے کہ یاد الٰہی میں مشغول رہیں۔ اور فقہ اور سلوک کی کتابوں سے شغف رکھیں۔ اپنے مقام سے نہ ہٹیں۔ اور نہ دنیاداروں کے ساتھ نشست و برخاست رکھیں۔ اور ان کے گھر نہ جائیں صرف زیارت مزارات اور صاحب دل عالم کے دیکھنے کے لیے جس کا ظاہر دین اور دین داری سے آراستہ ہو، البتہ جاسکتے ہیں۔ ایسے عالم کے دیدار کو سعادت دارین متصور کریں۔ اور اپنے کسی کام یا کوئی غرض یا مطلب برآری کیلئے کسی حاکم یا کسی دوسرے شخص سے خواہاں نہ ہوں کہ کارساز صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہاں محض اللہ کیواسطے مخلوق کی مطلب برآری ہر شخص کے ساتھ الحاح اور ابرام کرکے اس کا مطلب پورا کریں۔ کہ یہ مثمر ثواب ہے۔ ایک دن ایک حاکم نے اس عاجز کے ایک کام میں مخالفت کی۔ بہت سے عزیزوں نے اس کی خوشامد کی مگر وہ نہ مانا۔ اس نے کہا اگر شاہ صاحب مجھ کو خط لکھیں تو میں اس مخالفت سے باز رہوں گا۔ عزیزوں نے اس اللہ کے محتاج بندے کو اس حاکم کو خط لکھنے پر جب بہت زیادہ مجبور کیا تو میں نے مجبوراً صرف یہ بیت لکھ دیا ہے۔

آنکہ رخسار ترا رنگ گل و نسرین داد — صبر و آرام، تواند بہ من مسکیں داد

اس نے جب یہ شعر پڑھا تو مخالفت سے باز آگیا۔ بہرحال اس کی یاد میں رہو اور اس کے لیے " ففروا الی اللہ، ولا تقنطوا من رحمۃ اللہ وعلی اللہ فتوکلوا" دل وجان اور زبان پر جاری رکھو۔ اور طریقہ ظاہر کو عمدہ انداز سے بغیر بحث و تکرار کے پیش کرو۔ دین کی چادر کو (جسم سے) خواہ کتنی ہی تکلیف اور سختی کیوں نہ ہو۔ جدا نہ کرو۔ جاهدوا فی سبیل اللہ (اللہ کے راستہ میں سعی و کوشش کرو) ہاں جہاد اکبر یہی ہے۔ کہ خود کو آرام نہ دو۔ جب تک آرام حاصل نہ ہو۔ نفس کے ساتھ جنگ کرتے رہو اور مملکت کے محکموں سے رجوع نہ کرو۔ اور لوگوں پر ہرگز ہرگز بھروسہ نہ کرو۔ ان کے محتاج نہ ہو ہے

باغ ما را چہ حاجت سرو و صنوبر است — شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمتر است

دیگر:-

نصیحت گفت یاد گیر و در عمل آر — کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد است

مجو درستی عہد از جہان سست نہاد — کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

مقصود یہ ہے کہ علم و عمل کو سامنے رکھو اور اس پر مغرور نہ ہو اور یہ دعا مانگو کہ چشم اشک بار، دل سوزاں، عمل خالص، استجابت دعا، رفاقت درویشاں میسر آئے۔ مسجد مسکن ہو اور آہ دردناک اور اخفائے حال تائید الٰہی اور اس کے فیض لامتناہی سے میسر آئے۔ آمین، ثم آمین۔ میں اس نصیحت کی نگارش میں معروف تھا کہ میرے دل نے مجھ پر عتاب کیا اور میری جان پیچ و تاب کھانے لگی۔ کہ اے فلاں اس مشہور قول کے مطابق کہ دوسروں کو نصیحت اور خود ان نصیحتوں پر عمل نہیں۔ اے بے راہ رو! تیرے بال تو سفید ہو گئے۔

اور تیرا دل اسی طرح سیاہ ہے تیرا ظاہر آراستہ ہے اور تیرا باطن تباہ ہے۔ تو اپنے مآل کار پر نظر رکھ اور اپنے حال پر رو اور ماتم کر۔ تو نے خود کون سی نیکی کی ہے؟ کہ دوسروں کو نصیحت کر رہا ہے اور تو نے کون سا نیک کام کیا ہے تجھ سے کون سا عمل پسندیدہ سرزد ہوا ہے کہ تو دوسروں کو اس کا حکم دے رہا ہے۔ بس کر اور وقت ضائع نہ کر۔ ؎

از نارِ فراق خود ہمیں سوز — بنشیں پس کار و دیدہ بر دوز

یہ گندم نمائی اور جو فروشی کب تک کرتا رہے گا (یہ دور خاپن کب تک) ایسا بن جا جیسا کہ تو دکھائی دیتا ہے۔ یعنی جیسا ہے ویسا ہی نظر آئے میں نے جب اس بات پر غور کیا تو میں نے خود کو اس سے بھی بدتر اور بُرا پایا۔ جیسا کہ دل نے کہا تھا آہ، صد آہ! ؎

عمرے کہ بحضورِ صراحی و جام رفت — وقت عزیز رفت بیا تا قضا کنیم

بس نصیحت کی نگارش کو میں نے ختم کر دیا۔ اور خاموش ہو گیا۔ وہ جوش اور شور جو مجھ میں پیدا ہوا تھا ختم ہوا اور پھر ہوش میں آ گیا۔ "یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ" بحمدہ ذکرہ وہ اپنے احسان اور کرم سے مردہ میں سے زندہ کو نکالتا ہے" (شاہ صاحب کی نصیحت ختم ہوئی)

۵۸

سید علیم الدین رحمۃ اللہ علیہ

سید علیم الدین ابن سید حسین بن سید ابو الفتح بن میر عبد الجلیل بن میر عبد الواحد اکبر بلگرامی قدس سرہم آپ نے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور ابتدائے شباب ہی میں حق کی جانب مائل ہوئے اور سید العارفین کی درگاہ سے وابستہ ہو گئے۔ جب آپ کی بہت سی کراماتیں مشاہدہ کیں۔ تو بیعت کا شرف حاصل کیا۔ پیر طریقت نے نفس کشی و ریاضت کے راستہ پر ڈالا۔ اور اس سے خالص سونا بن کر نکلے۔ یعنی نفس کشی کی تعلیم سے مراتب طریقت کو طے کیا اور کمال معرفت پر پہنچے۔ ذکر قلبی کی مشق یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جب کبھی رات کو سو جاتے تو ان کے قلب سے لوگ بلند آواز میں اللہ اللہ کا نام سنتے تھے۔ وقلب ذاکر رہتا تھا ابتدا سے آخر عمر تک قناعت کی زندگی بسر کی۔ وراثت میں تھوڑی سی مزروعہ زمین جو ملی تھی اسی کی قلیل آمدنی پر اکتفا فرماتے تھے لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ جنوں کو قید کرنے اور شیاطین کو جلانے پر آپ کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی وفات ۱۱۱۰ھ کے دوسرے عشرہ میں ہوئی۔ آپ کی آرام گاہ بلگرام میں ہے۔

۵۹

سید محب اللہ بلگرامی قدس سرہٗ

سید محمود اکبرؒ مذکور کے اخلاف و احفاد میں سے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے سید محب اللہ بن سید محمود بن سید محمود فاضلؒ بن سید عبدالکریم بن سید ابوالقاسم بن سید خان محمد بن سید محمود اکبر (قدس اللہ سرہم) ابتدائے جوانی میں قرآن مجید حفظ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے مکان کے بالاخانہ پر خلوت گزیں ہو کر چھ ماہ میں قرآن حفظ کرلیا۔ اور اس مدت میں کبھی بالاخانہ سے باہر نہیں آئے۔ بہت زیادہ پرہیز گار اور خوف الٰہی رکھنے والے تھے۔ خود کو سید العارفین قدس سرہٗ کے ارادت کے شکار بند سے وابستہ کردیا۔ (یعنی ان کے مرید ہوگئے) اور ہستی کے کتانی لباس کو ماہتاب فنا کی ضو سے پارہ پارہ کرکے نور سرمدی میں مستغرق و مستہلک ہوگئے اپنے حال کا اخفا اپنا شعار بنایا تاکہ کوئی شخص ان کو اس گروہ صوفیہ سے نہ سمجھ لے۔ لہٰذا ظاہر میں سپاہی کی صورت میں رہتے اور بباطن یاد الٰہی میں مصروف رہتے۔ بہادری اور مردانگی کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ (بڑے بہادر اور شجیع تھے) متعدد بار بہت سے کارہائے دلیرانہ انجام دیے۔ آپ شہزادہ معظم بن سلطان عالمگیر کے زمرۂ ملازمین میں شامل تھے۔ جب دارالفتح صوبہ اجین کی صوبہ داری بادشاہ کے دربار سے شہزادہ محمد معظم کو سپرد ہوئی۔ اور فضائل خان کے فرزند میر زین العابدین کے سپرد اس صوبہ کی نیابت کی گئی۔ تو سید محب اللہ منصب داروں کے زمرے میں شامل تھے۔ میر زین العابدین نے ان کو اجین بھیج دیا۔ آپ وہاں مقیم ہوگئے۔ اتفاق سے کسی سفر میں ایک دن فوج سے الگ ہوکر سرائے "سسی" کے قریب پہونچے۔ اور دروازہ کے سامنے سایہ دار درختوں کے نیچے اپنے گھوڑے سے اتر پڑے۔ اور زین پوش بچھا کر بیٹھ گئے۔ باوجودیکہ فوج کی منزل آگے تھی۔ خدمت گاروں سے فرمایا کہ سامان نیچے اتار دو۔ پھر آپ نے سفید لباس نکالا۔ نیا لباس پہنا اور شربت بنا کر پیا۔ پھر قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول ہوگئے۔ تلاوت سے فارغ ہوکر کشت کے اوپر آئے۔ اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ مرزا سلطان نظر جو میر زین العابدین کے عزیزوں میں تھے۔ اور اس زمانہ میں فوج کے بخشی تھے۔ سید محب اللہ کے ساتھ ان کے روابط و دوستی تھے۔ وہاں سے گذرے اور سید محب اللہ کے گھوڑے کو پہچان لیا۔ قریب پہنچ کر ملازمین سے فرمایا۔ منزل آگے ہے انہیں جگانا چاہیے اور خود گھوڑے کے اوپر بیٹھے بیٹھے دو تین مرتبہ آواز دی۔ جواب نہیں ملا۔ مجبوراً ملازمین سے فرمایا۔ چادر کھینچ لو۔ جب ان لوگوں نے چادر ہٹائی دیکھا کہ ان کا وصال ہوچکا ہے مرزا سلطان نظر نے تجہیز و تکفین کی اور اسی جگہ سپرد خاک کردیا۔

میر سید احمد بلگرامی جو اس وقت شاہ جہان پور، سجاول، اندور اور صوبہ مالوہ کی حکومت کے منتظم تھے سید محب اللہ کے بڑے بھائی میر سید لطف اللہ جو میر سید احمد کے ہمراہ رہتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک شخص کو

کچھ روپیہ دے کر بھیجا کہ مرحوم کی قبر کو اس روپے سے پختہ بنا دیا جائے۔ جب وہ شخص روپیہ لے کر وہاں پہونچا، تو دیکھا کہ اس سرائے کے حاکم نے پہلے ہی قبر اور اس کے چبوترہ کو "گچ و خشت" سے پختہ بنا دیا ہے ان کے گھوڑے نے دانہ اور گھاس کھانا چھوڑ دی تھی۔ رات دن اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے۔ لہذا حاکم نے تین روز بعد اس کو ذبح کر کے مزار مبارک کے پائیں میں دفن کر دیا۔ گھوڑے کی قبر چبوترہ بنا دی گئی۔ اور ایک کنواں کھود کر اس کو بھی اینٹوں سے تعمیر کرا دیا۔ اس جگہ لوگ سید صاحب کے مزار کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اور نقارہ بجاتے ہیں اور نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ آپ کی وفات ۲۴ شعبان ۱۱۳۰ھ کو ہوئی سرائے سیتی کی فصیل چھڑکی ہے۔ سید صاحب کی قبر اکبر آبادی دروازہ کی طرف ہے۔ اور یہ سیتی، منزور اور کالا باغ کے درمیان ہیری کے ضلع میں ہے۔ قرآن مجید کا ایک نسخہ تیس پارے مکمل پندرہ جلدوں میں سید محب اللہ کی دستخط کے ساتھ جو انتہائی صحیح نسخہ ہے۔ آج بھی وہاں موجود ہے۔ لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور دیگر نسخوں کی صحت اس کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ سید العارفین فرماتے تھے کہ سید محب اللہ کہتے تھے کہ کلمہ طیبہ کے ذکر کے وقت جب لا الٰہ کہتا ہوں مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اور جب الا اللہ کہتا ہوں ہر چیز موجود ہو جاتی ہے۔ سید العارفین یہ بھی فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ میں نے سید محب اللہ کو خط لکھا اس میں یہ شعر بھی میں نے تحریر کیا تھا ؎

غیرت روا نہ داشت کہ برقع بر افگنم ۔۔۔ تا جلوۂ نگر بہ دگر جانانہ خودم

سید محب اللہ نے اس شعر کے مقابل یہ شعر تحریر کیا ؎

جز تو کس نیست تا ترا بیند ۔۔۔ از چہ برقع نمی کشائی تو

سید العارفین فرماتے ہیں کہ سید محب اللہ کا یہ شعر میرے شعر سے بھی سبقت لے گیا۔

۶۰

میر سید لطف اللہ عرف خورد میر قدس سرہٗ

آپ سید محب اللہ کے حقیقی اور طریقتی بھائی ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں رئیسوں کی ملازمت کرتے تھے۔ لیکن حقیقت میں انجمن میں خلوت کی شمع روشن رکھتے۔ دولت حسن صوری سے بہرہ ور تھے۔ حسین و جمیل تھے آپ ہمیشہ ارباب احتیاج کی ضرورتیں رفع کرنے میں بہت بلند حوصلہ تھے۔ اور بغیر نمود و نمائش کے نیکی و احسان کی خلعتوں سے لوگوں کے جسم کو آراستہ و پیراستہ کرتے تھے۔ امراء کی ملازمت کے باوجود تقوے اور پرہیزگاری میں حد درجہ سعی فرماتے۔ اور ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ تہجد کی نماز کبھی ضائع نہیں کی۔ ظاہری اور باطنی لوگوں کے ساتھ ایک عرصہ گذارا۔ اور ۱۱۳۲ھ میں دارالحکومت شاہجہان آباد سے بلگرام آ گئے۔ سکندرہ اور قنوج کے درمیان ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا۔ جس میں شدید زخم آئے اسی

مجروح حالت میں وطن پہنچے ۔ اور ایک ہفتہ بعد انہی زخموں کے باعث آپ کی موت واقع ہوئی ۔ (شہادت پائی)۔ اور حویلی سید احمدؒ بن سید مبصرؒ کی دیوار سے متصل شمال کی جانب قبرستان میں آرام فرما ہیں ۔ آیت کریمہ "و رضوا عنہ" (سنہ ۱۱۴۳ھ) سے میں نے تاریخ وفات نکالی ۔ استاد المحققین میر سید طفیل محمدؒ نے ان کی تجہیز و تکفین کی ، رحمۃ اللہ علیہ ۔

۶۱

شیخ محمد سلیم[1] قدس سرہٗ

بلگرام کے قاضیوں کے خاندان سے ہیں ۔ اور قاضی یوسف عثمانی کی اولاد ہیں ۔ اپنے زمانہ کے ممتاز لوگوں میں تھے ۔ انتہائی عزت و وقار اور فضائل اخلاق کے مالک تھے ۔ ابتدائے حال میں کچھ عرصہ بلگرام میں منصب قضا پر فائز رہے ۔ انتہائی خدا ترسی اور ایمانداری سے آخر وقت تک کام کیا ۔ یہاں تک کہ اپنی ملوجہت کے باعث اس خدمت سے سبکدوشی اختیار کر لی ۔ اور قضا کا عہدہ اپنے بھتیجے قاضی محمد حافظ کو عنایت کر دیا ۔ اور سید العارفین کی ارادت کے حلقہ میں داخل ہونے کی سعادت[2] حاصل کی ۔ اور کئی سال ان کی خدمت میں بسر کیے اور اس عرصہ میں اپنی صلاحیت سے ہلال کو اخذ فیض کر کے بدر کامل بنا لیا ۔

۲۸ محرم سنہ ۱۱۴۳ھ کو منہ قضیٰ نحبہ کے سر رشتہ میں منسلک ہو گئے ۔ (وصال فرمایا) مزار پاک اس باغیچہ میں جو حویلی میر سید احمد کے قریب ہے بڑے چوکور چبوترہ پر واقع ہے راقم الحروف نے تاریخ وصال آیت کریمہ و نجزی الذین احسنوا بالحسنیٰ سے نکالی ۔

جب میر نوازش علی سلمہ اللہ تعالیٰ صاحب سجادہ سید العارفین قدس سرہ پیدا ہوئے ۔ تو شیخ محمد سلیم نے اپنے گھر والوں کو خواب میں بشارت دی کہ آج رات شاہ لدھا کے پوتا پیدا ہوا ہے ۔ وہ تھوڑے سے جو جو گھر میں موجود ہیں وہاں نذر بھیجنا چاہیے ۔ جب اہل خانہ بیدار ہوئے ۔ اس ارشاد پر عمل کیا ۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۔

---

[1] عرف لال میاں ۔ قاضی محمد یوسف ثالث کے لڑکے اور قاضی محمد فضیل (سنہ ۱۰۹۱ھ) کے بڑے بھائی ہیں ۔ (تاریخ خطۂ بلگرام)

[2] ان کو شاہ لدھا کا مرید قرار دینا خلاف واقعہ ہے (بحوالہ شرائف عثمانی ، تاریخ بلگرام)۔

۶۲

شیخ محمد حافظ قدس سرہٗ

شیخ محمد سلیم[1] کے برادرزادہ ہیں۔ اپنے زمانہ میں نہایت عزت و وقار کے ساتھ زندگی بسر کی شہر کے تمام چھوٹے بڑے آپ کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔ بچپن کے ابتدائی دور میں ہی قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ اور عنفوان شباب میں حصولِ تعلیم کی جانب توجہ فرمائی۔ اور قاضی علیم اللہ کھنڈوی کے حلقہ درس میں بطور شاگرد داخل ہو گئے۔ طلباء کے گروہ میں امتیاز خاص پیدا کیا۔ خط نسخ اور نستعلیق نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ جب شیخ محمد سلیم ؒ نے عہدہ قضا ان کے سپرد کیا۔ تو کچھ دنوں یہ کام ضرورت وقت کی بنا پر جاری رکھا۔ دل کو یاد الٰہی میں اور ہاتھ کو دنیاوی کام میں مشغول رکھا۔ دنیا کے مال کو عبرت کی ترازو میں تولتے تھے (مالِ دنیا سے عبرت حاصل کرتے تھے) سونا چاندی ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ آخر میں عہدہ قضا کو اپنے عم محترم کی طرح اپنے ایک عزیز کے سپرد کر دیا۔ اور سید العارفین ؒ کے مرید ہو گئے۔ بے حد ریاضت کی اور اپنے احوال کو عشق الٰہی سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ آپ بہت ہی خوش محبت انسان تھے۔ اور آپ کی ذاتِ گرامی ذوق و شوق کا مجسمہ تھی۔ اشعار مستانہ وار پڑھتے تھے۔ وجد کرتے اور روتے جاتے تھے۔

حضرت میر عبد الجلیل بلگرامی ؒ کے صاحبزادہ میر محمد سلمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں قاضی محمد حافظ ؒ کے گھر کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ قاضی بلندی پر کھڑے تھے میں نے سلام کیا اور چاہا کہ وہاں سے (بغیر ملاقات کیے) گذر جاؤں مگر انہوں نے آواز دی کہ ٹھہر جاؤ اور مرزا صائب[2] کا ایک شعر سنتے جاؤ۔ ؎

---

[1] شیخ محمد حافظ بن قاضی تفضیل بن قاضی محمد یوسف ثالث۔ شیخ مذکور نے مختصرات ملا محمود مانک پوری سے پڑھیں۔ اور مطولات کی تعلیم سید غلام مصطفٰی اجالی عرف ملا باسو ؒ سے حاصل کی۔ ان کو شاہ لدھا کا مرید بیان کرنا ان کے چچا کی طرح صحیح نہیں ہے۔ صاحب شرائف عثمانی نے اس قول کو غلط کہا ہے (تاریخ خطہ بلگرام)۔

[2] مرزا صائب، محمد علی تبریزی، اصفہانی، غزل طرازوں کے امام اور سخن پردازوں کے پیشوا ان کے اشعار بہت مشہور ہیں اور تحریر کے محتاج نہیں۔ اصفہان میں پلے بڑھے۔ اور بہت کم عرصہ میں شش جہات میں اپنی زباندانی کی شہرت پھیلا دی۔ عالم جوانی میں شاہ جہانگیر کے دور میں آخر میں ہندوستان کا رخ کیا کابل میں ظفر خان اپنے والد خواجہ ابو الحسن تربتی کی نیابت میں ناظم صوبہ تھا۔ اس نے مرزا کو مقرب بنالیا جب حکومت کابل لشکر خان کو ملی تو ظفر خان کے ساتھ مرزا ہندوستان کی سیر کے لیے آئے۔ اتفاق سے ۱۰۴۲ھ میں ظفر خان کو حکومت کشمیر دی گئی۔ تو مرزا نے ایران کا ارادہ کیا۔ اور آخر وقت تک سلاطین صفویہ کے پاس باعزت اور باوقار زندگی بسر کی۔ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی آزاد بلگرامی نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے ؎
طلبل گلزار جنت صائب عالی مقام (۱۰۸۰ھ)۔ (مفتاح التواریخ، ماثر الامراء، سرو آزاد)۔

ساعد سیمیں اورا چوں کلیم اللہ دید | نسخہ افسوں شد دستے کہ در اعجاز داشت

اس وقت ایسی حالت میرے مشاہدہ میں آئی۔ جس نے مجھ پر بہت اثر کیا اور مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ ایکدن میں قاضی کے گھر گیا تھا۔ ان کو بہت ہی مسرور دیکھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا اپنے والد کے اشعار جو بطور امانت میرے پاس ہیں لیتے جاؤ۔ اور امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل جو انہوں نے علامہ مرحوم میر عبدالجلیل ؒ سے سنی تھی پڑھنے لگے ایسا ذوق اور ایسی کیفیت تھی کہ جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ غزل۔

یار قبا چست کرد رخش بہ میدان برید | ای سر و بر سر کہ ہست در خم چوگاں برید
لباس چست پہن کر وہ آیا میدان میں | ہر ایک سر کو لیا اس نے خم چوگاں میں
غمزہ زنان مارسید ساختہ دارید جاں | یوسف ما بازگشت مژدہ بہ کنعاں برید
وہ میرا غمزہ زن آیا، لو نذر جاں لاؤ | خوشا کہ یوسف گم گشتہ آیا کنعان میں
مست خراب حاجت نقل است اگر | ای جگر خام سوز را بہ نمکداں برید
دل خراب اگر چاہتا ہے نقل و گزل | تو کردو غرق جگر کو میرے نمکدان میں
نیست دل چوں منی درخور شاہین شاہ | پارہ مردار را بر سگ درباں برید
یہ دل ہے کب میرا اس شاہ باز کے لائق | تم اس کو پیش کردو بس حضور کلب درباں میں
بر در رخ از خوں نوشت خسرو دلخستہ حال | وہ ز دل ماندہ ام قصہ بہ سلطان برید
لکھا ہے خون سے خسرو نے اس کو اپنے چہرہ پر | سناؤ قصۂ دل تم حضور سلطان میں

ان کی وفات ۲۴ محرم ۱۲۳۲ھ کو قصبہ موہان ضلع لکھنؤ میں واقع ہوئی۔ نعش مبارک بلگرام لاکر ۲۷ محرم کو سپرد خاک کی گئی۔ قاضی محمد سلیم کے مزار کے پائیں ایک جداگانہ چبوترہ پر ان کا مزار ہے قطعۂ تاریخ سید محمد ؒ کے احوال میں گذر چکا ہے۔

۶۳

شاہ رحمت اللہ ؒ

آپ کا تعلق سادات حسینی واسطی بلگرامی خاندان چہچہیہ ساکن محلہ میدان پورہ سے ہے۔ آپ سلطان العاشقین اور برہان العارفین تھے۔ مجرد تھے (شادی نہیں کی) ابتداء سے ہی طلب علم میں بے قرار ہوئے اور گھر بار چھوڑ کر سید العارفین سے وابستگی اختیار کرلی۔ اور ان کے مرید ہو گئے۔ معرفت الٰہی کا جب ساغر پیا تو کیفیت وصال میں مستانہ وار نہایات وصال تک پہنچ گئے تجرد اور بے تعلقی کا راستہ اختیار کیا۔ پورا سال صرف ایک چادر، ایک ٹوپی اور ایک زیر جامہ میں بسر کرتے تھے۔ اور جامع مسجد محلہ میدان پورہ کے ایک کونہ میں

پڑے رہتے، دنیا کے مال و منال سے ایک حبہ بھی نہ لیا۔ اور تمام عمر سونے چاندی کو ہاتھ نہیں لگایا اور کبھی کسی سے کسی چیز کے سوال کے لیے لب کشائی نہ کی۔ بس مرشد کے گھر سے جو آسانی جو آذوقہ میسر آجاتا تھا اس میں سے اس قدر جو زندگی باقی رکھنے کے لیے ضروری ہوتا قبول فرما لیتے تھے۔

ابتدا میں مدہوشی اور مستی کا مشرب ان کے مزاج پر غالب تھا۔ پھر سکون کی کیفیت پیدا ہوگئی کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے ہمارے سامنے پیری، مریدی (کا مطلب) محبت ہے۔ ایک عزیز نے اس فقیر آزاد سے بیان کیا کہ میں ان کا بے حد معتقد ہوں۔ ہمیشہ عرض کرتا تھا کہ میں بیعت کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ انکار کرتے تھے ایک دن میں نے جب بے حد اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا مرید ہونے سے کیا مطلب ہے اگر یہ مقصد ہے کہ کل قیامت کے دن میں تمہارے کام آؤں تو دو حالتوں سے خالی نہیں ہے اس دن میرا حکم چلے گا یا نہیں؟ دوسری صورت میں مرید ہونا بے کار ہے۔ پہلی صورت میں ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور افسوس ہے اس دوست پر جو قدرت کے باوجود اپنے دوست کی خدمت سے باز رہے جس دن سے انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے میں نے بیعت پر اصرار نہیں کیا ہے۔ آپ حسنِ ظاہر کی جانب حد درجہ رغبت رکھتے تھے۔ اس میں انسانی حسن کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ بلکہ ہر چیز جو ان کی نگاہ کو اچھی معلوم ہوتی اس پر عاشق ہو جاتے تھے اور کہتے تھے "میر شوق من سلامت" میں جہاں نظر ڈالتا ہوں وہاں حسن نظر آتا ہے۔

زبردست خاں[1] ناظم صوبہ اودھ جب بلگرام کے راستہ گذرے۔ تو ان کے ہاتھی آپ کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ کہ ایک ہاتھی ان میں آپ کو اچھا لگا۔ اس کو دیکھتے دیکھتے سات، آٹھ کوس کا راستہ طے کر لیا فیل بانوں نے دیکھا کہ ایک فقیر ننگے پیروں الجھے بالوں والا ساتھ چلا آتا ہے۔ انہوں نے پوچھا میاں درویش کیا چاہتے ہو؟ فرمایا میں اس ہاتھی کے قریب رہ کر جی بھر کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ وہ ہاتھی مست تھا اور زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ اور بہت سے محافظ اس کے گرد چلتے تھے۔ فیل بانوں نے کہا کہ یہ ہاتھی مست ہے ممکن ہے کہ تم کو کوئی تکلیف پہونچائے فرمایا تم کو اس کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ فیل بانوں نے ہاتھی کو کھڑا کر دیا شاہ صاحب قریب بیٹھے اور جی بھر کر اس کو دیکھا۔ جو لوگ موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ ہاتھی اس وقت ایک جسدِ بے جان بنا ہوا تھا جب فیل بانوں نے یہ معاملہ دیکھا تو آپ کے ساتھ انتہائی تواضع سے پیش آئے اور اصرار کرنے لگے کہ آج کے دن ہماری قیام گاہ کو عزت بخشیں فرمایا ہمارا شوق بس اسی حد تک تھا یہ کہا اور واپس لوٹ آئے۔

جس پر بھی آپ کی نظر پڑ جاتی تھی اگرچہ وہ لوگوں میں پہلے سے منظور و مقبول نہ ہو لیکن آپ کی ایک ادنیٰ سی توجہ اسے ہر خاص و عام میں مقبول بنا دیتی۔ ایک مرتبہ ایک ایسے شخص پر دل آگیا جو انتہائی کالا کلوٹا تھا ایک مجلس میں جس میں راقم الحروف (میر آزاد بلگرامی) بھی موجود تھا ایک شخص نے اعتراض کیا کہ اس کالے کلوٹے شخص پر فریفتہ ہیں

---

[1] انہوں نے عالی مرتبت بادشاہ فردوس آشیاں سے منصب کے علاوہ سیستان کے ناظم اور فوجدار کے مرتبہ کی عزت حاصل کی تھی سنہ عالمگیر جلوس میں سنہ ... میں منصب آئے اور وہیں اسی سال وفات پائی۔ (مآثر الامرا، مقالات شعراء)۔

ابھی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ یکبارگی وہاں ظاہر ہو گئے۔ اور اعتراض کرنے والے سے فرمایا کہ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔

اپنے منظورِ نظر کے ساتھ تنہا نہیں بیٹھتے تھے۔ جب تک تیسرا آدمی موجود نہ ہو اس سے نہیں ملتے تھے چھوٹے بڑے سب ہی ان کی آزاد منشی کے عاشق تھے۔ اور عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور وہ آئینہ کی طرح ہر ایک کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ وہ مجھ پر زیادہ مہربان ہیں۔

مدہوشی کے غلبہ کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ لوگوں نے اعتراض کیا اور سید العارفینؒ کی خدمت میں (بطورِ شکایت) عرض کیا گیا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ وہ میرے بادشاہ کے ساتھ ایک پیر کے بل بیٹھے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں کہنا چاہیے شاہ صاحب موت کی بہت تمنا رکھتے تھے اور ملک الموت کو اکثر یاد کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک سانپ کو پکڑ لیا۔ ان کے ہاتھ کی "چھنگلیا" میں سانپ نے ڈس لیا لیکن زہر نے ان پر کچھ بھی اثر نہ کیا۔

ایک مرتبہ اپنے دونوں ہاتھوں میں نشتر لگایا خون نکلنے لگا یہاں تک کہ رگوں میں خون ختم ہو گیا اور بدن سفید پڑ گیا۔ متعدد بار زہر ہلاہل استعمال کیا۔ مگر چونکہ وقت نہیں آیا تھا اس لیے کوئی اثر نہیں ہوا۔

فرمایا ایک مرتبہ میں شاہ جہان پور سے بلگرام آرہا تھا جب آٹھ کنوہ کی سرحد تک پہنچا جو ایک بڑا اور مشہور گاؤں ہے تو میں نے دیکھا کہ دیہات کا ایک آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ دور سے ہی اس نے مجھ سے کہا اپنی چادر ادھر پھینک دو۔ ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اپنی چادر اتار کر اس کی جانب پھینک دی۔ اور اپنا راستہ لیا۔ دو تین دن بعد روح الامین خان بلگرامی نے جو ان دنوں صوبہ اودھ کے بعض علاقوں کے ناظم فوجداری تھے "آٹھ کنوہ" پہنچ کر سخت تباہی مچائی۔ اور وہاں کے تقریباً گیارہ سو لوگ قتل کر ڈالے۔ لوگوں نے اس واقعہ کو شاہ صاحب کی کرامت سمجھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس واقعہ کا راز یہ ہے۔ کہ میری چادر میں جوئیں بہت ہو گئی تھیں اور میں خود ان کو چادر سے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ رزاقِ حقیقی ان کو میرے جسم سے غذا پہنچاتا تھا۔ اس لٹیرے نے اللہ کی اس مخلوق کو رزق سے محروم کر کے ہلاکت میں مبتلا کر دیا۔ اور محض ایک شخص کی شامتِ اعمال سے ایک بڑی جماعت کو غیرتِ الٰہی نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ کیونکہ ہر قسم کی مخلوق ایک ہی رنگ رکھتی ہے (یکساں ہیں) اور اللہ کے انصاف کی ترازو میں ہم وزن ہیں۔ " وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم۔" اس پر دال ہے حضرات ابدال (قدس سرہم) کسی موذی کو بھی تکلیف نہیں پہنچاتے ہیں۔ اور ہر زہر والے نیش کو اپنی ذات کے لیے گوارا کر لیتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ جو تکالیف برداشت کرتے تھے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ "مقام ایوبی" میں تھے۔

ایک عزیز نے بتایا کہ شاہ صاحب اور میں قصبہ ساندی سے بلگرام آرہے تھے۔ ساندی کے باغ میں ایک چور کو مار کر ایک درخت پر لوگوں نے لٹکا دیا تھا۔ شاہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ ٹھہرو اور خود آگے بڑھ کر چور کے

پاؤں کو چوم لیا۔ میں نے پوچھا آپ نے یہ کیا کیا؟ فرمایا اس چور نے اپنے ہنر کو کمال تک پہنچا دیا ہے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس راستہ پر جس کو اس نے اختیار کیا اس چور کی طرح ثابت قدم رکھے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ ایک تقریب میں دریائے گنگا کے راستہ سے گئے۔ جو جاجموئے کے نیچے سے گذرتا ہے شاہ صاحب بھی اسی کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے دریا کے ساحل سے جہاں کنارہ بہت اونچا تھا شاہ صاحب کو کشتی میں دیکھا اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کے دریا میں کود پڑا۔ شاہ صاحب بھی دونوں ہاتھ وا کر کے دریا میں کود پڑے اور دونوں گلے مل کر دریا میں ڈوبنے لگے۔ کشتی کے لوگوں میں ایک شور مچ گیا۔ ملاح اس جگہ جلدی سے پہنچے اور ان دریائے محبت کے دوستوں کو باہر نکال کر کشتی میں لا کر بٹھا دیا۔

ایک رات بلگرام سے ملاوہ جانے کا ارادہ کیا۔ رات کے آخر حصہ میں ملاوہ پہنچے۔ چوکیداروں کے دستہ نے ان کو چور سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ اور حوالات میں بند کر دیا۔ صبح کوتوال کو اطلاع دی گئی۔ کوتوال نے ان کو طلب کیا جب جمال مبارک دیکھا قدموں میں گر پڑا اور بڑی معافی مانگی۔

ایک دن سید محمد باقر فاضل بلگرامی ایک بچہ کو شاہ صاحب کے پاس لائے۔ اور عرض کہ یہ بچہ یتیم ہے۔ اس کے حق میں دعا کریں۔ فرمایا یہ بچہ یتیم نہیں ہے۔ کیونکہ فہم اور عقلِ سلیم رکھتا ہے یتیم وہ شخص ہے جس کے پاس عقلِ سلیم فہم نہ ہو۔

آپ کی وفات کا واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ایک رات شہر میں ایک اجتماعی تقریب تھی۔ اور ہر محلہ کے لوگ ایک گھر میں جمع تھے۔ نغمہ سرائی کی ایک دلفریب اور حسن کی جلوہ نمائی کرنے والی محفل منعقد ہوئی۔ شاہ صاحب کو اس محفل میں لطفِ معشوق حاصل تھا۔ اور ان پر ایک کیفیت خاص طاری تھی۔ اچانک اٹھے اور حاضرینِ مجلس میں ہر ایک سے اس طرح رخصت ہوئے گویا بہت دور کے سفر پر جا رہے ہوں۔ لوگوں نے پوچھا تو مبہم سا جواب دیا۔ رات ہی رات میں قصبہ ملاوہ میں جو بلگرام سے چھ کوس کے فاصلہ پر ہے پہونچ گئے اور وہاں کے قاضی کے ساتھ جن سے پہلے سے ہی تعلقات تھے۔ ملاقات کی اور علی الصباح قاضی کے ہمراہ موضع فرحت نگر جو ملاوہ سے ایک کوس پر ہے تشریف لے گئے۔ ایک باغ میں جو اس موضع میں قاضی نے لگایا تھا تفریح فرمائی۔ اس باغ کا ایک پھول آپ کو پسند آگیا۔ قاضی صاحب سے ہنس کر کہا اگر میرا وقت آجائے تو اسی پھول کے پودے کے قریب مجھے دفن کر دینا۔ قاضی صاحب نے عرض کیا کہ میں آپ کے مزار پر عالی شان گنبد تعمیر کراؤں گا۔ شاہ صاحب نے اس مصرعہ کے ذریعہ قاضی صاحب کو جواب دیا۔ ؎

برسر گورِ غریباں گنبدِ گردوں بس است

اس روز سارے دن تھکان بالکل نہیں معلوم ہوئی۔ جب رات ہوئی تو قاضی صاحب سے فرمایا آج کی رات میرا وقت آجائے گا۔ کچھ رات گذری تھی کہ پیچش کی تکلیف ہوئی۔ اور دو تین گھنٹہ میں جاں بحق ہو گئے آخری سانس میں دو تین مرتبہ لفظ "حق" زبان پر آیا۔ نزع کے وقت سید عبدالوہاب بلگرامی نے پوچھا

کیا حال ہے؟ تو انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

مستِ ذوقِ عارفیم کز نغمہ توحید تو
لذت آوارہ در کام جہاں انداختہ
(عرفی شیرازی)

یہ واقعہ شب ۱۴ ربیع الآخر ۱۰۳۰ھ کو پیش آیا۔ آپ کی قبر اسی جگہ ہے (جہاں فرمایا تھا) راقم الحروف نے اس طرح تاریخ وفات کہی ہے۔

رحمت اللہ شاہ کشور دیں
یافت در عالم تقدس راہ
سال تاریخ رحلتش آزاد
گفت "مشمول رحمت اللہ"
(۱۰۳۰ھ)

۶۴

سید محمد بلگرامی قدس سرہٗ

تپکاپہیہ محلہ میدان پورہ کے سادات میں سے ہیں۔ سید العارفین کے مرید اور مشائخ مرزوقیہ کے دیکھنے والوں میں سے تھے۔ مرید ہونے سے پہلے بہت کچھ سیر و تفریح کی۔ اور بہت سے اہل دل بزرگوں کی صحبت میں پہنچے۔ اور ان سے فیوض اور برکات حاصل کیں اور کئی سال تک ایسی سخت نفس کشی کی جو جسم شکن لیکن روح پرور تھی۔ علم دعوت، تکسیر اور جعفر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک دن بیان کیا کہ ایک مرتبہ بہار کے علاقہ بھاگل پور کا میں نے ارادہ کیا۔ شہر میں داخلہ کے وقت شدید بارش ہونے لگی۔ آفتاب غروب ہونے کا وقت ہو گیا تھا۔ شہر کے قریب ہندو جوگی کا تکیہ نظر پڑا۔ اسی جگہ پناہ لینا پڑی۔ جب صبح ہوئی تو سفر کی تکلیف (اور) پیر کے چھالوں کی وجہ سے مزید ٹھہر گیا۔ بہت سے ہندو مرد اور عورتیں جو جوگی کے عقیدتمند تھے آنا شروع ہوئے اور میری نماز میں مخل ہونے لگے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے جوگی سے کہا کہ تم نے یہ کیا مکر و فریب کا جال بچھا رکھا ہے؟ جوگی نے مجھے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بحث بہت بڑھ گئی۔ جوگی نے کہا کہ چپ ہو جاؤ۔ ورنہ میں تم کو ہلاک کر دوں گا۔ میں نے اس سے کہا جو تو کر سکتا ہے کر گزر۔ اس میں دریغ نہ کر۔ جوگی تھوڑی سی شکر لے آیا۔ اور اس پر کچھ منتر پڑھ کر پھونکا اور کہا اگر تم جواں مرد ہو تو اس کو کھالو میں نے اس کے ہاتھ سے شکر لے کر کھالی۔ کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ پھر میں نے جوگی سے کہا کہ اب تم خبردار ہو جاؤ اور زمین سے چند سنگریزے اٹھا کر ان پر اللہ تعالیٰ کے اسمائے جلالی سے ایک نام پڑھ کر پھونکا۔ اور جوگی پر مارے۔ جوگی اسی دم زمین پر گر پڑا۔

ایک دن اسمائے الٰہی کی دعوت میں مشغول تھے۔ اچانک خوفناک شکل کا ایک دیو نظر کے سامنے

آگیا۔ دیو نے آپ کو ان کی جگہ سے اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد سخت قسم کی سوزش اور سینہ میں سخت تکلیف معلوم ہوئی۔ انتہائی پریشانی کی حالت میں حضرت سید العارفین قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی روئیداد بیان کرنا چاہی۔ حضرت اس وقت حقہ پی رہے تھے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ارشاد فرمایا۔ اٹھو اور حقہ کا پانی تازہ کرو (پانی بدل دو)۔ سید محمد اٹھے اور پانی کھینچنے کے لیے "ڈول" کنوئیں میں ڈالا۔ صرف ڈول بھر نکلی آواز ہی سے جو ان کے کانوں میں پہونچی، سوزش اور درد میں کمی آگئی۔ جب حقہ کا پانی تازہ کیا اور حقہ لا کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ تو صرف حقہ کی گڑگڑ سنتے ہی بقیہ سوزش اور درد بھی رفع ہو گیا۔ اس کے بعد جب حضرت سے بیعت کی عزت حاصل کی۔ تو عجیب حالت اور کیفیت کو پہونچ گئے۔ برق واسوختگی نے ان کے خرمن وجود کو جلا ڈالا۔ چنانچہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز پر ٹھوکر ماردی۔ بیوی، بچوں، یار، احباب سب سے بیگانہ ہو گئے اور ہر وقت نماز فرض، نوافل اور اوراد و وظائف میں مشغول رہنے لگے۔ اور خود کو "انوار سرمدی" میں گم کر دیا۔ جذبات کا غلبہ اس قدر بڑھ گیا کہ نغمہ کی ذراسی آواز بھی ان کو بے خود بنا دیتی تھی۔ تڑپنے لگتے اور بے چین ہو جاتے۔ موزوں آوازوں سے اس شعر کے مصداق بے خود ہو جاتے تھے۔ ؎

کسانیکہ یزداں پرستی کنند ۔ بہ آواز دولاب' مستی کنند

اور صبح سے شام تک آہ دلسوز بھرتے اور جاں گداز نعرے لگاتے رہتے۔ ایک لمحہ کو بھی آرام نہیں آتا تھا لوگ کہتے تھے کہ تعجب ہے اس کے باوجود ان کا گلا نہیں بیٹھا۔ اسی حالت میں ایک شخص جس کو بہت پہلے سے ان سے محبت تھی۔ الٰہ آباد لے گیا۔ وہاں بھی وہی پریشاں حالی اور گریہ وزاری تھی۔ وہاں سے خود ہی کالپی گئے اور آسمان ولایت کے قطبین میر سید محمد اور میر سید احمد قدس سرہما کے مزار کے پائیں حجرہ میں قیام فرمایا اور گمنامی اور خمول کے گوشہ میں بیٹھ گئے۔ لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ شورش و پریشاں حالی بڑھتی گئی یہاں تک کہ سر ایک جانب جھک گیا۔ (سر ٹھاڑ گیا) بالآخر حج کا پختہ ارادہ کیا۔ خیال غالب یہ ہے کہ میر اپنے کو حرمین شریفین کے راستہ ہی میں مار گئے۔ (وصال فرما گئے) اور یہ سانحہ سنہ ۱۱۴۲ھ میں پیش آیا۔

۶۵

سید غلام مصطفیٰ قدس سرہٗ

سید غلام مصطفیٰ ابن سید عبد اللہ، سید العارفین کے حقیقی برادر زادہ اور ان کے خاص مریدوں میں سے ہیں آپ بلند مرتبہ دلے تھے۔ فقر و درویشی کی دنیا رکھتے تھے۔ انتہائی عمدہ اخلاق کے مالک اور بہت متواضع تھے ابتدا میں کچھ زیادہ علم ان میں نہیں تھا۔ نوجوانی کے زمانہ میں توفیق بخشنے والے نے ان کی رہنمائی فرمائی، اور

ظاہر و باطن کی تہذیب کا کمال حاصل کیا اور سید العارفین قدس سرہٗ کے ہاتھ پر توبہ کی اور ان کے مرید ہوئے۔ نفس کشی اور ریاضت کے راستہ پر قدم آگے بڑھایا۔ اور کمال کی مرزبان پر قدم رکھ کر تکمیل کی چوٹی پر پہنچ گئے سپاہ گری آپ کا بظاہر ذریعہ معاش تھا۔ اور اسی طرح سیر فی اللہ کے شبدیز کو جولان رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ ولایت کا نشان ان کی پیشانی سے ظاہر تھا۔ اس لباس میں بھی لوگ ان کے بے حد گرویدہ تھے اور ان سے عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے۔ راقم الحروف (آزاد بلگرامی) کے حال پر خاص شفقت و مہربانی کرتے تھے اور اپنے اشعار اکثر مراسلات میں تحریر فرمایا کرتے تھے بسال ۱۱۳۶ھ میں مؤلف اوراق (آزاد بلگرامی) دار الخلافہ شاہجہان آباد میں حضرت علامی میر عبد الجلیل بلگرامی کے سایہ عاطفت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ مشار الیہ (سید غلام مصطفیٰ) اس وقت نواب مبارز الملک سر بلند خان تونی کی ملازمت کے تعلق سے وہاں تشریف لائے۔ اور مثنوی ترجمان اسرار قیومی مولانائے رومی قدس سرہ کی سند حضرت علامی قدس سرہٗ سے حاصل کی۔ اسی زمانہ میں نواب مذکور کو بارگاہِ شاہی سے صوبہ گجرات (احمد آباد) کا ناظم بنایا گیا۔ مشارٌ الیہ (سید غلام مصطفیٰ) نواب کی ہمراہی میں وہاں گئے اور جب گجرات کی حکومت نواب سے واپس لے کر راجہ ابھئی سنگھ ولد راجہ اجیت سنگھ حاکم قلعہ مارواڑ کو دی گئی تو نواب اور راجہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور شہر احمد آباد میں دونوں کے درمیان سخت جنگ واقع ہوئی۔ مشارٌ الیہ (سید غلام مصطفیٰ) اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ اور احیاء عند ربہم یرزقون (یعنی زمرہ شہداء) کے سلسلہ میں شامل ہو گئے۔

یہ واقعہ ۱۱۴۳ھ میں ۸ ربیع الاول کو پیش آیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد تمام شہیدوں کے جسم میدان جنگ میں پائے گئے۔ لیکن سید غلام مصطفیٰ کا کوئی نشان انتہائی تلاش کے بعد بھی نہ مل سکا۔ شہادت سے چند روز پہلے انہوں نے ایک رباعی کہی تھی جس میں انہوں نے اپنے آیندہ کے حال کی اطلاع دی تھی۔ رباعی یہ ہے۔

در خلوت ما ورائے ما بارے نیست — یعنی کہ بہ عرش و فرش اغیارے نیست
ما روئے مجردیم ز آرائش مرگ — ما را بجنازہ و کفن کارے نیست

اس جنگ میں سید نجابت نے بھی شہادت کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ سید نجابت، سید غلام مصطفیٰ کے حقیقی برادر بزرگ تھے۔ اور سید العارفین قدس سرہٗ کے مرید۔ تقویٰ اور راستی کے زیور سے آراستہ و پیراستہ تھے اپنے ہم عصر دلاوروں میں ممتاز تھے۔ متعدد جنگوں میں شریک ہوئے۔ راقم السطور کہتا ہے سے

چوں میر نجابت بہ شہادت برسید — ویں بادۂ غلام مصطفیٰؐ نیز چشید
از ہاتف غیب خواستم تاریخے — فرمود شدند ہر دو ہمراہ شہید

۱۱۴۳ھ

۶۶

سیّد فرید الدین قدس سرہٗ

سیّد فرید الدین عرف سیّد بدل بن سیّد خواجہ معین الدین بن سیّد عبد الوہاب بن سیّد اجمل بلگرامی (قدس سرہم) جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ اپنے زمانہ کے پیشوا تھے اور بڑے عالم اور پارسا تھے خصائلِ ستودہ اور اوصافِ پسندیدہ کے مالک تھے۔ مشارٌ الیہ (سیّد فرید الدین) اور سیّد ضیاء اللہ بلگرامی کے صاحبزادہ میر سیّد قادری دونوں نے ایک ساتھ شیخ احمد عرف مُلّا جیون امیٹھوی طابَ ثراہ سے تحصیل علوم کی۔ اس کے بعد شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے درس میں پہنچے۔ اور بقیہ کتابیں پڑھیں سیّد فرید الدین نے شیخ کی خدمت میں فراغت حاصل کی۔ اور سیّد قادری نے تھوڑا پڑھ کر چھوڑ دیا۔ سیّد فرید الدین تحصیل علوم سے فراغت کے بعد شیخ جنید عرف شیخی میاں بن شیخ عبد الواحد بن شیخ شبلی بن شیخ سری سقطی بن شیخ محمد بن شیخ نظام الدین[1] امیٹھوی قدس سرہم کے مرید ہو گئے۔ اور سیّد قادری کے ساتھ حرمین شریفین کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اور اس سعادت (حج و زیارت) کے حصول کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ لیکن "بندر سورت" پہنچ کر وہیں مقیم ہو گئے۔ اور درس و تدریس اور اطاعتِ الٰہی میں زندگی بسر کرنے لگے۔

بارہویں صدی ہجری کے تیسرے عشرہ (سنہ ۱۱۰۰ھ) میں عقبیٰ کا جانب سفر فرمایا۔ اور اسی شہر میں مدفون ہوئے بہت سی درسی کتابیں، مختصرات اور مطولات ان کی تصحیح شدہ اور محشیٰ بلگرام میں موجود ہیں۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔

۶۷

سیّد قادری بلگرامی قدس سرہٗ

نام نامی سیّد ہے اور طریقت کے اعتبار سے قادری ہیں صاحب عرفان اور کاشف حقیقت تھے بڑے خدا شناس

---

[1] ابن محمد حسین بن فخر الدین بن ابی الفضل بن تاج الدین عثمانی امیٹھوی سلسلہ چشتیہ کے بڑے مشائخ میں تھے شیخ سری سقطی (ابو الحسن) کی اولاد میں تھے مکتب کی تعلیم شیخ معروف بن عبد الواسع جونپوری (سنہ ۹۴۳ھ) سے حاصل کی جو مولانا الہداد شارح کافیہ کے مرید تھے۔ طریقت کی تعلیم شیخ نور بن حامد الحسینی سے حاصل کی۔ ملا عبد القادر بدایونی نے ان کی وفات سنہ ۹۶۹ھ میں لکھی ہے (تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر، اخبار الاخیار، المنتخب بدایونی اور تاریخ قصبہ امیٹھی از شیخ خادم حسین) ان کے فرزند شیخ محمد بھی بزرگی اور تقویٰ میں مشہور ہیں (سنہ ۱۰۱۱ھ) میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر)۔

اور ظاہری اور باطنی بزرگی کے مالک تھے۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ بچپن ہی میں اپنے والد سید ضیاء اللہ بلگرامی کی خدمت میں (جن کا تذکرہ دوسری فصل میں آئے گا) قرآن مجید حفظ کیا۔ تجوید سیکھی اور ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد جیسا کہ اس سے قبل بیان ہوا سید فرید الدین بلگرامی کیساتھ ملا جیون امیٹھوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اس کے بعد شیخ غلام نقشبند؁ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ اور بقیہ درسی کتابیں انہیں سے پڑھیں۔ اور فراغت کا شرف ان سے حاصل کیا۔ لیکن رسم فراغت کے پابند نہ ہوئے کچھ کتابیں ابھی باقی رہ گئی تھیں۔ اس وقت توفیق الٰہی نے ان کو حرمین شریفین (زادا اللہ شرفاً و تعظیماً) کی طرف عازم کر دیا تین مرتبہ فریضہ حج ادا کیا۔ اور مدینہ طیبہ کی زیارت کی۔ وہاں سے کربلائے معلی اور بغداد کرامت آباد روانہ ہوئے تھے راستہ میں ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تلواروں کے بہت سے زخم آئے اور تمام ساز و سامان لٹ گیا اس علاقہ کے بعض بدو۔ آپ پر رحم کھا کر اپنے قریہ میں لے گئے۔ اور وہاں ان کی تیمارداری کی۔ زخم بھر جانے کے بعد کربلائے معلی روانہ ہوئے۔ سبط شہید کے مزار کی زیارت کی عزت سے مفتخر ہوئے اور آخرت کی سرخروئی حاصل کی۔

یہاں سے فراغت کے بعد دار السلام بغداد تشریف لے گئے۔ اور ۱۱۱۸ھ میں دار السلام پہنچ کر کچھ دنوں آرام کیا۔ وہاں کے بابرکت مزارات خصوصاً حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کی۔

پھر قریۂ حماۃ کی جانب روانہ ہوئے اور سید لیسین حموی صاحب سجادہ غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایسی عزت حاصل کی جس پر ناز کیا جا سکتا ہے اور ان کے مرید ہو گئے۔ صاحبزادہ گرامی قدر نے انتہائی قدر شناسی سے ان کی آمد پر اظہار مسرت کیا اور خانقاہ شریف میں قیام کے لیے جگہ دے دی۔ خلافت خرقہ اور غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ کے بعض تبرکات عطا فرمائے۔ ان کا سلسلۂ ارادت اس طرح ہے۔

اخذ السید قادری الطریقۃ القادریہ عن شیخہ السید لیسین و ہو من والدہ السید عبد الرزاق و ہو من والدہ السید شریف الدین و ہو من ابن عمہ السید جلال الدین و ہو من ابن عمہ السید شہاب الدین احمد[1] و ہو من والدہ السید قاسم و ہو من ابن عمہ السید عبد الباسط و ہو من والدہ السید شہاب الدین ابو العباس و ہو من والدہ السید نور الدین حسن السید جمال الدین عبد اللہ و ہو من ابن عمہ السید شمس الدین ابو الوفا و ہو من شقیقہ السید شہاب الدین ابو العباس و ہو من والدہ السید بدر الدین حسن و ہو من السید علاؤ الدین علی و ہو من والدہ السید شمس الدین محمد و ہو من والدہ السید شرف الدین یحیی و ہو من والدہ السید شہاب الدین احمد و ہو من والدہ السید عماد الدین ابی صالح نصر و ہو من والدہ جمال الدین السید عبد الرزاق و ہو من والدہ القطب الربانی الشیخ عبد القادر جیلانی قدست اسرارہم۔

سید قادری حماۃ سے واپس بغداد آئے اور ایک عرصہ تک روضۂ مقدسہ کی مجاوری کرتے رہے۔

---

[1] یہاں سے سقوط ہے یعنی جمال الدین و ہو من والدہ السید عبد الرزاق۔

علم تجوید مولانا سلطان بن ناصر[1] بن احمد قدس سرہٗ سے حاصل کیا۔ کتاب شاطبی بھی مولانا سے پڑھی سند علم تجوید اور سند صحاح ستہ اور تمام مفردات، تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ تمام علوم مولانا سے حاصل کیے۔ اجازت کی سند سلسلہ وار تشریح کے ساتھ اور تمام کتب کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے اس اجازت نامہ میں مذکور ہیں طریقہ رفاعیہ اور شاذلیہ بھی مولانا سلطان خابوری قدس سرہٗ سے حاصل کیا۔ دونوں طریقوں کا شجرہ ان کے اجازت نامہ میں درج ہے۔ مولانا سلطان قدس سرہٗ اجازت نامہ کی ابتداء میں حمد و صلوٰۃ کے بعد فرماتے ہیں۔

(ترجمہ عربی عبارت)

امام عالم، بزرگ کامل، دانش مند، متقی، پرہیزگار، عابد اور اسلاف کی نشانی آنے والی نسلوں کیلئے نمونہ، پیروی کیے جانے والے اماموں میں منتخب ہدایت کے ستاروں میں برگزیدہ صاحب حسب و نسب مالک اخلاق مرضیہ آثار سنت نبوی کے متقفی سید محمد قادری ابن سید ضیاء اللہ حسینی واسطی ہندی بلگرامی حنفی اللہ نے ان کو اپنی مہربانیوں سے توفیق عمل بخشی جب ۱۱۵۱ھ میں دارالسلام بغداد میں تھے۔ اور غوث صمدانی قطب ربانی سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ العزیز کے حرم کے مجاور تھے۔ تب انہوں نے اس شکستہ عاجز بندہ سے کتاب شاطبیہ پڑھی۔ جس کو انہوں نے بحث و اتقان اور امعان نظر کے ساتھ پڑھا۔ پھر ان کو اپنے گھر کے لوگوں اور دوستوں کے دیکھنے کے شوق نے یہاں رہنے نہ دیا۔ اور وہ یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ اس نے جن مصنفین کو پڑھا ہے ان کے حال و انساب سے پورا پورا اعتنا برتے اور جو کچھ ان سے اخذ کیا ہے اس کی بھرپور معرفت حاصل کرے۔ اور ان کے شیوخ سے آگہی حاصل کرے۔

اس سلسلہ میں یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی شخص پر لفظ "محدث" کا اس وقت تک اطلاق نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ "مقام حدیث" اور اس کے رواۃ کے احوال سے واقف نہ ہو۔ اور وہ اپنے سے بلند مرتبہ کم رتبہ اور اپنے ہم سر سے حدیث کو قبول کرے۔ بنابریں جب اس بندہ فقیر سے اس کے آقا و مولا تبحر علمی کے مالک سید محمد قادری نے (اللہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے اور ان کو ان کے مناسب جزا عطا فرمائے) ائمہ معتبرین سے حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ میں روایت کرنے کی اجازت طلب کی تو میں نے ان کی درخواست کو قبول کر لیا اور میں ان کے لیے خلوت و جلوت میں دعا گو ہوں (انتہیٰ)

اور مولانا سلطان قدس سرہٗ نے اسی اجازت نامہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے۔

"اور تحقیق کہ میں نے سید محمد قادری مذکور کو اجازت دی مذکورہ کتابوں میں۔ اور جو کچھ ان اوراق میں ہے اس کی روایت کی اجازت دی اور شیخ ابوالحسن شاذلی قدس سرہٗ کے اوراد اور احزاب کی بھی اجازت دی سائل

[1] الخابوری متوفی ۱۱۳۰ھ۔ بغداد کے بڑے علماء میں سے تھے۔ الخابور ایک بڑا قبیلہ ہے جو نہر خابور (فاتہ غربی) کے کنارہ پر آباد ہے۔ دو تحریریں ان کی یادگار ہیں (۱) قرأت سبع اور (۲) نحو میں اعلام۔

سید محمد قادری کو اجازت ہے کہ وہ ان تمام اوراد و وظائف کی تلقین کریں اس کے طالبوں اور دوسرے بھائیوں کو جس وقت جس جگہ اور جس طرح بھی چاہیں لیکن طالب کی اہلیت دیکھ کر (اللہ ان کو اچھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور مجھ فقیر سلطان بن ناصر بن احمد کو خابور جس کا وطن ہے جو بغداد کے توابع سے ہے۔ جبوری قبیلہ کا ایک فرد ہے شافعی مسلک رکھتا ہے۔ اشعری کا معتقد ہے اور طریقت میں قادری رفاعی شاذلی مسلک رکھتا ہے اپنی خلوت اور جلوت کی نیک دعاؤں میں نہ بھولیں۔ عافیت اور خاتمہ بخیر کے ساتھ اور اللہ ہی کے لیے تعریف ہے اور سلام ہے اس پر جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے)۔

نیز مولانا سلطان قدس سرہٗ نے اسی رسالہ میں یہ بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

"اور تحقیق کہ میں نے "شرح عقود الجوہرہ" واللآلی علی القواعد المقررہ والفوائد المحررہ کی بھی اجازت دی جو شیخ محمد بقری[1] کی تصنیف ہے (عربی عبارت کا ترجمہ ختم ہوا)۔

مختصر یہ کہ سید محمد قادری لامحدود برکتوں کے ساتھ ہندوستان واپس لوٹے اور کچھ دنوں دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں قیام فرمایا۔ اور طالبوں کی ہدایت و رہنمائی میں مشغول ہو گئے۔ بہت سے لوگ آپ کے سلسلہ میں داخل ہوئے بالآخر ملگرام تشریف لائے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ نماز کے اوقات کے علاوہ گھر سے بہت کم نکلتے تھے نماز پنجگانہ محلہ کی جامع مسجد میں ادا کرتے۔ اور امامت فرماتے تھے قرآن پاک بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ہندوستان اور یمن کے لوگ سمندر کے راستہ بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے جاتے ہیں تو بیچ سمندر میں "یلملم" کے مقابل احرام باندھتے ہیں حالانکہ جدہ سے بھی احرام باندھنا درست ہے۔ سمندر میں احرام کی تکلیف اٹھانا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص بھی میقات کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے مکہ معظمہ کا قصد کرے وہ میقات کے محاذ میں احرام باندھے۔ اور محاذات کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ سے احرام باندھا جائے۔ وہاں سے مکہ معظمہ تک کی مسافت، میقات اور مکہ کے درمیان کی مسافت کے برابر ہو۔ یلملم ہندوستانیوں اور یمن والوں کی میقات ہے اور ثبوت کو یہ بات پہنچ چکی ہے کہ جدہ اور مکہ کے درمیان کی مسافت اسی قدر ہے جتنی یلملم اور مکہ کے درمیان ہے اور سمندر میقات سے باہر تو سمندر میں احرام کا باندھنا کہاں ضروری ہے۔؟

جس وقت میں نے یہ مسئلہ سنا میرے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ میں ان سے پوچھوں کہ کس کتاب سے یہ بات ارشاد فرما رہے ہیں (لیکن دریافت نہ کر سکا) اب جبکہ یہ کتاب زیر تالیف ہے اور میں اس مقام پر پہنچا تو

---

[1] شیخ محمد قاسم بن اسمٰعیل بقری شناوی (۱۰۱۸ھ تا ۱۱۱۱ھ) اپنے عہد کے شافعی علمائے کبار میں آپ کا شمار تھا۔ ان کی نسبت نزلۃ البقر یا دار البقر کی جانب ہے جو مصر کے دیہاتوں سے ایک دیہات ہے کتاب غنیۃ الطالبین معروف بہ مقدمۃ البقری علم تجوید میں۔ فتح الکبیر المتعال آیات کی بعض مشکلات کے حل میں۔ قواعد المقررہ فی قواعد القراءۃ السبعہ اور عمدۃ السنیہ علم تجوید میں ان کی یادگار ہیں۔

یہ مسئلہ تحفہ شرح منہاج میں جو شیخ ابن حجر مکی[1] کی تصنیف ہے بے غبار ہے۔
تحفہ کے الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

لوجاوز المیقات یمنۃ اویسرۃ ای لا الی جہۃ الحرم فلہ ان یؤخر احرامہ لکن بشرط ان یحرم من محل مسافۃ الی مکۃ مثل مسافۃ ذلک المیقات قالہ الماوردی وجزم بہ غیرہ وبہ یعلم ان الجائی من الیمن فی البحر لہ ان یوخر احرامہ عن محاذاۃ یلملم الی جدۃ لان مسافتہا الی مکۃ کمسافۃ یلملم کما صرحوا بہ بخلاف الجائی فیہ من مصر لیس لہ ان یوخر احرامہ عن محاذات الجحفۃ لان کل محال من البحر بعد الجحفۃ اقرب الی مکۃ منہا۔

سید قادری نے ۱۹ ربیع الاول شب پنجشنبہ ۱۱۴۵ھ کو وصال فرمایا۔ قبر شریف حویلی نشست گاہ میں ہے راقم الحروف نے اس طرح تاریخ وفات کہی ہے:

رحل القادری سیدنا — صاحب الکشف والکرامات
الہم الحق عام رحلۃ — إنّ للمتقی لجنات

۱۱۴۵ھ

ان کے احفاد میں سید محمد مقتدیٰ[2] بن سید محمد بن سید قادری مذکور ہیں۔ انہوں نے عربی کی کتب متداولہ پڑھیں اور بچپن ہی میں حرمین شریفین کی توفیق حاصل ہوئی۔ ۱۱۶۳ھ میں یہ سعادت حاصل کی۔ اور مقامات مقدسہ میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا۔ اس زمانہ میں زبید میں مقیم ہیں۔ شیخ عبدالخالق[3] زبیدی سے فن حدیث کی سند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں اور اضافہ کرے۔ اور دینی ترقی عطا فرمائے۔

---

[1] تحفۃ المحتاج فی شرح المنہاج تصنیف ابن حجر مکی"۔ تفصیلات شافعیہ میں اور مصنف منہاج (منہاج الطالبین) امام محی الدین ابن زکریا ابن یحیٰی بن شرف النووی الشافعی (۶۷۶ھ) میں اور یہ کتاب "المحرر" کی مختصر ہے جو تفصیلات شافعیہ میں امام ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد الرافعی القزوینی (۵۰۰ لغایۃ ۶۲۳ھ) کی تالیف ہے (کشف الظنون) اور شیخ عبدالکریم قزوینی علماء شافعیہ میں بہت بڑے عالم ہیں۔ تفسیر وحدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ اور رافعی، رافع بن خدیج صحابی سے ان کو نسبت ہے صاحب تالیفات ہیں۔ التدوین فی ذکر اخبار قزوین، الایجاز فی اخطار الحجاز، المحرر، فتح العزیز فی شرح الوجیز مصنفہ امام غزالی، مسند الشافعی، الامالی الشارحہ لمفردات الفاتحہ، سواد العینین در مناقب احمد رفاعی۔ ان کی تالیفات میں (فوات الوفیات مفتاح السعادات، معجم المطبوعات، ہدیۃ العارفین، طبقات الشافعیہ، کشف الظنون)

[2] یعنی مرتضیٰ زبیدی بلگرامی صاحب، تاج العروس، شرح قاموس (تقصار)۔

[3] بن الزین بن محمد باقی المزجاجی (یہ نسبت وادیٔ زبید کے ایک دیہات مزجاج کی جانب ہے) اتحاف البشر فی القراءۃ الاربعۃ عشر، اُن کی تالیف ہے۔

۶۸

میر طفیل محمد بلگرامی قدس سرہٗ

دریائے معقول و منقول کے مرکز اتصال ، آفتاب فروع و اصول کے مطلع تاباں ترک دنیا اور تجرد و تفرید میں یگانۂ زمانہ خصائل پسندیدہ اور شمائل حمیدہ میں یکتا و بے مثل میر طفیل محمد بلگرامی آپ کے والد سید شکر اللہ طالب شاہ نے لڑکپن ہی میں سید سعد اللہ بلگرامی کے حلقۂ ارادت میں داخل کرا دیا تھا ۔ آنجناب نے اسی نسبت کو کافی سمجھا اور آغازِ شعور سے ہی تفرید و تجرید کے طریقہ اور تعلقات دنیوی سے علیحدگی پر مداومت فرمائی ۔ آپ کی اصل ضلع آگرہ کے شہر اترولی کے معزز سادات سے ہے ۔ اسی جگہ ، ذی الحجہ ۱۰۸۳ھ کو منزل عدم سے وجود کی انجمن میں جلوہ فرما ہوئے ۔ سات سال کی عمر میں اپنے چچا سید احسن اللہ نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ اترولی سے دارالخلافہ شاہ جہان آباد تشریف لے گئے ۔ اور عربی کا پہلا سبق بڑی آرزو سے حضرت سید حسن رسول نما کی خدمت میں پڑھا ۔

ابن حاجب کی کافیہ کی شرح المعروف بہ شرح مُلّا جامی ؒ تک عم بزرگوار کی خدمت میں پڑھی ۔ اور پندرہ سال کی عمر میں بسال ۱۰۹۸ ہجری حصول علم کے لیے اترولی سے بلگرام تشریف لائے ۔ مختصرات پہلے میر سید مربی بلگرامی کی خدمت میں اور پھر اپنے پیر سید سعد اللہ قدس سرہٗ سے پڑھیں ۔ متوسطات قاضی علیم اللہ لکھنوری اور بعض اکبر آباد کے علماء سے پڑھیں ۔ منتہیات مولوی سید قطب الدین شمس آبادی کے درس میں ختم کیں ۔ آپ طلباء میں اپنی نکوئی طبع ، کثرتِ مطالعہ اور تحقیق و تجسس کی وجہ سے بہت مشہور و ممتاز تھے ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جو کتاب خود پڑھتے وہ شاگردوں کو بھی پڑھاتے تھے ۔ قوتِ فہم اس قدر زیادہ تھی ۔ کہ فرماتے تھے کہ اس وقت جب میں اور علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی ؒ اکبر آباد گئے ۔ اور نواب فضائل خان کی مجلس میں پہلی مرتبہ باریاب ہوئے تو نواب کے حضور میں علماء کی ایک جماعت بھی موجود تھی ۔ اتفاقاً ایک علمی گفتگو کے دوران نواب کی زبان سے نکلا کہ آیت کریمہ وعلی الذین یطیقونہٗ فدیۃ طعام مسکین (بقرہ) میں مفسرین نے نفی کے معنی " یطیقونہٗ " میں مقدر سمجھے ہیں یعنی جن کو روزے کی طاقت نہیں ہے ۔ فقیر کو کھانا کھلائیں میرے دل میں اس وقت اس سلسلہ میں ایک نکتہ پیدا ہوا ۔ کہ بغیر "لا" کو مقدر سمجھے ہوئے " یطیقونہٗ " میں خود معنی سلبی (نفی) موجود ہیں ۔ یعنی " یطیق " باب افعال سے ہے اور ہمزۂ " افعال " سلب کے لیے آتا ہے پس یطیقونہٗ " لا یطیقونہٗ " کے معنی میں ہے ۔ لوگوں نے نواب صاحب کی توجیہ پر بڑی تعریف کی ۔ میں نے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو بندہ ایک بات عرض کرے ۔ نواب صاحب نے اجازت مرحمت فرمائی ۔ میں نے کہا یہ توجیہہ بے حد مستحکم ہے ۔ بشرطیکہ سلبی معنی " اطاقت " میں مراد لیے گئے ہوں ۔ کیونکہ سلب کا ہمزہ

باب افعال میں سماعی ہے۔ قیاسی نہیں ہے۔

تفسیر کبیر[1] امام فخرالدین رازی و تفسیر کشاف[2] و بیضاوی اور دیگر تفاسیر اور لغت کی کتابوں میں مثلاً صحاح جوہری اور قاموس وغیرہ ملاحظہ فرمائیں کسی جگہ سلبی معنی اس مادہ میں نہیں آئے ہیں۔ نواب نے انصاف کی داد دی اور کہا تمہارا اعتراض بجا ہے۔ اور نواب صاحب نے میرے ساتھ بہت التفات اور گرم جوشی کا اظہار فرمایا۔ اور مجھے اور علامہ مرحوم کو اپنی صحبت و رفاقت میں قبول فرمالیا۔

حضرت فرماتے تھے۔ کہ یہ گفتگو ابتدائے تعلیم کی ہے۔ اس کے بعد جب دوسری تفسیروں پر عبور حاصل ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ شمس الائمہ کی یہ رائے ہے کہ اطاقت کا ہمزہ سلب کا ہمزہ ہے۔ بعض علماء انکی توجیہ کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ اور بعض علماء ان پر اعتراض کرتے ہیں۔ آنجناب تعلیم مکمل کرکے بلگرام میں مقیم ہو گئے شروع میں سید محمد نعیض زمیندار کے گھر میں جو سادات بلگرام میں ایک بزرگ شخصیت تھے قیام فرمایا۔ اس کے بعد تقریباً تیس سال دم بازپسیں تک علامہ مرحوم میر عبدالجلیل نور اللہ مرقدہ کے دیوان خانہ محلہ میدانپورہ میں مقیم رہے۔ اور بلگرام کے زمانہ قیام میں کبھی گجرات، شاہ دولہ اور کشمیر اور دوسرے شہروں میں سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن ہر بار جلدی واپس آجاتے۔ بہت پاکیزہ وضع۔ نزاکت اور عزت و وقار کے ساتھ زندگی گذاری۔ پاکیزہ زبان شیریں بیان تھے۔ عقل کے محکم اور رائے کے پختہ تھے۔ ظرافت سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ ان کی محفل میں ہر شخص باریاب ہو سکتا تھا کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ آداب صحبت سے بہت زیادہ بہرہ ور تھے۔ با ایں ہمہ اس کے بہت زیادہ خواہاں و فریفتہ تھے۔ تقریباً ستر سال تک تدریس کی مسند پر احیاءِ علوم میں مشغول رہے اور طلبہ کو شاگردی کی پستی سے نکال کر استادی کی بلندی پر پہونچاتے رہے۔ شہر کے سب چھوٹے بڑے۔ آپ کے عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے۔

اس کتاب میں آنجناب کو میں نے "استاد المحققین" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ماہ صفر [illegible]ھ میں بمقام اورنگ آباد (خجستہ بنیاد) فقیر کو بخار آگیا۔ اور علالت نے طول کھینچا۔ ایک رات بستر پر کمزوری کے عالم میں نیند آگئی آنجناب خواب میں تشریف لائے فرمانے لگے اے فلاں! تو نے بہت درد سر برداشت کیا۔ کل انشاء اللہ بخار اتر جائے گا۔ خاطر جمع رکھو۔ آخر شب خواب سے میں بیدار ہوا۔ اور اس آرام بخش بشارت سے میں نے مزاج میں کچھ آرام محسوس کیا۔ اس وقت ملہم غیبی نے یہ رباعی دل میں القا فرمائی ؎

کس را خبرے نیست چہ آید فردا | نیرنگیٔ قدرت چہ نماید فردا
نومید مشو ز مژدۂ عالم غیب | شب حاملہ است تا چہ زاید فردا

فرماتے تھے کہ نفس کی شکست انسان کی معراج ہے۔ اور فرماتے تھے کہ میں نے ایک خاص

[1] محمد عمر المعروف بہ فخرالدین رازی (۵۴۳ھ تا ۶۰۶ھ) مشہور کتابوں کے مولف ہیں آپ کی تفسیر مفاتیح الغیب کے نام سے مشہور ہے اس کو تفسیر کبیر بھی کہتے ہیں (طبقات الشافعیہ البدایہ والنہایہ، لسان المیزان، الوفیات) [2] الکشاف عن حقائق التنزیل علامہ زمخشری (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بات ایک عام شخص کی زبان سے سنی ہے کہ کسی وقت بھی دل سے محو نہیں ہوئی۔ ایک دن دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں ایک گلی سے گذر رہا تھا۔ خاکروبوں کا ایک مجمع کسی خاکروب کی شادی میں ایک مکان میں جمع تھا، اور ایک بھاٹ اُس قوم کی تعریف کر رہا تھا۔ اس کا ایک جملہ میرے دل پر اثر کر گیا۔ اس کا حاصل کلام یہ تھا کہ تم لوگ آخرت میں بہترین لوگ ہو گے۔ اس لیے کہ قیامت کی میزان میں کوئی صحیح عمل شکستِ نفس سے زیادہ وزنی نہیں ہے اور یہ صفت تمہارے اندر بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

فرماتے تھے کہ ایک شخص نگرام کا حاکم تھا، اور خاصہ علمی ذوق رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ فرض کفایہ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ کہ اگر ایک آدمی کوئی کام کرلے تو سب کے اوپر سے یہ ذمہ داری ہٹ جاتی ہے۔ ورنہ سب کے سب گنہ گار۔ میں نے کہا یہ بالکل ظاہر ہے۔ جیسے تم کسی دیہات میں جاتے ہو اگر اس جگہ کا کوئی ایک آدمی تمہارے سامنے آکر اظہار فرمانبرداری کرتا ہے تو سب محفوظ ہوتے ہیں ورنہ سب پکڑ لیے جاتے ہیں۔

فرماتے تھے کہ ایک طالب علم میرے پاس فقہ کی کتاب ہدایہ پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی ہدیہ کے طور پر کوئی ضرورت کی چیز یا شیرینی میرے لیے لاتا تھا۔ شہر کے سنار آکر کہتے تھے کہ آپ کا فلاں شاگرد کیمیا ساز ہے اکثر اوقات ہمارے پاس چاندی فروخت کرنے کے لیے لاتا ہے۔ میں نے یہ بات کبھی اس طالب علم کے سامنے نہیں کی۔ یہاں تک کہ ایک روز وہی طالب علم میرے پاس آیا۔ اور اس نے مجھ سے رخصت چاہی۔ اور خود بخود کہنے لگا کہ میں کیمیا ساز ہوں۔ اور میرا استاد کوہ "سوالک" میں رہتا ہے۔ اس نے مجھ کو عمل قمری بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ سات سال بعد عمل شمسی بھی بتاؤں گا۔ وعدہ کا وقت آپہونچا۔ چاہتا ہوں کہ کوہ "سوالک" استاد کے پاس اب پہونچ جاؤں۔ اور عمل شمسی بھی حاصل کروں۔ میں نے کہا کہ تم عمل نقرہ ہی سے ساری دنیا کی چاندی حاصل کر سکتے ہو۔ اس قدر سخت اور دور دراز راستہ اختیار کرنا اور خود کو مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو؟ اس نے میری نصیحت پر بالکل توجہ نہیں دی۔ اور اپنے مضبوط ارادہ پر قائم رہا۔ (اور کہا کہ) آپ کا حق استادی مجھ پر بہت زیادہ ہے۔ اس کے عوض میں آپ کی یہ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ عمل میں آپ کو بتا دوں۔ اس نے بہت ہی زیادہ اصرار کیا لیکن میں انکار کرتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا کہ میں یہ عمل آپکے سامنے کرتا ہوں۔ تاکہ یہ خیال پیدا نہ ہو کہ میری یہ بات صرف دعوی ہی دعوی ہے۔ وہ تھوڑی سی آگ لایا۔ اور بوتہ (وہ برتن جس میں چاندی سونا گلاتے ہیں) میں تھوڑا سا پارہ (سیماب) ڈال دیا اور تھوڑی سی خاک جو کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ نکال کر اس پارہ پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر) ان کی تالیفات میں متعدد کتابیں یادگار ہیں۔ اساس البلاغۃ (لغت) المفصل (اعراب) الفائق (غریب الحدیث) اعجب العجب فی شرح لامیۃ العرب وغیرہا۔ مولف نے اس تفسیر میں مذہب اعتزال کی تائید کی ہے اور صوفیہ پر سخت اعتراض کیا ہے۔ (وفیات الاعیان، ارشاد الاریب، لسان المیزان، ترجمۃ الاولیاء، الجواہر المضیئۃ، آداب اللغۃ، مفتاح السعادۃ، معجم المطبوعات والتاج)۔

ڈال دی۔ فوراً چاندی کی تکیہ بن گئی۔ اس کے بعد وہ طالب علم رخصت ہو کر چلا گیا، اور پھر واپس نہ آیا۔

آنجناب نے ۲۴ رذی الحجہ سنہ ۱۱۵۱ھ کو وصال فرمایا۔ اور وصیت کے مطابق باغ محمود میں علامہ مرحوم میر عبد الجلیل بلگرامی نور اللہ مضجعہ کے مزار سے متصل جانب مشرق مدفون ہوئے۔ مؤلف اوراق (آزاد) کہتا ہے۔

افسوس کہ آفتاب معنی　　　　از حلقہ آسماں بروں رفت

سنہ ۱۱۵۱ھ

تاریخ وصال او خرد گفت　　　　علامہ از جہاں بروں رفت

وہ بلگرام کے نامور علماء کی نشانی تھے۔ ان کی برکتیں تمام شہر خصوصاً علامہ مرحوم کے اہل بیت کے شامل حال تھیں۔ جیسا کہ ابو الطفیل صحابی رضی اللہ عنہ روئے زمین کے تمام صحابہ میں سب سے آخری صحابی ہیں جنہوں نے سنہ ۱۰۲ھ میں مکہ معظمہ میں وصال فرمایا۔ اسی طرح آنجناب بلگرام کے آخری علمائے سلف میں سے تھے۔ جنہوں نے اس دار فانی سے گلستان باقی کی طرف کوچ فرمایا۔

راقم الحروف اور میر محمد یوسف جن کا ذکر فصل ثانی میں کیا جائے گا، ان ہی صاحب فیض کے تربیت یافتہ ہیں۔ میر محمد یوسف نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور منزل آخری تک پہونچایا۔ بندہ نے اسی سال وصال مبارک کے مہینہ ذی الحجہ میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اور تمام مقامات بابرکت میں پاک وصاف دعاؤں سے زبان کو تر کیا اور ایک عمرہ ان ہی کے نام نامی سے ادا کیا۔ اور انتقال کی خبر سننے کے بعد عربی زبان میں ایک مرثیہ تحریر کیا اس کتاب میں وہ قصیدہ حضرت شیخ عبد الحق دہلوی قدس سرہٗ کی اقتدا میں تحریر کیا جاتا ہے کہ اخبار الاخیار میں انہوں نے بھی دو مرثیے تحریر کیے ہیں۔ ایک قصیدہ "دالیہ" ہے جو مولانا احمد تھانیسری کی وفات پر لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

اطار لبی جنین الطائر الغرد　　　　وهاج لوعة قلبی التایہ الکمد

دوسرا قاضی عبد المقتدر دہلوی کا مرثیہ لامیہ ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

یا سابق الطعن فی الاسحار والاصل　　　　سلم علی دار سلمی نابك ثم سل

لیکن مذاق شاعری نہ رکھنے والوں نے ان قصائد میں بہت کچھ تحریف کردی ہے۔ راقم الحروف نے اخبار الاخیار کے متعدد نسخوں میں ان کی تصحیح کی ہے۔ اگر اس صحیفہ میں بھی ایسے ناقصوں کے قلم سے تحریف ہو جائے اور ایسی اغلاط پر کسی استاد کی نظر پڑ جائے تو مجھے امید ہے کہ وہ حیرخاک شدہ افکار کی تصحیح کرکے اس کو زندہ کر دیں گے

قصیدہ مرثیہ یہ ہے ؎

یا للاحبۃ سار وا فی التباشیر　　　　فاسود یومی کاحداق الیعافیر

نحن الجسوم هم الارواح فارتحلوا　　　　وخلفونا کامثال التصاویر

لقد اجبنا بانواع الدموع متى ... غنى الحداة باقسام المزامير
كم من قلوب رقاق اثر عيسهم ... يا حادي العيس رفقا بالقوارير
عجبت منهم رضوا بالبين واعتذروا ... ايسكن القلب عن تلك المعاذير
ما جن ليل وما راعيت انجمه ... الا وقد لسعتني كالزنابير
هي المجرة فانظر في كواكبها ... تشق قلبي كاسنان المناشير
وما لروض الحمى من بعد ما رحلوا ... كمامه في فؤاد كالمسامير
تساقط النور والاغصان قد يبست ... فيها حمامة عن روض الحمى طير
قلبي اذ بيت وفيه الحب مرتسم ... فلا يقيس على نقش الدنانير
لان تخلت فقد زادت همومهم ... والطيب يزداد من سحق العقاقير
احوم حول فؤادي وهو مسكنهم ... وتسكب الماء عيني كالنواعير
كم من عقائق دمع ان لقيتهم ... اندى اوازم بها الا بالقناطير
ان الهموم التي حلت بانفسنا ... مخالب في شراشيب العصافير
من لي باجراء امراض زمنت بها ... راح الطبيب المداوي بالتدابير
السيد القدوة المختار ضيغمة ... من آل احمد اقمار الدياجير
عوني ملاذي معاذي سيدي سندي ... وقوتي عضدي خير المناصير
من اسمه اشرف الاعلى طفيل محمد ... ومن هو مقبول الجماهير
صدر الاماثل في مجد وشرف ... راس المعاريف اكليل المشاهير
العلم عقلا ونقلا قد احاط به ... واستوفر الحظ من فن التحارير
مدارس العلم حتى فهي تشكره ... كالروض يشكر احسان النواطير
كم صير الترب تبرا من له نظر ... تاثيره فوق تاثير الاكاسير
لله در امام كان منفردا ... في حسن نطق وفي حسن التعابير
كم من جواهر لفظ جاد مقوله ... بها تزين اجياد المناشير
تقاطر دمع عين براعته ... الا وضحك اوراق الدساتير
لم انس عهد الحمى والنور مبتسم ... والقلب منشرح مثل الازاهير
وكنت ملتزما اعتاب خدمته ... وكنت لم ارض فيها بالتقاصير
وقد كسبت علوما من افادته ... عقلا ونقلا الى فن التفاسير
سقاه صوب الغيوم الهاطلات كما ... روى الغليل بسلسال التقارير

ثم النجوم اصابتني باعينها — ومر عن كبدي سهم التقادير

والدهر ماد بين العدوان حيث طوى — بساط عانيق على الطوامير

فصار مولاي روح الكون مرتحلا — وزلزل الحزن اركان الدهادير

اذا تذكرت ايامي به هملت — عيناي كالسحب البيض المقاطير

ضاقت على الطباق السبع واضطرمت — بمارج من عذاب لا لتناخير

ويرتجي الصبر منه في مصيبته — اذ خرنه جل عن حصر المقادير

ورب معتصم بالصبر صبره — غضب المصيبة مقطوع النواشير

لا يحمل العضو نار اتلك في كبدي — فكيف يحملها سلك الاساطير

حمامة بالعشي ناحت مورخة — قد راح نجم البها بدر التقادير

ابقاه الله في روض النعيم على — اريكة بين ربات المقاصير

قصیدہ کے بعض لغات کی تصریح اور انکے معانی

قاموس میں ہے تباشیر صبح کے وقت کی پہلی روشنی کو کہتے ہیں۔ یَعَافیر منتخب میں یعفور ہرن کا بچہ یَعَافیر جمع ہے۔ مزامیر کے معنی قاموس میں واد اور وہ باجے جن کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ اور جن کو بجا کر مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ مزمار اور مزمور کی جمع ہے۔ حدیث میں رفقا بالقواریر کا لفظ آیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض سفروں میں انجشہ رضی اللہ عنہ ساتھ تھے۔ اور وہ اعلیٰ ترین خوش گلوئی کے ساتھ حدٰی خوانی کرتے تھے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حدٰی خوانی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا انجشہ قواریر کے ساتھ نرمی برتو (قواریر ایسے تیز چلنے والے اونٹ کو کہتے ہیں جو خود ہی تیز چل رہے ہوں)۔ اس میں اس شبہ کی بھی گنجائش ہے۔ کہ یہاں قواریر سے مراد عورتیں بھی لی گئی ہوں کیونکہ (اپنے نازک ہونے کے سبب) وہ بہت جلد تھک کر چور ہو جاتی ہیں۔ اور سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس لیے منع فرمایا تھا۔ کہ جب حدٰی کی آواز اونٹوں کے کانوں میں پڑتی ہے۔ تو وہ مست ہو کر تیز چلنے لگتے ہیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حسن صوت عورتوں کو متاثر کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ غنا، زنا سے متصل ہے۔

قاموس میں جنۃ اللیل سے مراد اس پر پردہ ڈالنا ہے۔ قاموس میں ہی راعی النجوم سے مراد نگہبان ہے منتخب میں مجرہ کے معنی کہکشاں ہے قاموس میں ہے الکمہ دعا النعوا اس کی جمع اکمام ہے تاج المصادر میں مخول باب فتحہ سے ہے۔ عقاقیر خوشبودار دوائیں، سکب بہانا، ناعورہ وہ چرخی جو کنوئیں سے پانی کھینچنے کے کام آتی ہے اس کی جمع نواعیر ہے۔ عقائق جمع عقیق، قنطار سونے سے بھری ہوئی گائے کی ایک کھال (چرمی کپا) قناطیر جمع ہے۔ قاموس میں شریان شرائین کا واحد ہے وہ رگیں جن میں

دورانِ خون ہوتا ہے اور جس سے نبض معلوم کی جاتی ہے۔ قاموس میں وجع مرض کو حرکت دینے والی تکلیف جمع اوجاع وجاع جیسے جبال، منتخب میں ضِنضِئ (دونوں صاد کے نیچے زیر ہے) اصل کے معنی میں ہے یعنی جڑ، اثمار جمع ثمر کی ہے۔ دیاجیر دیجور کی جمع ہے۔ مناصیر، منصار کی جمع ہے اکلیل تاج کو کہتے ہیں قاموس میں ناطور انگور کے درخت اور شہد کی مکھیوں کے محافظ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نواطیر ہے۔ تبز اصلی سونا مقول زبان، مناشیر منشور کی جمع ہے۔ یراعہ قلم، دستور بر حساب کی جمع کرنے والی تحریر جس سے دوسری تحریریں بنائی جائیں۔ نور شگوفہ، ازاہیر جمع ازہار اور وہ زہر کی بھی جمع ہے۔ جس کے معنی کلی یا شگوفہ کے ہیں صوب بمعنی تیز دوڑنا۔ روی ترویہ سے مشتق ہے سیراب کرنا اس کے معنی ہیں۔ غلیل معنی تشنگی، سلسال میٹھا جاری پانی۔ قاموس میں ہے الدھار یداول الدھر فی الزمن یعنی کسی شہر میں گذرا ہوا زمانہ، قاموس میں ہے ھملت عینہ یعنی اس کی آنکھ بہہ گئی۔ قاموس میں ہے سحاب، بہت زیادہ کڑک والا بادل، القطر اس کی جمع مقاطیر۔ تاج المصادر میں اضطرام کے معنی آتشیں شعلہ پھینکنا، بارح، لخیر بی کا شعلہ، تنانیر جمع تنور، معتصم پنجہ سے پکڑنے والا، عضب شمشیر، قاموس میں نواشیر کے معنی اندر اور باہر سے ایک ہاتھ کی تلوار قاموس میں نقصار، ہنسلی کو کہتے ہیں تقاصیر اس کی جمع ہے۔ ربّات التقاصیر یعنی حوریں۔

۶۹

شیخ فخر الدین احمد مانکپوری بلگرامی قدس سرہ

آپ ملک بہاؤ الدین عرف ملک بہلی کے صاحبزادہ ہیں۔ جن کا ذکر فضلاء کی فصل میں آئے گا۔ ملک بہاؤ الدین بلگرام سے مانکپور کسی تقریب میں اہل دمیال کے ساتھ گئے تھے شیخ فخر الدین احمد وہیں پیدا ہوئے لہٰذا اسی نسبت سے مانکپوری مشہور ہوگئے۔ کتب مختصرات اپنے والد سے پڑھیں اس کے بعد اپنے والد کے حکم کے مطابق استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی کے شاگرد ہوئے اور بقیہ تمام کتابیں انہیں سے پڑھیں۔ اور فضل وکمال حاصل کیا۔ میر سید قادری بلگرامی سے بیعت کی۔ اور یادِ الٰہی کا توشہ فراہم کرکے زندگی کی منزلیں انہیں کی خدمت میں طے کیں۔ سال ۱۱۴۰ھ کے وسط میں منزل آخرت کی جانب رہ سپار ہوئے۔

۶۰

میر سید اسماعیل بلگرامی قدس سرہٗ

بلگرام کے حسینی واسطی سادات سے ہیں اور خاندان ویچ بہیہ محلہ میدان پورہ کے رہنے والے ہیں آپکا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ سید اسماعیل بن سید ابراہیم بن سید شاہ میر بن سید نعمت اللہ جو سید تاج الدین حجرہ نشین قدس سرہٗ کے بڑے بھائی ہیں۔ اس سلسلہ کی باقی پشتیں اس سے قبل معرض تحریر میں آچکی ہیں۔ سید اسمٰعیل لوگوں کے امام اور خاص و عام کی توجہ کا مرکز تھے۔ ابتدائی عمر ہی سے کسب کمال کے حصول میں مشغول ہو گئے اور درسی کتابوں کی فراغت کے مرحلے درجہ بدرجہ گذرتے گئے۔ کبھی استاد المحققین میر طفیل محمد قدس سرہٗ کی خدمت میں اور کبھی دوسری جگہ کتب علوم متداولہ پڑھیں۔ اس کے بعد خدا طلبی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور شیخ عبدالرزاق ساکن بانسہ قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچکر مورد عنایات بنے۔ اور بیعت کی عزت حاصل کی۔ تقریباً بارہ سال شیخ کی تربیت کے سایہ میں نفس کشی کرتے رہے۔ اور بے انتہا برکتیں ان سے حاصل کیں۔ اور فقر کے منتہائے کمال تک جا پہنچے۔ شیخ کے انتقال کے بعد سجادۂ خلافت پر بیٹھے۔ حضرت شیخ کے تمام مریدین اور خلفاء ان کو اپنا امام تصور کرتے تھے کمال ادب و اعتقاد کے طریقے بجالاتے تھے۔ علامہ عصر مولوی نظام الدین خلف الصدق مولانا قطب الدین سہالوی شہید جن کا ذکر فضلاء کی فصل میں لکھا جائے گا۔ شیخ کی وفات کے بعد حضرت میرؒ کی خدمت میں واپس حاضر ہوئے۔ اور نور باطن سے خود کو مالا مال کیا۔ میر صاحب مسولی ضلع لکھنؤ میں مقیم رہے۔ اکثر بلگرام تشریف لاتے تھے اور ہمیشہ طالبوں کی رہنمائی اور ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے مرید ہو کر اپنے اپنے مدعا کو پہونچے۔ میر صاحب ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ کو اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ (انتقال ہو گیا) مسولی میں آرام فرما ہیں (آپ کا مدفن مسولی میں ہے) ان کی خاک پاک ہر خاص و عام کی زیارت گاہ ہے۔ راقم الحروف نے تاریخ اس طرح کہی۔

آفتاب سحر آگاہی	پیر روشن دل صاحب تکمیل
گفت تاریخ وصالش ہاتف	زیب خلد آمدہ میر اسماعیل

۱۱۶۴ ہجری

اس جگہ دو کلمے شاہ عبدالرزاق بانسوی قدس سرہٗ کے حالات میں تبرکاً تحریر کیے جاتے ہیں۔

۷۱

شاہ عبدالرزاق بانسوی قدس سرہٗ

بانسہ ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن اصلاً آپ کا تعلق قصبہ محمود آباد سے تھا۔ جو بانسہ کے قریب ہے ان کے والد کی شادی خاندان قدوائی میں کسی شیخ کی صاحبزادی سے ہوئی جو بانسہ میں رہتے تھے۔ شاہ عبدالرزاق ان ہی عفیفہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور والدہ کی وراثت کی بنا پر بانسہ میں وطنیت اختیار کر لی۔ ابتداء میں ملازمت آپ کی وجہ معاش تھی۔ آخر میں ملازمت چھوڑ کر ایک مدت سیاحت میں بسر کی۔ اور احمد آباد گجرات کے مضافات میں شاہ عبدالصمد خدا نما قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور مقصد اعلیٰ کے حصول میں کامیاب ہوئے پھر وطن مالوف کو مراجعت کی۔ ہمیشہ دنیا داروں کا لباس پہنتے تھے اور زراعت میں محنت کر کے کسب حلال کے ذریعہ روزی حاصل کرتے تھے۔ چونکہ فقر کی روشن نشانیاں آپ میں موجود تھیں۔ لہٰذا ادنیٰ اور اعلیٰ سب ہی طرح کے لوگ آپ کے منقاد و مطیع تھے۔ بلکہ علماء و فضلاء بھی آپ کے ارادت مند اور آپ کے غاشیہ بردار تھے۔ اگرچہ[۱] بالکل اُمّی تھے لیکن آیات قرآنی کی بے تکان پڑھ کر ان کی عجیب لطیف تفسیر بیان فرماتے تھے اور ایسے حقائق و معارف بیان فرماتے کہ دانشمندوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ان کی وفات ۵ رشوال ۱۱۳۶ھ کو واقع ہوئی۔ مزار مبارک قصبہ بانسہ میں زیارت گاہ عوام[۲] و خواص ہے۔

۷۲

راقم الحروف فقیر آزاد بلگرامی ؒ

حسینی نسب، واسطی اصل، قصبہ بلگرام کے قریب کا رہنے والا اور بلگرام ہی میرا منشاء و مولد ہے حنفی مذہب اور چشتی طریقت۔ ۲۵ رصفر ۱۱۱۶ھ کو ولادت ہوئی۔ اور ابتدائے شعور سے ہی میں تحصیل علم میں مشغول ہو گیا۔ اور درسی کتابیں شروع سے آخر تک استاذ المحققین میر طفیل محمد بلگرامی کے حلقہ درس میں ترتیب وار پڑھیں۔ لغت و حدیث، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور فنون ادب کی کتب متداولہ اپنے صاحب ولایت جد محترم استادی حضرت علامی میر عبدالجلیل بلگرامی قدس سرہٗ کی خدمت میں مکمل کیں۔ علم عروض وقافیہ

۱؎ بالکل امی نہیں تھے۔ بلکہ بعض فارسی کتابیں "یوسف زلیخا" تک پڑھے ہوئے تھے۔ (نزہۃ الخواطر)۔

۲؎ شیخ نظام الدین سہالوی اور ان کے بھائی محمد و محمد عبدالخالق وکمال الدین بن محمد دولت پوری وغیرہ نے ان سے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ عبدالرزاق کے لیے دیکھیے، مناقب رزاقیہ، نزہۃ الخواطر۔

اور بعض فنونِ ادب، میر سید محمد خلف الصدق علامہ مرحوم کی خدمتِ والا مرتبت میں حاصل کیے۔ سنہ ۱۱۴۷ھ میں جناب مستطاب سید العارفین میر سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی قدس سرہٗ سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ سنہ ۱۱۵۰ھ میں سفرِ خیر یعنی حرمینِ شریفین (زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً) کے ارادہ سے بلگرام سے روانہ ہوا۔ سنہ ۱۱۵۱ھ میں اس عمل اعظم یعنی سعادتِ عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہوا۔ اور مدینہ منورہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں حاضر ہو کر شیخنا مولانا شیخ محمد حیات سندھی مدنی حنفی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچ کر صحیح بخاری کی تلاوت کی اور صحاح ستہ اور تمام معقولات کی اجازت حضرت مولانا سے حاصل کی۔

مکہ معظمہ میں حضرت شیخ عبدالوہاب طنطاوی[1] مصری کی صحبت کا شرف پایا۔ اور بعض عظیم فوائد ان سے حاصل کیے۔ شیخ عبدالوہاب نور اللہ مرقدہٗ جو علمائے مصر میں ممتاز تھے۔ ان دنوں مکہ معظمہ تشریف لائے ہوئے تھے آپ علوم کی ضیا باریوں میں ہمیشہ ساعی رہتے تھے۔ سنہ ۱۱۵۷ھ میں آپ کا وصال ہو گیا اور جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہوئے۔ شیخ عبدالوہاب علیہ الرحمہ نے فقیر کے عربی اشعار سن کر بہت تعریف کی اور جب انہوں نے اس بندہ کا تخلص آزاد سنا اور اس کے معنی سمجھے فرمایا! یا سیدی! انت من عتقاء اللہ (تم اللہ کے آزاد کردہ لوگوں میں ہو) حضرت شیخ عبدالوہاب قدس سرہٗ نے اپنے نفس نفیس سے اس فقیر حقیر کے بارے میں جو خیالات ظاہر فرمائے ان کے پیش نظر یہ فقیر سراپا تقصیر آنجناب کی ذاتِ گرامی سے بڑی امیدیں رکھتا ہے۔

الغرض یہ فقیر مکہ معظمہ میں حضرت شیخ عبداللطیف قدس سرہٗ کے دولت کدہ پر قیام پذیر رہا۔ اور سنہ ۱۱۵۲ھ میں ان کی زبانِ مبارک سے "سفر بخیر" کا جملہ سماعت کر کے (ان سے حصول اجازت کے بعد) ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ حرمین شریفین کے تفصیلی حالات اس کتاب کے آخر میں تحریر کیے گئے۔ اور اتمام بالخیر کے طور پر وہاں کی عمارات مکانات مطہرہ و مقامات مقدسہ متبرکہ کا ذکر آخر میں لکھا گیا ہے۔ واپسی کے وقت "بندر سورت" کے مقام پر پانچ مہینہ قیام رہا۔ پھر وہاں سے ملاقہ دکن کا ارادہ کیا۔ بالآخر، ۲۷ ذی قعدہ سنہ ۱۱۵۲ھ میں اورنگ آباد (خجستہ بنیاد) آکر حضرت باباشاہ مسافر نقشبندی قدس سرہ کی خانقاہ میں خلوت نشین ہو گیا۔ وہاں حضرت باباشاہ مسافر نقشبندی قدس سرہٗ کے فیوض و برکات سے کافی بہرہ اندوز اور مستفیض ہوا۔ کچھ دنوں بعد اللہ تعالیٰ نے گوشہ نشینی کو راہ پیمائی یعنی سفر میں اور سکون کو حرکت میں تبدیل فرما دیا۔ چنانچہ میں نے دکن کے مختلف شہروں کی سیر کی۔ اور عجائباتِ قدرت کے گوناگوں مناظر اپنی نگاہ بصیرت افروز سے مشاہدہ کیے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ جس دن سے بتوفیق الٰہی اس فقیر کی یہ پُرخلوص پیشانی خانۂ کعبہ کی دہلیز سے آشنا ہوئی اسی دن سے مجھے اہلِ دنیا کے تعلقات اور ان سے بیگانگی بھی مرحمت فرما دی۔ اور فقیر کے آزاد تخلص کے صحیح معنی اس کی اہلیت و صلاحیت کے بقدر رونما اور ظاہر ہو گئے۔

---

[1] بن احمد بن برکات الاحمدی طنطاوی مصری شافعی (متوفی سنہ ۱۱۵۷ھ) ان کی تصانیف میں بذل العسجد فی جینی من اسرار احمد اور عقد الزبرجد من حروف محمد ہیں۔ (ہدایۃ العارفین)

فقیر کو نواب آصف[1] جاہ کے فرزند نواب نظام[2] الدولہ ناصر جنگ شہید سے ایک عجیب قسم کا تعلق پیدا ہو گیا۔ اور ایسی گہری دوستی ہو گئی جو تصور و گمان سے باہر ہے۔ جب نواب نظام الدولہ اپنے والد کے انتقال کے بعد دکن کی مسند حکومت پر متمکن ہوئے تو میرے کچھ دوستوں نے مجھے مشورہ دیا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ کہ موقع اچھا ہے۔ جو مرتبہ آپ چاہیں آسانی سے مل جائے گا۔ آپ کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور جو عہدہ پسند ہو اسے اختیار کر لینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں آزاد ہو چکا ہوں اب کسی مخلوق کا غلام نہیں بن سکتا دنیا نہر طالوت کی طرح معلوم ہوتی ہے اس میں ایک چلّو تو جائز اور حلال ہے لیکن اس سے زیادہ ناجائز اور حرام ہے۔ پھر میں نے یہ شعر پڑھا ؎

دریں دیار کہ شاہی بہ گدا بخشند　　　غنیمت است کہ مارا ہمیں بما بخشند

نفس کی پاکیزگی اور طہارت کے تاج کو پامال کرنا گویا چمکدار آئینہ جوہر نما کے ساتھ دوستی کا دم بھرنا اور اسی کے رنگ میں اپنے کو بھی رنگ لینا ہے۔ لیکن بہرحال نعمتِ الٰہیہ کا زبان پر ایک حق ہے۔ جو تحدیثِ نعمت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس فقیر حقیر کی ہمت اور اس کے حوصلہ کے سرو آزاد کو نشوونما کی استقامت عطا فرمائے اور توفیق کے گلِ سرسبد کو ثبات کا رنگ بخشے۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت، پورا قابو اور اختیار رکھتا ہے بندوں کی ہدایت اور توفیق و صبر و استقامت اسی کے اختیار میں ہے۔

اب میں اس موقع پر اپنے ان بعض بزرگوں کے تذکار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کے نام نامی اور اسمائے گرامی برسبیل تذکرہ نوکِ قلم پر آ گئے ہیں۔ اور اپنے قلم کے اسپ تیز رَو اور خوش رفتار کو ان ہی برگزیدہ اور

---

[1] نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر خلف نواب غازی الدین خان فیروز جنگ ابن قلیچ خان۔ موصوف عین عالمِ شباب میں عالمگیر کے منظور نظر ہوئے۔ چہار ہزاری منصب اور دیگر خطابوں سے سرفرازی حاصل کی۔ جہاندار شاہ کے زمانہ میں نظام الملک کے خطاب سے ملقب ہوئے۔ جب ۱۱۳۲ھ میں محمد شاہ بادشاہ کے طلب کرنے پر نظام الملک دکن سے جہان آباد آئے خلعت وزارت اور آصف بہادر کے خطاب سے معزز ہوئے۔ وزارت کے مرتبہ پر فائز ہونے کے سلسلہ میں میر عبدالجلیل نے ایک قصیدہ بھی تحریر کیا ہے جو فارسی، عربی، ترکی اور ہندی زبانوں میں چوالیس اشعار پر مشتمل ہے میر غلام علی آزاد نے ان کی تاریخ وفات " متوجہ بہشت " سے نکالی ہے (۱۱۶۱ھ)۔

[2] نواب نظام الملک کے دوسرے فرزند میں والد کی وفات کے بعد ۱۱۶۱ھ میں دکن کی مسند سروری پر متمکن ہوئے، جب ۱۱۶۳ھ میں نواب نظام الملک کے خواہرزادہ نواب مظفر جنگ نے بغاوت کی تو نواب نے لبھو پوری میں اس کو اور نصاریٰ کے لشکر کو شکست فاش دی اور افغانیوں اور فرانسیسیوں سے مل کر مظفر جنگ نے بتاریخ ۱۷ محرم الحرام ۱۱۶۴ھ شب خون مار کر ان کو شہید کر دیا۔ ان کی مدتِ حکومت صرف دو سال سات مہینے ہے۔ (مفتاح التواریخ)۔

باکمال اللہ والوں کے بیان کے میدان میں دوڑاتا ہوں (ان کا ذکر کرتا ہوں)۔

۷۳

شیخ محمد حیات سندھی مدنی قدس سرہٗ

آپ ایک ممتاز عالم باعمل اور بہت بڑے محدث تھے۔ ایک دن میں نے شیخ کے خاندان نسب اور وطن کے بارے میں ان سے پوچھا تو آپ نے اپنی ایک پاکیزہ تحریر میں ایک کاغذ کے ٹکڑے پر یہ لکھ دیا۔

فقیر محمد حیات سندھی مدنی کے والد ماجد کا نام "ملا قلاریہ" ہے۔ جو قبیلہ "چاچر" سے تھے یہ قبیلہ عادل پور کے اطراف میں سکونت پذیر تھا۔ ان کے والد سید موسیٰ قادری مشہور مقام "کوتہ" کے باشندہ تھے اور قبیلہ "چاچر" کے ایک ممتاز فرد تھے:

______ چاچر بروزن ساغر سندھ اور عادل پور کے اطراف میں آباد ایک قبیلہ تھا۔ جو "بھکھر" کے قرب وجوار میں ہے۔ فقیر آزاد نے اس کو دیکھا ہے اور سید موسیٰ قادری مضافات واطراف "بھکھر" کے ممتاز رؤسا میں سے ہیں ان کا کوٹ (گاؤں) مشہور ہے یہی کوٹ سید محمد حیات سندھیؒ کا مولد ومنشا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوانی ہی میں حرمین شریفین کی زیارت کی توفیق عطا فرمائی اس کے بعد آپ نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار فرمائی اور عقد مناکحت کی سنت بھی ادا فرمائی۔ پھر آپ علوم دین حاصل کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ باوجودیکہ آپ تنگی معاش کی آزمائش میں گرفتار تھے پھر بھی آپ نے صبر واستقلال کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے اکثر ممتاز اور مشہور علماء کی خدمت میں حاضر ہو کر گوناگوں علمی کمالات سے بہرہ ور ہوئے خصوصاً شیخ ابوالحسن[1] سندھی سے جو مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ (نور اللہ مرقدہٗ) کمالات حاصل کیے کچھ دنوں آپ کو شیخ عبداللہ بن سالم البصری[2]

---

[1] الکبیر نورالدین محمد بن الہادی حنفی مقیم مدینہ منورہ۔ ولادت بمقام ٹھٹھہ۔ شیخ محمد بن عبدالرسولؒ (۱۱۰۳ھ) اور شیخ ابراہیم بن حسنؒ کورانی مدنی سے تعلیم حاصل کی۔ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں درس دیتے تھے۔ بہت سی مفید کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان میں کتب صحاح ستہ پر حواشی بھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کتابوں پر بھی مفید حاشیے تحریر کیے۔ ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر)۔

[2] مکہ کے عالم تھے۔ حدیث کی بہت سی کتابوں کا انہوں نے احیاء کیا۔ ان میں مسند امام احمد بھی ہے قریب تھا کہ وہ نایاب ہو جاتی۔ مصر، عراق، شام وغیرہ کے قدیم کتب خانوں سے مختلف نسخے جمع کیے اور ان سے ایک اصل مکمل نسخہ پوری صحت کے ساتھ تیار کیا۔ اور صحاح ستہ کے اصول پر اس کو مرتب کیا۔

ساری عمر کتب حدیث کی روایت میں صرف فرمادی۔ آخر عمر میں شیخ عبداللہ مغربی نے بھی ان سے صحاح ستہ پڑھی۔ آپ نے ۱۱۳۴ھ میں وصال فرمایا۔ (تقصار)۔

کی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور شرف تلمذ حاصل کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

آپ نے اپنی ساری زندگی حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صرف فرمادی۔ اور فن حدیث شریف میں آپ نے یدطولیٰ اور مہارت تامّہ حاصل کی۔ یہی نہیں بلکہ تمام عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ اپنے حدیث شریف کی نشر واشاعت ہی میں صرف فرمایا۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ نیز مصر و شام و روم کے تقریباً تمام عوام و خواص آپ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ خلوص اور مخلصانہ عقیدت رکھتے تھے۔ آپ کی ذات بابرکات سے گوناگوں فیوض و برکات کا استفادہ کیا کرتے تھے۔ جس وقت یہ فقیر مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ (زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً) واپس آیا تو حضرت شیخ قدس سرہٗ نے اس فقیر کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں فقیر کا نام سید غلام علیؒ کے بجائے (غلام کی اضافت کے بغیر) صرف سید علی لکھا اس وجہ سے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ اور بندگی اور عبودیت کی نسبت کسی مخلوق کے ساتھ قائم کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ فقیر نے اس خط کے جواب میں اس مضمون کو تحریر کیا۔ کہ امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔

"عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی و امتی کلکم عباد اللہ وکل نساءکم اماء اللہ ولکن یقل غلامی وجاریتی وفتائی" (الحدیث)

اور بخاری نے اس کو یوں روایت کیا ہے۔

"لا یقل احدکم عبدی و امتی ولیقل فتای وفتاتی وغلامی"

نیز میں نے یہ بھی لکھا کہ اگر کسی نام رکھنے والے نے لفظ "غلام" کو عبد (بندہ) کے معنی میں رکھا ہو تو قطعی نامشروع اور ناجائز ہے لیکن اگر لفظ غلام کو غلام یا بیٹے کے معنی میں استعمال کیا تو قطعی جائز ہے اور نام رکھنے والے کو اس کا حق حاصل ہے اس لیے کہ (لکل امرء ما نوی اور انما الاعمال بالنیات کے مطابق) عمل کا دار و مدار صرف عامل کی نیت پر ہے۔

حضرت شیخ قدس سرہٗ نے میرا خط پانے کے بعد انصاف سے کام لیا۔ اور میرے خط کے بعد پھر اس فقیر کا نام غلام علی ہی تحریر فرمایا۔

ابن نجار[1] نے اپنی تاریخ بغداد میں احمد غزالی کے تذکرہ کے موقع پر ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ قاری نے ان کی مجلس میں قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ پڑھی "قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم (الآیۃ) پھر کہا کہ یائے اضافت کا شرف "یاعبادی" کے قول کی بنا پر آپ کی ذاتِ گرامی

[1] ابن نجار۔ محمد بن محمود بن حسن بن ہبۃ اللہ ابو عبداللہ محب الدین۔ ابن النجار۔ (۵۷۸ھ تا ۶۴۳ھ) مورخ و حافظ یعنی محدث تھے۔ بغداد آپ کا مولد ہے اور بغداد ہی میں وفات پائی۔

کی طرف سے ۔ کہ آپ نے فرمایا " یاعبادی " پھر یہ اشعار پڑھے ۔

وھان علی اللوم فی جنب حبہا   وقول الاعادی انہٗ لخلیع

اصم اذا نودیت باسمی واننی   اذا قیل لی یا عبدھا السمیع

حضرت شیخ محمد حیات قدس سرہٗ نے ماہِ صفر کی ۲۶ تاریخ کو چہارشنبہ کے دن سنہ۱۱۶۳ھ میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی راہ لی ۔ اور " بقیع " کے مبارک قبرستان میں دفن کیے گئے ۔ میں نے " رحلۃ شیخی " سے ان کی تاریخ نکالی ۔

لفظ " رحلۃ " میں پانچ حروف میں نے شمار کیے ہیں ۔ اس لیے کہ علم " جمل " کے قاعدہ میں تحریری شکل معتبر ہوا کرتی ہے نہ کہ تقریری ۔ (حروف ملفوظ معتبر ہیں مکتوبہ نہیں)

محمد بن ابی بکر بن احمد الحسینی الشلی[1] اپنی تصنیف " عقد الجواہر " میں لکھتے ہیں کہ مثلاً تلفظ میں " الف " اور تحریر میں " یا " ہے جیسے حمزۃ وطلحۃ جو بولنے میں " تا " اور لکھنے میں " ہا " ہے (تو اس میں " ت " کے عدد لیے جائیں گے) ۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ عبارت میں تحریر کا اعتبار کیا جاتا ہے تلفظ کا نہیں ۔ بعض کہتے ہیں تلفظ معتبر ہے ۔ تحریر نہیں ۔

سید عبداللہ ، مدہر یمنی[2] فرماتے ہیں کہ پہلا قول یعنی تلفظ قابلِ اعتبار ہوتا ہے ۔ دوسرے قول یعنی تحریر کا اعتبار بہت کم ہوتا ہے ۔

---

[1] شلی (سنہ۱۰۳۰ھ لغایہ سنہ۱۰۹۳ھ مطابق سنہ۱۶۲۱ء لغایہ سنہ۱۶۸۲ء) محمد ابن ابی بکر بن احمد الحسینی شلی ، حضرمی ، باعلوی ۔ علمائے تاریخ وریاضی میں سے ہیں ۔ ان کی ولادت حضرموت کے علاقہ " تریم " میں ہوئی اور نشوونما یہیں پائی ۔ حجاز اور ہندوپاک کی جانب انہوں نے تحصیلِ علوم کے لیے سفر کیا ۔ آخر میں مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے ۔ اور وہیں ان کا وصال ہوا ۔ چند تالیفات ان کی یادگار رہیں ۔ جیسے المشارع الباہر تکمیل النور السافر فی اخبار القرن العاشر ، المشرع الروی فی مناقب آل ابی علوی ۔ دو جلد میں عقد الجواہر ۔ والدرر فی الاخبار القرن الحادی عشر اور کتاب تاریخ ولاۃ مکہ اور رسائل فی الریاضی والافلاک (خلاصۃ الاثر اعلام زرکلی) ۔ ذیل کشف الظنون ۔

[2] ابن جعفر بن مدہر باعلوی ، یمنی ، حسینی مہاجر مکہ معظمہ متوفی سنہ۱۱۹۸ھ اور اعلام زرکلی میں تاریخ وفات سنہ۱۱۶۰ھ سنہ۱۷۴۷ء ہے ۔ علمائے صوفیہ سے تھے ۔ ہندوستان میں بیس سال تک رہے ۔ تصانیف اشرف النور ورشاش من سر معنی اشہد لا تشہد سواہ شرح اربعۃ ابیات القطب الحداد ، الایقاد لترجمۃ العیدروس جعفر بن مصطفےٰ ، دیوان اشعار ، شرح دیوان شیخ اسماعیل الشوی کشف اسرار ، علوم المقربین ، اللآلی الجواہریۃ علی عقائد النوفریہ ، علم النور ، بیاہ بسم اللہ تمم السرور النفحۃ الہداۃ بانفاس العیدروسی عبداللہ ، مراسلات وغیرہ (ہدیۃ العارفین ۔ زرکلی) ۔

(۴۷)

شیخ عبداللطیف قدس سرہٗ

آپ کی ولادت، تعلیم و تربیت، نشوونما سب کچھ قصبہ امروہہ ضلع مراد آباد میں ہوئی۔ جو دہلی کے قریب واقع ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عبداللہ[۱] تک پہنچتا ہے۔ جو شیخ ابن قدس سرہٗ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور اس مقام کے مشہور ترین اولیاء کرام میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت شیخ عبداللہ عرف شیخ ابن قدس سرہٗ نے ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۷۵ھ کو وفات پائی۔

شیخ عبداللطیف کو عنفوانِ شباب ہی میں علوم ظاہری کے حصول کا شوق پیدا ہوا۔ اور اس مقصد کیلئے کمربستہ ہوئے۔ امروہہ سے نکل کر بہت دنوں تک بلگرام اور قنوج میں تحصیل علم کے مشغلہ میں مصروف رہے۔ بہت سی درسی کتابیں آپ نے میر سید نعمت[۲] اللہ کی درس گاہ میں پڑھیں۔ میر سید نعمت اللہ، حضرت میر سید عبدالواحد اکبر بلگرامی قدس اللہ اسرارہم کے سجادہ نشین اور ان کے پوتے تھے۔ میر سید نعمت اللہؒ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہونے کے بعد شیخ عبداللطیفؒ نے حضرت شیخ حبیب[۳] اللہ قنوجی سے بیعت حاصل کی۔ اور عبادت و ریاضت کے نتیجہ میں علوم باطن کی نعمتوں کے خزانے حاصل کرلیے۔ آخر میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ اور مکہ مکرمہ میں قیام پذیر ہوگئے۔ کچھ زمانہ کے بعد آپ نے اس ارادہ سے ہندوستان کا سفر کیا۔ کہ اپنی والدہ ماجدہ کو بھی ہندوستان سے لاکر حرمین شریفین کی زیارت اور حج کرائیں لہٰذا ...... جب آپ اپنے وطن امروہہ پہنچے تو آپ کی والدہ ماجدہ انتقال فرماچکی تھیں۔ پس آپ دوبارہ مکہ معظمہ واپس چلے گئے۔ اور وہاں آپ نے پچاس سال قیام فرمایا۔ وہاں آپ ہر سال فریضہ حج ادا کرتے تھے۔ تقریباً بیس مرتبہ مدینہ منورہ (جس کے تاجدار پر اللہ تعالیٰ کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں) کی زیارت کی سعادت سے مشرف اندوز ہوئے۔ آپ مجھے لطیف طبع تھے۔ دل میں بے حد رقت تھی۔ اہل کمال کی قدر و منزلت بجالانے میں اپنی مثال آپ تھے۔ حج کے موسم میں ہر سال آپ ہندوستان کے باکمال بزرگوں اور شرفا کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ تاکہ شاید کسی ہم وطن سے ملاقات نصیب ہوجائے اور اپنی حیثیت اور مقدرت کے مطابق اس کی خدمت کرسکیں۔

---

[۱] ابن احمد بن طیفور بن شمس الدین بن محمد بن محمود الراجحی امروہوی۔ ابراہیم ابن علی رضا کی نسل سے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور اولیائے کرام میں ہیں۔ علم و عمل اور جذب و سلوک کی تعلیم شیخ علاؤ الدین چشتی دہلوی کی خدمت میں رہے (سنہ ۹۲۰ھ تا سنہ ۹۳۰ھ) ۹۷۵ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)

[۲] ابن محمد زاہد بن میر عبدالواحد متوفی سنہ ۱۱۳۰ھ۔

[۳] مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ درسی کتابیں مولانا عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی جونپوری (م ۱۰۴۲ھ) کے مدرسہ میں پڑھیں۔ تصوف و سلوک کی منزلیں شیخ عبدالجلیلؒ الہ آبادی (م ۱۱۳۳ھ) کے حضور میں طے کیں۔ جواہر خمسہ، انیس العارفین اور تذکرۃ الاولیا تالیفات میں مشہور ہیں۔ (نزہۃ الخواطر، ابجد العلوم، حدائق حنفیہ)۔

راقم الحروف کو جب مدینہ منورہ سے مراجعت کرکے مکہ معظمہ میں حاضری کا موقع نصیب ہوا، تو شیخ عبداللطیف کو اس فقیر کی آمد کی خبر ہو گئی ۔ وہ فوراً ملاقات کو آئے اور نہایت اصرار کے ساتھ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے جانے کے لیے مجبور کر دیا ۔ فقیر نے تقریباً پانچ ماہ تک مکہ مکرمہ میں شیخ عبداللطیف کے مکان پر قیام کیا ۔ اس دوران قیام میں میاں شیخ عبداللطیف نے اخلاق و محبت، شرافت و مروت کے وہ مظاہرے فرمائے، کہ بیان سے باہر ہیں اور جن کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان قاصر ہے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے انکی ہم نشینی اور صحبت میں رہ کر اکثر اوقات حضوری میں گذرے ۔

شیخ عبداللطیف فرماتے تھے کہ ایک دن حرم مکہ میں باب السلام کے سامنے مجھے ایک ہندی فقیر نظر آیا جو نہایت بوسیدہ پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا ۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے دل میں کراہت پیدا ہوئی لیکن پھر یکایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پرتو غیرت پیدا ہوا ۔ اور میں نے اپنے نفس کو ملامت کی اور کہا کہ اپنے ہم جنس انسان سے نفرت کے کیا معنی ہیں؟ لہٰذا اب تمہاری مناسب سزا یہی ہے کہ اس شخص کو ساتھ لیکر تم دونوں ایک برتن میں کھانا کھاؤ ۔ چنانچہ میں گھر آیا ۔ کھانا تیار کرایا اور فقیر کے پاس جا کر میں نے عرض کیا کہ حضرت ازراہ کرم ذرا غریب خانہ کی طرف قدم رنجہ فرمائیں ۔ فقیر کچھ نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ میرے گھر آ گیا ۔ میں نے کھانا لاکر فقیر کے سامنے رکھ دیا ۔ اور ہم دونوں نے ساتھ مل جل کر کھالیا ۔ فقیر نے میرے ساتھ اثنائے قیام میں ابتدائے نشست سے آخری لمحہ تک ایک بھی بات منہ سے نہیں نکالی ۔ کھانا کھایا ۔ اور خاموشی کے ساتھ اپنی قیام گاہ کو واپس چلا گیا ۔ دوسرے دن پھر میں کھانا تیار کرایا ۔ اور فقیر کو باب السلام سے اپنے گھر پر لایا اور حسب سابق دونوں نے ایک ہی برتن میں کھانا کھایا ۔ چالیس دن مکمل اسی طرح گذر گئے ۔ چالیسویں دن اس فقیر نے زبان کھولی ۔ اور کہا کہ میں نے ساری زندگی سیر و تفریح ہی میں گذاری ہے ۔ لیکن مجھے تم جیسا انسان آج تک کہیں نہیں ملا اور کہا کہ میں کیمیا بناتا ہوں تم نے جس خلوص و محبت سے میری خدمت کی ہے اس سے متاثر ہو کر میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے صلے کے طور پر میں تم کو کیمیا کا فن سکھا دوں ۔ میں نے کہا کہ میں بھی کیمیا بناتا ہوں فقیر نے کہا کہ تم کس طرح بناتے ہو ۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بازوؤں میں جو طاقت عطا فرمائی ہے اور جس کے ذریعے سے میں حلال روزی کماتا ہوں ۔ وہی (قوت بازو) میری کیمیا ہے ۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے بوریا کا گوشہ الٹ دیا ۔ اس کے نیچے وہی درہم و دینار پڑے ہوئے تھے ۔ جو میں نے اپنے قوت بازو سے کمائے تھے ۔ اس نے ان درہموں و اشرفیوں کی جانب کچھ توجہ نہیں کی ۔ اور مجھے فن کیمیا سکھانے پر مسلسل اصرار کرتا رہا ۔ لیکن میں فن کیمیا سیکھنے سے برابر انکار ہی کرتا رہا ۔ آخر کار وہ خود ہی جا کر تھوڑے سے دہکتے ہوئے انگارے اور ایک کوزہ (آبخورہ) لایا اور تانبے کو اسی آبخورہ میں پگھلا کر تھوڑی سی راکھ (جو ایک کاغذ کی پڑیا میں اس کی جیب میں موجود تھی) اس پڑیا سے نکال کر اس پر چھڑک دی ۔ وہ تانبہ چشم زدن میں اسی وقت سونا ہو گیا پھر فقیر نے مجھ سے کہا کہ اس موقع کو غنیمت جانو ۔ اور مجھ سے یہ فن سیکھ لو ۔ اس لیے کہ اب میں ہندوستان

جانے کا ارادہ رکھتا ہوں ایسا نہ ہو کہ یہ موقع ہاتھ سے کھو دینے کے بعد تم کو پچھتانا پڑے۔ اس پر میں نے کہا کہ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ فقیر نے کہا فرمایئے میں نے کہا کہ اگر آپ کو ایسے کسی جنگل میں کچھ دنوں قیام کرنے کا اتفاق پڑ جائے۔ جہاں تانبہ میسر نہ آسکے تو کیا آپ مٹی سے وہاں سونا بنا سکیں گے؟ فقیر نے جواب دیا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے۔ میں نے کہا کہ پھر کسی ایسے شخص کی تلاش کیوں نہ کی جائے۔ جو مٹی کو سونا بنا سکتا ہو۔ یہ سن کر فقیر نے میرے صبر و استقلال کی بڑی تعریف کی اور مجھ سے اجازت لے کر وہ رخصت ہو گیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ شیخ عبداللطیف جب مکہ معظمہ پہنچے تو اس کے فوراً بعد پورے ایک سال تک کوہِ ثور میں قیام فرمایا اور وہاں رہ کر تمام سال مسلسل سخت عبادت و ریاضت اور مجاہدۂ نفس میں گزار دیا۔ یہ پہاڑ شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار برج ثور کی شکل کا موجود تھا۔ اس غار میں ماہتاب عالم تاب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی شب میں اپنے مبارک قدم رکھے تھے (قیام فرمایا تھا)۔

کوہِ ثور کے تذکرہ کے سلسلہ میں مجھے اس پہاڑ سے متعلق خود اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ وہ یہ کہ گرمی کے موسم میں ایک مرتبہ جب کہ بادِ سموم کے جھلس دینے والے جھونکے بہت تیز چل رہے تھے۔ اور سورج کی تپش پتھر کا کلیجہ بھی پگھلائے دے رہی تھی۔ ماہ مکرم محرم (۱۱۵۲ھ) کی اکیس تاریخ تھی۔ میں نے کوہِ ثور کی زیارت کا ارادہ کر لیا۔ جوں ہی میں نے شہر سے باہر قدم نکالا۔ فضا کی تپش کے باعث پیاس کی شدت مجھ پر غالب آ گئی۔ میں نے اپنے ساتھ پانی نہیں لیا تھا خیال یہ تھا کہ جہاں مجھے پانی کی ضرورت پڑے گی۔ راستہ میں پانی مل جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ تھی۔ کہ اثنائے راہ میں پسینہ کے مسلسل قطرات کے سوا پانی کی ایک بوند بھی نصیب نہ ہو سکی آگے بڑھ کر اثنائے راہ میں کچھ اور مسافر بھی ملے اور اتفاق سے ان کے پاس بہت تھوڑی مقدار میں پانی تھا۔ شرم و حیا کی بنا پر میں ان سے پانی مانگنے کی جراءت نہ کر سکا۔ یہ احساس دامن گیر تھا۔ کہ خود ان بیچاروں کی ضرورت کو تو پانی کافی ہے ہی نہیں۔ یہ دوسروں کو کیا دے سکیں گے۔

ایک تو پہاڑ کی اونچی نیچی ناہموار زمین دوسرے کلیجہ کو بھون کر کباب کر دینے والی بادِ سموم۔ اور ناقابلِ برداشت گرمی۔ ان حالات میں جس تکلیف اور مصیبت سے میں نے دامن کوہ تک مسافت طے کی بیان سے باہر ہے۔ دوسری مصیبت یہ تھی۔ کہ انہیں حالات میں مجھے کوہِ ثور کی فلک بوس چوٹی تک چڑھنا بھی تھا۔ بہر کیف کسی نہ کسی طرح افتاں و خیزاں کوہِ ثور کے درمیانی حصہ تک پہنچ گیا۔ وہاں تک پہنچ کر میری طاقت نے جواب دے دیا اور میں ایک قدم بھی آگے بڑھانے کے لائق نہیں رہا۔ پانی کی خواہش میرے خیالات کے آئینہ میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ میرے ساتھی مسافروں میں سے ایک مسافر نے جو مجھ سے دو تین قدم کی بلندی پر راستہ طے کر رہا تھا۔ کے ہاتھ میں مٹی کی ایک صراحی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اس کی صراحی اچانک ایک پتھر سے ٹکرا گئی۔ صراحی کا اوپر والا نصف حصہ اس مسافر کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اور اس کا دوسرا نچلا حصہ کاسۂ امانت کی شکل میں نیچے کی طرف آیا۔ خداوند حفیظ و قدیر کی عنایت سے اس پیالہ (ٹوٹی ہوئی صراحی کا پیالہ نما نچلا حصہ) کے پانی کا ایک قطرہ

بھی ضائع نہیں ہوا۔ میں نے ہوا ہی میں اس پیالہ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور جس کی صراحی ٹوٹی تھی۔ اس سے اجازت لے کر پانی پی لیا۔

قسم ہے اس خالقِ کائنات کی جس نے مجھے میری پیاری جان عطا فرمائی ہے کہ مجھے یاد نہیں کہ اس سے زیادہ ٹھنڈا اور میٹھا، خوش ذائقہ پانی زندگی میں اور کبھی نصیب ہوا ہو۔ ابھی تک اس پانی کی لذت میرے کام و دہن میں موجود ہے اور جب بھی مجھے اس پانی کا خیال آتا ہے تو ایک عجیب اور خاص قسم کی لذت محسوس کرتا ہوں اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس بڑی شان والے، بگڑے کاموں کو بنانے والے اور بے نیاز مالک نے اس وقت اپنے ناچیز بندہ پر اپنی خاص رحمت نازل فرمائی اور اپنے اس جلے بھنے ناچیز بندہ کو اپنے فضل و کرم کے پیالہ کے پانی سے آسودہ فرمایا۔ فسبحان الذی ھو یطعمنی ویسقینی حضرت شیخ عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ۱۱۵۰ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ اور جنت المعلیٰ میں دفن کیے گئے۔ "بہشت نشین" سنہ ۱۱۵۰ھ آپ کی تاریخ وفات نکلی گئی۔ حضرت شاہ حبیب اللہ قنوجی جو حضرت شیخ عبداللطیف قدس سرہٗ کے پیر و مرشد تھے۔ ظاہری و باطنی دونوں علوم میں ید طولیٰ اور مہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ (حبیب اللہؒ) ہمیشہ دینی علوم کی تعلیم و تدریس عبادت و ریاضت، مجاہدۂ نفس و مراقبہ و کشف میں مصروف رہا کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ کتب درسیہ کے معانی اور مفاہیم سمجھنے میں اکثر قاصر اور غیر مطمئن رہ جاتے تھے۔ اسی سبب سے آپ کے دل میں تشویش اور کھٹک سی رہا کرتی تھی۔ ایک رات آپ نے جناب رحمۃ للعالمین، سید المرسلین، امام الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے عالم رؤیا میں یہ درخواست کی کہ حضورؐ اس ناچیز کے لیے علوم و فنون کے دروازے کھول دیے جائیں اور شرح صدر کی نعمت مجھے عطا فرمائی جائے۔ آپ کی درخواست سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکار میں قبول ہو گئی۔

جیسے ہی نیند سے بیدار ہوئے، علوم و فنون کے دروازے آپ پر کھل گئے۔ اسی دن سے آپ نے تعلیم و تدریس کی مسند پر بیٹھ کر ایک جہان کو علوم ظاہر و باطن کی نعمتوں سے مالامال اور سرفراز فرمایا۔ آپ نے سنہ ۱۱۴۰ھ میں اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ راقم الحروف نے آپ کی تاریخ وفات ذیل کے مشہور جملہ سے نکالی ہے۔

"الموت جسرٌ یوصل الحبیب الی المولیٰ الحبیب"

آپ کا مزار قنوج میں ہے۔

آپ کے مرشد شیخ حبیب اللہ قنوجی، حضرت شاہ عبدالجلیل[1] الٰہ آبادی قدس سرہٗ کے مرید ہیں اور حضرت

[1] ابن صدرالدین بن سراج الدین بن محمد بن یوسف بن سلطان محمد بن ملک محمد بن علی احمد سعید بن عبدالمجید بن فیض اللہ بن برہان الدین بن حسام الدین بن صدرالدین حسینی بخاری الاجی الٰہ آبادی، مشائخ چشتیہ میں ممتاز تھے ولادت سنہ ۹۹۳ھ حضرات ملا محمد جمیل جونپوریؒ سے پڑھیں اور مطولات "بلاد مشرق" میں دوسرے مشیوخ سے پڑھیں اور حدیث (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شاہ عبدالجلیل قدس سرہٗ، حضرت شاہ محمد صادق[۱] گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ حضرت شاہ محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عم محترم حضرت شیخ ابوسعید[۲] گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی۔ جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اسلاف کرام واجداد میں ہیں۔

قارئین کرام پر واضح ہو کہ باباشاہ مسافر اورنگ آبادی قدس سرہٗ (جن کے آستانہ پر یہ فقیر سات سال تک قیام پذیر رہا) کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم اعظم قدس سرہٗ تک پہونچتا ہے۔ حضرت مخدوم اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل و اوصاف حدود بیان سے باہر ہیں۔

اب اکابر متاخرین کے احوال مختصراً تحریر کرتا ہوں:۔

۷۵

مولانا میر خورد عزیزان بلخی قدس سرہٗ

آپ مخدوم اعظم قدس سرہٗ کے خواہرزادے ہیں۔ آپ کے باطنی اور روحانی کمالات کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ شہر بلخ اور اطراف وجوانب میں آپ کے بزرگی اور کرامت کی بہت ہی زیادہ شہرت تھی۔ ہر طرف آپ ہی کے اوصاف وفضائل کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر دل آپ کی کرامات سے متاثر اور ہر زبان آپ کے اوصاف و فضائل کے بیان میں رطب اللسان تھی۔ صاحب طبقات شاہجہانی، کہتے ہیں کہ سنہ ۹۹۳ھ میں اس دارِ فانی کو چھوڑ کر عالم علوی کا انہوں نے سفر اختیار فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ؕ

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر)

شیخ عبدالحق دہلوی قدس سرہٗ (سنہ ۱۰۵۲ھ) سے روایت کی۔ حقیقتاً شیخ مرجع انام تھے۔ بہت سی تالیفات ان کی یادگار ہیں۔ ان میں سے "بہار علمی" "ہدایۃ الصوفیہ" "معدان الدقائق" "حل المشکلات" "فیوضات" "علم الثقات" "علم المشکات" اسرار العاشقین (نظم) زاد المشائخ وغیرہ ہیں۔ سنہ ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)۔

[۱] ابن فتح اللہ حنفی گنگوہی۔ مشائخ چشتیہ میں ممتاز تھے۔ اپنے چچا شیخ ابوسعید گنگوہیؒ کے مرید تھے۔ شیخ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ سنہ ۱۰۴۰ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر، خزینۃ الاصفیاء، مفتاح التواریخ)

[۲] ابن نورالدین بن عبدالقدوس گنگوہی۔ مشائخ چشتیہ میں ممتاز تھے۔ شیخ نظام الدین بن عبدالشکورؒ تھانیسری کے مرید تھے (سنہ ۱۰۳۶ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی، شیخ محمد صادق اور دوسرے مشائخ سے فیوض حاصل کیے۔ سنہ ۱۰۴۹ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر، خزینۃ الاصفیاء) اور شیخ نظام الدین عمری تھانیسری مصنف ارشاد اللطائف میں (۹۔ ۹۶۹ھ) اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید ہیں آپ مشہور ومعروف اولیاء میں سے ہیں (نزہۃ الخواطر)۔

۷۶

مولانا پاینده اخسیکتی قدس سرہٗ

آپ حضرت مولانا میر خورد عزیزان کے خلیفۂ اکبر ہیں آپ کو نقش بند ثانی اور شیخ ولی تراش بھی کہتے ہیں ——— از خود رفتگی کے باوجود مخلوق الٰہی کے لیے خضر راہ تھے۔ لوگ آپ کے جمال باکمال کو دیکھ کر مدہوش ہو جاتے تھے۔ اور حقیقت کی منزل تلاش کرنے والے آپ کی ایک نگاہِ توجہ سے چند لمحات میں منزل مقصود (حقیقت اور معرفت کی منزل) تک پہنچ جاتے تھے ——— بخارا میں سجادہ مشیخت پر متمکن تھے۔ اور وہیں سے چشمۂ رشد و ہدایت اور دریائے منیض و کرامت جاری رہتا تھا۔ ——— آپ کی سخاوت و فیاضی سے ساری مخلوق اپنا دامن بھر کر تی اور فیوض و برکات سے مالا مال ہوتی تھی۔ طبقات شاہ جہانی کے مصنف کے قول کے مطابق آپ سن ۱۰۱۰ھ میں اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔

۷۷

شیخ درویش عزیزان قدس سرہٗ

آپ مولانا پاینده اخسیکتی کے کامل ترین خلفاء میں سے تھے۔ لوگ آپ کو "احرار ثانی" کہتے تھے۔ اس لیے کہ خداوند کریم نے آپ کو ظاہری اور باطنی دونوں نعمتوں اور دولتوں سے مالا مال فرمایا تھا۔ آپ کی جائیداد میں بہت سے گاؤں اور قصبے آپ کی ملکیت میں داخل تھے۔ لیکن اپنی جائیداد کی ساری آمدنی آپ اپنے مہمانوں اور مسافروں پر خرچ کرتے تھے ——— بادشاہ افاغنہ نذر محمد خان[1] نمازِ جمعہ کے وقت آپ کی

[1] شاہ جہان کے عہد میں بلخ، بدخشان، گھمر اور اس کے مضافات کے والی تھے۔ سنہ ۱۰۵۶ھ میں جب شاہ جہان نے تین لاکھ سواروں کے ساتھ قندھار کا رخ کیا۔ تو عالمگیر کو بلخ و بدخشاں کی طرف بھیجا۔ تاکہ وہ علاقہ نذر محمد خان سے چھین لیا جائے۔ شاہزادہ مراد بخش نے عالمگیر کے حکم سے وہ علاقہ فتح کیا

"والی توران برآمد از ملک توران"

اس کی تاریخ فتح ہے۔ جسے نصران شیرازی نے تعمیہ کے طریقہ سے استخراج کیا ہے۔ مختصر یہ کہ نذر محمد خان نے مال و دولت خاندان و املاک سب کچھ وہیں چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی۔ اس کی تاریخ مرزا عبد الرزاق مصنف کتاب "مجموع الصنائع" نے تعمیہ کے طریقہ سے اس طرح کہی۔

"شدہ ز بلخ و بدخشاں نذر محمد خان   زا و قبیلہ و املاک را گذشت در آن

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

زیارت کے لیے تشریف لائے ۔ اس وقت شیخ مراقبہ میں تھے ۔ آپ اپنا ایک ہاتھ اونچا اٹھائے ہوئے تھے اور انہوں نے اس وقت تک ہاتھ اٹھائے رکھا ۔ کہ قریب تھا کہ نماز جمعہ کا وقت گذر جائے ۔ کسی کو آپ پر اعتراض کرنے یا آپ کو ٹوکنے کی ہمت و جراءت نہیں ہوئی آخرکار آپ نے اپنا ہاتھ نیچا کیا اور نماز قائم کرنے کا حکم فرمایا ۔ نماز سے فراغت کے بعد بادشاہ وقت نذر محمد خاں نے نہایت ادب کے ساتھ آپ سے دریافت کیا کہ اس خاص حالت میں اتنی دیر تک رہنے کی کیا وجہ تھی ۔ آپ نے فرمایا بلخ کے سات کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے وہاں عبداللہ خان نے مسجد آدینہ (جامع مسجد) کے نام سے ایک شاندار مسجد بنائی ہے ۔ اس مسجد میں اس وقت میرے تمام عقیدتمند مریدین موجود تھے ۔ عین نماز جمعہ کے وقت جبکہ تمام لوگ نماز جمعہ میں مشغول و مصروف تھے مسجد کی چھت گرنے لگی ۔ میں ، اپنا ہاتھ اٹھا کر مسجد کی گرتی ہوئی اس چھت کو روکنے اور سنبھالنے میں مصروف تھا یہاں تک کہ جب سب لوگ مسجد سے باہر آ گئے تو اس چھت کو میں نے چھوڑ دیا ۔ اور وہ گر گئی ۔

بادشاہ نے کچھ لوگوں کو اس واقعہ کی تحقیق کے لیے بھیجا ۔ واقعہ ایسا ہی ہوا تھا ۔ غجدوان کے مقام پر آپ قیام پذیر تھے ۔ غجدوان ہی میں خواجہ جہانؒ کے قرب میں وفات کے بعد آپ دفن کیے گئے ۔

۷۸

بابا شاہ سعید پلنگ پوش قدس سرہٗ

آپ شیخ درویش عزیزان کے کامل ترین خلفاء میں سے ہیں ۔ پلنگ پوش آپ کا لقب اس لیے پڑا کہ آپ ہمیشہ چیتے کی کھال پہنے رہتے تھے ۔ بابا صاحب کی ولادت غجدوان میں ہوئی آپ کے والد ماجد وہاں کے رؤسا میں سے تھے ۔ بابا اپنی ابتدائی زندگی میں علوم متداولہ حاصل کرنے میں مصروف ہوئے زمانہ طالب علمی میں آپ اپنے تمام ساتھیوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور فائق تھے ۔ ایک دن سبق کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ علمی بحث و مباحثہ میں مصروف تھے ۔ اسی حالت میں آپ نے دیکھا کہ قلندروں کی ایک جماعت راستہ سے گذر رہی ہے ۔ اور انہیں گذرنے والوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس کا چہرہ بہت نورانی ہے ۔ جونہی آپ کی نظر اس شخص کے چہرہ پر پڑی آپ بے تابانہ اس کے پیچھے لگ گئے ۔ جب وہ صاحب مذکور اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو آپ نے ان سے درخواست کی کہ مجھ کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیجیے انہوں نے فرمایا کہ میاں ! فقیری بہت مشکل کام ہے ۔ اس کے حاصل کرنے میں تم کو پابند اور مقید ہو جانا پڑے گا ۔ اور ابھی تمہارا سن اس کی اجازت

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر)

کچھ دنوں ہندوستان میں مقیم رہ کر مکہ معظمہ روانہ ہو گیا ۔ راستہ میں سمنان کے قرب و جوار میں جمادی الثانی سال ۱۰۲۱ھ کی چاندرات کو انتقال کیا ۔ (مفتاح التواریخ ، مقالات الشعراء) ملاحظہ کیجیے اورنگ زیب خطوط کے آئینے میں از شمس بریلوی ۔

نہیں دیتا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ آپ نے اپنی درخواست واپس نہیں لی۔ التجا ہی کرتے رہے۔ چنانچہ اس مرد بزرگ نے ان کو برہنہ کرکے صرف ایک لنگی بندھوا دی۔ لنگی پہنتے ہی ان کا جذب اتنا شدید ہو گیا کہ اسی وقت وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور تقریباً گیارہ سال تک جنگلوں میں اسی طرح برہنہ پھرتے رہے۔ ——— قریہ قرشی میں ہفتہ میں دو بار بازار لگتا تھا کبھی کبھی آپ قرشی میں نظر آجاتے تھے اکثر لوگ آپ کو کپڑے دیا کرتے تھے۔ مگر کسی سے آپ تحفہ قبول نہیں کرتے تھے۔ عوام میں آپ سعید دیوانہ کے نام سے مشہور تھے۔ گیارہ سال کے بعد ایک دن آپ قرشی کے بازار میں لوگوں کے ہجوم کے درمیان اپنے ہوش میں آگئے۔ اور ایک شخص کا لباس لے کر خود پہن لیا۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ آج سعید دیوانہ ہوش میں آ گئے۔ جن بزرگ نے آپ کو یہ جذب عطا کیا تھا۔ ان کا نام "باباقل فرید" تھا۔ ہوش میں آجانے کے بعد بابا شاہ سعید بخارا کے بازار میں باباشاہ قل فرید کی خدمت میں پہنچے۔ پھر دونوں حضرات ایک ساتھ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور وہاں سے حج و زیارت کے بعد پھر بخارا کے بازار میں واپس آئے ایک دن "باباقل فرید" شاہ بابا سعید کا ہاتھ پکڑ کر حضرت شیخ درویش عزیزان کی خدمت میں لے گئے۔ اور فرمایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت آپ کے سپرد کرتا ہوں اس لیے کہ میرا وقت اب قریب آچکا ہے۔ ان ہی ایام میں باباقل فرید دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ اسی دن سے باباشاہ سعید، حضرت شیخ درویش عزیزان کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ اور آپ کی تعلیم و تربیت کی برکت اور آپ کی صحبت کے فیض و کمالات باطنی سے جلد آراستہ ہو گئے۔ باباقل فرید آپ کے پیر خرقہ ہیں اور حضرت شیخ درویش عزیزان آپ کے پیر ارادت ہیں۔ باباشاہ سعید ہندوستان تشریف لانے کے بعد نواب آصف جاہ کے والد نواب غازی الدین خان فیروز جنگ[1] کے لشکر کی حفاظت اور نگرانی کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ لہٰذا آپ ہمیشہ اس لشکر کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ آپ کی کرامات اور خوارقِ عادات بہت زیادہ ہیں۔ ——— حضرت عبدالرحیم بلخی جو حضرت باباشاہ مسافر کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں۔ اور جو قطب المحققین کی تحقیق کے مطابق ۱۱۳۲ھ میں دارالسلطنت لاہور میں اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرما ہوئے۔ ایک واقعہ یوں نقل فرماتے ہیں کہ:۔

ایک وقت باباشاہ مسافر قدس سرہٗ نے مجھے اورنگ آباد سے باباشاہ سعید قدس سرہٗ کی خدمت کیلیے

---

[1] قلیچ خان کے لڑکے ہیں۔ قلیچ خان کا نام عابد خان تھا۔ شاہجہان بادشاہ کے زمانہ میں ہندوستان آکر "قلیچ خان" کا خطاب صدر الصدور کا اور پنج ہزاری منصب پایا۔ قلیچ خان عہد عالمگیری میں ۱۰۹۸ھ میں قلعہ گولکنڈہ کے محاصرہ کے وقت مارے گئے۔ تو ان کے لڑکے شہاب الدین خان جو شاہجہان بادشاہ کے وزیر سعد اللہ خان کے داماد تھے۔ اور غازی الدین خان فیروز جنگ کے خطاب سے مفتخر تھے۔ بہادر شاہ کے ایام سلطنت میں گجرات کے صوبہ دار ہو گئے۔ ۱۱۲۲ھ میں انتقال ہوا۔ (مفتاح التواریخ، مآثر الامراء، نزہۃ الخواطر)

نواب فیروز جنگ کی فوج میں بیجاپور راستہ میں بحالت خواب میں نے دیکھا کہ دو ہاتھی میرے آگے پیچھے چل رہے ہیں اور میں ان کے بیچ میں ہوں۔ آگے والا ہاتھی چھوٹے قد کا ہے اور نہایت جوش و مستی کے ساتھ چل رہا ہے لیکن پیچھے والا ہاتھی جو شاندار ہے اور بڑے ڈیل ڈول کا ہے نہایت آہستہ آہستہ محوِ خرام ہے۔ بیدار ہونے کے بعد میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آگے والا ہاتھی بابا شاہ سعید قدس سرۂ ہیں اور پیچھے والا ہاتھی خود بابا شاہ مسافر قدس سرۂ ہیں شاید مرتبہ میں بابا شاہ مسافر زیادہ ہیں۔

جب میں بابا شاہ سعید کی خدمت میں پہونچا تو چھ ماہ تک ان کی خدمت میں رہا۔ اس اثناء میں میرے دل میں کوئی خیال نہیں گذرا۔ لیکن ایک دن جب کہ میں بابا شاہ سعید قدس سرۂ کی خدمت میں حاضر تھا اور حقائق و معارفِ الٰہیہ کی (حقیقت و معرفت کے موضوع پر) گفتگو ہو رہی تھی اسی وقت میرے دل میں گذشتہ خواب کا خیال گذرا۔ دل میں یہ خیال گذرا ہی تھا کہ دفعتاً بابا شاہ سعید قدس سرۂ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی لا نفرق بین احد من رسلہ۔ دوبارہ پھر ایک دن یہی خیال اس وقت میرے دل میں گذرا جبکہ ایک جماعت سے آپ مصروفِ گفتگو تھے۔ (جب کوئی خیال مسلسل دل میں گذرنے لگتا ہے تو پھر زندگی اور علائق زندگی کا کوئی دھیان نہیں ہوتا) آپ فوراً میری جانب متوجہ ہو گئے اور ارشاد فرمایا کہ اس موضوع کا تقاضا یوں ہی ہے کہ اس کا خیال دل سے نہ جائے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اپنے مرتبہ نبوت کے باوجود اس خیال سے بری نہیں تھے۔

ایک روز حضرت بابا شاہ سعید قدس سرۂ نے فرمایا کہ چالیس سال ہو چکے ہیں کہ آنکھوں کو نیند نصیب نہیں ہوئی ہے۔ اور ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سویا ہوں۔ حضرت بابا صاحب کی وفات سنہ ۱۱۰۱ھ میں رمضان المبارک کی ساتویں تاریخ کو ہوئی۔ جب کہ آپ گلبرگہ شریف کے شہر میں نواب فیروز جنگ کے لشکر گاہ میں تشریف فرما تھے آپ کے جنازہ مبارکہ کو اورنگ آباد میں لا کر تکیہ شریف میں دفن کیا گیا۔ ذیل کا مصرعہ تاریخ وفات ہے۔ ؎

"قصر جنت بود مکان سعید"

۱۱۰۱ھ

۷۹

بابا شاہ مسافر قدس سرۂ

بابا شاہ سعید پلنگ پوش کے ارشد خلفاء میں سے ہیں اور صاحبِ ولایت گذرے ہیں۔

لمولفہ:۔

قطب زماں صاحب شان عظیم	شاہ مسافر بہ درِ حق مقیم
قطب زماں مالک شان عظیم	شاہ مسافر درِ حق کے مقیم

خسرو بے تاج و نگین و علم　　تاج دِہ قیصر و خاقان و جم
آپ تھے بے تاج و نگیں بادشاہ　　آپ کے محتاج تھے خاقان و جم
ریشہ بہ اسرار حقیقت دواند　　دامن ہمت بہ دو عالم فشاند
واقف راز حقیقت تھے وہ　　یعنی تھے آزاد فکر دو عالم سے
خود شکنی با اثر ذکر او　　روشنی دل اثر فکر او
خود شکنی ذکر کا ان کے اثر　　روشن اثرِ فکر سے قلب و جگر
بادشہِ سلسلہ نقش بند　　یک نظر او دو جہاں را پسند
سلسلہ نقشبند کے تھے بادشاہ　　دونوں جہان کو پسند ان کی نگاہ

بابا شاہ سعید فرمایا کرتے تھے ۔ کہ سولہ حضرات ہمارے پاس سے کسبِ فیض کے بعد رخصت ہوئے اور سب پوشیدہ طور پر نکل گئے ۔ مگر شیخ شاہ مسافرؒ نے ہماری بزرگی اور شیخی کا اعلان کردیا ۔

بابا شاہ مسافرؒ غجدوان کے مقام میں پیدا ہوئے ۔ اور وہیں تعلیم و تربیت اور پرورش پائی ۔ آپ کا اصل نام "حافظ محمد عاشور" ہے ۔ بابا شاہ سعیدؒ نے ان کو مسافر کا خطاب عطا فرمایا ۔ اوائل عمری میں آپ میر عطاء اللہ ساکری کی خدمت میں حاضر رہے ۔ اور درویشانِ کبرویہ کے طریقہ پر نفس کشی و ریاضت کرتے رہے کچھ عرصہ کے بعد میر عطاء اللہ نے ان کو رخصت کیا اور سفر فرمانے کا حکم دیا ۔ انہوں نے وہاں سے "غزنی" کے مقام پر آکر بارہ سال تک قیام فرمایا ۔ اور وہاں کے اولیاءِ کرام اور مشائخ عظام کی صحبت اور خدمت میں حاضر رہ کر فیض حاصل کرتے رہے ۔ پھر وہاں سے آپ کابل تشریف لائے ۔ اور بابا شاہ سعیدؒ کو پالیا اور ان سے بیعت حاصل کی ۔ سات سال وہاں قیام کرکے اپنے مرشد کی اجازت سے حرمین شریفین کے سفر کا ارادہ فرمایا ۔

زیارت حرمین شریفین اور سفرِ حج سے واپس ہونے کے بعد شاہ "خلد مکان" کے ابتدائی دور میں ہندوستان واپس تشریف لائے ۔ اور اورنگ آباد کے مقام پر جہاں اب آپ کے مرقد (مزار مبارک) کا تکیہ ہے قیام فرمایا ۔ اور آخری دم تک پھر وہاں سے قدم نہیں اٹھایا ۔ وہیں رہ کر زندگی بھر آپ نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو درجہ کمال پر پہونچایا ۔ اور معرفت کی منازل طے کرائیں ۔ آخر کار رجب ۱۱۲۶ھ کو اس دنیائے فانی سے اپنا دامن کوتاہ کیا اور رہگزر عالم بالا ہوگئے ۔ اور اپنے مرشد کے پہلو میں آرام فرما ہوئے آپ کی تاریخ وفات میرزا عنایت اللہ بیگ اندجانی راجی تخلص نے اس طرح کہی ؎

مسافر شاہ اربابِ معارف　　مقیم عرش شد از فرش این طاق
خرد تاریخ سال رحلتش گفت　　مسافر شد ز عالم قطب آفاق

❊ ❊ ❊

۸۰

بی بی خورد قدس سرہا

آپ کی ولادت بلگرام میں ہوئی اور وہیں آپ کی تعلیم و تربیت اور پرورش ہوئی۔ جب آپ سن بلوغ کو پہنچ گئیں تو آپ کے والدین کو آپ کے عقد نکاح کی فکر ہوئی۔ آپ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے انکار فرمایا لیکن آپ کے والدین نہیں مانے انہوں نے آپ کے عقد کی تیاری شروع کر دی۔ جس وقت مشاطہ ان کا بناؤ سنگھار کر کے مہمان عورتوں کے سامنے لائی تو یہ عجیب قسم کا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا کہ وہ اللہ والی نیک بی بی مسکراتی ہوئی عالم ارواح کی جانب روانہ ہو گئیں۔

اُن کے والدین کو اس سے سخت جانکاہ صدمہ پہونچا۔ چنانچہ بیٹی کو اسی زیور اور لباس عروسی میں دفن کر دیا چوروں اور ڈاکوؤں کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو رات کے وقت ان کی قبر پہ آئے اور چاہا کہ قبر کو کھول کر ان کے زیورات اور سب کپڑے اتار لے جائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت اور اس کے حکم سے سب اندھے ہو گئے۔ اور حیرت کے عالم میں ششدر کھڑے صبح تک وہیں پڑے رہے۔

صبح کے وقت جب آپ کی یہ کرامت ظاہر ہوئی تو خلق اللہ میں ایک شور مچ گیا۔ اور آپ کی قبر مبارک کی خاک پاک صبح قیامت تک کے لیے زیارت گاہ خلائق بن گئی۔

محلہ خوردہ پورہ انہیں اللہ والی نیک بی بی کے نام سے مشہور ہے۔

اُن پر اللہ تعالیٰ کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں۔ آمین!

فصل اوّل تمام ہوئی

فصلِ دوم

احوال و تراجم

علمائے عظامؒ

مقدمہ فصلِ دوم

"علمائے کرام و فضلاء عظام کے حالات ضبط تحریر میں لانے سے پہلے چند ایسے گلہائے خوش رنگ عطر بیز صفحات پر منتشر کر رہا ہوں جن کی طرف اگر اربابِ ذوق اور حضرات فہام نظر توجہ مبذول فرمائیں گے تو یقیناً ان کی خوشبو سے اپنے دل و دماغ اور مشام جاں کو تر و تازہ اور عطر آگیں بنانے کی سعی فرمائیں گے"۔

احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار و اخبار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے منازل و مراتب سے جو حضرات آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہادی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث کی منازل و مراحل سے گذرنے والے حضرات کے قلوب پر یہ بات اچھی طرح روشن اور واضح ہے کہ قرون سابقہ اسلام یعنی آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے قبل دور جاہلیت میں بھی کچھ ایسے عالی دماغ اور بلند نظرت اصحاب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تھا جنھوں نے اپنے جسم و جان کو ذکر الٰہی اور عبادت خداوندی کی آنچ سے کچھ ایسا تپایا اور پگھلایا تھا کہ ان کی روح دنیاوی کدورتوں اور آلائشوں سے پاک و صاف ہو کر نکھر گئی تھی اور وہ "برائی العین" عالم ملکوت کے مناظر سے لطف اندوز اور لوح محفوظ کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوا کرتے تھے نیز کائناتِ عالم کی حقیقتوں کو اپنی قوت ادراک کے مطابق معلوم کر لیا کرتے تھے۔

انھیں بزرگوں نے مختلف علوم و فنون کے لیے طرح طرح کے قوانین وضع کیے اور نئی نئی اصطلاحیں بنا کر بعد میں آنے والے لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا "کشف الظنون" کے مصنف نے اپنی عبارت (عربی) میں جن خیالات کا اس سلسلہ میں اظہار کیا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"دنیا کے لوگ دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی علمی تحقیقات اور مساعی سے علوم و فنون کی شان میں اضافہ کیا ہے۔ نیز حقائق و معارف کے بحر ناپیدا کنار میں غوطے لگا کر گوناگوں گوہر نایاب نکالے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ اس جماعت سے متعلق ہیں جنھوں نے علوم کی طرف صرف اس حیثیت سے توجہ فرمائی ہے کہ ان کو صرف برائے نام

عالم کہا جا سکتا ہے (انھوں نے اس بارے میں تحقیق سے کام نہیں لیا ہے)

پہلی قسم کے لوگوں میں ملک مصر، روم، ہندوستان، فارس و عرب کے باشندے اور عبرانیین یعنی بنی اسرائیل اور کلدانیین ہیں۔ کلدانیین اس فرقہ کے لوگ ہیں جن کی زبان سُریانی تھی اور زمانۂ قدیم میں جن کا وطن جزیرۂ عرب اور سرزمین عراق تھا۔ دوسری قسم کے لوگوں میں باشندگان ملک چین اور ترکستان کے سوا دنیا کے تمام ممالک کے لوگ شامل ہیں جب مہر عالمتاب اسلام فضائے عرب کے افق سے طلوع ہوا اور دونوں جہان کے امام سیدنا حضرت خیرالانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث مبارک کے اس مضمون کے مطابق یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بموجب ازویت لی الارض فرأیت مشارقھا ومغاربھا وسیبلغ امتی ما زوی لی۔[1] تو ابتدا میں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ نیز مسلمانوں نے پچھلی امتوں کی بہت سی کتابیں جلا ڈالیں۔[2] اور علماء نے توراۃ اور انجیل وغیرہ کے مطالعہ کو ممنوع قرار دیا۔ بلکہ بعض علماء نے تو ان کتابوں کے مطالعہ پر کفر کا فتویٰ تک دے دیا۔ بخاری شریف کے شارح کرمانی فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے توریت اور انجیل کی تحریف میں بایں صورت اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ تحریف لفظی ہے یا معنوی۔ بعض لوگ شق ثانی کی طرف گئے ہیں اور انھوں نے ان کتابوں کا مطالعہ جائز رکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ قول باطل ہے۔ اس باب پر تمام امت کا اجماع ہے اور اتفاق ہے کہ ان تحریف شدہ کتابوں کا مطالعہ ناجائز ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس توراۃ کا ایک نسخہ دیکھا تو اظہار ناپسندیدگی فرمایا۔"

(کرمانی کا قول ختم ہوا)

جب حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے فارس کا ملک فتح کیا اور فلسفہ کی بیشمار کتابیں ان کے قبضہ میں آئیں تو انھوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان کتابوں کو کیا کرنا چاہیئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ:

ترجمہ "اُن کو پانی میں ڈال دو۔ اگر وہ ہدایت ہیں تو اللہ تعالےٰ نے ہم کو اس سے عظیم ہدایت عطا فرمائی ہے۔ اور اگر وہ گمراہی ہیں تو اللہ تعالےٰ نے ہم کو اُن سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ان تمام کتابوں کو پانی میں بہا دو اور نذر آتش کر دو"[3]

---

[1] حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ ہیں، جسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔

[2] یہ قول صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔

[3] مقدمہ ابن خلدون صـ ۲۵ طبع اول ۱۳۲۹ھ۔

الغرض تمام مسلمانوں نے اس پر اتفاق کرلیا کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس پر عمل کرنے کی ہدایت رسولِ اکرم تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک اور زبان وحی ترجمان سے ہی حاصل کریں گے۔ نیز آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے اس طرح کی نعمتیں اور دینی ہدایتیں حاصل کریں گے اس لیے کہ انھوں نے رسولِ اکرم منبعِ علم وحکم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت کے فیض سے نورِ ہدایت کے سرچشمے اور عقل حکمت کے خزانے پائے ہیں اور ان کا زمانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے متصل تھا۔ اسی طرح تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بھی علوم شریعت کے قوانین وضوابط مرتب کرنے کی ضرورت لائق نہیں ہو بلکہ بعض حضرات تو علمِ دین اور قوانینِ شریعت سے متعلق کسی کتاب کی تالیف کو مکروہ سمجھتے تھے اور اس کے جواز میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث کو بطورِ استدلال پیش کرتے تھے کہ ا۔ استاذن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی کتب العلم فلم یاذن لہ[1]۔ ایک شخص نے ایک مجموعہ حدیث لکھ کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے پیش کیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس کو لے لیا اور پانی سے دھوکر اس کے حروف مٹا دیئے اس شخص نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اس خوف سے ایسا کیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگ کتاب پر بھروسہ کرکے حفظ کرنا چھوڑ دو۔

جب مذہب اسلام نے وسعت اور ترقی پائی اور اہلِ اسلام نے مشرق ومغرب کے تمام شہروں پر قبضہ کرلیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف شہروں میں تقسیم ہوگئے اور ان میں سے اکثر صحابہ کرامؓ دنیا سے رخصت ہوگئے، مختلف اطراف وجوانب سے فتنوں نے سر اٹھایا اور لوگوں کے خیالات اور عقائد میں اختلاف رونما ہونے لگا۔ علوم دین کے حافظوں اور عالموں کی ہستیاں بھی کم رہ گئیں۔ مسلمانوں کے دینی حوصلے بھی پست ہوگئے تو عام مسلمانوں نے باقی ماندہ علماء ومجتہدین کی طرف رجوع کیا اس وقت اور شرعی احکام میں فتویٰ نویسی کا آغاز ہوا لیکن اس بات کا اندیشہ ہوا کہ کہیں شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام قوانین زوال پذیر نہ ہوجائیں اور حق وباطل کے ساتھ مل کر مختلط اور تلف نہ ہوجائیں۔ چنانچہ تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آخری دور میں علمائے مذہبِ اسلام نے تدوینِ حدیث کا آغاز کیا۔ اور اس امتِ مسلمہ مرحومہ پر اپنا بہت بڑا حق ثابت کردیا (اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔)

اب اختلاف اس امر میں ہے کہ دورِ اسلام میں جس شخص نے سب سے پہلے تدوینِ حدیث پر کام کیا وہ کون ہے؟ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے اسلام میں حدیث کی تدوین پر قلم اٹھانے والے عبدالملک بن عبدالعزیز[2] بصری ہیں جن کی وفات ۱۵۶ھ میں ہوئی اور بعض لوگوں کی رائے میں تدوینِ حدیث پر سب سے

---

[1] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم (حدیث) کو ضبطِ تحریر میں لانے کی اجازت مانگی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی

[2] ابومحمد عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج مکی (۸۰ھ - ۱۵۰ھ / ۶۹۹ - ۷۶۷ء) رومی الاصل تھے۔ موالی قریش میں تھے (تذکرۃ الحفاظ، ابن خلکان، تاریخ بغداد، دول الاسلام، طبقات المدلسین)

پہلی تالیف ربیع بن صبیح[1] کی ہے جنھوں نے سنہ ۱۶۰ھ میں انتقال فرمایا۔ اس کے بعد اس موضوع پر سفیان[2] بن عینیہ کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد امام مالک[3] رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں "موطا" مرتب کی اس کے بعد عبد اللہ[4] بن وہب نے مصر میں، معمر[5] بن عبد الرزاق نے یمن میں، سفیان ثوری[6] اور محمد[7] بن عقیل و ابن عمران نے کوفہ میں، حماد بن سلمہ[8] اور روح بن عبادہ[9] نے بصرہ میں، ہشیم[10] نے واسط میں، اور عبد اللہ[11] بن مبارک نے خراسان میں حدیث شریف کی کتابیں مدوّن کیں۔

ان بزرگوں کا مطمح نظر اپنی ان تصانیف میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو واضح کرنا اور قرآن و حدیث

۱۔ ابو بکر السعدی البصری (م ۱۶۰ھ) یہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے بصرہ میں تدوین حدیث پر کام کیا (تہذیب التہذیب، حلیۃ الاولیاء)۔

۲۔ ابن میمون الہلالی کوفی۔ حرم مکہ کے محدث تھے حافظ و ثقہ تھے۔ ان کے اور مالک بن انس کے اوپر اہل حجاز کے علم کا مدار تھا۔ حدیث میں الجامع، اور تفسیر میں ایک کتاب ان کی تالیفات سے ہے (تذکرۃ الحفاظ، رسالہ مستطرفہ، صفوۃ الصفوۃ، ابن خلکان، میزان الاعتدال حلیۃ الاولیاء، الشعرانی، تاریخ بغداد)

۳۔ ابو عبد اللہ مالک بن انس، امام دار الہجرۃ (مدینہ منورہ) ۹۳ - ۱۷۹ھ، ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں، مالکی مذہب انہی سے منسوب ہے۔ ان کی تالیفات میں موطا، بہت زیادہ مشہور ہے۔ حیات امام مالک پر ابو زہرہ مصری اور امین خولی کی مستقل تصنیفات ہیں۔ (دیباج المذہب، الوفیات، تہذیب التہذیب، حلیۃ ابی نعیم، الانتقاء، معجم المطبوعات)

۴۔ ابن مسلم الفہری، (۱۲۵ - ۱۹۷ھ) مذہب مالکی کے فقیہ تھے۔ کتاب الجامع اور موطا (فن حدیث میں) ان کی تصانیف ہیں۔ (تہذیب، الوفیات، الانتقاء)۔

۵۔ معمر بن راشد ابو عروہ یمنی (م ۱۵۳ھ) یمن میں تدوین حدیث پر قلم اٹھانے والے آپ پہلے شخص ہیں

۶۔ ابن سعید بن مسروق الثوری (۹۷ - ۱۶۱ھ) امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے مشہور تھے علوم دینیہ اور تقوی میں بلند پایہ تھے کتاب جامع کبیر و صغیر حدیث میں اور ایک کتاب فرائض میں ان سے منسوب ہے۔ ابن جوزی نے ان کے مناقب میں ایک مستقل تالیف کی ہے۔ (جواہر مضیئہ، طبقات ابن سعد، اصید الخاطر)۔

۷۔ ابو عبد اللہ محدث بلخ مصنف المسند، التاریخ، الابواب (تذکرۃ الحفاظ)۔

۸۔ ابن دینار بصری، ربعی، رجال حدیث میں سے ہیں۔ ثقہ تھے مگر کبر سنی میں حافظہ خراب ہو گیا تھا اسی لیے امام بخاری نے ان کو ترک کر دیا ہے۔ صاحب تالیفات ہیں (تہذیب التہذیب، میزان الاعتدال)۔

۹۔ ابو محمد قیسی، ثقہ تھے سنن و احکام میں ایک کتاب تالیف کی ہے اور ایک تفسیر بھی لکھی ہے ائمہ ان سے روایت کرتے ہیں (تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد)

۱۰۔ (۱۰۴ - ۱۸۳ھ) ابن بشیر بن ابی خازم واسطی نزیل بغداد مفسر ہیں اور ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ چار سال رہے۔ علاوہ تفسیر کے فقہ میں کتاب السنن اور مغازی ان کی یادگار ہیں (میزان الاعتدال، تاریخ بغداد)۔

۱۱۔ (۱۱۸ الغایۃ ۱۸۱ھ) حدیث و فقہ کو جمع کیا۔ کتاب الجہاد اور الرقائق ان کی یادگار ہیں (المستطرفہ، مفتاح السعادۃ، شذرات)۔

کے معانی اور مفاہیم کو مشرح اور مفصل بیان کرتا تھا۔ جب خلافت بنو عباس کے حصہ میں آئی تو خلیفہ ثانی منصور[1] دوانقی ایرانی امراء کی صحبت سے متاثر ہو کر علوم فلسفہ کی جانب راغب[2] ہوا خصوصاً علم نجوم سے اس کو بڑا شغف تھا۔ نجومیوں اور ستارہ شناسوں پر خاص طور پر نگاہِ لطف و کرم تھی[3]۔ جب ساتویں خلیفہ مامون[4] بن ہارون رشید کا زمانہ آیا تو اس نے ان علوم (فلسفہ و نجوم) کی طرف خاص توجہ کی اور اس کے آباء و اجداد نے جس فن کی بنیاد ڈالی تھی اس نے اس کی عمارت مکمل کر دی۔ نیز اس نے فلسفہ کے علم و فن کو اس کے اصل منبع سے استخراج کیا۔

اور بادشاہ روم کے پاس اپنے ایلچی بھیج کر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں۔ شاہ روم کو افلاطون[5]، ارسطو[6] بقراط[7]، جالینوس[8]، اقلیدس[9]، اور بطلیموس[10] وغیرہ کی جتنی تصانیف میسر آسکیں ان سب کو اس نے خلیفہ

---

[1] ابو جعفر منصور عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (۹۵ لغایۃ ۱۵۸ھ) بنو عباس کا دوسرا خلیفہ اپنے بھائی سفاح کے انتقال کے بعد ۱۳۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا، اسی نے شہر بغداد کی بنیاد رکھی۔ مدت خلافت بائیس سال ہے۔ عمر بن شیبہ نمیری نے اس کی سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے (ابن اثیر، تاریخ الخمیس، تاریخ بغداد)۔

[2] یعنی ۱۳۶ھ میں۔ مقدمہ ابن خلدون میں تفصیل ہے۔ اور شبلی نے اپنے مقالات میں لکھا ہے کہ منصور عباسی سے علوم فلسفہ کے تراجم کی ابتداء بتانا مؤرخین کی نیاضی ہے ورنہ اس کی بنیاد تو عہد بنی امیہ میں پڑ چکی تھی۔

[3] علم نجوم کی اہم کتاب "سندھ ہند" ہے (مقالات)

[4] مامون عباسی (۱۷۰ھ تا ۲۱۸ھ) عبداللہ بن ہارون الرشید بن محمد المہدی بن ابی جعفر المنصور ابو العباس بنی عباس میں خلیفہ ہفتم ہے۔ سیرت، وسعت علم و فتوحات میں بہت مشہور ہے۔ مؤرخ ابن دحیہ نے "العالم المحدث النحوی اللغوی" اس کو لکھا ہے۔ اپنے بھائی امین الرشید کو اپنے راستہ سے ہٹانے کے بعد ۱۹۸ھ میں تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کے عہد میں یونان کے بڑے بڑے حکماء کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا "خلق قرآن" کے فتنہ کو بھی اسی کے عہد میں فروغ ہوا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ (تاریخ بغداد، المسعودی، ابن اثیر)

[5] (۴۲۷ ق م - ۳۴۷ ق م) یونان کا مشہور فلسفی، سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا "بستان اکیڈمی" میں اپنے فلسفہ کا درس دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کی بنیاد "صور افلاطونیہ" ہے اس کا کہنا ہے کہ فکر کی انتہاء "خیر" ہے۔ کتاب الجمہوریہ یا سیاسۃ الشرائع کے موضوع پر اس کی کتاب مشہور ہے۔ (المنجد الاعلام)

[6] ارسطو یا ارسطاطالیس، اسکندر کا استاد اور مشہور یونانی فلسفی تھا (۳۸۴ - ۳۲۲ قبل مسیح) اعاظم مفکرین میں شمار ہوتا تھا۔ اسحاق بن حنین (مؤسس فلسفۃ المشائین) نے اس کے منطق، فلسفہ، الٰہیات اور اخلاق کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کی کتابیں، مابعد الطبیعۃ، الکون والفساد، السماء والعالم، الخطابہ، المقولات یہ سب نام عربی تراجم کے ہیں (المنجد الاعلام)

[7] (۴۶۰ قبل مسیح) یونان کے جزیرہ کوس میں پیدا ہوا، مشاہیر اطباء قدیم میں تھا۔ سب سے پہلے اسی نے اخلاط کے فساد کو امراض کا سبب بتایا ہے۔ "تقدمۃ المعرفۃ وطبیعۃ الانسان" اس کی مشہور کتاب ہے جو عربی میں اسی نام سے ترجمہ ہو چکی ہے (المنجد الاعلام)۔

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہارون الرشید نے باکمال مترجمین سے ان کا ترجمہ کرایا اور ان تراجم کو طلباء کے درس میں داخل کر دیا۔ اس دور کے دانشوروں نے اپنے عزم صمیم سے اپنی اہلیت وصلاحیت کے مطابق ان علوم کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ ان بزرگوں نے اپنی کوششوں سے آنے والی نسلوں اور دور مستقبل کے طلباء کے لیے اس فن میں نہایت ہی لطیف اور دلچسپ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔
ان دانشوروں میں معلم ثانی ابو نصر فارابی[۱]، ابو علی سینا[۲]، قاضی ابو الولید بن الرشید[۳] اور وزیر ابو بکر مشہور وممتاز ہیں۔ جو ابن الاصابیع اندلسی کے نام سے مشہور ہیں۔ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ اس سلسلہ میں صاحب "کشف الظنون" کی رائے مختصرا پیش کی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

• یہ عجیب بات ہے کہ علوم شرعیہ وعلم فلسفہ ومنطق کے علماء اکثر عجمی ہیں۔ البتہ فن خطابت فصاحت وبلاغت اور شاعری کو عربوں نے درجۂ کمال پر پہونچایا اور کوئی دوسری قوم ان کی بلندیوں تک نہ پہونچ سکی۔ چونکہ تمام علوم شرعیہ کی بنیاد قواعد واصول پر ہے۔ اور یہ تمام قوانین ایسے دوسرے علوم وفنون کے محتاج ہیں جو علوم شرعیہ سے آگہی کا ذریعہ ہیں۔ مثلاً عربی زبان کے قواعد، استنباط مسائل کے قواعد وضوابط۔ فن قیاس کے اصول اور ان تمام دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے قاعدے اور ضابطے

بقیہ حاشیہ[۸] (۱۳۱ — ۲۰۱ قبل مسیح) اطباء یونان میں سے ہے جس کو تشریح ومنافع الاعضاء کے علم میں بڑی دسترس تھی۔ اطباء تے عربی اس کی اتباع کی (المنجد الاعلام) [۹] (۳۰۶ — ۲۸۳ قبل مسیح) بطلیموس کے زمانہ میں اسکندریہ میں علم ہندسہ کی تعلیم دیتا تھا۔ علم ہندسہ کی مبادیات اسی نے وضع کی "الاصول" اس کی مشہور کتاب ہے جس پر علامہ نصیر الدین طوسی نے شرح لکھی ہے۔ [۱۰] بالائے مصر میں پیدا ہوا۔ ہیئت، تاریخ وجغرافیہ کا عالم تھا۔ المحلی واکثار البلاد اس کی مشہور تالیفات ہیں علم افلاک میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ زمین متحرک نہیں ہے اور آسمان اس کے گرد گھوم رہا ہے (معجم الاعلام) مذکورۃ الصدر تمام نام تراجم کے ہیں اصل نام یونانی ہیں۔ حاشیہ صفحہ ہذا:۔ [۱] ابو نصر فارابی۔ محمد نام فاراب میں پیدا ہوئے اور دمشق میں وفات پائی۔ علماء نصاریٰ سے فلسفہ پڑھا اور ارسطو کے بعد "معلم ثانی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اپنے فلسفہ کی بنیاد افلاطون کے فلسفہ پر رکھی۔ اس طرح جدید اسلامی فلسفہ کی بنیاد پڑی۔ ریاضیات اور فن موسیقی کے ماہر تھے۔ کتاب "احیاء العلوم" اور "المجموع" فارابی کی تالیفات ہیں اور مقالہ فی العقل اور رسالہ فی اثبات المفارقات ان کی تالیفات میں بہت مشہور ہیں (المنجد الاعلام) [۲] حسین بن عبد اللہ بن سینا ابو علی (۳۷۰ — ۴۲۸ھ) ان کی تالیفات علم طب، منطق، فلسفہ، طبیعیات، الہیات میں مشہور ہیں نظریات الہیات، نبوات، معاد اور شرائع میں ملحد تھے۔ الحاد میں ان کے اشعار مشہور ہیں۔ ایک سو کتابیں انھوں نے تالیف کیں۔ طب میں "القانون" ایک کتاب ہے جو چھ صدیوں تک علم طب میں معتمد ہے اس کے علاوہ الارشادات (فلسفہ ومنطق) رسالہ حی بن یقظان، الشفاء (حکمت واخلاق میں) اور لغت میں لسان العرب ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ دو فیات، تاریخ علماء الاسلام، لسان المیزان الشیخ کی مؤلفات پر جارج قنوتی نے ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے اور محمود وفرتیح ابن سینا بین الدین والفلسفہ تحریر کی ہے۔ [۳] ابن رشد (۵۲۰ — ۵۹۵ قبل) محمد بن احمد بن محمد بن رشد اندلسی فلسفی مصنف بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ارسطو کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں اور ان میں اضافے کیے۔ ان کی بہت سی تالیفات ہیں جیسے فلسفہ ابن رشد تہافۃ التہافہ رد غزالی میں۔ ان کی سیرت میں عباس محمود عقاد کی "ابن رشد" سب سے بہتر کتاب ہے۔

جن کے ذریعہ عقائدِ باطلہ کا رد کیا جاسکے۔ اور یہ تمام فنون تعلیم و تعلم کے محتاج ہیں۔ فنکار اساتذہ کی ہدایت و اعانت کے محتاج ہیں اور یہ فنون ان علمی کاوشوں (صنعتوں) کے تابع ہیں جو اہل حضارت (اصحاب بلاد) سے متعلق ہیں۔ تمدن و حضریت کے تمام اوصاف و آداب عجم کے تابع ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ ان صنائع اور مختلف حرفتوں میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اور اس خصوصیت میں وہ دوسری امتوں اور قوموں سے بڑھ چڑھ کر ہیں اس میں شک نہیں کہ علوم و فنون کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے میں اہل عجم کی برابری دوسرے لوگ نہیں کرسکتے۔ علم نحو کے ممتاز اور فنکار علماء میں سے سیبویہ[1]، ابو علی فارسی[2] اور زجاج[3] ہیں اور یہ سب کے سب ایرانی نژاد اور عجمی ہیں۔

ان لوگوں نے اہل عرب کے اختلاط اور ارتباط سے عربی زبان سیکھی۔ اور عربی زبان کے قوانین و ضوابط کو احاطہ تحریر و قیدِ کتابت میں لاکر محفوظ فرمایا۔ اور اسی طرح محدثین و حفاظ حدیث نے اصحاح ستہ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، سنن نسائی) کے جامعین اور دوسرے مفسرین و اصولین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) ہیں کہ ان میں اکثریت عجمیوں کی ہے۔ ہاں علم فلسفہ و منطق، ہیئت و نجوم وغیرہ کے علوم و فنون ان سب کو صناعت میں شمار کیا گیا ہے اور ان علوم پر کتابیں تصنیف کرنے کا سہرا عجمیوں ہی کے سر ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ ادبی و فنی کارنامہ انجام دینے کے لیے عجمیوں کو ہی منتخب فرمایا تھا۔ "کشف الظنون"

چونکہ مملکت روم و ایران و توران قدیم الاسلام ہیں اور ان علوم کا یہ پودا سب سے پہلے اس سرزمین عجم میں لگایا گیا اور اس کی جڑیں ادھر اُدھر پھیلیں اور "جڑ زمین میں ہے اور شاخیں آسمان پر" کا مصداق اس پر ثابت آیا۔ جب ان ممالک کے بعد اسلامی لشکر نے تسخیر ہند کے لیے اپنے علَم بلند کیے اور اسلامی پرچم سرزمین ہند پر سایہ گستر ہوا تو بہت سے علماء عالی مقام ہندوستان میں تشریف لائے اور اپنے انوارِ علمی سے شبستان

---

[1] (۱۲۹ — ۱۸۰ھ) عمرو بن عثمان بن قنبر الحارثی۔ سیبویہ لقب، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نحو کو تفصیل سے مرتب کیا۔ اور انہی کی وجہ سے علم نحو کی شہرت ہوئی۔ علماء نے ان کی سوانح حیات پر مستقل کتب تالیف کی ہیں۔ اس سلسلہ میں علی نجدی کی "سیبویہ امام النحاۃ" اور احمد بدوی کی "تالیف حیاۃ سیبویہ" مشہور ہیں۔ (ابن خلکان، الشریشی، البدایہ والنہایہ، طبقات النحویین) [2] ابو علی فارسی (۲۸۸ — ۳۷۷ھ) الحسن بن احمد بن عبد الغفار الفارسی الفسوی، مشاہیر ائمہ عربیہ میں سے ہیں ان کی تالیفات میں سے بعض "التذکرۃ" علوم عربیہ میں، ۲۰ جلدیں)، تعالیق سیبویہ (۲ جز) "الحجہ" (علم قرأت میں) جواہر النحو، المقصور والممدود والعوامل (علم نحو میں) اور عضد الدولہ کے لیے کتاب الایضاح، تصنیف کی ہیں (نزہۃ الالباء، تاریخ بغداد، انباہ) [3] الزجاج (۲۴۱ — ۳۱۱ھ) ابراہیم بن محمد بن السری بن سہل، ابو اسحاق الزجاج، علمائے لغت و نحو میں سے تھے۔ المبرد (صاحب الکامل) سے تعلیم حاصل کی ان کی تعلیم کا قصہ مشہور ہے۔ امام شعبہ سے خاص قرب رکھتے تھے۔ معانی القرآن، الاشتقاق، الامالی ان کی مشہور کتابیں ہیں (معجم الادباء، نزہۃ الالباء، انباہ، تاریخ بغداد، ابن خلکان)۔

ہند کو منور کیا اور علوم عقل و نقل کے چراغ اس سرزمین میں روشن کیے، اس کے بعد ہر دور میں ان علمائے کرام نے اپنے وجود گرامی سے اس سرزمین کو عزت بخشی اور ہر عصر اور ہر دور میں علوم کی ترویج کی اور علوم و فنون کو پھیلایا جس کی تفصیلات آپ کو کتب تاریخ میں مل سکتی ہیں۔

میں اس مختصر کتاب میں برکت کے طور پر صرف کچھ ایسے مشہور اور مخصوص علماء کا ذکر کر رہا ہوں جو بہت ممتاز گزرے ہیں۔ ان حضرات کے ذکر کے بعد بلگرام کے ان علماء و فضلاء کا ذکر کروں گا جو اس کتاب "ماثر الکرام" کی تالیف کا محرک ہوئے ہیں جن کے اذکار کے لیے میں نے " ماثر الکرام " مرتب و تالیف کی ہے۔

(۱)

مولانا حسن قدس سرہ

ابن محمد بن حسن حیدر الصغانی لاہوری[۱] نور اللہ مرقدہ، آپ ایک عالم متبحر اور دینی علوم کے بلند پایہ محقق تھے۔ علم فقہ و حدیث اور دوسرے علوم و فنون میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ماہ صفر کی پندرہویں تاریخ ۵۷۷ھ[۲] میں آپ لاہور میں پیدا ہوئے۔ صغانی آپ کو آپ کے آباء و اجداد کے اصل وطن کی مناسبت سے کہا جاتا ہے۔ صَغان[۳] صاد کے زبر اور غین معجمہ کے ساتھ ماوراء النہر کا ایک شہر ہے۔

ابتدائے عمر میں آپ نے اپنے والد ماجد کی خدمت میں رہ کر درسی کتابیں پڑھیں اور بہت سے علوم و فنون حاصل کیے۔ چونکہ ایران و توران اور روم کے ممالک زمانہ قدیم سے ہی اسلام کی آغوش میں آ چکے تھے۔ اس لیے ان تمام علوم و فنون کی جڑیں سب سے پہلے ان ہی ممالک میں پھیلیں اور مضبوط ہوئیں اور انھیں ممالک کو اصلھا ثابت و فرعھا فی السمآء کا مرتبہ ملا۔

اس کے بعد جب اسلامی افواج کی فتح و نصرت کے پرچم ہندوستان کی سرزمین پر لہراتے اور اس کی سلطنت پر سایہ افگن ہوئے تو بلند مرتبہ علماء کی ایک جماعت نے اپنی تشریف آوری کے نور سے ہندوستان کی مجلس کو روشن کیا۔ اور علوم دین و فلسفہ و منطق کے انوار سے ہر طرف نور کے چراغ جلا دیئے اس کے بعد ہر دور میں ذی مرتبہ اور باوقار علماء کی یہ جماعت سرزمین ہند میں پیدا ہوتی رہی اور اپنی عالی ہمتی اور کوشش سے دینی علوم و فنون کی اشاعت کے جھنڈے ہر طرف بلند کرتی رہی۔ اس کی تفصیل تواریخ[۴] کی کتابوں میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

---

[۱] فوائد الفواد میں ہے کہ یہ بداؤں کے تھے۔ یہ لاہور کے تھے یا بداؤں کے؟ اصل میں یہ ایک ہی شخصیت ہیں یہ لاہور کے تھے اور بداؤں میں شہرت حاصل کی۔ (تاریخ ہند، بزم مملوکیت، فوائد الفواد) [۲] نزہۃ الخواطر میں ان کی ولادت ۵۵۷ھ لکھی ہے۔ [۳] صاغان، "چغان" کا معرب ہے (معجم البلدان) [۴] مقدمہ نزہۃ الخواطر از سید عبد الحی لکھنوی۔

اور تمام علوم و فنون میں مہارت تامہ حاصل[1] کی۔ ۶۱۵ھ میں آپ بغداد تشریف لے گئے اور کئی سال تک وہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ پھر بغداد سے آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور زمانہ دراز تک خانہ کعبہ کی مجاوری کی خدمت انجام دے کر پھر عراق کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۶۱۷ھ میں خلیفہ وقت نے آپ کو سفارت کی خدمت پر ہندوستان بھیجا[2]۔ ۶۲۴ھ میں آپ خدمت سفارت انجام دیکر ہندوستان سے عراق روانہ ہوئے۔ دوسری مرتبہ پھر آپ سفارت کی خدمت انجام دینے کے لیے عراق سے ہندوستان آئے اور ۶۳۷ھ میں ہندوستان سے لوٹ کر بغداد واپس آ گئے۔

مکہ معظمہ اور عراق، عرب و ہندوستان میں آپ نے اکثر فضلاء کرام و علماء و محدثین عظام سے حدیثیں سماعت فرمائیں نیز فن حدیث میں بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں مثلاً مشارق الانوار جو فن حدیث کی بہت مشہور کتاب ہے۔ اور شرح بخاری، مصباح الدجیٰ، الشمس المنیرہ، در السحابہ[3] وغیرہ۔ اور ہر ایک کتاب کی شرح بھی لکھی۔ اس کے علاوہ فن لغت میں آپ نے کتاب شوارد و عباب اور شرح القلادۃ السمطیہ فی توشیح الدریدیہ[4] اور فن لغت میں کتاب الانفعال لکھی۔ کتاب الفرائض اور کتاب العروض[5] بھی آپ ہی کی تصانیف میں ہیں۔

---

[1] مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ، شارح گازرونی کے قول کے مطابق مصنف نے اس کتاب میں ۲۲۴۶ صحیح حدیثیں جمع کی ہیں۔ یہ مستنصر باللہ عباسی کے لیے تحریر کی گئی چنانچہ دیباچہ میں مصنف لکھتے ہیں "یہ کتاب پسندیدہ ہے اور اس کی روشنی سے روشنی حاصل کی جائے گی اور یہ المستنصر بن الظاہر بن الناصر بن المستضیٔ العباسی کے خزانہ کے لیے عمل کے واسطے تحریر کی گئی" نیز مصنف بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے "مصباح الدجیٰ" اور "شمس منیرہ" کی تالیف سے فراغت پائی اسی میں ان احادیث کو بھی شامل کر دیا جو النجم اور الشہاب میں مذکور ہیں اور احادیث کے مخارج کو حروف تہجی کے اعتبار سے میں نے بیان کیا ہے۔ شرحوں کی فہرست "کشف" میں دیکھنا چاہیے اور کتاب الشہاب اور النجم میں قاضی ابو عبداللہ محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون القضاعی الشافعی نے ۴۵۴ھ میں تقریباً بارہ سو کلمات جو حکمت، موعظت اور امثال میں ہیں جمع کیا ہے۔ ان کو "شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب" سے موسوم کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ نجم الدین النیلی محمد بن احمد الاسکندری متوفی ۷۰۳ھ نے اس کی تلخیص کی۔ اور شیخ حسن صغانی نے دونوں کتابوں کی اصلاح کی۔ ان کے ابواب بنائے اور اس کا نام "کشف الحجاب عن احادیث الشہاب" رکھا۔ یہ کتاب آداب و حکم و امثال میں بہترین مجموعہ ہے علامہ ابن اثیر نے کتاب "المثل السائر" میں اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کی ہے۔ نیز شیخ صغانی نے شہاب قضاعی کی شرح بھی لکھی ہے (کشف الظنون)۔ [2] یعنی سلطان شمس الدین التمش کے پاس۔ بحیلہ نزہۃ الخواطر میں امر الدین اللہ مذکور ہے۔

[3] کتاب کا پورا نام در السحابہ فی مواضع وفیات الصحابہ ہے۔ القصیدۃ المقصورہ جو الف مقصورہ کے قافیہ پر ہے بزبان فارسی آل میکال کی مدح میں اور شرح حسن صغانی عمدہ ترین تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔ [4] ابن درید محمد بن حسن الازدی، عظیم علماء اور مشہور شعراء میں تھے ان کی مشہور تالیفات میں "جمہرۃ اللغۃ" تین جز اور چوتھا جز فہارس" دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے۔ ذخائر الحکم، المجتنیٰ، صفۃ السرج واللجام، السحاب والغیث، الامالی، ادب الکاتب، تقویم اللسان، الوشاح، اللغات میں ارشاد الادیب، وفیات الاعیان، طبقات الشافعیہ، آداب اللغۃ، لسان المیزان، نزہۃ الاولیاء، المرزبانی، تاریخ بغداد۔ [5] نیز تالیفات: الاحکام (فقہ حنفی میں)، رسالۃ الاسماء الاسد، اسماء الذئب، البقیۃ العدیات، تکملہ صحاح، العباب، المتعلق تبیین الغلط، النخ شرح ابیات المفصل للزمخشری، ضوء الشہاب القضاعی، کشف الحجاب عن احادیث الشہاب، العبادۃ فی الشہادۃ الغازیہ، کتاب

بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ

آپ کی وفات خلفائے عباسیہ کے آخری خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ میں بغداد سنہ ۶۵۰ھ میں واقع ہوئی۔ آپ نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ ان کی نعش مکہ معظمہ لے جاکر دفن کردیں۔ آپ کے بیٹوں نے پہلے تو آپ کی نعش کو امانت کے طور پر بغداد میں ظاہری حرم ..... میں کچھ دنوں محفوظ رکھا پھر اسی سال سنہ ۶۵۰ھ میں آپ کی نعش مکہ مقدسہ میں لاکر دفن کردی۔ مولانا حسن قدس سرہٗ نے اپنی تصنیف "مشارق الانوار" کے شروع میں یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ کاش ان کی قبر مکہ معظمہ کی پاک سرزمین میں بنائی جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔
اماته بها حميد افاقبرهٗ ثم اذا شاء انشره: رحمة الله تعالىٰ عليه

۲

شیخ حمید الدین دہلویؒ

آپ ایک عالی دماغ، باوقار اور ذی رتبہ عالم متبحر تھے۔ علم فقہ میں آپ نے ہدایہ کی ایک نہایت مفید شرح لکھی ہے۔ سنہ ۶۶۴ھ میں آپ نے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ کشف الظنون کے مصنف کی رائے آپ کے بارے میں درج ذیل ہے

"شیخ حمید الدینؒ نے انتہائی بہترین اور پسندیدہ شرح تحریر فرمائی ہے۔ جس کی ابتداء الحمد للہ الذی ہدانا فی بدایتنا الی خدمت کتاب المبین۔ الی آخرہ: سے کی ہے۔ علامہ ابن الکمال کہتے ہیں کہ یہ بڑی زبردست شرح ہے جس کے اندر بہت سی شرحوں کا ماحصل جمع کیا ہے لیکن انھوں نے طوالت اختیار کی ہے اختصار کی جگہ اطناب اور تفصیل کی جگہ اختصار سے کام لیا ہے اسی لیے ان پر اعتراضات کیے گئے ہیں"۔ (ترجمہ عربی سے)

"علامہ ابن الکمال کے اقوال کی صحت و درایت کا جہاں تک تعلق ہے تو اگرچہ وہ اپنے وقت کے ممتاز اور یکتا فرد تھے۔ لیکن خود انھوں نے عنان عزم اپنی اکثر تصانیف میں تحقیق کی جانب سے موڑ لی ہے (تحقیق کا راستہ ترک کردیا ہے) اور جدل کے راستہ پر چل پڑے ہیں۔ اپنی مشہور تالیفات میں خاص کر اپنی شرح ہدایہ میں۔ اور آخر تک جدل و خلاف میں مصروف رہے ہیں۔ (انتہیٰ کلام کشف الظنون ملخصاً)

اس لیے شیخ حمید الدین دہلوی پر یہ اعتراض ان کا وزن نہیں رکھتا ہے۔

سابقہ حاشیہ :- الاضداد (لغت میں)، کتاب الضعفاء، کتاب المفعول، مجمع البحرین (حدیث)، مجمع البحرین (لغت)، رسالہ مناسک حج، نوادر اللغۃ ہیں۔ حاشیہ صفحہ ہذا :- المعتصم باللہ عبداللہ (۶۰۹ھ — ۶۵۶ھ) بن المستنصر باللہ منصور (سینتیسویں خلیفہ) سنہ ۶۴۰ھ میں مسند خلافت پر بیٹھا۔ ابو زید موید الدین العلقمی پر تمام معاملات میں کلی اعتماد کیا۔ ہلاکو خاں نے سنہ ۶۵۶ھ میں معتصم کو قتل کرکے خاندان عباسیہ کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کردی۔ (مفتاح التواریخ، وفوات الوفیات، النجوم الظاہرہ)

۳

مولانا شمس الدین یحییٰ الاودی نوراللہ مرقدہٗ

آپ کی ذات گرامی ایک ایسا آفتاب ہے جس نے ہر طرف عقل و دانش کی شعاعیں بکھیری ہیں اور آپ کا آستانہ عالیہ وہ عالی شان درسگاہ ہے جہاں سے فہم و فراست کی گوناگوں فیض رسانی ہوئی ہے۔ آپ مولانا ظہیر الدین بھکری[۱] اور شیخ الاسلام اودھ مولانا فرید الدین شافعی[۲] کے شاگرد رشید ہیں۔ شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی[۳] قدس سرہٗ نے مولانا شمس الدین کی خدمت میں شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ اپنے استاد کی تعریف ذیل کے شعر میں یوں فرماتے ہیں:۔

سَأَلْتُ الْعِلْمَ مَنْ اَحْيَاكَ حَقًّا ۔۔۔ فَقَالَ الْعِلْمُ شَمْسُ الدِّيْنِ يَحْيٰى

مولانا شمس الدین یحییٰ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں۔

آپ اپنے زمانہ کے بلند پایہ اور ممتاز ترین علماء متبحرین کے امام تھے۔ آپ ہمیشہ علوم شرعیہ کی اشاعت میں سرگرم اور تصنیف و تالیف میں مشغول و مصروف رہتے تھے۔ مولانا کے علمی تبحر کی عظمت و شہرت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ دہلی کے تمام ممتاز علماء و اساتذہ نہایت ادب و احترام کے ساتھ آپ کے حلقۂ درس میں شریک رہتے تھے اور آپ کی شاگردی کے شرف پر مفتخر تھے اگرچہ مولانا قدس سرہٗ کی تصانیف بہت ہیں لیکن اس زمانہ میں وہ کمیاب ہیں آپ کی آرامگاہ دہلی[۵] میں ہے۔

---

۱ آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے (نزہتہ الخواطر)۔ ۲ ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱م میں وفات پائی (نزہتہ الخواطر)۔

۳ متوفی ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶م شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے عظیم خلفاء میں سے تھے "کتاب خیر المجالس" میں مولانا برہان الدین غریب (م ؟) اور شیخ مذکور کے ملفوظات ہیں جسے حمید قلندر شاعر نے مرتب کیا ہے سن ابتداء تالیف ۷۵۵ھ اور اتمام ۷۵۶ھ ہے۔ طرز تحریر سادہ اور تفصیل ہے (اخبار الاخیار) شیخ مذکور نے مولانا تقی الدین گیلانی، فخر الدین الہانسوی اور قاضی محمد الدین کاشانی (۷۱۹ھ / ۱۳۱۹م) سے درسیات پڑھیں (نزہتہ الخواطر و خزینۃ الاصفیا) ۴ ان کا نام محمد بن احمد بن علی بخاری (۷۲۵ھ) ہے یہ حضرت شیخ فرید الدین اجودھنی کے مرید و خلیفہ تھے۔ (اخبار الاخیار، حدائق الحنفیہ، مفتاح التواریخ، خزینۃ الاصفیا)۔

۵ ۷۴۷ھ میں مولانا مذکور کا وصال ہوا۔ مزار شریف "چبوترہ یاراں" دہلی میں ہے۔ تصوف میں ایک کتاب شمس المعارف ان کی یادگار ہے۔ (خزینۃ الاخیار)۔

(۴)

قاضی عبدالمقتدرؒ

قاضی عبدالمقتدر بن قاضی رکن الدین الشریحی الکندی الدہلوی قدس سرہٗ اپنے زمانہ کے ممتاز ترین بلندپایہ علماء و فضلاء میں سے ہیں ۔ آپ اپنے علوم ظاہری اور کمالات باطنی کے باعث بہت عظیم المرتبت سمجھے جاتے ہیں تحصیل علم کے زمانہ میں آپ شیخ نصیرالدین محمود قدس سرہٗ چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور دونوں حضرات کے درمیان اس قسم کی ملاقاتوں میں علمی مقدمات پر گفتگو اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

حضرت شیخ نصیرالدین محمود قدس سرہٗ، قاضی صاحب رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور آپ کے علمی مباحث کی بڑی تعریف فرماتے تھے اور تحصیل علم کی جانب ہمیشہ آپ کو رغبت دلاتے رہتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد قاضی صاحب قدس سرہٗ، حضرت شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی قدس سرہٗ کے مرید ہوگئے اور آپ سے بیعت حاصل کرلی۔ حضرت چراغ دہلوی قدس سرہٗ نے آپ کے ظاہری کمالات کو باطنی حسن وجمال سے آراستہ وپیراستہ کردیا۔

آپ ہمیشہ طلبہ کے افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ اور تشنگانِ علم کو اپنی تلقین وہدایت کی نہروں سے سیراب فرماتے تھے۔ حضرت شیخ نصیرالدین محمود اور آپ کے اکثر خلفاء نوراللہ مضاجعہم کا یہی طریقہ تھا۔ کہ اکثر اوقات یہ حضرات احکام شریعت کی تلقین میں مشغول رہا کرتے تھے۔ حضرت شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ ایک دینی مسئلہ کی تعلیم وتلقین ایسی ہزار رکعت نماز سے بہتر و افضل ہے جس میں ذرہ برابر بھی غرور وریاکاری کی آمیزش اور آلودگی ہو۔"

قاضی عبدالمقتدر قدس سرہٗ نے اٹھاسی سال کی عمر پائی اور ۲۶ محرم ۷۹۱ھ کو وصال فرمایا آپ کا مزار شریف دہلی میں ہے۔

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عربی زبان کے بہت بلند مرتبہ شاعر تھے۔ آپ نے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس کو "قصیدۂ لامیہ"[۱] کے نام سے موسوم کیا ہے جس کا ذکر جمیل حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "اخبارالاخیار" میں بڑے اچھے انداز سے کیا ہے۔

(قصیدہ لامیہ کا مطلع یہ ہے :-)

یاسابق الظعن فی الاسحار والاصل　　　سلم علی دار سلمی فابلک ثم سل

---

[۱] قصیدہ لامیہ میں جو نعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے تقریباً پچاس اشعار ہیں۔ (المجم)

۵

مولانا معین الدین عمرانیؒ

آپ صفِ اوّل کے جید عالم اور علوم دینیہ و فلسفہ اور منطق کے ماہرین میں سے تھے۔ شہر دہلی کے ممتاز اور مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ سلطان محمد بن تغلق شاہ[۱] کے ہم عصر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے مولانا معین الدین کو قاضی عضد ایجی[۲] کے پاس مملکت فارس میں بھیجا اور یہ گذارش کی کہ وہ ہندوستان تشریف لائیں اور "مواقف" کے متن کو ان کے نام سے منسوب اور معنون کر دیں۔ والی شیراز سلطان ابو اسحاق[۳] نے اس کام سے اُن کو باز رکھا اور کہا کہ میں آپ کو تخت شاہی (سارے ملک کی حکمرانی اور شاہی) سپرد کیے دیتا ہوں اور آپ کو جس چیز کی خواہش ہوئی آپ کی خدمت میں حاضر کرنے کو تیار ہوں۔ قاضی صاحب نے جب بادشاہ کی تواضع اور انکساری اس حد تک دیکھی تو انھوں نے ہندوستان کے سفر کا ارادہ ترک کر دیا اور ترکِ وطن کا خیال دل سے نکال دیا۔ اور اپنی کتاب "مواقف" کو سلطان ابو اسحاق کے نام نامی سے معنون کر کے عزت افزائی بخش دی مولانا معین الدین عمرانی جس وقت شیراز کے علاقہ میں تشریف فرما ہوئے اور وہاں اُن کے فضل و کمال اور فہم و فراست کے آثار ظاہر ہوئے تو اُن کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے لوگ پیش آئے اور ان کی بہت زیادہ توقیر و تکریم کی۔ "حواشی کنز، حسامی اور مفتاح[۴] آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

---

[۱] ۷۲۵ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد دہلی میں تخت سلطنت پر متمکن ہوئے اور ستائیس سال کی حکومت کے بعد دریائے سندھ کے کنارہ ٹھٹھہ (؟) ۷۵۲ھ میں انتقال کیا۔ (مفتاح التواریخ)۔ [۲] علامہ عضد الدین عبدالرحمن بن احمد الایجی القاضی نے اس متن کو غیاث الدین وزیر سلطان محمد خدا بندہ کے لیے تالیف کیا تھا۔ سید شریف علی بن محمد جرجانی نے (۸۰۷ھ) اس پر شرح لکھی جو شرح مواقف کے نام سے مشہور ہے۔ (کشف الظنون) [۳] یہ امیر محمود شاہ، خواجہ عبداللہ انصاری (۴۸۱ھ) کی نسل سے ہیں۔ سلطان ابوسعید خان مغل کے زمانہ میں امیر محمود شاہ حکومت شیراز میں مشغول تھے اور دولت اربا خاں کے زمانہ (پچاس اور چند یوم) میں ۷۳۶ھ میں قتل ہوئے۔ اس کے بعد ان کے لڑکے امیر مسعود ان کی جگہ پر بیٹھے۔ جب وہ بھی مقتول ہو گئے تو اس وقت امیر ابو اسحاق جو اس موقع کے منتظر تھے۔ شیراز واپس لوٹے اور شیراز پر قبضہ کر کے ۷۴۳ھ میں اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تقریباً ۱۳ سال شاندار حکومت کے بعد امیر محمد مظفر کے ہاتھ سے ۷۵۸ھ میں شہادت پائی۔ خواجہ حافظ شیرازی نے اُن کی تاریخ وفات کہی۔

قطعہ تاریخ

بروز کاف و الف از جمادی الاولی ۔ بسال ذال و گزشت عین لام اطلاق
خدائگان سلاطین شرق و غرب ۔ خدیو کشور عدل و کرم باستحقاق
سپہر علم و دریا آفتاب جاہ و جلال ۔ جمال دولت و دین شاہ ابو اسحاق
بیان عرصۂ میدان بہ تیغ قہر عدو ۔ نہادہ بر دل احباب خویش داغ فراق

[۴] یعنی مفتاح العلوم مصنفہ علامہ سراج الدین ابو یعقوب یوسف بن محمد بن علی السکاکی المتوفی ۶۲۶ھ۔ اور یہ کتاب تین قسموں پر منقسم ہے علمائے قسم ثالث (معنی و بیان) پر اس کے حاشیے اور شرحیں لکھی ہیں (کشف الظنون)۔

۶

مولانا خواجگی دہلوی قدس سرہٗ

آپ ایک عالم تبحر و عالم ربانی تھے۔ مولانا معین الدین عمرانی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ظاہری علوم و فنون کی تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطن کی منزلیں طے کیں اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود داؤدی قدس سرہٗ (حضرت چراغ دہلی) کے مرید ہوگئے۔ تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کو درجۂ کمال تک پہونچانے کے بعد مرشد سے خلعت خلافت و اسناد حاصل کیں اور اپنے پیر طریقت اور برادران سلسلہ کے طریقہ کے مطابق رشد و ہدایت اور تعلیم و تلقین کے مشغلہ میں معروف ہوگئے۔ آپ ہمیشہ عقل و حکمت، تقویٰ اور ہدایت کی تعلیم میں مشغول رہتے اور طالبانِ حق کو علم دین کی دولت و نعمت سے سرفراز و بہرہ مند فرماتے رہے۔

جس وقت صاحب قران[1] امیر تیمور لنگ نے دہلی پر حملہ کا ارادہ کیا تو میر سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ (م ۸۲۵ھ) (خلیفۂ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی) عالم خواب میں امیر تیمور لنگ گورگانی کی فوجوں کی یورش اور شہر دہلی کی بربادی سے مطلع ہوتے انھوں نے تمام لوگوں کو اس واقعہ سے خبردار اور ہوشیار کر دیا۔ مولانا خواجگی حضرت سید قدس سرہٗ کا خواب سُن کر دہلی سے باہر نکل آئے اور کالپی کا سفر اختیار کیا۔ پھر تمام زندگی کالپی ہی میں گذار کر راہیٔ ملک بقا ہوئے۔ آپ کا مقبرہ شہر کالپی کے باہر مرجع زائرین ہے۔

۷

مولانا احمد تھانیسری رحؒ

آپ ایک بے مثل عالم و فاضل اور نہایت خوش گو اور خوش بیان شاعر تھے۔ حضرت چراغ دہلوی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت کی نعمت حاصل کر کے قلب کو انوار باطنی سے منور کر لیا تھا۔ مولانا خواجگیؒ دہلوی سے بڑا بھائی چارہ تھا۔ لیکن آپ کو شہر دہلی سے ہجرت کے موقع پر ان سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔ یہاں تک کے

---

[1] امیر تیمور لنگ گورگانی، تومنا خان بادشاہ ترکستان کی اولاد سے تھا۔ ۷۳۶ھ میں ولادت ہوئی امیر حسین کے قتل کے بعد ۷۷۱ھ تاج سلطانی سر پر رکھا اور ۸۰۷ھ میں وفات پائی (مفتاح التواریخ)

تیموری فوجیں آپہونچیں اور دہلی کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ (یہ واقعہ ۸۰۱ھ میں پیش آیا) مولانا احمد تھانیسری کے اعزا اور متعلقین سب گرفتار کر لیے گئے۔ اور فتنہ و فساد کا طوفان فرو ہو جانے کے بعد، رائی پائی صاحبقران امیر تیمور نے مولانا تھانیسری کی تعریف سُن کر آپ کو اپنے دربار میں طلب کیا اور آپ کے فضل و کمال کو دیکھ کر اپنی مجلس کی مصاحبت عطا فرمائی۔[1]

تیموری فوجوں کی واپسی اور مغل دہلی کی بے رونقی اور برہمی کے بعد مولانا احمد تھانیسری بھی مع اہل و عیال دہلی سے ہجرت فرما کر کالپی چلے گئے۔ اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ باقی تمام عمر آپ نے شہر کالپی میں عبادت و ریاضت اور علوم شرعیہ کی تعلیم و تلقین اور ارشاد و ہدایات میں گذار دی۔ مولانا کا مقبرہ قلعہ کالپی کے اندر ہے۔[2]

شیخ عبدالحق دہلوی قدس سرہ نے اپنی کتاب اخبار الاخیار میں آپ کا ایک عالی شان قصیدہ درج فرمایا ہے جس کے چند منتخب اشعار اس کتاب میں بھی درج کیے جا رہے ہیں (اس قصیدہ کا صرف مطلع تحریر کیا جاتا ہے)۔

اطادلبی حنین الطائر الغرد ❊ وھاج لوعۃ قلبی اثاثہ الکمد

---

⑧

قاضی شہاب الدینؒ ملک العلماء

قاضی شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی دولت آبادی، ہندوستان کے ممتاز دانشوروں اور علماء و فضلاء میں شمار کیے جاتے تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عرب و عجم کے اکثر شہروں میں آپ کی شہرت تھی۔ دولت آباد (دہلی) آپکا مولد و منشا ہے۔ آپ نے حضرت مولانا خواجگی دہلوی اور قاضی عبد المقتدر

---

[1] اسی سلسلہ کی ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ مولانا تھانیسری اور شیخ الاسلام نبیرۂ مولانا برہان الدین مرغینانی (۵۱۱-۵۹۳ھ) کے بیچ مجلس شاہی میں نشست کے تقدم و تاخر میں بحث چھڑ گئی۔ امیر تیمور نے کہا کہ یہ نبیرۂ صاحب ہدایہ ہیں جو ان کے بڑے باپ تھے۔ انھوں نے ہدایہ میں متعدد مقامات پر غلطیاں کی ہیں۔ کیا حرج تھا کہ ایک ہی آدھ مقام پر غلطی کرتے۔ شیخ الاسلام نے کہا وہ کون سے غلط مقامات ہیں ثبوت کے ساتھ بتائے جائیں۔ مولانا نے اپنے صاحبزادوں اور شاگردوں کو اشارہ فرمایا کہ اس سلسلے میں وہ جواب دیں۔ امیر تیمور نے ان کی عزت و ناموس کے تحفظ کی خاطر مجلس برخاست کر دی (اخبار الاخیار)۔

[2] ۸۲۰ھ میں وصال ہوا۔ تاریخ وصال "گلشن ہدایت" ہے۔

شریحؒ کی خدمت میں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ آپ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ آپ کے زمانہ میں اگرچہ کچھ اور علماء و فضلاء بھی امتیازی شان رکھتے تھے۔ لیکن قدرت نے جو شہرت و عزت ان کے لیے مقدر فرمادی تھی وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکی۔ زمانہ اور تاریخ کے صفحات پر جو آثار آپ نے چھوڑے ہیں کسی اور عالم کے ایسے آثار موجود نہیں ہیں۔ قاضی عبدالمقتدر ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میرے سامنے ایک ایسا طالب علم آیا کرتا ہے جس کی پوست، استخوان اور مغز سب میں علم سمایا ہوا ہے۔ (یعنی رگ رگ میں) جس دن فوج تیموری افواج[1] دہلی کی طرف حرکت کر رہی تھیں۔ اس وقت قاضی شہاب الدین بھی دہلی سے ہجرت کر کے اپنے استاد مولانا خواجگی کے ہمراہ ہو گئے۔ مولانا خواجگی کالپی پہنچ کر قیام پذیر ہو گئے۔ لیکن قاضی صاحب جونپور کی طرف روانہ ہو گئے وہاں سلطان ابراہیم شرقی[2] نے بڑی عزت اور ادب واحترام کے ساتھ ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کی تشریف آوری کو مغتنم سمجھ کر آپ کی بے حد قدر و منزلت کی آپ کو ملک العلماء کا خطاب دے کر آپ کی عزت و شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ لیکن دوسرے علماء اور معاصرین آپ کا یہ اعزاز برداشت نہ کر سکے اور حسد کی آگ بھڑک اٹھی قاضی صاحب نے اپنے حاسدوں کی شکایت مولانا خواجگی کو لکھ کر بھیجی۔ اس کے جواب میں مولانا خواجگی نے شیخ سعدیؒ[3] کے یہ دو اشعار ان کو لکھ کر بھیج دیئے:-

اے پیش ازانکہ در قلم آید ثنائے تو — واجب براہل مشرق و مغرب دعائے تو

اے در بقائے عمر تو نفع جہانیاں — باقی مباد آنکہ نخواہد بقائے تو!

لوگوں کا بیان ہے کہ کچھ مدت کے بعد حاسدوں کی جماعت ختم ہو گئی اور وہ سب ذلیل و خوار ہو کر دنیا سے گئے۔ قاضی عبدالمقتدرؒ کی تصنیفات میں سے حواشی کافیہ[4] ان کی زندگی ہی میں بہت مشہور و مقبول ہو چکی

---

[1] امیر تیمور گورگانی ۷۳۶ھ میں ... عازم ہندوستان ہوا۔ ۸۰۰ھ میں دریائے سندھ عبور کر کے محمود شاہ اور دہلی (متوفی ۸۱۵ھ) سے جو دہلی کا حکمران تھا جنگ کی، اور ہندوستان کو فتح کر کے دہلی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ [2] سلطان العادل ملک اکرم شمس الدین بن خواجہ جہاں جونپوری معروف بہ سلطان ابراہیم شرقی اپنے بھائی سلطان مبارک شاہ شرقی کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس کی عدالت وانصاف پروری نے بڑی شہرت پائی۔ علماء و فضلاء دور و نزدیک سے آکر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سلطان علم دوست تھا اور علماء و مشائخ کا معتقد تھا۔ اس کی حکمرانی کا زمانہ ۸۰۴ھ سے لے کر ۸۴۴ھ تک ہے۔ (تاریخ جونپور۔ نزہۃ الخواطر)۔

[3] شیخ عارف، امام الفصحاء شیخ مصلح الدین شیرازی سعدی اپنے عہد کے سلطان اتابک سعد بن زنگی کی نسبت سے سعدی تخلص فرمایا۔ شروع زمانہ میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں شیخ الشیوخ ابو الفرج ابن جوزی کی خدمت میں علم و کمال حاصل کیا۔ تیس سال تک تحصیل علم اور تیس ہی سال سیاحت و سفر میں مشغول رہے۔ اور دنیا کے چوتھائی حصہ کی سیر و سیاحت کی باقی عمر عبادت و ریاضت میں بسر کی۔ چودہ مرتبہ حج کیا اور شیخ العالم شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سفر کیا۔ کتاب بوستان اور گلستان ان کی یادگار ہیں ۶۹۱ھ میں وفات پائی۔ (مفتاح التواریخ) [4] حاشیہ کافیہ جو شرح ہندی کے نام سے موسوم ہے۔ مولانا الہداد جونپوری اور غیاث الدین جعفر جونپوری نے اس شرح پر حاشیے لکھے ہیں (نزہۃ الخواطر)۔

ستی۔ آپ کی دوسری تصنیف "ارشاد متن" ہے جو علم نحو کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نحوی مسائل کو نہایت تازہ اور نئے ڈھنگ سے نادر مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔ تیسری تصنیف "بدیع المیزان" ہے جو فن "بلاغت" پر لکھی گئی ہے۔ بدیع المیزان کی نثر مقفع اور مسجع ہے۔ آپ کی چوتھی گرانمایہ تصنیف "بحر مواج" ہے جو فارسی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے آیات قرآنیہ کے باہمی فصل و وصل کے اسباب بیان کئے ہیں اور جملوں کی ترکیب اور ان کے مفاہیم کی تشریح میں زبردست کوشش کی ہے۔ آپ نے "اصول بزدوی" پر "امر" کی بحث تک ایک شرح لکھی ہے آپکی ایک شرح قصیدۂ بانت سعاد پر بھی ہے[1] اقسام علوم اور صنائع بدائع کے موضوع پر بھی آپ نے فارسی زبان میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ آپ کا تصنیف کردہ ایک رسالہ "مناقب السادات"[2] کے نام سے بھی موسوم و مشہور ہے۔ قاضی شہاب الدینؒ ۵ ررجب المرجب ۸۴۹ھ کو اس دار فانی سے جنت الفردوس کی جانب راہی سپار ہوئے۔ آپ کا روضۂ منورہ شہر جونپور میں سلطان ابراہیم شرقی کی مسجد[3] کے جنوب کی جانب واقع ہے۔

---

(٩)

شیخ علی بن احمد مہائمی قدس سرہ

آپ کا تعلق نوایت قوم سے ہے۔ نوایت قوم کے لوگ بلاد صوبۂ دکن میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ "نائیہ" قوم قبیلۂ قریش کی ایک شاخ ہے جو حجاج بن یوسف

---

[1] بانت سعاد یہ قصیدہ لامیہ مصنفہ کعب بن زہیر بن ابی سلمیٰ کی تصنیف ہے اٹھاون اشعار پر مشتمل ہے اس قصیدہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں معذرت خواہی کی گئی ہے۔ اور اس میں سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کا اہتمام کیا گیا ہے اسکے صلہ میں سرکار نے اپنی ردائے مبارک حضرت کعبؓ کو عطا فرما کر دائمی شرف سے نوازا اسی لیے اس قصیدہ کو قصیدۂ بردہ شریف بھی کہتے ہیں۔ ہر دور کے علماء و مشائخ نے اس قصیدہ پر شرحیں تحریر کی ہیں اور اجر حاصل کیا ہے۔ علمائے ہند میں قاضی شہاب کی شرح مشہور ہے جو مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکی ہے (کشف الظنون ابجد العلوم عربی)

[2] اس رسالہ کا سبب تالیف ور سید اجمل شاہ کا واقعہ اور قاضی صاحب کی اپنے پہلے رسالہ پر ندامت ہے جو انھوں سادات پر عالم کی فضیلت و بزرگی کے سلسلہ میں تحریر کیا تھا۔ تفصیل دیکھیے اخبار الاخیار و تاریخ جونپور۔ [3] یہ مسجد مسجد اٹالہ کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ جونپور میں لکھا ہے ان کا مقبرہ ۱۵ کا کا فکھا مذہب اس مسجد کی تاریخ تعمیر دیکھنی چاہیئے۔ نیز یہ کہ قاضی شہاب الدین کی بدیع المیزان پر شیخ منور بن عبدالحمید لاہوری نے ۱۰۱۱ھ میں جو شیخ سعد اللہ بن ابراہیم لاہوری کے شاگرد تھے۔ حدائق البیان کے نام سے ایک شرح بھی لکھی ہے اور اسی طرح ارشاد قاضی پر تعلیقات تحریر کی ہیں اور تفسیر بحر مواج پر اعراب لگائے ہیں (نزہۃ الخواطر)۔

ثقفی کے خوف سے (جس نے پچاس ہزار علماء اور اولیاء اللہ کو ناحق قتل کر ڈالا تھا) مدینہ منورہ سے نکل کر بحر ہند کے ساحل تک پہونچی اور اسی سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا۔ حجاج بن یوسف ثقفی کا یہ فتنہ ۱۵۲ھ میں واقع ہوا تھا۔ مہائم بروزن عظائم احمد آباد گجرات کی ایک بندرگاہ ہے۔ شیخ علی قدس سرہ اپنے وقت کے ایک عالم متبحر اور قابلِ قدر فاضل تھے۔ آپ کے قلب مبارک میں معرفت و محبت الٰہی کا دریا موجزن تھا۔ آپ توحید وجودی کے قائل تھے اور شیخ محی الدین ابن عربی[۱] قدس سرہ کے متبع تھے۔ آپ کی نادر تصانیف میں تفسیر رحمانی[۲]، زوارف شرح عوارف المعارف[۳]، شرح نصوص الحکم[۴]، شرح نصوص[۵] شیخ صدر الدین قونوی، ادلۃ التوحید[۶] وغیرہ[۷] خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

آپ جمادی الاولیٰ کے مہینہ میں ۸۳۵ھ میں اس عالم عنصری کو چھوڑ کر راہگذار عالم ارواح ہوئے مہائم آپ کی دائمی آرام گاہ ہے جہاں آپ کا روضۂ مبارک زیارت گاہ خلائق ہے۔

---

[۱] شیخ محی الدین ابن عربی توحید وجودی کے علمبردار تھے۔ متوفی ۶۳۸ھ۔ آپ کے تفصیلی حالات کے لیے فوات الوفیات، مفتاح السعادۃ، میزان الاعتدال، لسان المیزان، نفح الطیب، شذرات الذہب، آداب اللغۃ العربیہ، مرآۃ الجنان یافعی، معجم المطبوعات، التیمور، تقصار، خزینۃ الاصفیاء، لوامع الانوار ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] اس کا اصل نام تبصیر الرحمن و تیسیر المنان فی تفسیر القرآن ہے اور تفسیر مہائمی کے نام سے معروف ہے۔ مؤلف نے فرمایا ہے کہ میں نے اس تفسیر کا مقابلہ لوح محفوظ کی تحریر سے کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض آیات کا دوسری آیات سے ربط ثابت کیا گیا ہے جو ایک ندرت ہے۔ یہ کتاب مرحوم جمال الدین وزیر بھوپال کے خرچ سے (دو جلدوں میں) مصر میں طبع ہوئی۔ موصوف نواب بھوپال کے خسر بھی تھے۔ [۳] تصوف میں حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد بن عبد اللہ سہروردی کی تصنیف ہے (۶۳۲ھ) امیر قنوجی نے تقصار میں فرمایا ہے کہ تصوف میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔ سید شریف جرجانی نے اس پر تعلیق تحریر کیا ہے (۸۱۶ھ) اس کے احادیث کی تخریج کی ہے۔ شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۸۷۹ھ) [۴] شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف ہے جو ۲۷ فصوص پر مشتمل ہے۔ شیخ رکن الدین شیرازی وغیرہ نے اور ملا علی بن سلطان الہروی ۱۰۱۴ھ معروف بہ ملا علی قاری نے اس پر شرحیں لکھی ہیں۔

[۵] النصوص فی الطور المخصوص مصنفہ شیخ صدر الدین محمد بن اسحاق قونوی متوفی ۶۷۳ھ۔

[۶] یعنی اجلۃ التائید فی شرح ادلۃ التوحید۔

[۷] منجملہ ان کے استجلاء البصر فی الرد علی استقصاء النظر لابن المطہر الحلی (علامہ جمال الدین حسن بن یوسف بن المطہر الحلی الشیعی۔ النور الاظہر فی کشف سر القضاء والقدر اور اس کی شرح الضوء الاظہر، انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام (در اسرار شریعت)، ترجمہ لمعات عراقی، ترجمہ کتاب جام جہاں نما، اور اس کی شرح اراءۃ الدقائق فی شرح مرآۃ الحقائق، رسالہ در فقہ شافعی، رسالہ در وجوہ اعراب۔ الٓمٓ ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین جس میں ۱۲۸۳۴۴۵۲۲ وجوہ اعراب نکلے ہیں۔

۱۰

شیخ سعدالدین خیرآبادی قدس سرہ

آپ کے والد ماجد کا نام قاضی بڈھن[1] تھا جو قصبۂ انام کے قاضی تھے۔ قاضی بڈھن نے اپنے صاحبزادہ شیخ سعدالدین کو عالمِ طفلی میں چھوڑ کر دنیا سے رحلت کی۔ صغرسنی ہی سے سعادت مندی کے آثار شیخ سعدالدین کی پیشانی سے ظاہر و نمایاں تھے۔ جب ان کو اعزہ نے مکتب میں بٹھایا تو اپنا سبق زبانی یاد کر لیتے تھے اور اپنے سبق کی پوری تختی ہر رات کو ایک ہزار بار پڑھتے تھے۔ اسی طرح قرآن مجید بھی ایک ایک پارہ یاد کرتے ہوئے پورا قرآن پاک یاد کر لیا ——— عالم شعور کا آغاز تھا کہ آپ مولانا اعظم[2] لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تحصیل علم پر کمربستہ ہو گئے۔ اس کے بعد اپنی ارادت و عقیدت کا ہاتھ حضرت شیخ شاہ مینا لکھنوی[3] کے ہاتھ میں دے کر آن کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ شیخ کی نگاہِ دلنواز نے شرابِ معرفت کا ایک جامِ لبریز پلا کر عشق حقیقی کے نشہ سے چھکا دیا۔

حضرت شیخ مینا نے ۲۳ صفر المظفر ۸۸۴ھ میں اس دنیائے فانی سے ... سوئے جناں کوچ فرمایا۔ مرشد کے انتقال کے بعد شیخ سعدالدین قدس سرہ نے کچھ دنوں تک لکھنؤ میں قیام فرمایا۔ آخرکار حضرت شیخ مینا (مرشد) نے خواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ شیخ سعدالدین تم کو خیرآباد جانا چاہیے۔ شیخ نے مرشد کے حکم کی تعمیل میں فوراً خیرآباد کی راہ لی۔ اور وہاں پہنچ کر خیرآباد کو اپنا وطن بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہاں بڑی عزت اور شہرت عطا فرمائی۔ ہر طرف سے نذور و فتوح خدمت میں آتی تھیں۔ لیکن جو کچھ آتا تھا سب مہمانوں کی خدمت و ضیافت میں صرف کر دیا جاتا تھا۔ حقداروں کے وظیفے مقرر کر دیئے گئے تھے! اپنے اعزہ و اقرباء کو انام سے خیرآباد میں بلا لیا۔ اور ان کے لیے کئی مکانات تعمیر کرا دیئے۔ اس کے باوجود جس دن انھوں نے انتقال فرمایا تو گھر سے ان کے کفن کے لیے کپڑا بھی فراہم نہ کیا جا سکا۔

---

[1] قاضی بڈھن ابن شیخ محمد قدوائی انامی ثم خیرآبادی۔ (نزہتہ الخواطر)۔

[2] شیخ محمد بن ابو البقاء کرمانی لکھنوی ملقب بہ اعظم ثانی اپنے وقت کے جید علماء میں شمار تھا۔ درسی کتابیں شیخ ابوالفتح سے پڑھیں۔ شیخ مینا اور شیخ سعدالدین خیرآبادی ان کے تلامذہ میں ہیں۔ (نزہتہ الخواطر۔ تذکرہ رحمان علی)۔

[3] شیخ محمد بن قطب الدین لکھنوی معروف بہ شیخ مینا، شیخ قوام الدین عباسی کے شاگرد رشید اور شیخ سارنگ کے مرید تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب عوارف المعارف، شیخ محمد بن ابو البقاء لکھنوی سے پڑھی اور پھر ساری زندگی زہد و عبادت میں بسر کی۔ آن کی وفات ۸۸۴ھ یا ۸۸۵ھ میں ہے (نزہتہ الخواطر، اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیا)۔

شیخ سعد الدین نے اپنی زندگی اپنے مرشد شیخ میناؒ لکھنوی کے طریقہ پر گذار دی۔ کئی سال تک علوم شرعیہ کی تعلیم اور رشد و ہدایت و تزکیۂ باطن کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے کئی ایک مشہور اور دینی کتابوں پر اچھی شرحیں تحریر فرمائی ہیں۔ مثلاً شرح بزودی، حسامی، کافیہ، مصباح وغیرہ۔ آپ نے رسالہ مکیہ[1] پر بھی ایک شرح تحریر فرمائی جو مجمع السلوک کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں آپ نے حضرت شیخ شاہ میناؒ کے بعض احوال اور آپ کے ملفوظات پیش کیے ہیں۔ جس وقت اپنے مرشد کا کوئی قول نقل کرتے ہیں تو یوں بیان کرتے ہیں کہ: قال شیخی شیخ مینا دامہ اللہ فینا۔ آپ کا روضہ منورہ خیرآباد میں زیارتگاہِ خلائق اور سرچشمۂ فیوض و برکات ہے۔

---

(۱۱)

مولانا عبداللہ تلنبیؒ

تلنبہ (بتائے فوقانی کو ضمہ اور لام کو زبر ہے۔ نون ساکن ہے۔ اور بائے موحدہ کو زبر اور آخر میں ہائے ہوز ساکن ہے۔ ملتان کے اطراف و جوانب میں ایک شہر ہے یہی شہر آپ کا وطن مالوف ہے آپ علماء و فضلاء کے امام ہیں۔ آپ کی ذات گرامی تمام علوم معقول و منقول (علم فقہ و تفسیر و حدیث، تاریخ و فلسفہ، منطق و نجوم، صرف و نحو، ہیئت و بلاغت وغیرہ) کا مرکز اور سرچشمہ ہے۔ آپ تمام عمر اپنے پیارے وطن میں رہ کر خدمتِ خلق کی مسند پر جلوہ افروز رہے اور خلق اللہ کو مستفید فرماتے رہے اور علوم شرعیہ کی تبلیغ و تلقین اور ارشاد و ہدایت کے انوار سے چار دانگ عالم کو منور فرماتے رہے۔

---

[1] رسالہ مکیہ، مؤلفہ شیخ قطب الدین دمشقی (م ۷۸۰ھ / ۱۳۷۸ء) مسائل تصوف میں یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر بڑا جامع ہے اور عوارف المعارف مؤلفہ شیخ سہروردی اور رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب کے مرتبہ کا ہے علماء نے اس پر توجہ کی ہے اور اس کی شرحیں تحریر کی ہیں، نیز فضلائے کرام نے اس رسالہ کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا ہے، منجملہ دیگر فارسی ترجموں کے حضرت مخدوم جہانیاں کا ایک ترجمہ چھپا ہے (۱۔ لغاتیہ ۵۰۰) نیز مولانا رشید احمد گنگوہی نے (م ۱۳۲۳ھ) حافظ محمد ضامن تھانوی (م ۱۲۷۷ھ) کے حسب ایماء "امداد السلوک" کے نام سے ایک ترجمہ کیا جو مراد آباد میں طبع ہوا اور ۱۳۱۶ھ میں پاکستان میں بھی چھپا۔ اسے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اردو میں ترجمہ "ارشاد السلوک" کے نام سے شائع کیا ہے۔ رسالہ مکیہ کی شرحوں میں ایک شرح "مجمع السلوک" بھی ہے جس میں شیخ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات اور احوال "خزانہ جلالی" (ملفوظات مخدوم جہانیاں) کے طرز پر درج کیے گئے ہیں۔ ملفوظات شاہ مینا علیہ الرحمۃ کو قاضی ارتضا علی خاں گوپاموی (م ۱۲۷۰ھ) نے فوائد سعدیہ کے نام سے ترجمہ کیا ہے یہ ترجمہ فارسی مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکا ہے۔ فوائد سعدیہ کی روشنی میں فضل حسین صابری نے اردو میں تلخیص کر کے اس کا نام "مخدوم شاہ میناؒ" رکھا۔ خزانہ جلالی کے مرتب شیخ احمد الملقب بہ بہاؤ الدین حسنی بن محمود بن سلیمان تلنبی ہیں، یہ مجموعہ اپنے نام کی طرح خزانۂ علم ہے اور ستر ابواب فقہ اور تصوف پر مشتمل ہے۔

آخر کار ملتان کی تباہی و بربادی کے باعث آپ شیخ عزیز اللہ تلنبی[1] کے ساتھ ترک وطن فرما کر ملتان سے دہلی چلے آئے اور دہلی و اطراف دہلی میں آپ نے فلسفہ و منطق وغیرہ علوم معقولات کو رائج کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں علم منطق و فن کلام میں شمسیہ[2] و صحائف کی شرح کے علاوہ کوئی دوسری کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ سلطان سکندر لودھی[3] نے ان حضرات کی تشریف آوری کو غنیمت جانا اور حد سے زیادہ عزت افزائی کی۔

مولانا عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی۔ دہلی آپ کا مدفن ہے۔ "اولئک لھم الدرجات العلیٰ" سے آپ کی تاریخ وفات نکالی گئی۔ جس سے آپ کا سن وفات (۹۲۲ھ) نکلتا ہے۔

---

(١٢)

مولانا الہداد جونپوری قدس سرہ

آپ کی ذات عالی اپنے اسم گرامی کے مقتضٰی کے مطابق خداوند کریم کے فضل و کرم کا ایک بہترین نمونہ اور گراں قدر عطیہ تھی۔ آپ کی ذاتِ گرامی خزائن قال کی کلید اور مجالس حال کا روشن چراغ تھی۔ آپ کی ذات گرامی میں حال و قال دونوں بدرجہ کمال جمع تھے۔

آپ مولانا عبداللہ تلنبی[4] نور اللہ مرقدہ کے شاگرد رشید اور حضرت حامد شاہ مانک پوری[5] کے

---

[1] ملتانی ثم سنبھلی شیخ نظام الدین خیر آبادی (۹۳۰ھ) اور میاں حاتم بن ابو عاصم سنبھلی (۹۶۶ھ) ہر دو حضرات ان کے شاگرد ہیں۔ ۹۶۷ھ میں وفات پائی۔ رسالہ عینیہ جو رسالہ عزیزیہ مصنفہ شیخ امان اللہ پانی پتی کے مقابلہ میں تحریر کیا گیا آپ کی یادگار ہے۔ (تذکرہ رجال علماء)

[2] شرح صحائف: الصحائف فن کلام میں ہے جو ایک مقدمہ، چھ صحائف اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے اکثر علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں شمس الدین محمد سمرقندی کی (۷۰۲ھ) المعارف فی شرح الصحائف بھی ہے۔ بہشتی نے بھی اس کی دو شرحیں لکھی ہیں۔

[3] ولادت ۸۶۳ھ تخت نشینی ۸۹۴ھ۔ اپنے والد سلطان بہلول لودی کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ اصل نام نظام خاں تھا۔ تخت نشینی کے بعد علاؤ الدین سکندر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اپنے والد کی طرح تمام معاملات میں دین کو فوقیت دیتے تھے۔ ۹۲۳ھ میں بمقام شہر آگرہ وفات پائی ان کی مدت سلطنت اکیس سال اور چند ماہ ہے (مفتاح التواریخ)۔

[4] صاحب نزہتہ الخواطر نے مولانا الہداد جونپوری کے مولانا عبداللہ تلنبی کا شاگرد ہونے سے انکار کیا ہے (اخبار الاخیار، خزینۃ الاصفیا)

[5] بن ابو حامد بن عزیز الدین بن شہاب الدین بن حسام الدین بن شہاب الدین گردیزی مانک پوری متوفی ۹۰۰ھ ہجری شیخ حسام الدین مانک پوری کے مرید تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کے بڑے مشائخ میں شمار ہوتا ہے۔ امی تھے۔ (نزہتہ الخواطر)۔

مرید تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر عزیز تعلیم دین اور علوم دینیہ کی تصنیف میں بسر فرما دی۔ اور نہایت بلند پایہ اور نادرۂ روزگار کتابیں تصنیف فرمائیں۔ علم فقہ میں ہدایہ کی شرح کئی جلدوں میں لکھی۔ آپ نے بزدوی کی شرح بھی لکھی اور تفسیر مدارک پر تعلیقات قلمبند فرمائیں۔ ہندیہ[1] پر بھی حاشیہ لکھا۔

۱۳

شیخ علی متقی قدس سرہٗ

آپ کا مولد برہانپور[2] ہے لیکن اصل وطن جونپور رہے۔ آپ اپنے وصیت نامہ میں جس کا خلاصہ درج ذیل[3] ہے۔ یوں فرماتے ہیں:۔

"میرے والد صاحب نے میرے بچپن ہی میں مجھے شیخ باجن[4] برہانپوری کا مرید کرا دیا تھا۔ جب میں اپنے سن شعور کو پہونچا تو میں نے اپنے والد کے منشاء کے مطابق شیخ باجن ہی سے سلسلۂ ارادت قائم رکھا۔ جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی لڑکا کسی شیخ کا مرید کر دیا جائے تو سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد اس کو اختیار رہے چاہے وہ اس شیخ سے سلسلہ ارادت قائم رکھے یا کوئی دوسرا شیخ (پیر) پسند کرے۔ جب میرے والد اور میرے شیخ (دونوں) انتقال کر گئے اور جب شیخ عبدالحکیم[5] بن شیخ باجن قدس سرہٗ کے ہاتھوں سے مشائخ چشت کا خرقہ پہنا تو اس وقت مجھ کو ایک ایسے

---

[1] ۹۲۳ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات "شہنشاہ دوراں" ہے۔ حواشی ہندیہ سے مراد مولانا شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ کا حاشیہ ہے یہ شرح نہایت عمدہ اور نادرۂ روزگار ہے۔ اس شرح پر دیگر علماء کی طرح شیخ نے بھی حاشیہ تحریر کیا ہے۔

[2] بن حسام الدین بن عبدالملک بن قاضی خاں المتقی القادری شاذلی، مدینی، چشتی۔

[3] مفصل وصیت نامہ اخبار الاخیار میں ملاحظہ فرمایئے۔

[4] ان کا نام شیخ بہاؤالدین اور عرفیت شیخ باجن ہے سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ شیخ باجن بن حاجی معزالدین بن شہاب الدین بن شیخ ملک بن مولانا تاج الدین الخطابی مدنی۔ اور خطابی کی نسبت نفیل ابن خطاب کی طرف ہے جو حضرت عمر بن الخطاب کے حقیقی بھائی تھے۔ شیخ باجن شیخ رحمت اللہ بن عزیز اللہ (۸۶۰ھ) کے مرید ہیں۔ ۹۱۲ھ میں وفات پائی ان کے والد حاجی معزالدین حضرت مخدوم جہانیاں جلال بخاری (۷۵۸ھ / ۱۳۸۴ء) کے عظیم خلفاء میں ہیں۔ (نزہتہ الخواطر اردو ترجمہ گلزار ابرار) شیخ رحمت اللہ المتوکل کے حالات کے لیے نزہتہ الخواطر۔

[5] العالم الفقیہ شیخ عبدالحکیم بن بہاءالدین برہانپوری۔ (نزہتہ الخواطر)۔

شیخ کی صحبت میں حاضر ہونے کی ضرورت پیش آئی جو مجھے علم باطن کی تعلیم و تلقین کرے اور طریقت و حقیقت کا راستہ بتائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر میں ملتان روانہ ہوگیا اور عرصۂ دراز تک حضرت شیخ حسام الدین متقی[1] کی صحبت و خدمت میں حاضر رہا۔ اس کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا عزم کیا اور وہاں مجھے شیخ ابوالحسن بکری[2] کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ اور پھر مجھے قادری، شاذلی اور مدنی سلسلوں کے خرقے نصیب ہوئے۔ ان تینوں خاندانوں کے خرقے میں نے شیخ محمد بن محمد سخاویؒ کے دست اقدس سے زیب تن کیے۔" (وصیت نامہ کا خلاصہ ختم ہوا)

آپ ۹۵۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں ہی قیام پذیر ہوگئے۔ وہاں آپ نے اپنی عبادت و ریاضت، مجاہدۂ نفس اور زہد و تقویٰ نیز علوم ظاہر و باطن کی اشاعت اور تبلیغ سے عالمِ بالا تک اپنی شہرت کو پہنچا دیا۔ (ہر طرف مشہور ہوگئے)۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے تمام عوام و خواص آپ کے ظاہری و باطنی فضل و کمال اور ولایت و روحانیت کے معترف تھے۔

ابتداءً "صواعق محرقہ" کے مصنف عزم محترم کے مفتی شیخ ابن حجر مکی[3] آپ کے استاد تھے لیکن آخر میں وہ اپنے آپ کو شیخ کا شاگرد کہتے تھے۔ اور ان سے انھوں نے بیعت بھی کرلی تھی۔ اور خرقۂ خلافت بھی آپ سے پہنا تھا۔ آپ کے تصنیفات کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔

آپ نے علامہ جلال الدین سیوطی[4] کی کتاب "جامع صغیر" اور "جمع الجوامع" کو فقہی ابواب پر ترتیب دیا ہے۔ اور تصرفات کے اسباب وغیرہ بھی حتی الوسع بیان کیے ہیں۔

شیخ ابوالحسن بکریؒ فرماتے تھے "للسیوطی منتہ علی العالمین وللمتقی منتہ علیہ"

---

[1] سلسلۂ چشتیہ کے عظیم خلفاء میں ہیں اور فاضل و کامل ہیں۔ شیخ علی متقی ان کے شاگرد رشید ہیں۔ ۹۶۰ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات "زاہد دین پیشوا متقی" ہے (خزینۃ الاصفیا، اخبار الاخیار، تقصار نزہۃ الخواطر)۔

[2] ابوالحسن البکریؒ شافعی (۸۹۹ھ / ۹۵۲ھ) محمد بن محمد بن عبدالرحمن بن احمد البکری الصدیقی، مفسر، متصوف، مورخ کہتے ہیں کہ ان کی تصانیف چار سو سے زائد ہیں۔ منجملہ ان کے شرح منہاج النووی اور تحفہ واہب المواہب فی بیان المقامات والمراتب (تصوف)، الدرۃ المکللۃ فی فتح مکۃ المبجلۃ ہے۔

[3] احمد بن محمد بن علی بن حجر الہیثمی السعدی الانصاری۔ شہاب الدین شیخ الاسلام معروف بہ ابن حجر ہیثمی مکی (۹۰۹ھ–۹۷۴ھ / ۱۵۰۴–۱۵۶۷ء) آپ کی تصنیفات بہت مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے صواعق محرقہ علی اہل البدع والضلال والزندقہ، تحفۃ المحتاج شرح المنہاج مصنفہ بیضاوی (فقہ شافعی میں)، الفتاویٰ الحدیثیہ (۴ جلدیں کامل) طبع شدہ اور مشہور ہیں۔

[4] علامہ جلال الدین سیوطی ولادت ۸۴۹ھ وفات ۹۱۱ھ۔ آپ کی تالیفات تین سو سے زیادہ بیان کی گئی ہیں۔ آپ نے اسلاف کے بہت سے علوم کو اپنی تالیفات کے ذریعہ محفوظ فرما دیا۔ لیکن آپ کی تالیفات میں جامع صغیر اور جمع الجوامع بہت مشہور ہیں۔

(علامہ سیوطیؒ کا احسان دونوں عالم پر ہے اور شیخ متقیؒ کا احسان علامہ سیوطی پر ہے) آپ کی وفات ۲ / جمادی الاول ۹۷۵ھ کو ہوئی۔ "شیخ مکہ"[1] آپکی تاریخ وفات ہے۔ آپکی عمر شریف ۹۰ سال تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ شریف کے "ترجمہ" میں کتاب الامارۃ والقضاء میں شیخ عبدالوہاب متقی[2] سے متعلق ایک واقعہ نقل کرکے یوں فرماتے ہیں کہ:-

"ایک مرتبہ شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انصاف وعدالت کا ثواب بیشمار ہے اگر اس کا موقع ہاتھ آجائے تو بہت اچھا ہو۔ چند دن اس مقصد کے لیے عدل وانصاف کی خدمت انجام دینا چاہیے۔ اور یہ آزمائش کرلینی چاہیئے کہ کیا دنیاوی مشغلہ حضور قلب اور سکون خاطر کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے یا نہیں؟ جب سلطان محمود گجراتی کو جو حضرت شیخ کے بہت مطیع وفرمانبردار اور معتقد تھے۔ آپ کی اس خواہش کا علم ہوا تو انھوں نے خدمتِ سامی کے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور اس منصب پر آپ کے متمکن ہونے کو سلطنت کے کاروبار کے لیے ایک نیک شگون اور خوش فالی تصور کیا۔ چنانچہ حضرت شیخ نے دارو غگی کا عہدہ پسند فرمایا۔ اور عدل وانصاف کی کرسی پر جلوہ افروز ہوگئے۔ لیکن آپ کے غریب اور شریف النفس خادموں میں سے کچھ لوگوں نے رشوت لینی شروع کردی۔ جب بادشاہ کو یہ خبر پہنچائی گئی کہ شیخ اپنے زہد وتقویٰ اور دیانتداری کے باوجود رشوت لیتے ہیں اور معاملات میں بے اعتدالی اور افراط وتفریط روا رکھتے ہیں تو بادشاہ نے اس بات کا یقین نہیں کیا۔ تو لوگوں نے کہا کہ کچھ ملازمین خاص جو شیخ کے ساتھ رہتے ہیں وہ رشوت لیتے ہیں اور شیخ ان کے اس فعل کو جانتے ہیں اور اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ جب شیخ نے یہ سنا کہ لوگوں نے بادشاہ کو اس طرح کی خبر پہنچائی ہے تو کچھ دن اس معاملہ کے سدھارنے میں مصروف رہے آخر کار جب آپ نے دیکھا کہ اس معاملہ میں کوئی اصلاح نہیں ہورہی ہے (لوگ باز نہیں آتے) تو ایک دن آپ عدالت کی مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ یکایک آپ نے اپنی چھڑی ہاتھ میں لی اور وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر ادھر دیکھا اور اپنے دوستوں کو سلام کرکے کہا کہ لوگو! یہ دونوں کام (دین اور دنیا کے مشاغل) اکٹھا نہیں ہوسکتے۔" والعاقبۃ بالخیر، یعنی نجات کا دارو مدار نیک انجام پر ہے۔

---

[1] اسی طرح "متابعۃ النبی" اور "فقطی نجیہ" سے بھی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

[2] بن شیخ ولی اللہ مندوی ثم برہانپوری۔ مکہ معظمہ پہونچ کر شیخ علی متقی کی خدمت میں رہے۔ ۹۶۳ھ سے شیخ کی وفات ۹۷۵ھ تک ۱۲ سال تک مکہ میں قیام فرمایا۔ رسالہ اتحاف التقی فی فضل الشیخ علی متقی۔ اپنے شیخ کے حالات میں ان کی یادگار ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کے مرید ہیں۔ اخبار الاخیار میں ان کے حالات درج کیے ہیں۔ (خزینۃ الاصفیا)۔

(۱۴)

شیخ محمد بن طاہر الفتنی (پٹنی) قدس سرہٗ

آپ خادمِ حدیثِ نبوی و ناصرِ سننِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (حدیث شریف کی عظیم خدمت انجام دی ہے) مروجہ دینی کتب کی تحصیل و تکمیل کے بعد آپ حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منورہ کے عزم سے روانہ ہوئے۔ ان مقدس مقامات پر پہونچ کر آپ نے ان شہروں کے علماء اور باکمال مشائخ کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ خصوصاً شیخ علی متقیؒ قدس سرہٗ کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت شیخؒ کی باکرامت محفل کی حاضری کی برکت سے آپ نے بے اندازہ فیوض و برکات حاصل کیے اور آپ سے بیعت کا شرف بھی حاصل کر لیا۔ پھر اپنے وطن کا رخ کیا اور وہاں پہونچ کر دینی و شرعی علوم کی تبلیغ و اشاعت سے خلق خدا کی فیض رسانی اور اعلاء کلمۃ الحق کا بازار گرم کیا۔ (علوم شرعیہ کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔)

آپ اپنے شیخ قدس سرہٗ کی وصیت کے مطابق اپنی روشنائی دینی کتب لکھنے والوں کے تعاون کے لیے بناتے تھے۔ یہاں تک کہ دینی کتابوں کا درس دیتے وقت بھی آپ روشنائی بناتے رہتے تھے تاکہ دل و دماغ اور زبان کے ساتھ ہاتھ بھی دینی خدمات اور علوم دین کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ آپ نے علم دین کے موضوعات پر بہت سی کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ مثلاً مجمع البحار، غرائب الحدیث، مغنی اور اسماء الرجال[1] وغیرہ۔ وہ اپنے ہم قوم "بواہیر مہدویہ" کو شکست دینے کے کام میں بھی اپنے استاد کی طرح سرگرم عمل رہے۔ (فرقۂ مہدویہ کے لوگ سید محمد جونپوریؒ[2] کے پیرو تھے۔ اور ہندوستان میں وہی اس فرقے کے بانی تھے۔ جن کے فتنے مشہور ہیں) اور یہ اقرار کیا تھا کہ جب تک بدعت و گمراہی کا داغ اس گروہ کی پیشانی سے دھو نہ دیں گے اس وقت تک اپنے سر پر عمامہ نہ باندھیں گے۔

جب اکبر بادشاہ نے ۹۸۰ھ میں گجرات کو فتح کیا اور پٹن میں شیخ سے اُن کی ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے شیخ کے سر پر پگڑی باندھی اور یہ فرمایا کہ آپ نے جس وجہ سے پگڑی باندھنی چھوڑ دی ہے اس کی اطلاع میرے کانوں تک پہونچ گئی ہے۔ آپ اطمینان رکھئے کہ میں نے دین اسلام

---

[1] تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات فی ذکر الضعفاء والوضاعین۔ کتابیں بھی ان کی تصنیفات میں ہیں۔

[2] سید محمد جونپوری ہندوستان میں فرقۂ مہدویہ کے بانی تھے۔ ان کا فتنہ مشہور ہے۔ ۹۱۰ھ میں وفات پائی۔ (تذکرہ علماء ہند، ہدیہ مہدویہ مولانا محمد زمان شاہجہانپوری و شیخ محمد اکرام۔)

کی خدمت اور مدد کرنے کا بارِ عظیم آپ کی منشا کے مطابق اپنے عدل وانصاف کے ذمہ لے لیا ہے۔

اسی سال گجرات کی حکومت کا انتظام خان اعظم مرزا عزیز کوکہ[1] کے سپرد ہوا اور خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی مدد سے گمراہی اور بدعت کی اکثر رسمیں جڑ سے اکھاڑ دی گئیں۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد گجرات کا پورا صوبہ عبدالرحیم خان خاناں[2] کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کی امداد اور حمایت و پشت گرمی سے فرقہ مہدویہ کا یہ گروہ پھر موقع پا کر اپنی کمین گاہ سے نکل پڑا۔ حضرت شیخ نے اپنے سر سے عمامہ اتار دیا اور آگرہ کے سفر کا ارادہ کیا تاکہ اس واقعہ کی خبر شہنشاہ اکبر کے کان تک پہنچا دیں اور اس کا کوئی مناسب تدارک عمل میں لائیں۔ شیخ وجیہ الدین علوی قدس سرہٗ نے اگرچہ اشارۃً وکنایۃً بہت کچھ اس سفر سے روکا اور یہ فرمایا کہ ساری کائنات خلاق ارض وسما کے جلالی اور جمالی مظاہر کا آئینہ ہے۔ اور اسمائے الٰہیہ میں ہر اسم کے آثار واحکام کی پوری پوری حفاظت کرنا ایک صراط مستقیم اور راہ ہدایت ہے۔ لیکن حضرت شیخ وجیہ الدین قدس سرہٗ کی یہ ہدایتیں اور نصیحتیں ذرہ برابر مؤثر اور مفید ثابت نہ ہوئیں اور شیخ محمد بن طاہر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مخالفین کی ایک جماعت ان کے پیچھے لگ گئی اور انھوں نے شیخ کو اجین اور سارنگ پور کے درمیان جا لیا اور ان پر حملہ آور ہو کر شہید کر ڈالا اس طرح ۹۸۶ھ میں آپ نے اثنائے سفر میں جام شہادت نوش فرمایا۔

لوگوں نے آپ کی نعش کو "مالوہ" سے "فتن" کے مقام پر لے جا کر ان کے آبا و اجداد کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ آپ کے نبیرگان میں سے ایک بزرگ شیخ عبدالقادر بن شیخ ابوبکر مکہ معظمہ میں مفتی کے عہدہ[3] پر فائز تھے۔ اور علم وفضل، فصاحت وبلاغت خصوصاً تقویٰ وپرہیزگاری میں آپ اپنے دور کے تمام علماء و فضلاء میں ممتاز تھے۔ مکہ معظمہ میں آپ کئی سال تک مفتی حرم محترم کی حیثیت سے مسند افتاء پر رونق افروز رہے۔ تالیفات میں فتاویٰ (چار جلدوں میں) اور "نفثات" آپ کی یادگاریں ہیں۔ ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی۔

جناب شیخ عبدالقادرؒ کے استاد شیخ عبداللہ طرفہ انصاری کی شافعی نے اپنے شاگرد کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں شیخ عبداللہ انصاری نے شیخ عبدالقادر کے دادا شیخ محمد طاہرؒ کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہونچایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

---

[1] کوکہ "دودھ شریک بھائی" کو کہتے ہیں اور مرزا عزیز اکبر کے رضاعی بھائی تھے۔ جلوس اکبری کے انیسویں سال طبیعت سے ۱۰۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ (مفتاح التواریخ۔ مآثر الامراء)

[2] عبدالرحیم خان خاناں پسر بیرم خاں خان خاناں۔ ولادت ۹۶۴ھ اور وفات ۱۰۳۶ھ۔ دہلی میں مدفون ہیں۔

[3] شیخ عبدالقادر بن ابوبکر الصدیقی الحنفی الہندی محی الدین ابو الفرج الفقیہ مفتی مکہ معظمہ تحصیل علم شیخ عبداللہ انصاری (متوفی ۱۱۳۲ھ) سے کی تبیان الحکم بالنصوص، الدرۃ الدرۃ علی الشرق من اللام، فتاویٰ چار جلدوں میں، قطع الجدال تحقیق مسئلہ الاستبدال، مجموعہ النفثات، آپ کی تصانیف ہیں۔

قد کان جد ابیک بل ضریحۃ — من اوحد العلماء والفضلاء

آپ کے والد محترم کے جدِ محترم — علمائے زمانہ اور فضلائے عصر میں یکتا و منفرد تھے

اعنی محمد طاہر من منجی — الصدیق حققہ لبغیر مراء

یعنی محمد طاہر قدس سرہٗ جن کا سلسلۂ نسب — حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے

لیکن اس بات پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ شیخ محمد طاہر بوہرہ[1] قوم میں سے ہیں اور اخبار الاخیار میں حضرت شیخ عبدالحق دہلوی کی توضیح و تشریح بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شیخ محمد طاہر نسبًا اپنی ماں کی طرف سے صدیقی ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کا اپنے آپ کو صدیقی کہنا یا لکھنا محض اپنے عقیدہ کی بنا پر تھا۔ جیسا کہ شیعہ اپنے آپ کو حیدری کہتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی اپنے آپ کو صدیقی کہتے تھے۔

---

(۱۵)

شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی قدس سرہٗ

آپ معقولات و منقولات کے بحرِ ذخار اور علوم ظاہری و باطنی کے خزانوں کے خزینہ دار ہیں ماہِ محرم سنہ ۹۱۱ھ میں جانبانیر کے مقام پر آپ کی پیدائش ہوئی۔ اور یہیں آپ نے نشو و نما اور تعلیم و تربیت بھی پائی۔ گجرات جیسے عظیم اور متمدن شہر میں آپ نے باقی علوم و فنون متداولہ کی تکمیل ملا عماد طارمی[2] سے کی۔ بیعت و ارادت کا شرف آپ نے شیخ قاضن[3] قدس سرہٗ سے حاصل کیا (مرید ہوئے) جب حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری[4] قدس سرہٗ احمد آباد میں تشریف فرما ہوئے تو شیخ وجیہ الدین آپ کے جمال ظاہری میں

---

[1] نواب صدیق حسن خاں نے ایک رسالہ "بوہرہ" قوم کی تحقیق میں تالیف کیا ہے اور کوثر میں شیخ محمد اکرام نے بھی بوہرہ قوم پر شرح و بسط سے لکھا ہے۔

[2] شیخ الفاضل محمد (۹۴۱ھ) بن محمود الطارمی۔ عماد الدین (طارم خراسان کی ایک قصبہ کا نام ہے) جلال الدین محمد بن السعد الدوانی (ف ۹۰۸ھ) کے شاگرد رشید تھے، مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی اور قاضی علاؤ الدین عیسیٰ گجراتی احمد آبادی دونوں ہی نے ان سے تحصیل علم کیا (ف ۹۴۱ھ)۔ (نزہۃ الخواطر)

[3] شیخ محمد بن العلاء القیری المعروف بہ شیخ قاضن شطاری (۹۴۰ھ) خلیفۂ اعظم شاہ عبداللہ شطاری (۸۳۲ھ) (اردو ترجمہ گلزار ابرار، نزہۃ الخواطر)۔

[4] محمد بن خطیر الدین بن عبداللطیف شطاری۔ ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری تک پہنچتا ہے (ف ۶۲۷ھ) چنگیز خانی فتنہ کے دوران شیخ عطار شہید کردیئے گئے تھے۔ اسرار نامہ اور تذکرۃ الاولیاء ان کی یادگاریں ہیں۔ (نفحات الانس، مفتاح التواریخ، خزینۃ الاصفیاء) شیخ محمد غوث گوالیاری، حاجی حمید بن ظہیر شطاری (ف ۹۴۰ھ) کے مرید اور پروردہ تھے سلسلۂ شطاریہ ہندوستان میں ان ہی کی وجہ سے مقبول ہوا۔ ہندوستان میں اس سلسلے کے بانی عبداللہ شطاری ہیں۔ ان کے صاحبزادہ ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست

بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

محو و مستغرق اور آپ کے کمال باطنی پر فریفتہ و والہ و شیدا ہو گئے۔ اور شیخ کے سایۂ تربیت میں کچھ زمانہ گذار کر علوم ظاہری و باطنی کا تکملہ کیا۔ اس کے بعد عرصۂ دراز تک آپ فیض رسانی خلق کی مسند پر جلوہ افروز رہے اور مشرق و مغرب کو اپنے فیوض و برکات سے مالا مال اور معمور کرتے رہے۔ آپ کثیر التصانیف ہیں ان میں چند مخصوص تصانیف درج ہیں۔

تفسیر میں حاشیۂ بیضاوی، اصول حدیث میں حاشیۂ نخبہ[1]، حاشیۂ عضدی، حاشیۂ تلویح، حاشیۂ بزدوی حاشیۂ ہدایہ[2]، فقہ میں حاشیہ شرح وقایہ، علاوہ ازیں حاشیۂ مطول و مختصر معانی، حاشیۂ اصفہانی[3]، حاشیۂ شرح عقائد تفتازانی[4]، محقق دوانی کے قدیم حاشیہ پر حاشیہ، حاشیہ شرح حکمت[5] العین، حاشیۂ شرح مقاصد، حاشیہ شرح قطبی، حاشیہ شرح چغمینی[6]، شرح تحفۂ شاہی[7]، شرح رسالہ[8] فارسی، ملا علی قوشجی[9]

بقیہ حاشیہ: شطاری (۹۷۰ھ) نے اس سلسلہ کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان سے حاجی حمید حضور رسنا اور ان سے شیخ محمد غوث گوالیاری نے جو بابر بادشاہ کے مقرب خاص تھے شیخ وجیہ الدین علوی انھیں کے خلیفہ ہیں اور شیخ قاضن شیخ عبداللہ شطاری کے خلیفہ اعظم ہیں۔ شیخ غوث گوالیاری کی بہت سی تصانیف ہیں منجملہ ان کے جواہر خمسہ ہے جو انھوں نے سب سے پہلے ۹۱۶ھ میں تالیف کی بختم ۹۵۶ھ کے بعد ترتیب جدید کے ساتھ اس کو مرتب کیا۔ (۲) کلید مخازن اس رسالہ میں مبداء و معاد کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے جو اہل کلام اور صوفیاء کا مشکل ترین مسئلہ ہے! ورقا نے یونان نے بھی اس مسئلہ میں بحث کی ہے (۳) الصمائر و البصائر ان دونوں کتابوں کا موضوع علم تصوف اور اس کے مبادی و مقاصد ہیں (۴) بحر الحیاۃ یہ رسالہ اصل میں امرت کنڈ کا ترجمہ ہے۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کے اشغال اس میں مندرج ہیں۔ (۵) کنز الوحدۃ، اس رسالہ میں اسرار توحید اور ایمان کی قسموں کو موضوع قرار دیا ہے (۶) شرح کلید مخازن۔

حاشیہ صفحہ ہذا: ۔ [1] نخبہ اصول حدیث کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر مولفہ حافظ ابن حجر عسقلانی ہے۔ (۷۷۳-۸۵۲ھ) جو فتح الباری شرح بخاری کے مولف ہیں۔ اس کے بعد مولف نے اس رسالہ پر تفصیلی شرح بھی لکھی ہے۔ اور اس کا نام شرح نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر ہے۔ مؤلف کی اس شرح پر علماء نے شرحیں اور حواشی لکھے ہیں منجملہ ان کے ایک شرح بسیط شیخ محمد اکرم بن عبدالرحمن سندھی کی امعان النظر فی توضیح نخبۃ الفکر کے نام سے ہے۔ اسی طرح شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی مدنی کی بھی بہجۃ النظر علی شرح شرح نخبۃ الفکر کے نام سے ایک شرح ہے شیخ وجیہ الدین گجراتی نے بھی مولف کی شرح پر ایک شرح لکھی ہے مگر احسن ترین شرح فارسی کی وہ شرح ہے جو مولوی محمد حسین المرتجلی ہزاروی شاگرد شیخ المحدث سید نذیر حسین دہلوی عرف میاں صاحب (۱۳۲۰ھ) کی ہے۔ [2] شیخ الاسلام مرغینانی (۵۹۳ھ) کی تالیف اور فروع حنفیہ میں متداول ہے [3] شرح مختصر و کلام میں اصفہانی کی تالیف جس پر علامہ گجراتی کا حاشیہ ہے۔ [4] رسالہ عقائد نسفی انتہائی مختصر رسالہ ہے جو علم اصول دین میں ہے اور شیخ نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد متوفی ۵۳۷ھ کی تالیف ہے اس پر متعدد علماء نے شرحیں تحریر کی ہیں منجملہ ان کے شرح علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ ہے جو مدارس دینیہ میں متداول ہے۔ مولف نے ۷۶۸ھ میں شرح تحریر کر کے فراغت پائی۔ (کشف الظنون) اور اس شرح پر شیخ مذکور کا حاشیہ ہے [5] علم منطق میں میران کاتبی متوفی ۶۷۵ھ کی تالیف ہے جو نصیر الدین طوسی کے شاگرد رشید تھے۔ [6] یعنی قاضی زادہ رومی کی شرح پر حاشیہ۔ ہیئت بسیط میں یہ شرح محمود بن محمد کی تالیف شرح چغمینی کی تلخیص ہے۔ [7] ہفت اقلیم میں اس کتاب کو مولانا قطب الدین علامہ شیرازی سے منسوب کیا گیا ہے۔ جو علم ہیئت میں ہے شیخ وجیہ الدین نے اس کتاب پر حواشی لکھے ہیں (ہفت اقلیم مطبوعہ کلکتہ بحوالہ حواشی مقالات الشعراء از پیر حسام الدین راشدی)۔ [8] علم ہیئت میں ملا علی قوشجی کا مولفہ فارسی میں ایک رسالہ ہے (۸۷۹ھ) علاء الدین علی بن محمد الحنفی مشہور بہ قوشجی جو قاضی زادہ موسیٰ الرومی شارح ملخص چغمینی کے بیٹے تھے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

حاشیہ شرح ضیائیہ، شرح ارشاد[۱] قاضی شہاب الدین دولت آبادی، شرح ابیات منہل، شرح جام جہاں نما[۲]، شرح کلید مخازن[۳]، رسالہ حقیقت محمدیہ۔

۹ صفر ۹۹۸ھ بروز یکشنبہ آپ نے وفات پائی۔ آپ کا مقبرہ احمد آباد میں ہے۔ "لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا" آپ کی تاریخ وفات ہے۔

---

(۱۶)

شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوریؒ

آپ اپنے دور کے علماء متبحرین اور فضلاء کاملین میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کے آباء و اجداد میں سے پانچویں جد نے ملک یمن سے باہر قدم نکالا۔ اور تمام دنیا کی سیر فرمائی اور قدرت الٰہیہ کے بہت سے حیرت انگیز مناظر ملاحظہ فرمائے۔ آخر کار نویں صدی ہجری میں سیوستان (سندھ) کے مضافات میں "ایل" نامی ایک قصبہ میں آپ نے اپنا رخت سفر کھول دیا۔ اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر کے شادی بھی کر لی۔ ان کی اولاد میں سے شیخ خضر دسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کے سیر و سیاحت کے لیے "ایل" سے روانہ ہوئے۔ اور ناگور کے شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی مقام پر (ناگور میں) ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک نے مادی و بشری جامہ پہنا (پیدا ہوئے) نوجوانی کے زمانہ تک وہاں قیام کرنے کے بعد آپ نے احمد آباد گجرات کا سفر کیا اور وہاں خطیب ابو الفضل گازرونی نیز وہاں کے دیگر علماء و فضلاء سے کمالات ظاہری و باطنی حاصل کیے۔ ۹۵۰ھ میں آپ نے آگرہ کا رخ کیا اور یہاں مقیم ہو گئے۔ آگرہ میں اپنے پچاس سالہ قیام

بقیہ حاشیہ:۔ قاضی زادہ نے تجرید العقائد وغیرہ کی بھی شرح کی ہے (ہدیۃ العارفین، ثقافۃ الہند)۔ ۵ تحفہ شاہی از علامہ قطب الدین محمود ابن مسعود شیرازی متوفی ۷۱۰ھ جو وزیر امیر شاہ محمد ابن صدر السعید تاج الدین ابن معتز کے نام سے لکھی ہے ایک جلد ہے اور چار ابواب پر مشتمل ہے (کشف الظنون)۔

حاشیہ صفحہ ہذا:۔ ۱ یہ کتاب علم نحو میں ہے نیز اس نام کی ایک کتاب اور بھی ہے جو شیخ ابو محمد عبد اللہ بن جعفر معروف بابن درستویہ نحوی متوفی ۳۴۷ھ کی تالیف ہے۔ ۲ جام جہاں نما علم تصوف میں ایک رسالہ ہے جو شیخ محمد شیرین (محمد عز الدین المغربی) المعروف بہ شیخ مغربی متوفی ۸۰۹ھ کی تالیف ہے یہ رسالہ دو مرتبہ طہران (۱۳۱۳ھ) اور بمبئی (۱۳۲۱ھ) میں طبع ہو چکا ہے۔ (فہرست کتابہائے چاپی فارسی)۔

۳ "کلید مخازن" حضرت محمد غوث گوالیاری کی وہ تالیف ہے جس کی شرح میں شیخ شطاری نے مبداء و معاد کی حقیقت سے بحث کی ہے۔ یہ مسئلہ مسائل کلامیہ میں سخت ترین مسئلہ ہے علمائے تصوف اور فلاسفہ یونانی نے بھی اس بحث میں شرکت کی ہے اور شیخ مذکور نے اسی پر شرح تحریر فرمائی ہے۔

کے دوران آپ نے وہاں کے لوگوں کو اپنے سرچشمۂ علم وفضل سے سیراب فرمایا۔ آپ کا ایک نہایت ہی حیرت انگیز کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے پانچ سو ضخیم کتابیں خود اپنے قلم سے تحریر کیں۔ آخری عمر میں اگرچہ آنکھ کی روشنی زائل ہوگئی تھی اس کے باوجود اپنی قوت حافظہ سے پورے قرآن پاک کی تفسیر چار جلدوں میں تصنیف فرمائی اور تفسیر مذکور کا نام "منبع عیون المعانی" رکھا۔ قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ تفسیر کی عبارت آپ مسلسل بلا تکلف بیان کرتے جاتے تھے۔ اور املا نویس حضرات اس تقریر کو تحریر کرتے جاتے تھے۔ آپ کی وفات ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۰۱ھ میں واقع ہوئی آپ کا مقبرہ آگرہ میں ہے۔

۱۷۱

شیخ ابوالفیض فیضی بن شیخ مبارکؒ

آپ ۵ رشعبان المعظم ۹۵۴ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں اپنے والد کی شاگردی میں مروجہ علوم وفنون کی تکمیل کی۔ فنِ طب، عربی ادب پر آپ نے خصوصیت کے ساتھ اتنی دسترس اور کمال حاصل کر لیا تھا کہ اپنے تمام معاصرین سے ممتاز اور سربلند ہوگئے ہر علم وفن کے میدان میں اپنی شہرت کا لوہا منوالیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔ ؎

آنم کہ فنون ذوفنوناں دارم　　انوارِ چراغ رہنموناں دارم
ایں کالبدم زخاک ہنداست ولے　　در ہر بُنِ مو ہزار یوناں دارم

جب فیضی کے جوہر قابل کی اطلاع اکبر بادشاہ کو پہونچی تو ۹۷۴ھ میں بادشاہ اکبر نے فیضی کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ دربار میں ملازمت حاصل کرنے کے بعد فیضی بادشاہ کی توجہات خصوصی کا مرکز بن گئے۔ اور دربار اکبری میں ان کو تقرب اور مصاحبت کا شرف حاصل ہوگیا۔ علاوہ بریں بادشاہ اکبر نے ان کو "ملک الشعراء" کا خطاب دیکر مزید عزت بخشی۔ فیضی بحیثیت شاعر بے عدیل و بے نظیر تھے۔

شیخ فیضی کی شاعری کی خصوصیات حصۂ شعراء میں تحریر کریں گے۔

فیضی ۹۹۹ھ میں اکبر بادشاہ کے دربار سے منصب سفارت پر فائز ہو کر خاندیس کے بادشاہ[1] راجہ

---

[1] الملک الفاضل علی بن مبارک بن عادل بن حسن بن نصیر الفاروقی راجہ علیخاں برہان پوری ملقب بہ عادل شاہ اپنے بھائی محمد شاہ کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور تدبر سے حکمرانی کی۔ علماء و مشائخ کے بڑے قدردان تھے ۱۰۰۵ھ میں وفات پائی اور برہانپور میں مدفون ہوئے۔ (تاریخ فرشتہ)۔

علی خان) کے دربار کی طرف روانہ ہوئے۔ بادشاہ اکبر کے احکام پہونچانے اور سفارت کی خدمت انجام دینے کے بعد احمد نگر کے والی برہان شاہ[1] کے دربار میں بطور سفیر بھیجے گئے۔ ان دونوں سفارتی خدمات کو انجام دینے کے بعد سنہ ۱۰۰۳ھ میں فیضی پھر واپس دربار اکبری میں آ گئے۔ ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ھ کو فیضی کا انتقال ہوا۔ اور اپنے والد ماجد کے مقبرہ کے پاس دفن کیے گئے۔ جب فیضی پر نزع کا عالم طاری تھا تو اکبر بادشاہ آدھی رات کو ان کی مزاج پرسی کے لیے آیا اور ان کے سر کو اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

شیخ فیضی کی علمی لیاقت اور فضیلت کی دلیل اس کی قرآن پاک کی "بے نقط" تفسیر "سواطع الالہام" ہے۔ ایسی تفسیر اس سے قبل ایک ہزار سال کی مدت میں کسی عالم یا مصنف کو لکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسے دشوار کام کا اس نے صرف دو سال کی مدت میں تکملہ کر دیا۔

میر حیدر معمائی کاشی[2] نے تفسیر "سواطع الالہام" کے مکمل ہونے کی تاریخ "سورۂ اخلاص" سے نکالی جو سنہ ۱۰۰۲ھ ہے اور دس ہزار روپے بطور صلہ عنایت ہوئے۔ اس زمانہ کے بہت سے ممتاز اور مشاہیر علماء و فضلاء نے اس تفسیر پر اپنے تبصرے، تقاریظ اور آراء تحریر کیں۔ مثلاً شیخ یعقوب[3] کشمیری و سید[4] محمد شامی۔

---

[1] امیر کبیر برہان بن احمد بن الحسن البحری احمد نگری معروف بہ برہان نظام شاہ۔ اپنے والد کی وفات کے بعد سنہ ۹۱۴ھ میں بمقام احمد نگر تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ بکمل خان دکنی نے امور سلطنت اپنے ہاتھوں سے کر برہان کی اتالیقی کے فرائض انجام دیئے۔ تعلیم کے بعد برہان شاہ نے امور سلطنت اپنے ہاتھ میں لیے اور شاہ طاہر الحسینی کے اشارہ پر مذہب تشیع کی اشاعت شروع کر دی۔ سخت تعصب اختیار کیا۔ بہت سے علماء اہل سنت وجماعت کو قید کر دیا۔ شیخ شاہ محمد نیا پوری، ملا علی گل استرآبادی، ملا رستم جرجانی، اور ملا علی مازندرانی وغیرہم اس کے مصاحبین تھے۔ سنہ ۹۶۱ھ میں وفات پائی اور احمد نگر میں دفن ہوئے۔ (تاریخ فرشتہ، نزہتہ الخواطر) اس کی وفات کی تاریخ "خالدٌ فی النار" ہے (شمع انجمن)۔

[2] معمائی تخلص ہے کاشان کے رہنے والے تھے اعلیٰ علمی استعداد کے حامل تھے۔ فن معما اور تاریخ گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ دوسرے علوم کا پتہ نہیں چلتا۔ گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں انتقال ہوا۔

[3] صرفی تخلص (۹۰۸-۱۰۰۳ھ) خلف شیخ حسن گنائی عاصمی کشمیر کے بزرگوں میں تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے شاگرد رشید محمد شاہ آفی اور ملا نصیری کی خدمت میں درسیات پڑھیں! اس کے بعد زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل کیا۔ شیخ حسین خوارزمی سے سند حدیث لی اور تعلیم باطنی سے فیضیاب ہوئے شیخ ابن حجر مکی (م ۹۹۵ھ) اور بہت سے مشائخ وہابیہ سے فیوض حاصل کیے اور ان سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ کافی مریدتھے۔

[4] شیخ الفاضل محمد بن ابو محمد شامی الشیخ زین الدین مجتہد شیعہ عامل کے بھتیجے تھے ان کے دو مسلک مناسب جگہ تحریر کیے گئے ہیں۔ بہادری اور سفارش کے اوصاف سے متصف تھے۔ فنون عربیہ میں دوسرے کسائی تھے۔ عبدالقادر بدایونی نے ان کے رقعات میں سے ایک رقعہ نقل کیا ہے (نزہتہ الخواطر، منتخب التواریخ)۔

ان کے علاوہ ملا ظہوری ترشیزی[1] نے بھی لطائف اہمال میں تقریباً ستر رباعیاں اور ایک نہایت ہی عمدہ قصیدہ تفسیر مذکور کی تعریف میں نظم کیا ہے۔ ملا ملک قمی[2] نے بھی بہت سی رباعیاں اس موضوع پر نظم کی ہیں۔ چونکہ تفسیر سواطع الالہام کا نسخہ کم دستیاب ہوتا ہے اس لیے نمونہ کے طور پر سورۂ کوثر کی تفسیر جو سب سے چھوٹی سورہ ہے درج ذیل کی جا رہی ہے تاکہ قارئین اس کی صحیح کیفیت و لطافت سے آشنا ہوں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم لما حل ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادرکہ السام وسمعہ العاص وکلم وھو عسور لا ولد لہ لو ادرکہ السام ھلک وحسم اسمعہ صلعم ارسل اللہ انا اعطیناک محمد الکوثر العطاء الکامل علما وعملا والمورد الامرء ماء والاحمد ھواء وورد ماء الملا امر وھو مورد رسول اللہ صلعم اعطاہ اللہ صلعم کرماء او المراد الاولاد او علماء الاسلام او کلام اللہ الموصل فصل دواما لربک اللہ لا لما سواہ کما ھو عمل مرء مراد عمل الاسھوا وانحر واشرح للہ واعطہ اھل السؤال وھو عکس الکلام الاول المصرح لاحوال اھل السھو والصد واعمالھم ان شانئک عاداک ھو الابتر المعدم لا ولد لہ وادام اللہ اولادک ومراسم اسماء ک امرک ومکارم عصرک ومحامد مراسمک ۞ (تفسیر سورہ الکوثر ختم ہوئی)

حواشی

سام۔ مرگ (موت) وصم۔ عیب کردن (عیب لگانا) عسور بالفتح دشوار زائندہ (مشکل سے پیدا ہونے والا) حسم بالفتح بریدن (کاٹنا) امرء بالفتح گوارا تر (انتہائی پسندیدہ) مرائی ریا کنندہ (مکار) صرح ذبح کردن (ذبح کرنا) پہلے کلام سے مراد سورۂ ماعون ہے۔

اس کے علاوہ موارد الکلم نامی ایک غیر منقوط رسالہ بھی علم الاخلاق کے موضوع پر فیضی ہی کی یادگار ہے۔

---

[1] سلطنت دکن کے بادشاہ ابھی کا اعلیٰ کلام بلندیوں تک پہونچا ہوا تھا۔ ان کا نام محمد طاہر ہے۔ ملا ملک قمی نے اپنی صاحبزادی کا عقد مولانا سے کر دیا تھا۔ ملا ظہوری نے بمقام دکن ۱۰۲۵ھ میں انتقال کیا۔ گلزار ابراہیم، خوان خلیل اور ساقی نامہ ان کی یادگاریں ہیں۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ ان کے نثری مضامین سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں۔

[2] عہد اکبری کے مشہور شعراء میں تھے۔ ۱۰۲۴ھ میں وفات پائی۔ پہلے مرتضیٰ نظام شاہ پھر برہان شاہ والی احمد نگر سے قربت حاصل کی اور آخر میں بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر عزت و افتخار کی زندگی گزاردی۔ اور بقول مولانا ظہوری کتاب "نورس" جس میں نو ہزار اشعار ہیں عادل شاہ کے نام سے معنون کی اور نو ہزار ہون (دینار کی ایک قسم جو دکن کے علاقہ میں اس وقت رائج تھی۔) سو سو کی رقم کے ساتھ حاصل کیے (سرو آزاد، نزہۃ الخواطر، مفتاح التواریخ)۔

علم الحساب کے موضوع پر لیلاوتی نامی ایک کتاب کا ہندی زبان سے فارسی میں ترجمہ بھی فیضی کا کارنامہ ہے۔

(۱۸)

شیخ عبد الحق دہلوی قدس سرہٗ

آپ کی شہرت کا غلغلہ اہل جہان کے کانوں میں گونج رہا ہے اور مؤرخین کے قلم آپ کی منقبت نگاری (مختصراً اور مفصلاً) میں معروف رہے ہیں۔ چند سطریں آپ کے لوحِ مزار پر کندہ کر کے آپ کے روضۂ منورہ کے سرہانے نصب کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں صرف آپکے لوحِ مزار کی عبارت پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جو یہ ہے:۔

اس سراپا زہد و اتقا، پیکر مجد و اقتدار، اپنے وقت کے مسلم الثبوت پیشوا یعنی شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کمالات اور روحانی کرامات کا مختصر اور واقعی حال یہ ہے کہ آپ ابتدائے سنِ شعور سے ہی عبادتِ الٰہی اور طلبِ علم کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ جب سنِ بلوغ کے قریب پہونچے تو آپنے بہت سے دینی علوم و فنون حاصل کر لیے تھے۔ اور بائیس سال کی عمر میں تمام دینی علوم پر آپ کو پوری دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ اس عمر تک پہونچتے پہونچتے آپ نے قرآن مجید بھی تمام و کمال حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد آپ مسندِ رشد و ہدایت پر جلوہ افروز ہوگئے۔ عنفوان شباب ہی تھا کہ عشق الٰہی کے شعلے دل میں بھڑک اٹھے۔ یکبارگی دنیا اور علائق دنیا سے کنارہ کش ہو کر زیارت حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور عرصۂ دراز تک ان مقامات مقدسہ میں قیام کرکے اور وہاں کے علمائے متبحرین اور اولیائے کاملین کی صحبت سے بہرہ اندوز ہو کر ظاہری و باطنی، علمی و روحانی کمالات سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اس کے علاوہ فن حدیث میں کمال حاصل کر کے بہت سی نعمتوں اور برکتوں کے خزانے ساتھ لے کر وہاں سے اپنے محبوب وطن کو واپس ہوئے۔

وطن واپس آکر باون سال تک علوم ظاہری و باطنی اور ارشادات ربانی کے ذریعہ فرزندان توحید اور طالبان حق کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ دینی علوم خصوصاً حدیث شریف کی نشر و اشاعت میں

سلہ یہ کتاب لیلاوتی سلاطین اودھ کے زمانہ میں لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے "مثنوی نل دمن" کہ الشعراء (بیر بل ہرش) کی سنسکرت زبان میں نظم کی ایک کتاب "نندھ چرت" کا فارسی ترجمہ ہے فیضی نے یہ ترجمہ ۱۰۰۳ھ میں مکمل کیا بلا مبالغہ لکھتے ہیں، یقیناً ایسی مثنوی ہے جس کے مثل ان تین سالوں میں امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں شاید ہی کسی نے کہی ہو نیز ایک کتاب "مرکز ادوار" بھی فیضی کی جانب منسوب کی جاتی ہے جس کی تکمیل ان کے انتقال کے بعد شیخ ابو الفضل نے ۱۰۰۵ھ میں کی۔

معروف رہ کر ایسی امتیازی شان اور بلند مرتبہ حاصل کیا۔ جو کسی کو آج تک نصیب نہ ہو سکا۔ دینی علوم کے مختلف فنون میں ایسی نادر و نایاب کتابیں آپ نے تصنیف فرمائیں[1] کہ علمائے زمانہ نے ان کو اپنا دستورالعمل بنایا۔ خواص و عوام میں سے تمام دانشور اور ارباب علم و خرد آپ کی تصانیف نادرہ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد تقریباً سو جلدوں[2] تک پہونچتی ہے آپ کے اشعار کی تعداد بھی شمار کے اعتبار سے پانچ سو تک ہے۔ ماہ محرم ۹۵۸ھ میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی اور ۱۰۵۲ھ میں نہایت خندہ پیشانی اور ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ آپنے عالم قدس کا سفر اختیار فرمایا (انتقال فرمایا) شیخ اولیاء آپ کی تاریخ ولادت ہے اور تاریخ وصال فخر العالم ہے

۱۹

شیخ نور الحق قدس سرہ

آپ حضرت علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس اللہ سرہ کے فرزند سعید، و شاگرد رشید اور منظور نظر مرید ہیں۔ اسی کے ساتھ تمام ظاہری و باطنی، علمی و روحانی کمالات کے اعتبار سے اپنے والد کے صحیح جانشین اور وارث بھی!! ۔ چونکہ شاہجہان بادشاہ اپنی شاہزادگی کے زمانہ ہی سے آپ کے فنی کمالات اور علمی فضائل کے جوہر سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا۔ اس لیے جب اس نے دکن کی سرزمین کی جانب کوچ کرنے کے لیے اپنا عَلَم بلند کیا۔ تو حضرت شیخ نور الحق قدس سرہ کو اپنے مستقر

---

[1] (۱) لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح (عربی) (۲) ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ (عربی) (۳) رسالۂ اقسام حدیث (عربی) (۴) رسالہ شب برات (فارسی) (۵) ترجمۃ الاحادیث الاربعین (عربی) (۶) اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ (فارسی) (۷) اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی المشکوٰۃ (عربی) آپ کی مشہور ترین تصنیف فارسی زبان میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مدارج النبوت دو جلدوں میں ہے۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی سے اشعۃ اللمعات کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

[2] استاذ خلیق احمد نظامی (ندوۃ المصنفین دہلی) نے "حیات عبدالحق" میں ساٹھ سے زیادہ تالیفات تحریر کی ہیں شیخ عبدالحق (قدس سرہ) مذکور گو کہ محدث کے لقب سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کی مہارت فن حدیث سے زیادہ فقہ میں ہے۔ اور اسی لیے اہل الرائے کا رجحان ان کے تفقہ کی جانب زیادہ ہے۔ مترجم ماثر الکرام عرض کرتا ہے کہ ایسا خیال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ آپ کا لقب محدث دہلوی خود اس امر کا غماز ہے کہ فن حدیث پر آپ کو تبحر خصوصی حاصل تھا اور تدریس حدیث کی اجازت قیام مکہ میں آپ نے اپنے شیخ حضرت علی متقی قدس سرہ سے حاصل کی تھی اور وطن واپس آکر تمام عمر حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بسر کر دی چنانچہ اشعۃ اللمعات و لمعات فن حدیث سے آپ کی دلچسپی کے شاہد ہیں۔

یعنی اکبر آباد (آگرہ) میں قاضی کے عہدہ پر مقرر فرمایا۔ آپ مدت دراز تک اس شہر میں قاضی شہر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ اور اس نازک عہدہ کی خدمات اور ذمہ داریوں کو آپ نے کما حقہ، اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ انجام دیا۔ اپنے والد ماجد کی طرح آپ نے بھی بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جس طرح آپ کے والد ماجد نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ لکھ کر اس عہد کے مسلمانوں پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے بھی صحیح بخاری شریف کا ترجمہ کر کے مسلمانانِ عالم کے لیے اپنے فیوض و برکات کا چشمہ جاری کر دیا۔

آپ نے نوّے سال کی عمر پائی اور ۱۰۷۳ھ میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔ روضۂ مقدسہ[1] دہلی میں ہے۔

---

(۲۰)

ملا محمود جون پوریؒ

علماء محققین کے پیشوا اور حکمائے مسند نشین کے آپ جانشین ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ علم منطق و فلسفہ، ہیئت و نجوم، تفسیر و حدیث اور فقہ و اصول فقہ میں خصوصاً فن حکمت اور علم طب میں اپنے دور کے علماء و فاضلین میں ممتاز ترین حیثیت کے مالک تھے۔ آپ نے استاد الملک شیخ محمد افضل جونپوری کی شاگردی[2] میں رہ کر تمام علوم

---

[1] منجملہ آپ کی تصنیفات کے (۱) شرح شمائل ترمذی (قلمی نسخہ کتب خانہ رامپور) (۲) تفسیر سورہ فاتحہ (قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) (۳) حاشیہ علی شرح جامی (کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن) (۴) شرح مطالع۔ (۵) شرح ہدایہ۔ (۶) شرح قران السعدین (مثنوی امیر خسرو بنام نور العین) (۷) رسالہ در بیان رویا۔ (۸) مس القلوب۔ (۹) زبدۃ التواریخ (کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن) تیسیر القاری شرح صحیح بخاری (طبع ۱۳۰۵ھ مطبع علوی۔ محمد علی حسن خاں لکھنؤ۔ حیات شیخ عبدالحق (خلیق نظامی)۔

آپ کے صاحبزادہ کا اسم گرامی شیخ نور اللہ ہے جن کے چار صاحبزادگان ہوئے سیف اللہ مؤلف اشرف الوسائل شرح شمائل۔ شیخ محب اللہ مؤلف منبع العلم شرح صحیح مسلم۔ حلیم اللہ۔ جار اللہ۔

شیخ محب اللہ، حافظ محمد فخر الدین اور ان کے صاحبزادہ شیخ الاسلام محمد کے شاگرد رشید تھے جو صاحب تالیف ہیں حافظ محمد فخر الدین شرح حصن حصین فارسی کے مؤلف ہیں اور اخوند شیخ کتاب عین العلم مؤلفہ شیخ محمد بن عثمان بلخی کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے شیخ محب اللہ کے صاحبزادہ شیخ سلام اللہ رامپوری ہیں جو محلیٰ اسرار موطا امام مالک کے مؤلف ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی تالیفات ہیں شیخ نور الاسلام اور محمد سالم شیخ سلام اللہ رامپوری کے صاحبزادگان بھی علماء میں گزرے ہیں۔ ماخوذ حیات شیخ عبدالحق (خلیق نظامی)۔ [2] ولادت ۹۹۳ھ محمود بن محمد سلطان بن فرید الدین بن بہاء الدین عثمانی۔

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

متداولہ کی تکمیل و تحصیل کی اور سترہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون سے فراغت حاصل کر کے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ علم حکمت و فلسفہ کے موضوع پر آپ نے "شمس بازغہ" اور بلاغت کے فن میں "فرائد" تصنیف فرمائیں۔ ہمیشہ علمی تحقیقات و تصنیفات میں مشغول و مستغرق رہتے تھے۔ اگر کوئی آپ سے کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو اگر اس وقت دماغ حاضر ہوتا تو آپ اس کے جواب کی جانب متوجہ ہو جاتے ورنہ یہ کہہ دیا کرتے کہ اس وقت میرا دل و دماغ اس کے جواب کی طرف متوجہ نہیں ہے۔

آپ نے ستاروں کی گردش کا حال معلوم کرنے کے لیے صاحب قران ثانی شاہ جہان[1] کو ایک مینار بنوانے پر راضی کر لیا تھا لیکن وزیر نے کسی وجہ سے بادشاہ کی رائے سے اختلاف کیا اور یہ عذر پیش کیا کہ بلخ کی جنگ درپیش ہے۔ جس میں بہت سے زر و مال کی ضرورت پیش آئے گی اور جو زمین انھوں نے رصدگاہ کے لیے تجویز کی تھی۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ حکماء و فلاسفہ متقدمین میں سے کسی نے اسی جگہ کو اپنی رصدگاہ تعمیر کرانے کے لیے پسند کیا تھا۔

استاد الملک علامہ شیخ محمد افضل فرماتے ہیں کہ جس وقت سے علامہ تفتازانی[2] اور علامہ جرجانی[3] اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے آج تک کسی شخص نے کسی ایسے شہر کا پتہ نہیں بتایا جس میں ملا محمود جونپوری اور شیخ عبدالرشید جونپوری جیسے ذو بلند پایہ علمائے تبحر ایک ہی وقت میں جمع ہوئے ہوں حضرت شیخ عبدالرشید جونپوری کا ذکر جمیل آگے آرہا ہے۔

صاحب قران شاہجہان کے فرزند شاہ شجاع[4] نے حضرت استاد الملک شیخ محمد افضل کی شاگردی

بقیہ حاشیہ:- فضلا کے زمانہ میں ممتاز، علوم عقلیہ و نقلیہ کے امام، حضرت عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے ۱۰۶۲ھ میں وصال ہوا۔ ملا محمود جونپوری ان کے ارشد تلامذہ میں تھے (تذکرہ علمائے ہند)۔

حاشیہ صفحہ ہذا:- [1] شہاب الدین محمد خلف سوم جہانگیر بادشاہ۔ ولادت ۱۰۰۰ھ جلوس ۱۰۳۷ھ وفات ۱۰۷۶ھ (مفتاح التواریخ)۔

[2] سعدالدین بن عمر بن عبداللہ تفتازانی (۷۱۲ھ - ۷۹۳ھ) (حدائق۔ بغیۃ الوعاۃ۔ مفتاح السعادت۔ آداب اللغۃ۔ التصویریہ دائرۃ المعارف اسلامیۃ البدر الطالع شوکانی) شوکانی نے ان کی تالیفات کے سنہ اور تاریخیں ملا زادہ کے حوالہ سے نقل کی ہیں۔

[3] علی بن محمد بن علی جرجانی معروف بہ سید شریف جرجانی (۷۴۰ھ تا ۸۱۶ھ - ۱۳۴۰م تا ۱۴۱۳م) علمائے عربیہ میں ممتاز فلسفی تھے۔ ان کی تالیفات۔ (۱) التعریفات (۲) شرح مواقف ایجی (۳) شرح چغمینی (ہیئت) (۴) مقالید العلوم (۵) تحقیق الکلیات (۶) شرح سراجی (فرائض) (۷) الکبریٰ والصغریٰ (منطق) (۸) حواشی علی المطول (۹) مراتب الموجودات (۱۰) رسالہ فی تقسیم العلوم (۱۱) رسالہ فی فن اصول حدیث (۱۲) شرح تذکرہ طوسی (ہیئت) (۱۳) شرح الملخص (ہیئت) (الفوائد البہیہ۔ مفتاح السعادۃ و در دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ الضوء اللامع۔ معجم۔ آداب اللغۃ)

[4] شاہ جہان کے دوسرے فرزند، ولادت ۱۰۲۵ھ بمقام اجمیر ۱۰۶۹ھ عالمگیر سے شکست کھا کر بنگال بھاگ گئے۔ اور وہیں انتہائی پریشانی کے عالم میں ان کے دوست راجہ اندر نے ان کو مع اہل و عیال کے کشتی میں بٹھا کر دھوکے سے دریا میں غرق کر دیا۔ (مفتاح)

اختیار کی اور امیر الامراء شائستہ خاں[1] سے فوائد پڑھی۔ نایکا بھید کے فن میں فارسی زبان میں اُن کا تصنیف کردہ ایک رسالہ بھی ہے۔ اور وہ رسالہ ایسا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی اپنی معشوقہ کو ان کے ناز و ادا، ان کے عمر کے درجات، اُن کی وفاداری اور بے وفائی وغیرہ کے لحاظ سے کئی کئی قسموں پر تقسیم کرتے ہیں اور ہر نوع کا ایک مخصوص نام تجویز کیا ہے۔ اور ہر نوع کی تعریف میں انھوں نے نہایت عمدہ قسم کے اشعار بھی نظم کئے ہیں۔ یہ تمام تعریفات اس رسالہ میں درج کی گئی ہیں۔

ملا محمود نے ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ کو جہان فانی سے کوچ فرمایا۔ زمانہ کی گردش نے ملا محمود کی زندگی کی بساط ان کے استاد حضرت شیخ محمد افضل کے زمانۂ حیات ہی میں الٹ دی۔ شاگرد کی اس اچانک موت کا غم شیخ محمد افضل کے دل پر ایسا گہرا ہوا کہ اُن کے چہرہ پر کسی نے چالیس دن تک مسکراہٹ ہی نہیں دیکھی چالیس دن کے بعد استاد کی روح بھی اپنے پیارے شاگرد کی روح سے جا ملی۔ کسی شخص نے اس مصرعہ میں حضرت شیخ محمد افضل کی تاریخ وفات نکالی ہے ؎ ز محمود و افضل بگو آہ آہ۔

---

(۲۱)

شیخ عبدالرشید ملقب بہ شمس الحق قدس سرہٗ

آپ اپنے وقت کے اولیائے کاملین اور علمائے متبحرین میں ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے حضرت شیخ فضل اللہ جونپوری[2] کے شاگرد اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ مصطفیٰ[3] قدس سرہٗ کے مرید تھے آپ کے والد ماجد شیخ محمد بن شیخ نظام الدین[4] امیٹھوی قدس سرہٗ کے مرید تھے۔

حضرت شیخ عبدالرشید جونپوری کو اور دوسرے مشائخ کے سلسلوں سے بھی خلافت[5] حاصل تھی۔

---

۱ نواب آصف خاں بہادر کے لڑکے، شاہ جہان اور ان کے فرزند عالمگیر کے زمانہ میں وزارت کے عہدہ پر مامور تھے۔ اصل نام ابو طالب ہے۔ ۱۱۰۵ھ میں وفات پائی۔ (مآثر الامرا، مفتاح التواریخ)۔ ۲ یعنی ملا محمد افضل جونپوری ابن حمزہ عثمانی جو اپنے زمانہ کے جید عالم اور زبردست فاضل تھے استاذ الملک کے لقب سے شہرت پائی۔ ۹۹۵ھ میں قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔ ملا محمد حسینی کے حلقہ درس سے استفادہ کیا بظاہر ملا طاہر لاہوری اور حکیم اسماعیل کے شاگرد تھے علوم عقلیہ و نقلیہ میں ممتاز تھے۔ انتہائی متشرع، متقی، خوش خلق اور سنجیدہ مزاج کے مالک تھے بڑے وقت کے ساتھ اپنا مال بھی خدمت علم میں صرف کیا۔ ملا محمود جونپوری مصنف شمس بازغہ اور دیوان عبدالرشید مصنف رشیدیہ ان کے شاگرد رشید تھے۔ ۱۰۶۲ھ میں وفات پائی۔ (تذکرہ رحمان علی، سبحۃ المرجان، نزہۃ الخواطر، تاریخ جونپور) ۳ شاہ جمال مصطفیٰ جونپوری ۱۰۹۳ھ میں بعہد عالمگیر وفات پائی۔ ۴ انہوں نے قلیچ خاں لاہوری سے بھی استفادہ کیا ہے۔ (نزہۃ الخواطر) ۵ حقانی بزرگ دہلی میں بہت مشہور تھے ۱۰۳۱ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)۔ ۵ جیسے حضرت مخدوم آفتاب ہند سہروردی، خاندان مخدوم قطب الدین بینا دل جونپوری، خاندان مخدوم شیخ الہدیہ وغیرہ (تاریخ جونپور)

ابتدائی زمانے میں آپ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے لیکن آخر میں تمام معروفیات ترک کر کے حقیقت و معرفت کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً آپ کو شیخ محی الدین ابن عربی[1] قدس سرہ کی تصانیف کے مطالعہ کا بہت زیادہ شوق پیدا ہو گیا اور شیخ کی ان عبارتوں کو جن کے بارے میں علماء ظاہر کو اعتراضات ہیں۔ بڑی عقیدت مندی اور حسن ظن سے مطالعہ فرماتے تھے۔ دولت مندوں سے آپ کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے صاحب قران شاہ جہان نے آپ کی پاکیزہ صفتوں کو سُنا تو آپ سے ملاقات کی خواہش کی اور اپنے ایک شائستہ اور آداب شاہی سے واقف ملازم کے ہاتھوں ان کی طلبی کے لیے فرمان بھیجا۔ حضرت شیخ عبدالرشید جونپوری نے شاہی دربار میں حاضری سے انکار کیا اور اپنی خلوت کے گوشہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔

آپ نے بہت سی مفید تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ مثلاً مناظرہ کے فن میں رشیدیہ، زاد السالکین، شرح اسرار الخلوۃ[2]۔ (اسرار الخلوۃ ابن عربی کا ایک مختصر رسالہ ہے) اور رسالۂ محکوم مربوط جو ابن عربی کے علم کلام کی بعض تصریحات کا ترجمہ ہے۔ شرح مختصر عضدی[3] پر متفرق حواشی لکھے ہیں۔ کافیہ پر فارسی زبان

---

[1] ابن عربی (۵۶۰ – ۶۳۸ھ = ۱۱۶۵ – ۱۲۴۰م) محمد بن علی بن محمد ابو بکر الحاتمی الطائی المعروف بہ محی الدین ابن عربی ملقب بہ شیخ اکبر فلسفی تھے اور تمام علوم دینیہ متکلمین کے امام تھے بعض شطحیات کی بنا پر علماء نے ان کے خلاف فتوی دیا تھا بہت سے علماء نے شیخ کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں اور رسائل تحریر کیے ہیں شیخ مجد الدین فیروز آبادی مصنف قاموس (۸۱۶ھ) نے "الاغتباط بمعالجۃ ابن الخیاط" نام کا اس سلسلہ میں ایک رسالہ تالیف کیا ہے۔ تقی الدین ... میں جواب نے لکھا ہے شیخ سعد الدین حموی اور کمال الدین زملکانی (۷۲۷ھ) نے ابن عربی اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے متعلق جوابات دیئے ہیں۔ اور شیخ عز الدین بن عبد السلام نے ابن عربی کی تعریف کی ہے۔ صلاح الصفدی نے اپنی تاریخ میں شیخ کے مفصل حالات تحریر کئے ہیں۔ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے ابن عربی کی مدافعت میں "تنبیہ الغبی علی تنزیہ ابن عربی" نام کی ایک کتاب تصنیف کی ہے اور شیخ ابراہیم بن محمد حلبی نے اس کا رد "تنبیہ الغبی فی تکفیر ابن عربی" کے نام سے لکھا ہے۔ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور امام شوکانی نے فرمایا ہے کہ اہل علم پر اس قسم کے فتووں سے پرہیز لازمی ہے (اتاق) شیخ طہ عبد الباقی سرور نے شیخ کی سیرت میں مستقل ایک کتاب تالیف کی ہے شیخ کی تالیفات میں کتب و رسائل کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے ان میں فتوحات مکیہ، فصوص الحکم بہت مشہور کتابیں ہیں شیخ عبد الوہاب شعرانی (۹۷۳ھ) نے فتوحات مکیہ کا اختصار "مواقع الانوار القدسیۃ المنتقاۃ من الفتوحات المکیۃ" کے نام سے کیا ہے ان کے بعد اس مختصر کو "الکبریت الاحمر فی علوم الشیخ الاکبر" کے نام سے مختصر کیا گیا (فوات الوفیات، مفتاح السعادۃ، میزان الاعتدال، لسان المیزان، نفح الطیب، شذرات الذہب، معجم المطبوعات، التیموریہ، مرآۃ الجنان یافعی) [2] اس کتاب کا اصل نام "الانوار در اسرار الخلوۃ" ہے مولانا سید عبد الحی نے نزہۃ الخواطر میں اس کتاب کو "اسرار السالکین" کے نام سے ذکر کیا ہے۔ (زرکلی) [3] شیخ جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بہ ابن حاجب نحوی نے (۶۴۶ھ) ایک کتاب اصول فقہ میں "الاصول" کے نام سے تحریر کی۔ اس کے بعد اس کو مختصر کر کے "مختصر الاصول ابن حاجب" نام رکھا اور اسی نام سے وہ کتاب مشہور ہے۔ علامہ عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد الایجی (۷۵۶ھ) میں اس مختصر پر ایک شرح تالیف کی جو شرح مختصر عضدی کے نام سے مشہور ہے اور متداولات میں ہے۔ سید شریف جرجانی نے اس پر حواشی شریفیہ کے نام سے حاشیے لکھے اس کتاب پر صاحب تذکرہ کے بھی متعدد حاشیے ہیں۔

میں حواشی تحریر کیے۔ اور اردو وظائف میں مقصود الطالبین نامی کتاب تالیف فرمائی ہے۔ ایک دیوان اشعار کا بھی آپ نے یادگار چھوڑا ہے شمسی تخلص فرماتے تھے۔ آپ نے نماز فجر کی سنت ادا کرکے فرض کی نیت باندھی تھی کہ حق تعالیٰ کے دربار سے آپ کی طلبی کا حکم پہونچا۔ چنانچہ فجر کی نماز فرض کی ہی حالت میں آپ نے اس دار فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ اور اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون آپ کی وفات سنہ ۱۰۸۳ھ میں واقع ہوئی۔

۲۲

مُلّا عبد الحکیم سیالکوٹی برد اللّٰہ مضجعہ

آپ اپنے زمانہ کے ایک عالم تبحر اور اہلِ زماد کے لیے سرمایہ نازش تھے۔ آپ ایک درویش کامل بھی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام درسی علوم میں آپ جیسا ماہر و فاضل اور ماہر علوم و فنون ہندوستان کی سرزمین میں کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ جس نے اپنی غیر معمولی عقل و دانش اور فراست و حسن قبولیت کے باعث ایسے گہرے نقوش زمانہ کے دل و دماغ پر چھوڑے ہوں۔

آپ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت سیالکوٹ میں ہوئی جو لاہور کے قرب و جوار میں واقع ہے ابتدائے شباب میں آپ علومِ متداولہ کی تحصیل کے لیے کمربستہ ہوئے اور نہایت انہماک کے ساتھ طلبِ علم میں مشغول ہوگئے۔ ایک عرصہ دراز تک آپ کو حضرت ملا کمال الدین[1] کشمیری قدس سرہ کی شاگردی کا شرف حاصل رہا جو شہر سیالکوٹ کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ چند ہی دنوں میں علوم ظاہر و باطن میں ایسا کمال حاصل کیا گویا وہ ایک ماہِ کامل تھے۔ جس کی نورانیت سے ایک جہان منور ہوگیا اور ایک ایسا سرچشمہ فیض تھے جس کے برکات سے عرصہ تک خلق اللہ سیراب اور فیض یاب ہوتی رہی۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں آپ اپنی قلیل آمدنی پر شکر و قناعت کے ساتھ اپنے وطن ہی میں مقیم رہے لیکن جب ہندوستان میں صاحب قران شاہ جہان[2] کی سلطنت کا زمانہ آیا اور علماء و شعرا کو ان کے دربار میں قدر و منزلت حاصل ہوئی

---

[1] آپ سنی حنفی۔ علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے مرکز تھے۔ ایک عرصہ تک لاہور اور سیالکوٹ میں درس و تدریس میں مشغول رہے اور مخلوق خدا کو فیوض و برکات سے نوازتے رہے۔ شیخ احمد مجدد الف ثانی بھی ان کے شاگردوں میں ہیں۔ سنہ ۱۰۱۷ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔ مولانا رحمان علی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں ان کی قبر کا پتہ نہیں چلتا "ملق حق قطب" اور "تاج الاولیاء ملا کمال" ان کی تاریخ وصال ہے (نزہتہ الخواطر۔ تذکرہ علمائے ہند)۔

[2] سنہ ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ۔

اس دور میں آپ نے کئی بار شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں حاضری دی۔ جب بھی آپ صاحبقران شاہجہاں کے دربار میں تشریف فرما ہوئے آپ کو خصوصیت کے ساتھ بے شمار زر و دینار سے تولا گیا اور آپ کی بہت عزت افزائی کی گئی۔ دو مرتبہ حضرت ملا صاحب کو شاہجہاں کے دربار میں سونے سے تولا گیا۔ اور آپ کے وزن کے برابر آپ کو زر و جواہر انعام کے طور پر دیئے گئے۔ علاوہ ازیں چند گاؤں اور قصبے بھی بطور جاگیر آپ کو عطا کیے گئے۔ حضرت ملا عبد الحکیم نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے وطن سیالکوٹ میں مقیم رہے۔ اور تمام عمر طالبین و زائرین کے دامن طلب و مراد کو علم و فضل اور ہدایت و تلقین کے جواہر مقصود سے بھرتے رہے۔ آپ کی تصنیفات عرب و عجم کے ممالک میں بڑی عزت و قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

آپ کے تصنیفات کی تفصیل یہ ہے:۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ مقدمات تلویح، حاشیہ مطول، حاشیہ شریفیہ[1]، شرح مواقف[2]، حاشیہ شرح عقائد تفتازانی، حاشیہ خیالی[3]، حاشیہ شرح شمسیہ[4]، حاشیہ عبد الغفور، تکملہ حاشیہ عبد الغفور[5]، حاشیہ شرح مطالع[6]، حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی[7]، درۃ ثمینہ[8] در اثبات واجب تعالیٰ، حواشی شرح حکمۃ العین، حواشی شرح ہدایۃ حکمت، حواشی مراح الارواح۔

۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو آپ نے وفات پائی اور سیالکوٹ میں دفن کیے گئے۔

---

[1] صفحہ ۳۰ پر حاشیہ میں تحریر ہے کہ کتاب شریفیہ، سید شریف جرجانی کی تالیف ہے (۸۱۶ھ) جو عضدی کی شرح مختصر الاصول کے حواشی پر تحریر ہے۔ صاحب ترجمہ نے اس کتاب پر حاشیہ لکھا۔ اور دوسری کتاب شریفیہ، شرح سراجیہ ہے جو علم فرائض میں ہے۔

[2] از عبد الرحمٰن عضد الدین الایجی متوفی ۷۵۶ھ۔ علم کلام میں ہے اور اس پر سید جرجانی نے شرح لکھی ہے جو شرح مواقف کے نام سے مشہور ہے۔

[3] یعنی مولیٰ احمد بن موسیٰ جو خیالی کے نام سے مشہور تھے۔ متوفی ۸۶۰ھ کے بعد۔ شرح سعد تفتازانی پر شرح لکھی ہے۔

[4] شمسیہ فن منطق میں مشہور کتاب ہے جو نجم الدین عمر بن علی قزوینی عرف کاتبی (۶۹۳ھ) تلمیذ نصیر الدین طوسی (خواجہ شمس الدین محمد) کی تالیف ہے اسی وجہ سے "شمسیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ علامہ قطب الدین رازی (۷۶۶ھ) نے اس کتاب کی ایک شرح وزیر غیاث الدین محمد (وزیر سلطان خدابندہ) کے نام سے لکھی جو "تحریر القواعد المنطقیہ فی شرح شمسیہ" کے نام سے مشہور ہے اس کو قطبی بھی کہتے ہیں۔ "قطبی" پر مشاہیر علماء نے حاشیے لکھے ہیں، منجملہ ان کے ایک علامہ سیالکوٹی کا بھی حاشیہ ہے۔ میر سید شریف (سید السند) جرجانی ۸۱۶ھ نے اس شرح پر بھی حاشیہ لکھا ہے۔ جو "حاشیہ کوچک" کے نام سے موسوم ہے اور اسے "میر قطبی" اور "شرح شریفیہ در منطق" بھی کہتے ہیں۔

[5] مولانا عبد الغفور لاری (۹۱۲ھ) مولانا عبد الرحمٰن جامی کے بہترین شاگردوں میں تھے۔ ان کا لقب رضی الدین ہے۔ انھوں نے کافیہ ابن حاجب کی شرح "الفوائد الضیائیہ" پر مفردات تک حواشی لکھے ہیں اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی نے ان حواشی کا تکملہ اس طرح لکھا ہے کہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ کون سے حواشی کس نے لکھے ہیں (حدائق حنفیہ، تذکرہ علمائے ہند) [6] سراج الدین محمود بن ابی بکر الارموی (۶۸۲ھ) نے منطق میں ایک کتاب مطالع الانوار کے نام سے تحریر کی۔ مولانا قطب الدین رازی (۷۶۶ھ) نے کتاب ارموی کی شرح لکھ کر "لوامع الاسرار" کے نام سے موسوم کی۔ اس کے بعد یہ شرح "شرح مطالع" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس شرح پر علامہ سیالکوٹی نے حاشیہ لکھا۔ اس شرح پر میر سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) نے بھی حاشیہ لکھا ہے جسے حاشیہ شریفیہ مطالع کہتے ہیں۔ [7] متوفی ۹۰۸ھ۔ یہ شرح دوانی عقائد عضدیہ پر ہے۔ [8] درۃ ثمینہ ایک رسالہ ہے۔

(۲۳)

ملا عصمت اللہ سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ

آپ ہندوستان کے مشہور اور ممتاز علماء میں گذرے ہیں۔ اگرچہ آپ بینائی سے معذور تھے لیکن آنکھ والوں کو عقل و فراست اور فہم و حکمت کے راستے دکھاتے تھے۔ ساری عمر تعلیم و تدریس میں گذاری۔ بہت سی مفید تصانیف آپ نے یادگار چھوڑی ہیں۔ حاشیہ شرح مُلّا آپ ہی کی سحر انگیز تحریر کا نتیجہ ہے۔ آپ کی وفات ۱۰۳۹ھ میں واقع ہوئی۔ اسی سال حجاز میں ایک طوفان آیا اور شعبان کی ۱۹ ویں تاریخ کو چہار شنبہ کی رات میں مکۂ معظمہ کی سرزمین پر شدید قسم کی طوفانی بارش ہوئی، پانی کا ایک زبردست سیلاب خانۂ کعبہ میں داخل ہو گیا جو غلاف کعبہ تک چڑھ گیا۔ حجر اسود زیر آب ہو گیا۔ اور میزاب کعبہ نیچے گر پڑا۔ خانہ کعبہ کے اندر قدِ آدم پانی داخل ہو گیا۔ تمام مسجد میں قدِ آدم تک کوڑا کرکٹ اور مٹی بھر گئی۔ آبِ زمزم کا مزہ بدل گیا اور اس قدر خراب ہو گیا کہ حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ شعبان کی بیسویں تاریخ کو جمعرات کے دن عصر کے بعد خانۂ کعبہ کی عمارت بیٹھ گئی اور جو تعمیر حجّاج نے کی تھی وہ زمین بوس ہو گئی۔ باب شامی کی طرف سے پوری عمارت مشرقی جانب سے دروازہ تک اور مغربی جانب سے تین چوتھائی عمارت مسمار ہو گئی۔ اللہ اکبر۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے بعد سے خانۂ کعبہ کی یہ عمارت کبھی نہیں گری تھی۔ اس طوفان خیز حادثہ میں ساکنانِ مکّہ کے بھی چار ہزار مکانات منہدم ہو گئے اور تقریبًا پانچ سو افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ روم کے بادشاہ سلطان مراد چہارم بن سلطان احمد[1] نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا اور ۱۰۴۰ھ میں دوبارہ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد خانۂ کعبہ کی تعمیر کی سعادت عظمٰی سلطان مراد کو نصیب ہوئی۔ خانۂ کعبہ کی جو عمارت اس وقت موجود ہے اس سے پہلے سلطان محمد سلیم ثانی[2] نے ۹۸۰ھ میں بنوائی تھی جس کی مشرقی اور شمالی عمارت کو مکمل کرا کے سلطان راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ باقی ماندہ تعمیر سلطان محمد سلیم ثانی کے صاحبزادہ سلطان مراد (ثالث) نے مکمل کرانے کی طرف توجہ دی جس کا تکملہ ۹۸۴ھ میں ہوا۔ اس عالی شان عمارت کا حُسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] سلطان احمد بن محمد بن سلیم والی روم ولادت ۱۰۲۱ھ، سریر آرائی ۱۰۳۲ھ وفات ۱۰۴۹ھ۔ (البدر الطالع)۔

[2] سلطان سلیم بن بایزید بن محمد بن مراد بن بایزید بن مراد بن اورخان بن عثمان الغازی (بانی سلطنت عثمانیہ) ان کے لڑکے سلطان سلیمان بن سلیم جن کی ولادت ۹۰۰ھ تخت نشینی ۹۲۶ھ وفات ۹۷۴ھ ہے ان کے لڑکے سلیم ثانی بن سلیمان بن سلیم اول مذکور ان کی ولادت ۹۲۹ھ تخت نشینی ۹۷۴ھ وفات ۹۸۲ھ ہے (البدر الطالع)، لیکن بیت اللہ کی تعمیر کرنے والے مراد بن سلیم بن سلیمان ہیں جنھوں نے ۹۹۳ھ میں وفات پائی ۹۸۲ھ میں تخت نشین ہوئے اور ۱۰۰۳ھ میں وفات پائی۔ (البدر الطالع، مفتاح التواریخ)۔

(۲۴)

میر محمد زاہد الہروی الکابلی

آپ کے والد ماجد قاضی محمد اسلم[1] ہرات کے شہر میں پیدا ہوئے اور دار السلطنت کابل میں سکونت اختیار فرمائی قاضی محمد اسلم مولانا خواجہ کوہی[2] کی اولاد میں ہیں، جو خراسان کے مشہور اولیائے کرام اور مشائخ عظام میں تھے۔ بادشاہ جہانگیر کے دورِ سلطنت کے ابتدائی زمانہ میں تحصیل علم کے ارادہ سے آپ لاہور تشریف لائے اور شیخ بہلول چشتی[3] کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔

تحصیل علم سے فارغ ہو کر جہانگیر کے دار الخلافہ اکبر آباد پہنچ کر آپ جہانگیری دربار میں شامل ہوگئے۔ مولانا میر کلاں محدث قدس سرہٗ سے رشتۂ قرابت ہونے کے باعث آپ بادشاہ جہانگیر کی نوازشات اور کرم فرمائیوں کا مرجع و مرکز بن گئے۔ چنانچہ بادشاہ جہانگیر نے آپ کو کابل کی قضاء کا عہدہ سپرد فرمایا۔

حضرت مولانا میر کلاں محدث[4] حضرت مولانا خواجہ کوہی کے نواسہ ہیں آپ نے علوم عقلی و نقلی اپنے زمانہ کے علماء و مشاہیر سے حاصل کیے۔ اور علم حدیث میر جمال الدین محدث[5] اور سید میرک شاہ[6] سے حاصل کیا۔

---

[1] قاضی اسلم ہروی کے تفصیل تذکرہ کے لیے تذکرہ علمائے ہند، بزم تیموریہ، حدائق حنفیہ، نزہۃ الخواطر، ابجد العلوم مطالعہ کی جائے۔

[2] ان کے صاحبزادہ خواجہ محمد سعید خراسانی معروف بہ میر کلاں، ملا علی قاری کے اساتذہ میں سے تھے۔ [3] چشتی صابری، شاہ بھیکہ چشتی کے مرید تھے، افغان قوم سے تعلق تھا۔ سید عبد الرشید اور سید عتیق اللہ جالندھری سے علوم معقول و منقول کی تحصیل کی۔ قلندری انداز تھا۔ تقریباً نوے کتابیں تصنیف کیں۔ سید عظیم اللہ جالندھری علوم ظاہری میں ان کے شاگرد تھے۔ (نزہۃ) [4] محمد سعید حنفی خراسانی معروف بہ میر کلاں محدث شاہزادہ نور الدین جہانگیر کے استاد۔ ملا عصام الدین ابراہیم بن عرب شاہ اسفرائینی (ت ۹۴۳ھ) سے علوم عقلیہ کی تحصیل کی۔ حدیث کی سند نسیم الدین میرک شاہ بن جمال الدین حسینی ہروی سے کرتے ہیں۔ (ملا علی قاری (شارح مشکوٰۃ متوفی ۱۰۱۴ھ) اور سید غضنفر نہروالی (ت ۱۰۱۱ھ) علم حدیث میں ان کے شاگرد تھے۔ ۹۸۱ھ میں بمقام اکبر آباد وصال فرمایا۔ "فخر زمانہ" سن تاریخ وفات ہے۔ (تذکرہ علمائے ہند، حدائق الحنفیہ، ابجد العلوم، بوستان اخیار، نزہۃ الخواطر)

[5] میر جمال الدین ان کا نام عطاء اللہ بن فضل اللہ شیرازی حسینی ہے۔ لقب جمال حسینی، میر جمال الدین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی تالیفات میں کتاب "روضۃ الاحباب فی سیرۃ النبی والآل والاصحاب" بے مثل کتاب ہے حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی نے عجالہ نافعہ میں تحریر کیا ہے۔ اگر اس کتاب کا صحیح نسخہ دستیاب ہو جائے تو وہ تمام سیرت کی کتابوں سے بہتر ہے مگر شیخ عبد اللہ سلطانپوری (م ۹۹۰ھ) نے کہا ہے کہ یہ کتاب شیخ جمال الدین محدث کی نہیں ہے اسلیے کہ اسکی تیسری جلد میں مناقب حضرت علی میں یہ شعر ہے ؎ ہمیں بس بود حق نمائی او ۔ کہ گردند گمراہ از خدائی او ۔ اس شعر سے غلو کا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ میر جمال نے تمام علوم و فنون اپنے چچا سید اصیل الدین حسینی اور انکے ہم عصر علماء سے حاصل کیے اور مدرسہ سلطانیہ شریفیہ میں جو خاقان منصور کے مقبرہ میں واقع ہے اور خانقاہ اخلاصیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے (روضۃ الصفاء، روضۃ الاحباب، فوائد الرضویہ (عباس قمی)، حدائق الحنفیہ، مقالات الشعراء اور اسکی حواشی (حسام الدین راشدی)) [6] اسم گرامی محمد بن عطاء اللہ حسینی و فضل اللہ شیرازی ہے۔ اور نسیم الدین لقب ہے۔ میرک شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ علوم حدیث و دیگر تمام علوم میں اپنے والد سید جمال الدین محدث کے شاگرد ہیں۔ سن وفات کہیں نہیں لکھا ہے۔ (روضۃ الصفا)

توفیق ایزدی سے زیارت حرمین شریفین کی سعادت بھی حاصل کی۔

آپ نے سلسلۂ نقشبندیہ کے بہت سے مشائخ اور اکابر کا شرف زیارت حاصل کیا جب آپ ہندوستان میں تشریف لائے تو اکبر بادشاہ نے آپ کا بہت احترام کیا اور شہزادہ سلیم کی تعلیم کے لیے آپ کو اتالیق مقرر کیا۔ اس ملک (ہندوستان) کے لوگوں کی ایک کثیر جماعت نے حضرت مولانا میر کلاں محدث سے حدیث کا علم سیکھا۔ ملا علی قاری[۱] نے آپ ہی سے حدیث پڑھی ہے۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ کی ابتدا میں آپ اس کا اعتراف کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں کہ:-

"ثم انی قرأت بعض احادیث المشکوٰۃ علے منبع بحر العرفان مولانا الشہیر بمیر کلاں" وھو قرأ علے زبدۃ المحققین وعمدۃ المدققین میرکشاہ وھو علے والدہ السید السند مولانا جمال الدین المحدث صاحب روضۃ الاحباب وھو علے عمہ السید اصیل الدین الشیرازی[۲] رحمھم اللہ تعالیٰ۔

مولانا نے محرم ۹۸۳ھ میں بعمر ایک سو سال اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار اقدس آگرہ میں ہے۔

جب قاضی محمد اسلم نے زمانۂ دراز تک کابل کے قاضی کی حیثیت سے نہایت دیانت کے ساتھ اپنا کام انجام دیا اور اپنے زہد و تقویٰ کے باعث کافی شہرت حاصل کر لی۔ تو جہانگیر بادشاہ نے ان کو اپنے دربار میں بلا کر شاہی فوج کا قاضی بنا دیا۔ اور جب صاحب قِران بادشاہ شہاب الدین شاہ جہان تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ تو قاضی محمد اسلم کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا۔ چند دنوں بعد اس عہدے میں ہزاری منصب کا اضافہ فرما دیا۔ قاضی محمد اسلم نے تیس سال تک فوج کے منصب قضا پر فائز رہ کر نہایت دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کیے۔ اور ہمیشہ بادشاہ کی نگاہ میں عزیز رہے۔ ۱۰۴۵ھ میں شاہ جہان بادشاہ نے ان کو سونے میں تلوایا اور چھ ہزار پانچ سو روپے بطور انعام عطا کیے۔ ۱۰۵۰ھ میں لوگ ایک دن حسب معمول شاہی گھوڑوں کو بادشاہ کی نظر کے سامنے سے گزار رہے تھے (نمائش کر رہے تھے) کہ ایک چابک سوار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑایا۔ گھوڑا اتفاق سے قاضی صاحب کے پاس سے ہو کر بھاگا، اپنے حفاظت کی گھبراہٹ میں قاضی صاحب کا پاؤں پھسل گیا اور کبارگی زمین پر آ رہے۔ اس چوٹ کی تکلیف کی وجہ سے تقریباً چار ماہ تک صاحب فراش رہے۔ صحت حاصل ہونے کے بعد قاضی صاحب نے بادشاہ سے کابل جانے کی اجازت چاہی۔ رخصت منظور ہو گئی۔ کابل کی جاگیر اور سالانہ دس ہزار روپے سے زائد رقم جو بطور انعام کے سالانہ ملا کرتی تھی۔ وہ سب وظائف و انعامات ان کے موجودہ عہدہ

---

[۱] ملا علی قاری بن سلطان محمد الہروی متوفی ۱۰۱۴ھ [۲] نام عبداللہ اصیل الدین لقب ہے سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبداللطیف بن جلال الدین یحییٰ شیرازی دشتکی ہروی تلمیذ شرف الدین عبدالرحیم ہروی محدث (م ۸۹۶ھ) شیخ اصیل الدین نے ۸۸۳ھ میں وفات پائی۔ کتاب درج الدرر فی میلاد سید البشر اور مزار مزار (مزارات ہرات) ان کی یادگار ہیں (روضۃ الصفا، ہدیۃ العارفین)

کی تنخواہ کے علاوہ بدستور باقی رہے۔ قاضی محمد اسلم نے ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر لاہور میں ہے۔

ان کے لائق اور سعادت مند صاحبزادے میر محمد زاہد علمی تحقیق کے میدان میں ایک زبردست مبارز اور فنی تدقیق و تلاش کے کوچہ میں فنکاروں کے امام تھے۔

آپ کے طبع کی جولانی اور تیزی، فکر و خیال کی رگوں سے خون ٹپکاتی تھی اور آپ کے ذہن کی پاکیزگی اور اس کا ستھرا پن کلام کے رنگ کو عطر آگیں بنا دیتا تھا۔ آپ نے اپنے والد ماجد اور اپنے وقت کے دوسرے مشہور اور ممتاز علماء سے علوم و فنون حاصل کیے۔ لیکن آپ اپنی خداداد ذہانت و طباعی کے باعث اپنے اساتذہ سے بھی اپنی علمی استعداد میں بہت آگے نکل گئے۔ اور وقت کے تمام علما و فضلاء کے امام سمجھے جانے لگے۔ ماہِ رمضان المبارک ۱۰۶۳ھ میں آپ صاحب قران ثانی شاہ جہان کے دربار سے دارالملک کابل کی واقعہ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور بادشاہ عالمگیر کی تخت نشینی کے آٹھویں سال آپ شاہی لشکر کے محتسب کے عہدہ پر فائز ہوئے پھر چند ہی سال کے بعد آپ کو کابل کا صدر بنا دیا گیا۔ اس عہدہ پر فائز ہونے کا فائدہ آپ نے یہ اٹھایا کہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے عزیز وطن میں بیٹھ کر اپنے گراں قدر علوم و فنون کی بیش قیمت نعمتیں چار دانگ عالم کے طالبین پر نثار کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں مندرجہ ذیل نادر کتابیں بھی آپ نے تصنیف فرمائیں :-

(۱) حاشیہ شرح مواقف[1] (۲) حاشیہ شرح تہذیب علامہ دوانی[2] (۳) حاشیہ تصور و تصدیق ملا قطب الدین رازی[3] (۴) حاشیہ شرح ہیاکل[4] محمد اسلم خاں، نبیرہ میر محمد زاہد کہتے ہیں کہ میر محمد زاہد الہروی الکابلی کی وفات ۱۱۰۱ھ میں واقع ہوئی، آپ کا مزار کابل میں ہے۔

---

[1] المواقف، یہ کتاب علم کلام میں ہے جس کے مصنف علامہ عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد الایجی القاضی ہیں یہ کتاب غیاث الدین وزیر خدا بندہ کے لیے تصنیف کی گئی اور سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) نے اس پر شرح لکھی یہ کتاب شرح مواقف کے نام سے موسوم ہے میر محمد زاہد نے اس پر حاشیہ لکھا ہے (کشف الظنون)۔

[2] تہذیب المنطق والکلام۔ تصنیف علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ۔ یہ متن نہایت مختصر تھا۔ اس کا منطق کا حصہ بہت عمدہ اور بہت مشہور تھا۔ علامہ جلال دوانی (م ۹۰۸ھ) نے اس حصہ پر شرح لکھی ہے۔ اور اس شرح پر متعدد علماء نے حاشیے لکھے ہیں۔ انھیں میں ایک حاشیہ میر صاحب کا بھی ہے۔

[3] قطب الدین محمد رازی المعروف بہ تحتانی۔ اپنے دور کے مشاہیر میں سے تھے ان کی تالیفات اور کتابوں پر ان کے حاشیے بہت مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے رسالہ تصور و تصدیق ہے جس پر میر صاحب مذکور نے حاشیہ لکھا ہے۔

[4] کتاب کا نام ہیاکل النور ہے جو شیخ شہاب الدین یحییٰ بن حبش متوفی (م ۵۸۷ھ) سہروردی کی تالیف ہے اس کتاب پر مولانا جلال الدین دوانی (م ۹۰۸ھ) نے شرح لکھی ہے اور میر زاہد ہروی نے اس شرح پر حاشیے تحریر کیے ہیں (کشف الظنون)

(۲۵)

مُلّا قطب الدین شہید سہالوی نور اللہ مضجعہٗ

مُلّا قطب الدین شہید سہالوی علمائے متبحرین کے استاد اور ممتاز و مشہور فاضلین کے امام تھے آپ علم فلسفہ و منطق کے مخزن اور علم فقہ و تفسیر و حدیث کے مخرج و منبع تھے۔ آپ کا خاندان عمائد لکھنؤ کے قصبہ سہالی کے شیخ زادوں سے متعلق ہے۔ سہالی کے شیخ زادے انصاری اور عثمانی دو خاندانوں میں منقسم ہیں۔ یہاں کے شہری ریاست اور زمینداری دونوں جماعتوں میں تقسیم ہیں۔ مُلّا قطب الدین، انصاری شیخ زادوں میں سے ہیں۔ آپ نے مُلّا شیخ دانیال جوراسی کی خدمت میں رہ کر ظاہری و باطنی کمالات حاصل کیے۔

شیخ دانیال جوراسی، مُلّا عبد السلام دیوہ اور قاضی گھاسی[۱] کے شاگردوں میں ہیں۔ مُلّا قطب الدین سہالوی نے قاضی گھاسی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ قاضی گھاسی، حضرت شیخ محب اللہ الٰہ آبادی[۲] کے شاگرد رشید اور عظیم خلیفہ تھے۔ مُلّا قطب الدین نے تمام عمر اپنی تعلیم و تدریس اور تبلیغ میں صرف کی۔ تقریباً دنیا کے متعدد ممالک کے طالبان علم و فن اور خواہانِ رشد و ہدایت کو آپ نے کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ اور آج بھی برِ صغیر پاک و ہند کے اکثر علماء و مشائخ کے علمی و روحانی اور ظاہری و باطنی استفادہ کا سلسلہ انھیں کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوتا ہے۔

عثمانی شیخ زادوں اور شیخ اسد اللہ خان زادہ ساکن چنیتی پور کے درمیان (جو سہالی سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ہے) چونکہ زمینداری کی شرکت کا جھگڑا چل رہا تھا اس لیے تمام عثمانی شیخ زادوں نے مکر رات کے وقت شیخ اسد اللہ خان زادہ کے گھر پر اچانک علانیہ حملہ کر دیا اور قطب الدین جیسے بے نظیر عالم کو ان لوگوں نے شہید کر ڈالا۔

مُلّا قطب الدین نے شرح عقائد علامہ دوّانی پر ایک نہایت ہی دقیق حاشیہ تصنیف فرمایا تھا۔ فسادیوں نے حملہ کے وقت رات کو مُلّا قطب الدین کے گھر میں آگ لگا دی۔ گھر کے دوسرے تمام سامان کے ساتھ حاشیہ

---

[۱] شیخ صدر الدین بن قاضی داؤد چشتی الٰہ آبادی المعروف بہ قاضی گھاسی متوفی بعہد عالمگیر۔

[۲] عظیم دانشمند تھے اور اکابر مشائخ صوفیا میں شمار ہوتا ہے۔ علوم ظاہر و باطن میں اپنے عہد کے دانشوروں اور علماء و صوفیاء کے سردار تھے۔ ان کا نسب نامہ حضرت شیخ فرید گنج شکر کے واسطے سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی (۱۰۴۹ھ) سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اور شیخ کبیر کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کا شمار ابن عربی کے اقوال کے اکابر شارحین میں ہوتا ہے۔ علماء نے ان پر جرح اور ان کی مدح کی ہے۔ صاحب تصانیف ہیں۔ آپ کی مشہور مصنفات میں شرح فصوص الحکم عربی و فارسی اور رسالہ تسویہ شامل ہیں۔ ۱۰۵۸ھ میں یہ آفتاب عالم تاب پردۂ عدم میں چھپ گیا۔ قاضی گھاسی الٰہ آبادی و صدر الدین بن قاضی داؤد و میر سید کبیر قنوجی شیخ کے بہترین شاگردوں اور خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔ (تذکرہ علمائے ہند اور نزہۃ الخواطر)۔

مذکور بھی ظالموں کے ظلم وستم کی آگ کا لقمہ بن گیا (جل گیا)۔ ملا صاحب کی شہادت سنہ ۱۱۰۳ھ میں واقع ہوئی۔ کسی شخص نے بحر خفیف میں ایک تاریخی مصرعہ کہا تھا۔ جس میں ایک مرکب توصیفی قطعہ تاریخ تھا۔ اس لیے اس مصرعہ کو اس فقیر نے رباعی کے وزن میں منتقل کرکے اس میں تین مصرعے اور شامل کرکے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کی شکل دے دی۔

علامہ بحر زاخر فضل و ہنر — دردامن ارباب طلب ریخت گہر
دل خوں شدہ و تاریخ وفاتش فرمود — قطب عالم شدہ شہید اکبر

۲۶

مولوی سید قطب الدین شمس آبادی نور اللہ مرقدہ

آپ کا خاندانی سلسلہ امیٹھی کے خاندان سادات سے ملتا ہے (جو اودھ کے علاقہ میں واقع ہے) آپ نے اپنے وطن سے منتقل ہوکر شمس آباد کی سرزمین کو آباد و منور کیا۔ (شمس آباد، قنوج کے مضافات میں آباد ہے) علامہ سید قطب الدین اپنے زمانہ کے ایک بے مثل عالم متبحر اور اعلیٰ درجہ کے صاحب تصانیف فاضل ہیں۔ اپنے وقت کے باکمال علماء و فضلاء کی خدمت میں رہ کر آپ نے علوم متداولہ کا تکملہ کیا۔

آخرکار آپ ملا قطب الدین شہید سہالوی کے شاگردوں کی جماعت میں شامل ہوگئے اور مختلف علوم و فنون سے بہرہ اندوز ہوئے۔ جب آپ تحصیل علم سے فراغت پاچکے تو شمس آباد میں خلق اللہ کے افادہ پر کمربستہ ہوگئے اور اپنی عقل وحکمت اور علم وفضل کی فیض رسانی سے بہت سے لوگوں کو کمال کے درجہ پر پہونچا دیا۔ ملا قطب الدین شہید فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص گفتگو کے مغز کو جاننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہی قطب الدین کو سمجھ سکتا ہے۔ آپ نے تقریباً ستر سال کی عمر پائی اور آپ کی وفات سنہ ۱۱۲۱ھ میں ہوئی۔

۲۷

قاضی محب اللہ بہاری قدس سرہٗ

آپ مختلف علوم وفنون کے ایک بحر ناپیدا کنار ہیں اور کواکب رخشندہ میں ایک ماہ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت صوبہ بہار کے علاقہ "محب علی پور" نامی ایک گاؤں میں ہوئی۔ نوجوانی کے زمانہ

میں آپ نے مشرقی علاقہ کا سفر کیا اور اثناء سفر میں کتب ابتدائی اور متوسطات بھی پڑھ لیں۔ آخر کار آپ سید قطب الدین شمس آبادی کے شاگردوں کے حلقہ میں داخل ہو گئے اور حضرت سید قطب الدین کی راہنمائی کی برکت سے . . . . . علم و فن کے کمالات کی منزلیں طے کر لیں۔ علم و فضل کے زیور سے آراستہ ہونے کے بعد آپ نے دکن کا سفر کیا۔ اور بادشاہ خلد مکان کے دربار میں رسائی پا کر شہر لکھنؤ کے قاضی کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد آپ اس عہدہ سے الگ کر دیئے گئے۔ پھر آپ نے دکن کا سفر کیا۔ وہاں پہنچ کر آپ کو حیدر آباد کے عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کا موقع ملا۔ وہاں بھی ایک لغزش کے سبب عہدۂ قضاء سے برطرف کر دیئے گئے۔ پھر بعض حکام کی سفارش سے خطا معاف کی گئی اور آپ کو شاہ زادہ رفیع القدر بن شاہ عالم نامور کے اتالیق کی خدمت سپرد کی گئی۔ اور جب شاہ عالم کو دربار شاہی سے صوبہ کابل کی حکومت کا عہدہ عطا کیا گیا تو آپ بھی شاہ زادہ کی ہمراہی میں کابل تشریف لے گئے۔

جب خلد مکانی نے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا اور شاہ عالم اپنی فوجیں لے کر کابل سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے تو قاضی محب اللہ کی قسمت کا ستارہ بھی چمکا اور آپ کو سلطنت ہند کے تمام ممالک کا صدر الصدور بنا دیا گیا۔ اور فاضل خاں کے خطاب سے آپ کو سرفراز اور سربلند فرمایا گیا۔ لیکن قاضی صاحب کی عمر نے وفا نہ کی۔ جب شاہ عالم اکبر آباد پہنچے تو قاضی صاحب اپنی زندگی کی مدت پوری کر کے راہ گذار عالم بالا ہو گئے۔ آپ کا سال وفات ۱۱۱۹ھ ہے۔

آپ کی تصنیفات میں فن منطق میں سلم العلوم[۱] اصول فقہ میں مسلم الثبوت[۲] اور جز ملا یتجزیٰ کے مسئلہ پر جوہر فرد نامی ایک رسالہ آپ کی گراں قدر یادگاریں ہیں جو علماء کے لیے آج بھی رہبری کی دستاویزات ہیں۔

---

[۱] یہ کتاب کتب متداولہ میں سے ہے اور فن منطق میں ہے مؤلف نے اس کے متن پر فخر کیا ہے۔ اور بعض معضلات کو جو شرح مطالع وغیرہ میں مذکور ہیں کر انبیاء کو اپنے نفس سے نسبت دی، اور دیگر شارحین کو خلجلات میں ڈال دیا ہے حل کیا ہے مجموعی عبارت متن مختصر اور جامع ہے۔ بعض علمائے فن نے اس کتاب پر حاشیے اور شرحیں لکھ کر اپنے آپ کو زندۂ جاوید بنا لیا ہے۔ ایک شرح ملا محمد حسن بن قاضی غلام مصطفیٰ کی ہے جنھوں نے مسلم الثبوت پر بھی مبادی الاحکام تک شرح لکھی ہے ملا صاحب کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ دوسری شرح قاضی مبارک گوپاموی بن شیخ محمد دائم (۱۱۶۲ھ) کی ہے۔ یہ ایسی شرح ہے جو سلم العلوم کی منطقیت پر گواہ کی حیثیت رکھتی ہے اور قاضی مبارک کے نام سے معروف ہے۔ تیسری شرح ملا حمد اللہ ولد حکیم شکر اللہ سندیلوی (۱۱۶۰ھ) کی ہے تصدیقات تک۔ یہ شرح حمد اللہ کے نام سے معروف ہے۔ چوتھی شرح ملا مبین کی ہے۔ پانچویں شرح بحر العلوم ہے یہ تمام شرحیں مقبول اور متعارف ہیں اور علماء نے ان پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

[۲] مسلم الثبوت، یہ بھی ایک سنجیدہ متن ہے۔ اس پر بھی علماء نے شرحیں اور حواشی تحریر کیے ہیں۔ ان میں ایک فواتح الرحموت فی شرح مسلم الثبوت علامہ عبد العلی بن نظام الدین سہالوی (۱۲۲۵ھ) کی ہے اور نفائس الملکوت مولوی ولی اللہ بن حبیب اللہ لکھنوی شرح علم المسلم مولوی مبین بن محب اللہ لکھنوی کا شرح علیہ شیخ احمد عبد الحق لکھنوی، کشف المبہم شرح المسلم قاضی بشیر الدین قنوجی اور اس کی شرح شیخ عبد الحق بن فضل حق خیر آبادی کی ہے۔ (ثقافۃ الہند)۔

(۲۸)

حافظ امان اللہ بنارسی قدس سرہٗ

حافظ امان اللہ بن نوراللہ بن حسین بنارسی حافظ قرآن اور ہندوستان کے نہایت مشہور عالم تبحر تھے۔ معقولات ومنقولات کے علم وفن میں ہر طرف ان کی شہرت وعظمت کا طوطی بول رہا تھا۔ علم اصول فقہ میں اپنے وقت کے علماء وفضلاء میں ممتاز تھے فن اصول فقہ میں آپ نے ایک متن تصنیف فرمایا ہے جس کا نام آپ نے "مسفر" رکھا تھا۔ محکم الاصول[۱] کے نام سے آپ ہی نے اس کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ آپ نے تفسیر بیضاوی، عضدی، تلویح، حاشیۂ قدیم، شرح مواقف، شرح حکمۃ العین، شرح عقائد، ملا جلال دوانی وغیرہ پر حاشیے لکھے ہیں اور فن مناظرہ میں (شیخ عبدالرشید جونپوری کی تصنیف) رشیدیہ پر بھی حاشیہ لکھ کر آپ نے اس کی بحثوں کو رد کیا ہے۔ آپ نے زمانہ کے حادث اور متغیر ہونے کے موضوع پر، جس پر ملا محمود محقق جونپوری نے میر باقر[۲] استر آبادی سے بحث وتمحیص کی ہے اپنا محاکمہ تحریر فرمایا ہے۔ ملا محمود محقق شاہ خلد مکان کے بعد کچھ زمانہ تک شہر لکھنؤ کی صدارت کے عہدہ پر فائز اور مامور رہے تھے اسی زمانہ میں قاضی محب اللہ صاحب بھی لکھنؤ میں قاضی کے عہدہ پر فائز تھے اور اس طرح یہ دونوں حضرات ایک ہی وقت میں شہر لکھنؤ میں جمع ہوگئے۔ اور دونوں میں باہم علمی مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں حافظ امان اللہ صاحب شاہ جہان آباد سے منتقل ہو کر الہ آباد آ گئے تھے۔ وہاں حضرت شیخ محمد یحییٰ[۳] المعروف بہ شیخ خوب اللہ الہ آبادی قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر (جن کا ذکر ترجمۂ زائر کے سلسلہ میں دوسری جلد میں آئے گا) نقشبندیہ سلسلہ کے طریقے اور اذکار واشغال سیکھے اور انہیں اذکار واشغال میں مشغول ہوگئے۔

۱؎ قاضی محب اللہ بہاری نے مسلم الثبوت میں محکم الاصول پر اعتراضات کیے ہیں، اور اس کتاب کے ضعف کے اسباب بیان کیے ہیں۔

۲؎ میر محمد باقر داماد (شیعہ) استر آبادی ثم اصفہانی خلف سید شمس الدین محمد داماد۔ ان کے والد نے شیخ علی آملی کی دختر سے عقد کیا تھا اور داماد کے نام سے شہرت پائی تھی۔ بہاء آملی کی وفات کے بعد بلاد عجم میں علمائے ریاست کی تولیت ان کو تفویض کی گئی۔ ۱۶۳۱ء—۱۰۴۰ھ میں بمقام نجف اشرف وفات پائی۔ بہت سی کتابیں تالیف کیں۔ ان میں "الافق المبین" بہت مشہور ہے۔ (ہدیۃ العارفین، مفتاح التواریخ)۔

۳؎ حضرت شیخ محمد افضل الہ آبادی (م ۱۱۴۴ھ) کے حقیقی برادر زادہ، داماد، مرید اور سجادہ نشین تھے، صاحب تصانیف تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں، ان میں وفیات الاعلام (ملا جامی کی نفحات الانس کے طرز پر)، مکتوبات کی چار جلدیں (حقیقت تصوف کے اظہار میں) افاضۃ الباری فی شرح ثلاثیات بخاری، شرح رسالہ مکیہ، حاشیہ دستور المبتدی (فن صرف میں) مشہور ومعروف ہیں (تذکرہ علمائے ہند، مفتاح التواریخ، انوار العارفین) ۱۱۴۴ھ میں وصال ہوا "لقد رضی" تاریخ وصال ہے۔ مزار مقدس الہ آباد میں ہے۔

اس بلند مرتبہ گروہ کے اشغال و اذکار کا اثر ظاہر ہونے کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ اس اجتماع کے بعد جو سید مُسنّد[1] اور خواجہ علاء الدین عطار[2] (عطر اللہ مرقدہٗ) کے درمیان واقع ہوا تھا۔ بظاہر ایسا اجتماع کبھی نہ ہوا ہوگا۔ لیکن اس اجتماع میں کہ تم میری خدمت میں ہو تم سید مُسنّد سے برتر اور اعلیٰ ہو۔ اس میں خواجہ عطارؒ کے مقابلہ میں کوئی مرتبہ نہیں رکھتا۔ حافظ امان اللہ صاحب نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ کہا کہ حضرت آپ تو خواجہ کے قدم بہ قدم ہیں اور میں سید مُسنّدؒ کے ساتھ برابری کا کوئی امکان نہیں رکھتا۔

اسی زمانہ میں بنارس ہی میں جو آپ کا مولد و مسقط الرّاس ہے آپ نے انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہیں۔ آپ کی وفات ۱۱۳۳ھ میں ہوئی۔

---

(۲۹)

شیخ غلام نقشبند لکھنوی قدس سرّہٗ

علامہ شیخ غلام نقشبند لکھنوی عجیب و غریب قسم کے ظاہری و باطنی علوم کے منبع و مخزن ہیں۔ آپ کے آباء و اجداد کا وطن مالوف قصبہ گھوسی ہے جو ضلع جونپور میں واقع ہے (اب ضلع اعظم گڑھ میں ہے) یہ حضرات وہاں کے بہت باعزت اور عالی مقام لوگوں میں ہیں۔ آپ کے والد ماجد حضرت شیخ عطاء اللہ[3] نے حضرت شاہ (بہاؤالدین) نقشبند قدس سرہٗ کے روحانی اشارہ سے آپ کا نام غلام نقشبند رکھا۔ آپ نے میر محمد شفیع قدس سرہٗ کے سایۂ تربیت میں رہ کر علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔ میر محمد شفیع، شیخ غلام نقشبند کے والد کے شاگرد رشید تھے۔ شیخ غلام نقشبند اٹھارہ سال کی عمر میں تمام معقولات و منقولات میں مہارت تامہ اور ید طولیٰ حاصل کر کے

---

[1] سید مُسنّد عرف خواجہ سید شریف جرجانی (۷۴۴ ــ ۸۲۵ھ) خواجہ علاء الدین عطار قدس سرہٗ کے مقبول اور منظور نظر تھے۔ بیعت کے بعد ان پر ایسا بے خودی و استغراق کا عالم طاری ہوا کہ اپنے آپے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ سید جرجانی فرماتے تھے کہ جب تک میں "زین علی لالا" کی خدمت میں نہیں حاضر ہوا تھا مجھے "رفض" سے چھٹکارا نہیں ملا تھا اور جب تک میں خواجہ علاؤالدین عطار سے نہیں ملا تھا خدا کو نہیں پہچان سکا تھا۔ (خزینہ ـ تقصار)

[2] خواجہ علاؤالدین عطار، آپ کا اسم گرامی محمد بن بخاری ہے۔ حضرت شیخ بہاء الدین نقشبند کی صاحبزادی سے آپ کے عقد کا واقعہ مشہور ہے۔ ۸۰۲ھ میں وصال ہوا۔ (خزینۃ الاصفیا)

[3] شیخ عطاء اللہ گھوسوی بن محمد شریف بن تاج محمود الحسینی المداری۔ اپنے دور کے مشہور مشائخ میں تھے۔ حدیث و تفسیر و فقہ وغیرہ کے علوم شیخ پیر محمد سلونی (۹۹۶ھ / ۱۰۹۱ھ) سے حاصل کیے اور خرقۂ مداریہ اپنے والد سے پہنا۔ ۱۰۹۱ھ کے بعد وصال ہوا (نزہۃ الخواطر)۔

فارغ التحصیل ہوگئے۔ اور اکیس سال کی عمر کو پہونچ کر آپ نے کچھ دنوں تک اپنے شیخ کے پیر طریقت، شیخ پیر محمد[1] لکھنوی قدس سرہ کی خدمت میں رہ کر علوم ظاہر و باطن کی تکمیل کی۔ آپ نے فرمایا کہ تحصیل علم کی ابتدائی منزل میں ایک رات میں عالم خواب میں سرور انبیاء علیہ السّلام کے دیدار سے مشرف ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے میری قبا کے بٹن کھول رہے ہیں۔ عین خواب ہی کی حالت میں خواب کی تعبیر بھی یہ دل میں القا ہوگئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر علوم کے دروازے کھول رہے ہیں اور مجھے شرح صدر کی نعمت عطا فرما رہے ہیں۔

میر محمد شفیع[2] کی مستقل سکونت شاہ جہان آباد میں تھی۔ آپ کا تکیہ اس شہر میں مشہور ہے۔ شیخ غلام نقشبند، میر محمد شفیع قدس سرہ کی زیارت کے لیے ان کی زندگی میں اور ان کے وصال کے بعد بھی شاہ جہان آباد جایا کرتے تھے۔ اور وہاں سے فیوض و برکات حاصل کیا کرتے تھے۔ جب شیخ پیر محمد قدس سرہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے تو ان کے تمام خلفاء اور عقیدت مندوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ میر محمد شفیع قدس سرہ کو ان کا سجادہ نشین بنایا جائے۔ اسی خیال سے لوگوں نے میر محمد شفیع کی آمد کے انتظار میں کسی کو سجادہ نشین نہیں کیا تھا۔ چنانچہ جب میر محمد شفیع لکھنؤ پہونچے تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شیخ غلام نقشبند کو سجادہ نشین بنانا چاہیے۔ سجادہ نشینی کے لیے آپ نے ایک دن مقرر کر دیا۔ اور اپنے دل کا منشا آپ نے کسی سے ظاہر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خود شیخ غلام نقشبند سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ شہر کے تمام لوگ (خاص و عام) اس تاریخ مقررہ پر آکر جمع ہوگئے۔ اور شیخ پیر محمد قدس سرہ کے مزار پر ایک بڑی محفل منعقد ہوئی۔ میر محمد شفیع اٹھے اور مصلے کو انھوں نے حاضرین محفل و اکابر مجلس کے سامنے بچھا دیا اور شیخ غلام نقشبند کا ہاتھ پکڑ کر سجادہ پر بٹھا دیا اور خود ان کے قدموں میں گر پڑے۔ حاضرین محفل میں سے ہر شخص نے میر محمد شفیع قدس سرہ کی پیروی کی اور شیخ غلام نقشبند کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی۔

حضرت شیخ غلام نقشبند کے بلند مرتبہ کا اندازہ اسی واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت میر محمد شفیع نے ان کو خلافت کے لائق دیکھ کر اپنے پیر کی "گدی" (سجادہ) پر بٹھا دیا۔ اور خود مریدانہ آداب بجا لا کر ان کی قدم بوسی کی۔

---

[1] بن اولیا جونپوری ثم لکھنوی۔ علوم ظاہری و باطنی میں جلیل القدر مرتبہ کے حامل تھے۔ صاحب تصانیف ہیں۔ درسی کتابیں قاضی عبد القادر عمری لکھنوی سے پڑھیں اور بیعت طریقت عبد اللہ السیاح مکی چشتی کے دست اقدس پر کی۔ سلوک میں کتاب منازل اربعہ، سراج الحکمۃ حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ مصنفہ صدر الدین شیرازی، حاشیہ ہدایہ (فقہ)، اور فتاوی فقہیہ وغیرہ اور کچھ رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ حضرت شیخ پیر محمد لکھنوی نے ۱۰۸۵ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر، تذکرہ علمائے ہند، خزینۃ الاصفیا) آپ کا مزار مبارک لکھنؤ میں ٹیلہ پیر محمد شاہ کے نام سے موسوم ہے۔

[2] میر صاحب، محمد خانم، نور الحواتی (۳۰۷ھ) کے اولاد میں ہیں آپ کی ولادت اور پرورش شہر لاہور میں ہوئی! و تربیت شیخ پیر محمد لکھنوی سے حاصل کی۔ ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی "پاک بخدا پیوست" تاریخ وصال ہے (نزہۃ الخواطر)۔

درحقیقت شیخ غلام نقشبند نے اس سجادہ کو ایک عجیب قسم کی رونق دی اور اس کی شان بڑھادی۔ آپ کی ذات گرامی ظاہری و باطنی علوم کے طلب گاروں کی زیارت گاہ اور مرکز بن گئی۔ آپ نے اپنی توجہ اور اپنے فیوض و برکات سے ایک عالم کو ظاہری و باطنی کمالات سے مالا مال کر دیا۔ اس زمانہ کے اکثر علماء و فضلاء کا سلسلہ تحصیل کمالات آپ ہی کی ذات گرامی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ عالمگیر بادشاہ غازی کے دوسرے بیٹے قطب الدین شاہ عالم[1] بہادر شاہ نے بھی آپ سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ اور حد سے زیادہ آپ کی عزت افزائی اور قدر و منزلت کی۔

آپ کا مزاج شریف ہر وقت احکام شرعیہ کی حفاظت میں مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ "الحبّ للّٰہ و البغض للّٰہ" کے مطابق اگر کسی سے کوئی فعل خلاف شریعت سرزد ہوتا تو آپ اس سے نہایت درجہ کبیدہ خاطر ہو جایا کرتے تھے۔ اور اگر اس شخص کو توبہ کی توفیق ہو جاتی تھی اور وہ صدق دل سے تائب ہو جاتا تھا۔ تو آپ کی مہربانیاں اور آپ کی خصوصی توجہات اس کی جانب پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دن ایک آزاد مشرب قلندر شیخ کی مجلس میں آیا۔ شیخ نے اس میں کچھ خلاف شرع باتیں دیکھیں تو متنفر اور کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا کہ اس گروہ کو (آزاد مشرب قلندروں کو) نہ اللہ تعالےٰ کا دیدار ہوگا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب ہوگی۔ قلندر نے کہا اے شیخ ٹھہرو! ہم لوگوں کو اللہ کا دیدار بھی نصیب ہوگا اور شفاعت رسول بھی حاصل ہوگی۔ لیکن تم کو ان دونوں میں سے ایک بھی نصیب نہ ہوگا۔ شیخ نے پوچھا کیوں؟ قلندر نے جواب دیا چونکہ آپ زندگی بھر گناہوں کے قریب بھی نہیں گئے ہیں۔ اس لیے کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے فرشتے آپ کو بغیر حساب کتاب اور سوال و جواب کے جنت میں داخل کر دیں گے اور ہم لوگ چونکہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لیے فرشتے ہم لوگوں کو اللہ تعالےٰ کے دربار میں لے جائیں گے اور جناب سید المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہم مٹھی بھر گناہ گاروں کی شفاعت کے لیے اللہ تعالےٰ کے دربار میں تشریف فرما ہوں گے۔ قلندر کے اس جواب سے شیخ بہت متاثر ہوئے۔ ان کے دل پر بڑی رقت طاری ہوئی اور بہت دیر تک زار زار روتے رہے۔

اسی مفہوم کو قصیدہ بردہ شریف کے مصنف حضرت بوصیری[2] نے کس قدر عمدہ انداز سے ارشاد فرمایا ہے۔

---

[1] ولادت ۱۰۵۳ھ جلوس ۱۱۱۹ھ وفات ۱۱۲۴ھ۔

[2] ابو عبد اللہ شرف الدین محمد بن سعید (۶۰۸ — ۶۹۵ھ) بن حماد البوصیری۔ اس قصیدہ میں ایک سو پینسٹھ ۱۶۵ اشعار ہیں امام بوصیری نے اس قصیدہ میں اپنی عرض اور گذارشات سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کی ہیں۔ شیخ شرف الدین بوصیریؒ نے یہ قصیدہ قصیدۂ بانت سعاد کے مقابل میں کہا ہے جس کے مصنف کعب بن زہیرؓ ہیں اور قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے قصیدے کے آخر میں امام بوصیری نے اپنے چند دعائیہ اشعار شامل کیے ہیں۔ ان ہی میں ایک شعر قصیدہ میں یہ واقع ہوا ہے۔

یا نفس لا تقنطی من زلۃ عظمت — ان الکبائر فی الغفران کاللمم (محشی)

لعل رحمة ربی حین یقسمھا   تأتی علی حسب العصیان فی القسم

ترجمہ:۔ امید ہے کہ جس وقت اللہ تعالےٰ کی رحمت گناہ گاروں کے درمیان تقسیم کی جائے گی تو ہر گناہ گار کی قسمت میں اس کے گناہوں کی تعداد اور مقدار کے مطابق ہی آئے گی۔

اس فقیر کو بھی اسی طرح کا ایک واقعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ یہ کہ جن ایام میں میرا قیام مدینہ منورہ میں تھا، شعبان کی پہلی تاریخ کو میں نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مسجد قبا کی زیارت کا ارادہ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ کی سیر کرنے کے لیے ہم لوگ گئے۔ بستان النبی قبا کے مقام میں ایک مشہور باغ ہے جس کو بُستانِ قُوَیم بھی کہتے ہیں۔ (ق کو پیش اور واؤ کو زیر کے ساتھ) اس جماعت میں ماوراء النہر کا ایک قلندر تھا۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اس قلندر نے کچے انگوروں کا ایک خوشہ بغیر اجازت کے توڑ لیا۔ اور چھپا کر اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے اپنے دوستوں کو قلندر کی چوری سے آگاہ کیا۔ دوستوں نے اس کو ملامت کی اور قلندر کو بُرا بھلا کہا اور کہا کہ چوری تو ہر جگہ بُری ہے۔ خاص کر ایسے پاکیزہ اور بزرگ مقام میں تو اور بھی نازیبا اور مذموم ہے۔ جب لوگوں نے ہر طرف سے اس قلندر کو اپنے طعن وتشنیع کے تیروں کا نشانہ بنا لیا تو اس قلندر نے جواب دیا کہ اے دوستو! تم لوگ خود عقلمند ہو۔ تم جانتے ہو کہ یہ کچے انگور کا کچھا کھانے کے لائق نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فعل کے ارتکاب میں میرا ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کا مال چوری سے لے لیتا ہے تو میدان قیامت میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے چور اور چیز کے مالک دونوں کو اللہ تعالےٰ کے دربار میں اکٹھا کریں گے۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو سر سے پیر تک گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں کسی طرح سے اس لائق نہیں ہوں کہ کل (قیامت کے دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار دُربار میں داخل ہو سکوں۔ میں نے یہ گچھا حضرت کے باغ سے صرف اس امید میں چوری سے توڑ لیا ہے کہ اس گچھے کے تقاضے کے لیے شاید اللہ تعالےٰ کے فرشتے مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں لے جائیں اور میں بھی اسی بہانہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی سعادت حاصل کر سکوں۔ یہ بات سنتے ہی حاضرین محفل کی حالت متغیر ہو گئی۔ سب پر ایک خاص قسم کی وجدانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ روم کا باشندہ ایک شخص اس جملہ کے برداشت کی تاب نہ لا سکا۔ ایک چیخ مار کر بے اختیار زمین پر گر پڑا اور لوٹنے لگا۔ پھر اٹھا اور قلندر کے پیچھے دوڑتا ہوا گیا۔ اور اپنا ایک گرہ بستہ رومال قلندر کی جھولی میں ڈال دیا۔ جب رومال جھولی سے نکال کر دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ سونے اور چاندی کے وہ سکے جو اس کے ملک میں رائج تھے۔ جن کا ایک سکہ ہندوستان کے چالیس روپیوں کے برابر تھا اس رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ قلندر کو اس کی نیک اور پاک نیت کا بدلہ اللہ تعالےٰ نے دنیا ہی میں نقد دے دیا۔ اللہ تعالیٰ عقبیٰ میں کیا عطا فرمائے گا اس کو وہی جانتا ہے۔

حضرت شیخ غلام نقشبند کی وفات لواخر رجب ۱۱۲۶ھ میں ہوئی آپ کا مزار مقدس لکھنؤ میں ہے۔

حضرت شیخ غلام نقشبند قدس سرہٗ کی تصانیف درج ذیل ہیں:۔

تفسیر انوار القرآن ربع قرآن مع حواشی۔ تفسیر سورۂ اعراف مع حواشی۔ تفسیر سورۂ مریم۔ تفسیر سورۂ طٰہٰ۔ تفسیر سورۂ محمد۔ تفسیر سورۂ یوسف۔ تفسیر سورۂ رحمٰن۔ تفسیر سورۂ عم با حواشی۔ تفسیر سورۂ کوثر۔ تفسیر سورۂ اخلاص۔ تفسیر آیت اللہ نور السموٰت والارض۔ تفسیر انا عرضنا الامانۃ۔ تفسیر آیت افحسبتم۔ تفسیر آیت لا تقولن لشیئ انی فاعل ذالک غدا۔ تفسیر آیت الرحمٰن علی العرش استوی۔ تفسیر آیت کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ کتاب فرقان۔ انوار لامعہ عرشیہ در مسئلۂ وحدۃ الوجود۔ شرح قصیدۂ خزرجیہ[1] (در علم عروض) وغیرہ۔

---

(۳۰)

شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون نور اللہ مرقدہٗ

شیخ احمد بن شیخ ابو سعید[2] بن شیخ عبید اللہ[3] بن شیخ عبد الرزاق[4] بن مخدوم خاصہ[5] قدس سرہٗ ہیں۔ اور یہ مخدوم خاصہ امیٹھی کے (جو لکھنؤ کے مضافات میں ہے۔) ایک بہت ہی مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔

---

[1] علم عروض اور قوافی میں یہ قصیدہ "الرامزۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ ضیاء الدین ابو محمد عبد اللہ بن محمد الخزرجی المالکی اندلسی کی تالیف ہے چند علماء نے اس قصیدہ کی شرحیں تحریر کی ہیں ان میں قاضی زکریا بن محمد انصاری متوفی ۹۲۶ھ کی "فتح رب البریہ بشرح القصیدۃ الخزرجیہ" اور شمس الدین محمد بن یحییٰ عثمانی شافعی کی "رفع حجاب العیون الغامز عن کنوز الرامزۃ" بھی ہے جس کی تکمیل ۱۰۰۶ھ میں ہوئی۔ ایک شرح اس کی شیخ غلام نقشبند نے بھی تحریر کی ہے۔ (کشف الظنون، ثقافۃ الہند)

[2] ولادت ۱۰۰۳ھ وفات ۱۰۶۵ھ (نزہۃ الخواطر)۔

[3] اصحاب علم و طریقت میں تھے ولادت ۹۶۹ھ وفات ۱۰۳۶ھ (نزہۃ الخواطر)۔

[4] متوفی ۱۰۱۴ھ شیخ نظام الدین بن محمد لٰسین عثمانی امیٹھوی (۹۰۰ھ تا ۹۷۹ھ) سے درسیات پڑھیں۔ اس کے بعد جونپور جا کر شیخ عبد السلام قلندر بن محمد جونپوری کے شاگرد ہوئے (۹۷۲ھ) شیخ جعفر بن نظام الدین امیٹھوی (۱۰۴۵ھ) اور قاضی حسین سرکھی (۱۰۳۰ھ کے بعد) ان کے شاگردوں میں ہیں۔ (نزہۃ الخواطر)۔

[5] خاصہ خدا بن خضر بن گدن بن خیر الدین عالمی مکی لقب بہا ذالحق حنفی امیٹھوی (۹۲۶ھ) شیخ احمد بن ابو سعید امیٹھوی نے مناقب الاولیاء میں لکھا ہے کہ ان کا نسب شیخ عبد اللہ علمبردار عالمی مکی تک پہونچتا ہے شیخ مذکور نے شیخ محمد بن عبد العزیز جونپوری سے شرف تلمذ حاصل کیا اور مولانا خواجگی بن علی انصاری سید پوری سے بیعت کی۔ (نزہۃ الخواطر)۔

ملا جیون کی ولادت اور تعلیم و تربیت سب کچھ قصبہ امیٹھی ہی میں ہوئی۔ آپ حافظ قرآن تھے۔ اس کے علاوہ علوم شرعیہ و عقلیہ میں آپ ایک اتھاہ سمندر تھے۔ آپ تحصیل علم کے ابتدائی دور میں بغرض طلب علم مشرقی علاقوں میں گھومتے رہے۔ اور اس وقت کے ممتاز علماء و فضلاء سے استفادہ کرتے رہے آخر میں آپ نے علوم متداولہ میں فراغت ملا لطف اللہ کوروی سے حاصل کی۔ انجام کار قسمت کی یاوری اور بلندی نے ان کو بادشاہ خلد مکان کے دربار تک پہونچا دیا۔ بادشاہ نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ملا جیون نہایت سادہ وضع میں رہتے تھے۔ اور رسمی تکلفات سے بے نیاز تھے۔ بادشاہ ان سے بہت زیادہ حسن عقیدت رکھتا تھا۔ اور آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اسی طرح شاہ عالم بہادر شاہ بھی اپنے پدر بزرگوار کی طرح ان کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ حد سے زیادہ تکریم بجالاتے تھے۔ آپ کی یادداشت کی قوت بہت زیادہ تھی۔ کتب درسیہ کے صفحات بلا تکلف پڑھتے چلے جاتے تھے۔ کسی طویل سے طویل قصیدہ کو صرف ایک مرتبہ سن کر زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ آپ نے حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین کی بھی سعادت حاصل کی۔ ساری زندگی آپ نے علوم دینیہ کی تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف کر دی۔ آپ کی وفات ۱۱۳۰ھ میں دارالسلطنت شاہ جہان آباد میں ہوئی۔ آپ کی نعش کو امیٹھی میں لے جا کر دفن کیا گیا۔ آپ نے ان قرآنی آیات کی ایک تفسیر لکھی ہے جن سے فقہی مسائل اخذ کیے جاتے ہیں جس کا نام "تفسیر احمدی" ہے۔ اصول فقہ میں "نور الانوار شرح[1] منار" بھی آپ ہی کی تصنیف ہے۔ جو "منار" کی ایک عمدہ شرح ہے اور متداول ہے۔

۳۱

سید سعد اللہ بن سید غلام محمد سلونی قدس سرہٗ

آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے "سلونی[3]" قول کے مجدد اور آسمان ہدایت کے ایک درخشندہ ستارے ہیں۔ آپ کی ولادت قصبۂ سلون میں ہوئی جو الہ آباد کے قریب واقع ہے (آج کل ضلع رائے بریلی میں شامل ہے۔) اور سلون ہی میں آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت بھی ہوئی۔ آپ شیخ پیر[2] محمد سلونی کے

---

[1] "منار الانوار" اصول فقہ میں شیخ ابو البرکات نسفی (م ۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے جس پر ملا جیون کی شرح لکھی ہے اور نور الانوار کے نام سے مشہور ہے۔

[2] ابن عبد النبی بن ابو الفتح بن الهداد بن محمد الشریف بن بہاء الدین العمری احمد نہروری ثم السلونی، مشاہیر مشائخ میں تھے۔ ۹۹۶ھ میں ولادت اور ۱۰۸۱ھ میں وفات ہوئی۔ شیخ عبد الکریم بن سلطان مانکپوری (م ۱۰۵۰ھ) کے شاگرد اور طریقت میں ان ہی کے خلیفہ تھے۔ ساری عمر رشد و ہدایت اور تلقین میں صرف کر دی۔ (نزہۃ الخواطر)

[3] مصنف مآثر الکرام نے لفظ سلونی کی نسبت سے "قول سلونی" استعمال کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ مجھ سے حقائق دین دریافت کر لو کہ میں اسرار دین کا خزانہ ہوں۔ غیر مجدد قول سلونی میں آپ کے مسلک شیعیت کی طرف ایک لطیف و بلیغ اشارہ ہے۔ (مترجم)

ہمشیرہ زادے ہیں جن کا شمار اولیاء کبار میں ہوتا ہے اور ۱۰۱۹ھ ۲۲ محرم جن کی تاریخ وفات ہے، حضرت شیخ پیر محمد سلونی کے مناقب مشہور زمانہ ہیں۔

سید سعداللہ کم سنی ہی میں علوم وفنون کی تحصیل کی جانب مائل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں تمام علوم متداولہ میں کامل دستگاہ حاصل کرلی اور عالم شباب ہی میں تعلیم وتربیت، درس وتدریس اور رشد وہدایت کی مسند پر متمکن ہوگئے اور پرانے اور کہنہ مشق اساتذہ کے دوش بدوش آپ کا چشمۂ فیض بھی جاری ہوگیا۔ اسی دور میں آپ نے نہایت گراں قدر کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ خصوصاً علم حقیقت ومعرفت، فلسفہ وحکمت اور فن منطق میں آپ کی تصانیف بہت بلند مقام رکھتی ہیں[1]۔

آپ نے بیعت اپنے والد ماجد سے کی جن کے پیر حضرت جہانی اور ان کے پیر حضرت صوفی فیروز اور ان کے پیر حضرت سید وجیہ الدین علوی احمد آبادی قدس سرہم ہیں۔ سید سعداللہ نے زیارت حرمین شریفین کی نعمت بھی حاصل کی۔ اور کچھ زمانہ تک مکہ معظمہ میں قیام کا شرف بھی نصیب ہوا۔ وہاں آپ کو بڑی عزت وقبولیت حاصل ہوئی۔ مکہ معظمہ کے چھوٹے بڑے، خواص وعوام سبھی آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اہالیان مکہ معظمہ نے آپ سے علم ظاہر وباطن بھی سیکھے۔

شیخ عبداللہ بصری مکی قدس سرہ جن کی وفات ۱۱۳۴ھ میں ہوئی اور جو اپنے وقت کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے اور ساری دنیا میں ایک مسلّم الثبوت استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور آج بھی عرب وعجم کے اکثر علماء کی اجازت کا سلسلہ انھیں کی ذات گرامی تک پہونچتا ہے آپ نے قادریہ سلسلہ کا بلند پایہ طریقہ حضرت سید سعداللہ قدس سرہٗ کی خدمت سے حاصل کیا تھا۔ شیخ عبداللہ بصری کے فرزند ارجمند شیخ سالم نے اپنے والد ماجد کی اجازت کے سلسلہ میں ایک رسالہ مرتب کیا ہے اس رسالہ میں آپ فرماتے ہیں:۔

"مشائخہ فی الطریق واساتذہ فی ارشاد والتحقیق جملۃ اجلاء منہم العلامہ المحقق السید سعداللہ الہندی عن السید عبدالشکور عن شاہ مسعود الاسفرائینی عن الشیخ علی الحسینی عن الشیخ جعفر احمد الحسینی عن الشیخ ابراہیم الحسینی عن الشیخ عبداللہ الحسینی عن الشیخ عبیداللہ الحسینی عن الشیخ عبدالرزاق عن سیدنا عبدالقادر الجیلانی قدس اسرارہم"

سید سعداللہ نے حرمین شریفین سے واپس آنے کے بعد سورت (گجرات) کی بندرگاہ میں قیام فرمایا وہاں آپ کے پاس ہر وقت مریدین ومعتقدین اور نیاز مندوں کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔ خلد مکان آپ کی ذات ستودہ صفات سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور بڑے خلوص سے پیش آتے تھے۔ حضرت سید سعداللہ کی وفات ۱۱۳۸ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار بندرگاہ سورت میں ہے۔

---

[1] منجملہ ان کے "حاشیہ حکمت، رسالہ کشف الحق، رسالہ جلی بیت مثنوی، رسالہ ثبوت مذہب فہیم، رسالہ تحفۃ الرسول، حاشیہ معین الوصول، آداب البحث (منطق)،" حواشی بر حاشیہ قدیم وجدید وغیرہ ہیں۔

سلسلۂ اجازت

شیخ عبداللہ البصری مکی ۱۱۳۴ھ
تا
سیدنا شیخ عبدالقادر الجیلانی رحمۃ اللہ علیہ

الشیخ عبدالقادر جیلانی

|

الشیخ عبدالرزاق

|

الشیخ عبداللہ الحسینی

|

الشیخ عبیداللہ الحسینی

|

الشیخ ابراہیم الحسینی

|

الشیخ جعفر احمد الحسینی

|

الشیخ علی الحسینی

|

الشیخ الشاہ مسعود الاسفرائینی

|

السید عبدالشکور

|

السید سعد اللہ

|

الشیخ عبداللہ البصری

۳۲

مولانا نور الدین نور اللہ مرقدہٗ

آپ شیخ محمد صالح احمد آبادی کے صاحبزادہ ہیں۔ آپ اپنے زمانہ کے ایک زبردست عالم تبحر اور اپنے معاصرین باکمال علماء میں سب سے زیادہ ممتاز اور فائق تھے۔ ان کے زمانہ میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ آپ نے ملا احمد سلیمانی[1] احمد آبادی اور ملا فرید الدین[2] احمد آبادی سے تعلیم حاصل کی۔ اور اپنے زمانہ کے تمام دانشوروں میں امتیاز خاص حاصل کیا۔ آپ نے ۱۱۲۳ھ میں زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل کیا۔ اور دوسرے سال وہاں سے واپس آئے۔ پھر حضرت محبوب عالم[3] احمد آبادی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے (جن کا لقب شاہ عالم ثانی تھا) بیعت کی اور کئی خانوادوں کی خلافت کا خرقہ بھی زیب تن کیا۔ پھر اپنی خانقاہ میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا۔ اور شروع سے آخر تک طالبین اور تلامذہ کو تعلیم دینے اور کتب تصنیف کرنے میں مشغول رہے۔ آپ نے بے شمار طالبین کو باکمال عالم بنا دیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زائد ہے۔ چند مخصوص تصانیف مختصراً بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ تفسیر کلام اللہ (مختصر) ۲۔ تفسیر نورانی فی السبع المثانی جو دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۔ تفسیر ربانی بر سورۃ البقرہ جو تیس ہزار اشعار پر مبنی ہے۔ ۴۔ حاشیہ بر اوائل تفسیر بیضاوی۔

---

[1] یہی مولانا سلیمان۔ ان کے پیدائش کا اصل مقام گرد ہے مولانا سلیمان احمد آباد گجرات آئے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) سے کسب فیض کیا۔ زبردست عالم ہوئے ان کے صاحبزادہ مولانا احمد بڑے جید عالم تھے۔ تمام علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ اکثر علوم میں لاجواب تصنیفات کی ہیں۔ گجرات کے علاقہ میں علوم عقلیہ کا انہی سے رواج ہوا۔ منجملہ ان کی تصنیفات کے "فیوض القدس" ایک ممتاز کتاب ہے علم کلام کا اکثر حصہ مولانا محمد شریف سے حاصل کیا۔ شرح مواقف اور اکثر علوم عقلیہ مولانا ولی محمد خان گجراتی سے پڑھے۔ اور تصوف میاں شیخ فرید سے حاصل کیا۔ ریاضی امیر تیاد بدخشی معروف دیانت خان (۱۰۸۳ھ) سے پڑھی۔ اور بعض علوم اپنے والد مولانا سلیمان سے حاصل کیے۔ ۱۱۱۲ھ میں وصال ہوا۔ مولانا نور الدین گجراتی نے تاریخ وصال میں یہ مصرعہ فرمایا۔ شمعے کہ بود بہ انجمن علم گل شد۔ (تذکرہ علمائے ہند)۔

[2] حنفی گجراتی، علوم عقلیہ اور نقلیہ میں مشاہیر علماء میں شمار تھا (نزہۃ الخواطر)۔

[3] شیخ العالم فقیہ محمد بن سید جعفر بدر عالم بن سید جلال مقصود عالم بن محمد الحسینی بخاری ابوالمجد محبوب عالم گجراتی ۱۰۷۱ھ-۱۱۱۱ھ خدا طلبی کا جذبہ اور تحصیل علم کا مادہ ان کی فطرت تھی مشائخ اور علمائے صوفیہ احمد آباد گجرات سے ہیں۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان میں دو تفسیریں بھی ہیں ایک فارسی میں بروایت اہل بیت اور دوسری عربی میں بطور تفسیر جلالین اور ایک مشکوٰۃ شریف کی شرح "زینت النکاۃ" درس و تدریس اور مطالعہ کتب کے باوجود اکثر عبادات اور ریاضتوں میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے والد سید جعفر نے ۱۰۶۷ھ میں وفات پائی۔ کتاب "روضات شاہیہ" ان کی یادگار ہے (تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر)۔

۵- نور القاری شرح صحیح البخاری۔
۶- حاشیہ قویہ برحاشیہ قدیمہ۔
۷- حاشیہ شرح مواقف۔
۸- حل معاقد حاشیہ شرح مقاصد[۱]۔
۹- حاشیہ شرح مطالع[۲]۔
۱۰- حاشیہ تلویح۔
۱۱- حاشیہ عضدی[۳]۔
۱۲- معول حاشیہ مطول۔
۱۳- حاشیہ شرح وقایہ۔
۱۴- حاشیہ شرح ملا۔
۱۵- حاشیہ منہل[۴]۔
۱۶- حاشیہ شمسیہ (منطق)۔
۱۷- شرح تہذیب المنطق[۵] (بڑی معرکۃ الآرا تصنیف ہے)۔
۱۸- طریق الامم شرح فصوص الحکم۔
۱۹- شرح مثنوی مولوی روم۔

بمقام احمد آباد ۱۰۶۳ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور اسی شہر میں ۹ شعبان المعظم ۱۱۵۵ھ کو آپ نے وفات پائی۔ "اعظم الاقطاب" تاریخ وفات ہے۔ آپ کی عمر اکانوے سال ہوئی۔ آپ کی خانقاہ سے قریب ہی آپ کا مزار ہے ۱۱۵۵ھ میں سید سعید اللہ بلگرامی قدس سرہٗ نے مولانا کی خانقاہ میں چند ماہ قیام فرمایا ہے۔ جیسا کہ فصل اول میں ذکر کیا گیا ہے۔

---

[۱] مقاصد الطالبین فی علم اصول الدین مصنفہ سعد تفتازانی مولف نے اس پر شرح بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب شرح مقاصد کے نام سے مشہور ہے مولف نے متن کی خود اپنے ہاتھ سے ترتیب کی ہے اور ۷۸۴ھ میں تکمیل کی۔ اس شرح میں مغالطہ عامہ "موسومہ الجذر الاصم" مشہور ہے۔ (کشف الظنون) مولانا نے اس شرح پر حاشیہ لکھا ہے۔ [۲] کتاب کا نام "مطالع الانوار" ہے (منطق و حکمت کے فن میں) جو قاضی سراج الدین محمود بن محمد ابی بکر الارموی متوفی ۶۸۹ھ کی تصنیف ہے۔ فضلائے فن نے اس کتاب کو درسیات میں شامل فرمایا ہے۔ یہ کتاب دو طرف پر مرتب کی گئی ہے پہلا طرف منطق میں ہے اور دوسرا فلسفہ میں ہے۔ علامہ قطب الدین محمد بن محمد رازی تحتانی نے اس متن پر شرح "لوامع الاسرار" تحریر کی ہے۔ جو وزیر غیاث الدین خدا بندہ کے لیے لکھی ہے۔ متعدد علماء نے اس شرح پر حواشی لکھے ہیں منجملہ ان کے حاشیہ سید شریف مشہور ہے۔ مولانا نور الدین نے بھی اسی شرح رازی پر حاشیہ تحریر کیا ہے۔ (کشف الظنون) [۳] "العضدی" ایک کتاب ہے علم نحو میں جو امام ابو علی الحسن بن احمد فارسی نحوی (۳۷۷ھ) کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے (کشف الظنون) مولانا نے اس پر حاشیہ لکھا ہے [۴] کتاب کا نام "المنہل الصافی فی شرح الوافی" ہے علامہ محمد بن عثمان بن عمر البلخی نے کتاب لکھ کر اس کا نام "وافی" رکھا۔ اس کے بعد شیخ امام محمد بن ابی بکر الدمامینی متوفی ۸۲۸ھ نے اس پر شرح لکھی۔ (کشف الظنون) کتاب المنہل کا متن ہندوستان میں درسیات میں شامل ہے۔ مولانا نے اس پر شرح لکھی۔ [۵] تہذیب المنطق والکلام۔ مولفہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ انتہائی مختصر کتاب ہے اور دو فنون پر مشتمل ہے مگر اس کا فن منطق کا حصہ بہترین اور بہت مشہور ہے اس متن پر بہت سے علماء نے شرحیں لکھی ہیں منجملہ ان کے علامہ جلال الدین محمد بن اسعد دوانی متوفی ۹۰۷ھ کی ایک نامکمل شرح ہے۔ اس کے بعد فاضل شہیر ابو الفتح سعیدی متوفی ۹۵۰ھ نے اس پر مکمل شرح تحریر کی۔ دوسری شرح مولانا کی ہے۔ تیسری شرح ایزدی۔ عبداللہ بن شہاب الدین حسین الیزدی الشہابادی، الشیعی نزیل بغداد متوفی ۱۰۱۵ھ اور مشہور ۹۸۱ھ ان کی شرح کا نام تحفۃ الشاہجہانیہ فی شرح التفتازانیہ ہے۔ (ہدیۃ العارفین، کشف الظنون)

(۳۳)

ملّا نظام الدین قدس سرہٗ

آپ ملّا قطب الدین سہالوی شہید طاب ثراہ کے سعادت مند صاحبزادے ہیں۔ استادِ جہاں اور معلم وقت تھے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں آپ نے علم کی تلاش میں مشرق کے بہت سے قصبات کا سفر کیا۔ اور اس زمانہ کے اہلِ فن اور علماءِ متبحرین سے درسی کتابیں پڑھیں۔ آخر میں حضرت شیخ غلام نقشبند لکھنوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بقیہ تمام درسی کتابیں ان سے پڑھیں۔ اور فارغ التحصیل ہو کر لکھنؤ میں ہی قیام پذیر ہو گئے۔ ساری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذاری اور بڑی عزت و شہرت کے مالک ہو گئے۔ آج بھی ہندوستان کے اکثر مقامات کے بہت سے علماء کرام ملا نظام الدینؒ قدس سرہٗ سے شاگردی کا تعلق رکھتے ہیں اور اس نسبت پر فخر کرتے ہیں اور جس شخص کی شاگردی کا تعلق کسی واسطہ اور سلسلہ سے آپ کی ذاتِ گرامی تک پہونچتا ہے وہ علماء و فضلاء کی جماعت میں بہت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے دینی درسی کتابیں کسی اور درسگاہ میں ختم کیں لیکن آخر میں ملا نظام الدینؒ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اور آپ کے ہاتھ سے دستارِ فضیلت سر پر باندھی۔ حضرت ملا نظام الدین قدس سرہٗ حضرت شیخ عبدالرزاق بانسویؒ کے مرید ہیں۔ اس کے علاوہ میر سید اسمٰعیل بلگرامی خلیفہ شیخ عبدالرزاق بانسویؒ سے بھی حقیقت و معرفت کی کافی تعلیم حاصل کی اور فیوض و برکات حاصل کیے۔ حکیم صدرائے شیرازی کی شرح ہدایت حکمت کا حاشیہ اور شرح مسلم الثبوت آپ کی مشہور تالیفات ہیں۔

فقیر کو بھی خوش نصیبی کے باعث لکھنؤ میں ایک بار ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ کو حضرت ملّا نظام الدین قدس سرہٗ کی ہم نشینی اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آپ کا طریقہ بھی سلف صالحین کا تھا۔ آپ کے تقویٰ اور تقدس کی تابانی آپ کی مبارک پیشانی سے ظاہر ہو رہی تھی۔

۹ رجمادی الاوّل چہار شنبہ کے دن ۱۱۶۱ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ مزار مقدس لکھنؤ میں موجود ہے۔ راقم سطور (یعنی مصنف کتاب میر غلام علی آزاد بلگرامی) نے تاریخ وفات اس طرح کہی ہے۔

عالم کامل امام عصر استاد جہاں — طائر روحش بہ سیر جنت الماویٰ شتافت
سال تاریخ وفات او بہ طور تعمیہ — گفتہ شد ملا نظام الدین دل فردوس یافت

ان اوراق کے قارئین اور عالم النفس و آفاق کے حقائق کے متلاشی حضرات پر یہ بات پوشیدہ نہ ہے۔

کی پورب کی سرزمین قدیم زمانہ سے علم اور علماء کرام کا معدن و مخزن رہی ہے۔ تاریخ سیر الاولیاء کے مصنف سید محمد کرمانی[1] جو حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین[2] اولیا قدس سرہ کے مرید ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "مولانا فرید الدین[3] شافعی اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ اور مولانا علاء الدین[4] نیلی اودھی حضرت شیخ الاسلام کے پاس تفسیر کشاف پڑھتے تھے۔ مولانا شمس الدین یحیٰ اور دوسرے علماء اودھ سامعین میں شامل ہوتے تھے۔

مولانا شمس الدین یحیٰ کا ترجمہ اس فصل کی ابتداء میں گذر چکا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام صوبے ان علمائے متبحرین کی ذات پر فخر کرتے ہیں۔ خصوصاً شاہان ہند کا دارالخلافہ "حصار" جہاں ہر فن کے باکمال علماء و اوباء مشاہیر جمع ہیں اور جہاں ہر دور کے بلند پایہ مفکرین اور دانشوروں نے اپنی علمی اہلیت کے سبب معقولات اور منقولات اور دوسرے تمام مروجہ علوم و فنون کو بام کمال پر پہونچا رکھا ہے۔ لیکن ان تمام مقامات میں اودھ اور الٰہ آباد کے دو صوبے وہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ جو ہندوستان کے کسی اور صوبے میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً علاقہ اودھ کے پورے صوبہ میں اور صوبہ الٰہ آباد کے اکثر مقامات میں تقریباً ۵ کوس سے ۱۰ کوس کے فاصلہ تک امن شرفا کی آبادی ہے۔ جن کو سلاطین وقت اور حاکمان عصر کی طرف سے وظیفے جاگیریں اور زمین ان کی مدد معاش کے طور پر ملی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجدیں، درسگاہیں اور خانقاہیں بھی بنادی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے مدرسین اور معلمین نے دانشوروں اور حوصلہ مندوں کے لیے علم و فن کے دروازے کھول رکھے تھے۔ اور شائقین علم کے لیے ان درسگاہوں میں داخلہ کی عام اجازت تھی۔ علم کے شیدائی اپنے اپنے شہروں سے وہاں جوق در جوق پہونچتے تھے۔ جس طالب علم کو جہاں سہولت نظر آتی تھی وہاں پہنچ کر گوہر مراد سے اپنے دامن کو بھرتا تھا۔ ہر آبادی کے حوصلہ مند اور اہل توفیق لوگ ہر طالب علم پر اپنی خاص توجہ کی نظر رکھتے تھے۔ طالبان علم کی خدمت اور امداد کو بہت بڑی نیکی اور اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

---

[1] سید محمد بن سید مبارک بن سید محمد کرمانی ہندی معروف بہ امیر خورد۔ بچپن ہی میں حضرت سلطان المشائخ کے مرید ہو گئے تھے۔ اور شیخ کی بعض مجلسوں میں شریک ہوئے۔ شیخ کے بعد ان کے خلفاء کی خدمت میں بھی رہے اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ) سے تربیت حاصل کی۔ آپ کے والد، چچا اور جد امجد، شیخ کے خصوصی خدام میں تھے۔ اپنی کتاب سیر الاولیاء میں انھوں نے جو کچھ تحریر کیا ہے۔ اس میں اکثر اپنے بزرگوں سے سماعت کیا ہے۔ ان کی کتاب جس میں دس باب ہیں شیوخ چشتیہ کے تذکروں میں معتبر ہوتی ہے۔ دستوری، ہدیۃ العارفین، اخبار الاخیار) [2] محمد بن احمد بن علی البخاری ملقب بہ نظام المشائخ محبوب الٰہی متوفی ۷۲۵ھ (تذکرہ رحمان علی، تقصار، تاریخ مشائخ چشت)

[3] مشاہیر علمائے اودھ میں سے تھے۔ علم نحو، لغت عربیہ میں بے مثل تھے۔ بڑے بڑے مشائخ اور علماء نے ان کی شاگردی کی ہے۔ ۷۳۵ھ ۱۳۳۵ء میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)۔

[4] علمائے اودھ میں سے تھے۔ مولانا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ کی خدمت میں تفسیر کشاف پڑھی۔ حضرت محبوب الٰہی کے مرید و خلیفہ تھے۔ (اخبار الاخیار، تذکرۂ رحمان علی، تقصار امیر قنوجی، تاریخ مشائخ چشت)

صاحب قِران ثانی یعنی شاہ جہان بادشاہ (انار اللہ برہانہ) فرمایا کرتے تھے کہ "میری سلطنت کا مشرقی علاقہ خیرلز ہے"۔

علم وفن کا بازار ۱۱۳۰ھ کے اواخر تک اس سرزمین میں گرم رہا۔ مشاہیر علماء کی کثرت اس دور میں عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری، محمد شاہ[1] کی تخت نشینی کے ابتدائی دور میں اودھ کے صوبہ کا حاکم ہو گیا۔ اور صوبۂ الہ آباد کے خاص خاص شہر مثلاً جونپور، بنارس، غازی پور، کڑہ مانک پور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ اس کے دائرہ حکومت میں شامل ہو گئے۔ شرفاء کے خانوادوں کی جدید وقدیم تمام جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ اور شرفاء کے تمام خاندان پریشانی اور تباہی میں مبتلا ہو گئے۔ بالآخر ان مقامات کے شرفاء کی اقتصادی بدحالی اور مالی پریشانی اُن کی جہالت اور علم سے محرومی کا باعث بن گئی اور حصولِ معاش کے لیے وہ لوگ سپاہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبوراً مائل ہو گئے۔ نتیجتہً علم حاصل کرنے کا رواج اور شوق بہت کم ہو گیا۔ جو دورِ قدیم زمانہ سے علم وفن کے مرکز تھے۔ اب تباہ حالی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ علماء وفضلاء اور اہل کمالات حضرات کی اکثر محفلیں درہم برہم ہو گئیں: انا للہ وانا الیہ راجعون "برہان الملک کے انتقال کے بعد اس کا ہمشیرہ زادہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ اس کا جانشین ہوا۔ مگر شرفاء کے خاندانوں کے وظیفے اور جاگیریں بدستور سابق بندہی رہیں۔

محمد شاہ کے آخری دور میں یعنی ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کی صوبہ داری بھی صفدر جنگ کے سپرد ہو گئی اور اس صوبہ کے کچھ آخری وظیفہ خوار جو ابھی تک ضبطی کی آفت ومصیبت سے محفوظ تھے، ضبطی کی زد میں آ گئے۔

احمد شاہ[2] کے زمانہ میں صفدر جنگ ترقی کر کے وزیراعظم کے عہدہ پر فائز ہو گیا اور صوبہ کے نائب نے وظیفہ پانے والے خانوادوں کو اور تباہ وبرباد کر دیا۔ چنانچہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک یہ صوبے حادثۂ آشوب زمانہ کی زد میں طرح طرح کی بربادیوں کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ "لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا"

ان اقتصادی بدحالیوں اور مالی خرابیوں کے باوجود تمام علوم متداولہ خصوصاً فلسفہ ومنطق کا رواج اور عروج جس انداز ورفتار سے ان صوبوں میں (الہ آباد اور اودھ) ہوا۔ تمام ہندوستان میں اس کی نظیر کسی اور صوبے میں نہیں ملتی۔ چنانچہ الہ آباد اور اودھ میں ایسے علماء متبحرین آج بھی موجود ہیں جو علم وفضل کے بلند درجہ پر

---

[1] محمد شاہ۔ ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ بادشاہ غازی ولد جہان شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ سترہ سال کی عمر میں ۱۱۳۱ھ میں بمقام آگرہ (اکبرآباد) تخت شاہی پر بیٹھا۔ محمد شاہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کے عہد میں نواب برہان الملک سعادت خاں صوبۂ اودھ کا ناظم مقرر ہوا اور ۱۱۵۱ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات "سعادت تمک حرام بُرد" اس کے انتقال کے بعد نواب منصور علی خاں جو اس کا داماد تھا۔ نواب صفدر جنگ کے خطاب سے مسند امارت پر بیٹھا۔ محمد شاہ نے ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی (مفتاح التواریخ)۔

[2] محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مجاہد الدین محمد ابوالنصر احمد شاہ بہادر بادشاہ غازی سریر آرائے سلطنت ہوا (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) اور خلعت وزارت نواب صفدر جنگ کو اور میر بخشی گری صلابت خاں ذوالفقار جنگ کو مرحمت کی اور ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی۔ (مفتاح التواریخ و ماثر الکرام)

فائز اور ممتاز ہیں۔ اودھ کے صوبہ میں بلگرام کا خطہ قدیم زمانہ سے ممتاز علمائے کرام اور فاضلین عظام کا مرکز رہا ہے۔ بہت سے باکمال دانشور اس شہر میں پیدا ہوتے۔ جنہوں نے بڑی خوبی اور شان کے ساتھ تعلیمی درسگاہیں قائم کیں۔ لیکن کسی حوصلہ مند کو ان ارباب کمال کے حالات سے استفادہ کی توفیق نہیں ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری کم حوصلگی کے باعث زمانۂ قدیم کے بہت سے اسلافِ باکمال گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ گئے۔ ان میں بہت ہی کم تعداد ایسے باکمال حضرات کی ہوگی۔ جن کو تاریخ کے صفحات میں جگہ دی گئی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے اہل قلم حضرات نے اپنی خاص توجہ صرف مشائخ طریقت اور اولیائے کرام کے حالات محفوظ کرنے کی جانب مبذول رکھی اور علماء اور باکمال دانشوروں کے حالات ضبط تحریر میں لانے کی طرف بہت کم توجہ کی چنانچہ اس موضوع پر نہ تو سابقہ اہل قلم کی کوئی تصنیف دیکھنے اور سننے میں آئی اور نہ ہی موجودہ ارباب قلم کی کوئی کتاب موجود ہے "عین العلم" نام کی کتاب اس بات کی ایک روشن اور واضح دلیل ہے۔ کہ اس کے مصنف ایک جلیل القدر عالم وفاضل اور متقی تھے۔ سب سے زیادہ صحیح قول کے مطابق وہ ہندوستانی تھے۔

حضرت ملا علی قاری "عین العلم" کی شرح میں فرماتے ہیں۔

هو من فضلاء الهند وصلحائهم على ما صرح به الشيخ ابن حجر العسقلاني في شرح مقدمته[1]

ہندوستان کے مورخوں میں سے کسی نے ان کے حالات نہیں لکھے۔ ان کی اس قدر بلند پایہ تصنیف موجود ہوتے ہوئے بھی گویا ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر بلگرام کے علماء و فضلاء کے حالات جیسا چاہیے نہیں ملے۔ مجبوراً میں نے "فان لم یصب وابل فطل" کے مضمون پر عمل کیا۔ پس جو کچھ معتبر کتابوں میں مختصر طور پر نظر آیا اور جو کچھ معتبر راویوں سے سنا گیا اسی کو میں نے لکھ لیا۔ ان تمام بزرگوں کے نام نامی جو تمام ظاہری و باطنی علوم کے مرکز و مخزن تھے اس کتاب کی فصل اول میں بیان کردیے گئے ہیں۔ اس موجودہ فصل میں بھی چند ایسے بزرگ اور باکمال حضرات کے احوال و اوصاف اور فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ جو اپنے کمالات کے باعث کافی شہرت رکھتے ہیں۔ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی مرحوم اپنی مثنوی "امواج الخیال" میں شہر بلگرام کے ایسے باکمال فضلاء کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

---

[1] مطبوعہ اور کشف میں اسی طرح تحریر ہے جیسا کہ ابن حجر نے اپنے مقدمہ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور اتنا اور زیادہ کیا ہے۔ وقیل انه منسوب الى بعض فضلاء بلخ، واللہ اعلم۔ ہدیۃ العارفین میں ہے "محمد بن عثمان بن عمر بلخی حنفی ہندی نحوی متوفی ۸۳۰ھ انھوں نے عین العلم تصنیف کی۔ اور امام غزالی کی احیاء العلوم" کا اختصار کیا۔ یہ کتاب لاہور میں طبع ہوئی ہے اور اس پر اس کے مؤلف کا نام موجود ہے۔ اور میں نے اس کا ایک نسخہ اپنے ایک بھائی کے پاس دیکھا ہے جس پر تالیف محمد بن عثمان کے الفاظ تحریر تھے۔

دقت منشان نکتہ پرواز	در ہر سر کوچہ اش سخن ساز
بلگرام کے دقت پسند نکتہ پرداز حضرات نے	ہر موضوع پر گفتگو کی ہے (اسکے ہر کوچہ پر کلام کیا ہے)
بشگافتہ ہر یکے بتحقیق	از دقت نظر مغز تدقیق
ان حضرات میں سے ہر ایک نکتہ پرداز نے تحقیق	اور دقت نظر سے تحقیق و تدقیق کے مغز نغز کو کھولا ہے
بر ابروے خود نمودہ واجب	تنقیح اصول ابن حاجب
اپنی ذات پر ہر ایک نے واجب کرلیا تھا	کروہ اصول ابن حاجب کی تنقیح و تصریح کرے گا۔
بر خویشتن شمردہ فرض چوں دین	توضیح رموز حکمت العین
اپنے لیے انھوں نے قرض دین کی طرح لازم کرلیا تھا	کر وہ "حکمت العین" کے رموز کی تشریح کریں گے
ابروے بیان شان رفیع است	مفتاح معانی بدیع است
چنانچہ اس سلسلہ میں ان ارباب کمال کا بیان بہت بلند	اور رفیع ہے اور معانی نادرہ کی کلید ہے
ہر بحث کہ دل کند بعد غور	در حیز حل کشند فی الفور
ہر وہ بحث جس میں دل کو ہزاروں غور و فکر سے کام	لینا پڑتا ہے اس کو وہ ذرا سی دیر میں حل کردیتے ہیں
از منطق شان خطا نفور است	تصدیق بحکم شان ضرور است
ان کی منطق خطا سے پاک و مبرا ہے	ان کے حکم کی تصدیق کرنا ضروری ہے
ہر فرد یگانۂ اماثل	شیرازۂ نسخۂ فضائل
ان میں سے ہر فرد، فرد یگانہ و یکتا تھا	اس کی ذات فضائل کمالات کے نسخہ کا شیرازہ تھی
دانائے حقائق کیانی	اشراقی حکمت یمانی
ان میں سے ہر ایک حقائق کیانی کا جاننے والا	اور حکمت اشراقی پر عبور رکھنے والا تھا

---

(۳۴)

سیّد رفیع الدین بلگرامی قدس سرہٗ

آپ سید محمد صغری کی اولاد میں سے ہیں۔ اور آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: سید رفیع الدین بن سید بدر الدین بن سید تاج الدین جو محلہ سید وارہ بن سید حسین کے چار قبیلوں میں سے ایک قبیلہ کے جدامجد اور مورث اعلیٰ ہیں۔ سید حسین جو سید دولارہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب سید دولارہ بن سید حسن بن سید محمود بدہن بن سید بدہن بن سید جمال الدین بن سید ابراہیم

بن ناصر بن سید سالار بن سید محمد صغریٰ قدس سرہٗ تک پہونچتا ہے۔ جن کا بیان پہلی فصل میں گزر چکا ہے۔
سید رفیع الدین اپنی نوجوانی کے زمانہ میں تحصیل علم کی غرض سے اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر باہر نکلے اور علم ادب و تفسیر، فقہ و حدیث، اصولِ فقہ و اصولِ حدیث اور منطق و فلسفہ وغیرہ تمام علوم میں کمال حاصل کر لیا۔
کمال علمی کے ساتھ ساتھ حسنِ عمل کے زیور سے بھی خود کو آراستہ کیا۔ اور آخر میں آپ نے اپنے مبارک قدموں کی برکت سے دوبارہ اپنے عزیز وطن بلگرام کو "عاد القمرالی ابراجہ" کے مصداق روشن اور تاباں فرمایا پھر تمام عمر وطن مالوف میں مقیم رہ کر طالبان علم کو اپنی ہدایت و تعلیم کے ذریعہ درجۂ کمال تک پہونچاتے رہے۔ فن کتابت میں بھی آپ کو اچھی مشق و مہارت حاصل تھی۔ آپ کی تحریر نہایت عمدہ اور دلکش ہوتی تھی۔ اپنی درسی کتابوں کو ختم کرنے سے پہلے ہی اپنے قلم سے . . . . تحریر فرما لیتے تھے آج بھی بہت سی کتابیں مثلاً مطول، تلویح اور اصول وغیرہ آپ کے نستعلیق اور خوش نما خط میں موجود ہیں۔ ہر ایک کتاب پر آپ نے شروع سے آخر تک حاشیہ لکھ کر اپنی علمی فضیلت اور استعداد کی ایک روشن دلیل بطور یادگار چھوڑی ہے۔ تلویح کے آخر میں آپ نے اپنے خاص خط میں یوں تحریر فرمایا ہے:۔

قد تم الفراغ من تسوید ہذہ النسخة الشریفة المسماة بالتلویح فی شرح التوضیح بملاسة استاذی العلامة انا نعم للخاصة والعامة اعلم العلماء واکمل الاتقیا حامی اهل الشرع والایمان ماحی آثار الظلم والطغیان الحضرة العلیة شیخ حسین بن شیخ داؤد متع اللہ الطالبین بطول بقائه فی افضل الایام یوم الجمعة الثامن عشر من شهر ربیع الاول سنة خمس وتسعین وتسع مائة مالکه وکاتبه ۱۸ ار ربیع الاول ۹۹۵ھ رفیع الدین بن بدالدین بن تاج الدین بن الحسین الحسینی والمأمول من القارئین لهذا الکتاب والمستفیدین به ان یذکروا الکاتب المذنب فی اوقاتهم الشریفة بدعاء الخیر وسلامة الایمان واللہ سبحانه هوالمستعان ؎

۳۵

سید حسین قدس سرہٗ

سید حسین بن سید نوح عرف سید پیارہ بن سید محمود اکبر قدس سرہٗ۔ سید محمود اکبر کے حالات براہ راست اور سید محمد نوح کے احوال اس کے ضمن میں پچھلی فصل میں گذر چکے ہیں سید حسین بہت بلند پایہ سادات کے

خاندان سے تھے اور اپنے علمی کمال کے اعتبار سے بھی اپنے زمانہ کے ممتاز علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ نہایت عالی حوصلہ اور بلند کردار بزرگ تھے۔ آپ کے اخلاق حسنہ کے پیش نظر آپ کو "انک لعلی خلق عظیم" کا مظہر یا نمونہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ان تمام ظاہری اوصاف کے ساتھ ساتھ آپ بہت متقی بھی تھے۔ اس کے باوجود آپ نہایت عاجزی، انکساری اور خاکساری کے ساتھ زندگی گذارتے تھے۔ آپ نے طویل عمر پائی۔ ابتداء سے زندگی کے آخری ایام تک آپ اپنے وطن عزیز ہی میں مقیم رہے اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ کتب بینی اور عبادت الٰہیہ ہی آپ کے وہ مشاغل تھے۔ جن میں آپ مشغول رہ کر اپنی زندگی کو ہمیشہ سنوارتے رہے۔ ایک قبالۂ شرعیہ میں سید حسین اور ان کے بھائی سید حسن کے دستخط دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ سید حسن کا تذکرہ آئندہ اوراق میں آئے گا۔ تاریخ تحریر قبالہ ۱۰۰۰ھ ہے۔

۳۶

سید حسن (برادر اعیانی سید حسین مذکور) رحمۃ اللہ علیہ

آپ ایک عالم باعمل اور باکمال فاضل تھے۔ فقہ حنفی کے جزئیات پر آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی، فقہ کی کتاب قدوری[1] پر شروع سے آخر تک آپ کا ہی تحریر کردہ حاشیہ ہے جو آج بھی موجود ہے۔ اپنے زمانہ کے علماء و فضلاء کے درمیان ایک امتیازی شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی ساری زندگی وطن ہی میں گذاری شعبان المعظم کی نویں تاریخ کو آپ نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

۳۷

قاضی اللہ داد قدس سرہٗ

بلگرام کے فرشوری شیوخ میں سے ہیں آپ محلہ سید واڑہ کے رہنے والے ہیں۔ سلسلۂ نسب

---

[1] جزئیات حنفیہ کی ایک مختصر کتاب ہے جو ابو الحسین احمد بن محمد القدوری بغدادی حنفی متوفی ۴۲۸ھ معروف بہ "قدوری" کی تصنیف ہے اور اس کو "الکتاب" بھی کہتے ہیں۔ فقہ حنفی کا یہ متن معتبر بھی ہے اور درسیات میں شامل ہے بعض شارحین کے قول کے مطابق بارہ ہزار مسائل پر مشتمل ہے اس کی متعدد مشہور شرحیں ہیں۔ جن میں ایک شرح ابو بکر علی معروف بہ حدادی (۸۰۰ھ) کی ہے جو "الجواہر المنیرہ" کے نام سے موسوم ہے۔ الجواہر المنیرہ شرح السراج الوہاج کی مختصر ہے اور یہ شرح غیر معتبر ہے (کشف الظنون) قدوری کی شرحوں میں سب سے معتبر شرح ہے یہ ایک ایسی شرح ہے کہ خود اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں اور فقہ حنفیہ کا وہ آج بھی ماخذ و مستند ہیں۔ مترجم ماثر الکرام۔

قاسم[1] بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک پہونچتا ہے۔ بلگرامی قریشیوں کے بہت سے خاندان اور بہت سی شاخیں ہیں۔ شہر کے تمام شرعی عہدے بہت قدیم زمانہ سے اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عہدۂ قضاۃ کچھ دنوں سے عثمانی شیلوخ میں بھی منتقل ہوگیا ہے۔ لیکن عدالت کا عہدہ اور قاضی کا لقب خاص طور پر قاضی اللہ داد کے خاندان میں باقی ہے۔ جب اپنے زمانہ میں قاضی اللہ داد سیارۂ مشتری کی طرح عروج وترقی کے آسمان پر چمکے تو انھوں نے قضا کا عہدہ قاضی کمال عثمانی سے واپس لے لیا جو ان کے بزرگوں کے زمانہ سے عثمانی خاندان میں چلا آرہا تھا۔ وہ نہایت دینداری کے ساتھ اس بلند مرتبہ عہدہ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہاں تک کہ قاضی محمود ابن قاضی کمال نے بادشاہ اکبر کے دربار میں پہونچ کر عروج وترقی حاصل کی اور وزارت کے بلند عہدہ پر پہونچ گئے۔ ۲ رشوال ۱۰۰۱ھ کو عہدۂ قضا کے تمکن کے لیے اپنے والد کے نام حکم شاہی جاری کراکے اپنے آبائی منصب کو حاصل کرلیا۔ یہ منصب آج تک ان کی اولاد کے لیے مخصوص ہے لیکن فضل خداوندی دیکھئے کہ قاضی کا لقب اسی وقت سے قاضی اللہ داد کے خاندان میں مشہور ہوگیا۔ آپ تفقہ، تقویٰ اور دیانتداری کے اعتبار سے اپنے وقت کے امام ابو یوسف تھے۔ اوائل عمری ہی سے آپ کے اندر علم وہنر کا ذخیرہ جمع کرنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ توفیق الٰہی کی رہنمائی سے آپ نے طلب علم کی منزل طے کرلی۔ اور شاہ عبدالرحمٰن جانباز لاہر پوری[3] کی نگاہ التفات سے علوم متداولہ کی تکمیل کی اور ان سے تربیت حاصل کی پھر واپسی کی اجازت پاکر بلگرام لوٹ آئے اور عہدۂ قضا کی مسند پر بیٹھ کر راست بازی اور درست کرداری کو اپنا شعار بنالیا۔ دور دراز کے سائلین حصول فتویٰ کے لیے آپ کے پاس آتے تھے اور اپنا حق حاصل کرتے اور فتنہ وفساد کے دفع کرنے کے لیے آپ کو اپنا وسیلہ بناتے تھے۔ قاضی صاحب جب حکومت کے کام سے فارغ ہوجاتے تو درس وتدریس کی جانب توجہ کرتے اور اپنے علم وفضل کے انوار وفیوض سے حلقۂ درس کو روشن فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ "تہذیب المنطق" کا ایک نسخہ میرے ہاتھ لگا۔ کتاب کے حاشیہ پر قاضی صاحب کی تحریر کردہ ایک تشریح نظر آئی۔ جو ان کے جوہر پرجستگی اور جودت طبعی کا پتہ دیتی تھی بعض شرعی احکام وقوانین کی دستاویزات پر آپ کے دستخط بھی دیکھے گئے ہیں۔ دستاویز کی تاریخ تحریر ۲۸ رشعبان المعظم ۹۹۹ھ ہے[4]۔

---

[1] مدینہ منورہ کے سات فقہا میں سے ایک ہیں اور تابعین کے سرداروں میں ہیں ۱۰۸ھ میں وصال ہوا۔

[2] ابوالفتح قاضی کمال الدین بن بندگی قاضی عبدالدائم عرف دادے دائم خلف الصدق قاضی محمود اللہ داد۔ قاضی کمال کی ولادت ۹۱۷ھ میں ہوئی۔ اپنے والد کی حیات میں ہی عہدۂ قضا پر متمکن تھے۔ قاضی کمال نے ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ خطۂ بلگرام)

[3] بن علاء الدین عباسی شاگرد عبداللہ بن اللہ داد عثمانی ۹۶۷ھ میں وصال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر)

[4] سال ولادت ۹۱۷ھ سال وفات ۱۰۰۱ھ ہے آپ کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی ملا شیخ فیروز عثمانی نے یہ تاریخ وفات کہی ہے۔

صبر بہتر از یں ملال، مثال ۱۰۰۱ھ

(مفتاح التواریخ)

۳۸

قاضی عنایت اللہ قدس سرہٗ

آپ قاضی اللہ داؤدؒ کے فرزندِ سعید ہیں۔ آغاز تعلیم سے تحصیل علم کی آخری منزل تک آپ نے اپنے والد ماجد ہی کی شاگردی میں رہ کر علم وفضل میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ شہر کے مفتی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آپ نے اس بلند منصب کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے۔ جب میر سید طیب بن میر عبد الواحد اکبر بلگرامی قدس اللہ اسرارہما دہلی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ تو آپ نے قاضی عنایت اللہ کو ان کی خواہش وگذارش کے مطابق حضرت شیخ عبد الحق دہلوی قدس سرہ کا مرید کرا دیا۔ اوران کے شجرہ کا سلسلہ قاضی عنایت کی اس ارادت سے حضرت شیخ قدس سرہ کے بزرگوں سے مل گیا۔

۳۹

شیخ کمال بن مکرم قدس سرہٗ

آپ بلگرام کے شیوخ فرشوری میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ ان آراضیات موقوفہ کے متولی کے منصب پر فائز تھے جو زمانۂ قدیم سے آپ کے خاندان کے لیے بطور مدد معاش جاگیریں مقرر تھیں۔ اور آج ہمارے اس زمانہ تک بدستور باقی ہیں۔ اس خاندان میں بڑی تعداد میں علماء و فضلاء پیدا ہوئے۔ شیخ کمالؒ خصوصیت کے ساتھ آسمانِ کمالات کے بدر منیر اور اپنے زمانہ کے علماء و فضلاء میں ممتاز و بے نظیر تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ علامہ جرجانی اور تفتازانی کی بہترین یادگار تھے۔

آپ نے باوجود صاحبِ امارت ہونے کے اپنی زندگی کی ابتداء سے آخر وقت تک ساری عمر علم دین کی خدمت میں گذار دی۔ آپ نے زندگی کے مبارک دنوں کو ان چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دن کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے، دوسرا حصہ طالبین کو علم دین کی تعلیم دینے کے لیے تیسرا حصہ تصنیف وتالیف کے لیے اور چوتھا حصہ اعزا اور احباب کے حقوق کی ادائیگی کے لیے وقف تھا۔ آپ کا خط نسخ بہت ہی عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ آپ نے صرف ونحو، منطق وفلسفہ، معانی وبیان، فقہ واصول فقہ اور تفسیر وغیرہ کی بہت سی درسی کتابیں خود اپنے ہاتھ سے لکھیں اور ہر کتاب پر شروع سے آخر تک اس انداز و اہتمام سے حاشیہ لکھا کہ کتاب کی اصل عبارت کی اور شرح کو مزید تشریح اور حاشیہ کی ضرورت

باقی نہیں رہی۔ تاکہ ان کتابوں کو آسمانی اور ربانی کتابوں کا نمونہ کہا جا سکے۔ اس لیے کہ ان تمام کتابوں میں جو آپ نے تحریر فرمائی تھیں کہیں ایک حرف اور نقطہ کی غلطی بھی نہیں پائی جا سکتی۔

خدا کی قسم اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے قلم مشکبار کی مدد سے اپنی قبر پر ایسے ایسے عجیب وغریب پودے لگا رکھے ہیں جن کی خوشبوئیں قیامت کی صبح تک انھوں نے اپنے دماغ کو تروتازہ رکھنے کے لیے وقف کر لی ہیں۔ اس لیے کہ تمام دینی مدرسے آپ کی لکھی ہوئی ان کتابوں سے ہر زمانہ میں فیض اٹھاتے اور آپ کے حق میں دعائے خیر کرتے اور آپ کی روح کو ثواب پہونچاتے رہیں گے۔ آپ کی تحریر کردہ مذکورہ بالا کتابیں زمانہ کے انقلابات کی وجہ سے آجکل آپ کے کتب خانہ سے نکل کر ادھر ادھر منتشر ہو گئی ہیں۔ ان کتابوں میں سے کچھ تو بلگرام میں جگہ جگہ پر موجود ہیں اور کچھ دوسرے مقامات پر پہونچ گئی ہیں[1]۔

بعض شرعی دستاویزات اور مقالات سے یہ واضح ہوا کہ حضرت شیخ کمال ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے ان کے مرثیہ کے بارے میں بھی ایک شعر نظر آیا جو مندرجہ ذیل ہے۔

درد او حسرتا کہ زوال کمال شد ∴ برطالباں حیات دو وزہ وبال شد

۴۰

شیخ عبد الکریم بلگرامی قدس سرہٗ

آپ خانوادہ شیخ کمال میں نہایت دانشور اور بلند مرتبہ تھے۔ اپنے خاندان کی موقوفہ جائیداد کے متولی بھی تھے۔ کم سنی میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اس کے بعد اپنے خاندان ہی کے علماء سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ فلسفہ ومنطق، صرف ونحو، فقہ وحدیث، تفسیر، اصول تفسیر، اصول فقہ وغیرہ تمام مروجہ علوم وفنون میں آپ مرتبہ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ زبان عربی میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ ایک یگانۂ روزگار کی حیثیت سے آپ مشہور تھے۔ کتاب "مقامات حریری" تو آپ کو زبانی یاد تھی۔ اس کے ساتھ ہی عربی زبان کے آپ اچھے انشاء پرداز تھے۔ استاد المحققین میر طفیل محمد نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ شیخ عبد الکریم نے تین دن کی مدت میں میرے لیے "شمسیہ" جیسی کتاب کا حاشیہ لکھ ڈالا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انھوں نے "مقامات حریری" کے طرز پر خود بھی کچھ مقالے لکھے تھے اور "مقامات حریری" پر فارسی میں شرح بھی آپ نے لکھی۔ بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں آپ نے دنیائے فانی سے کوچ فرما کر عالم جاودانی کی راہ لی۔

---

[1] آپ نے بایں فضل وکمال کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔

۴۱

مولوی شیخ عبدالغفور قدس سرہٗ

آپ شیخ عبدالکریم مذکور کے اعیانی برادر خورد ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور اور ممتاز ترین عالم تھے۔ آپ نے اپنے خاندان کے بزرگوں اور دوسرے صاحبان فن اساتذہ سے علمی کمالات حاصل کیے اور تمام مروجہ علوم میں آپ نے مہارت تامہ حاصل کرلی۔ اور اس کے بعد ساری عمر طالبان علم کو اپنے فیوض وبرکات سے مالامال کرتے رہے۔ بہت سے شاگردوں کو درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ استاد المحققین میر محمد طفیل نوراللہ مرقدہٗ نے مولوی شیخ عبدالغفور کی خدمت میں اصول بزدوی پیش کی استاد المحققین فرماتے تھے۔ کہ مولوی عبدالغفورؒ نے مجھ سے متعدد بار کہا کہ فلسفیوں کی کتابیں مطالعہ کرنے کی وجہ سے میرا میلان اس گروہ کے مذہب کی جانب ہوگیا تھا اور مدتوں تک میں اس بیابان میں سرگرداں پھرتا رہا۔ کہتے تھے کہ ایک دن میں اسی خیال میں غلطاں تھا کہ اسی رات میں خواب میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چند باتیں ارشاد فرمائیں۔ جس سے شک و شبہ کا جو زنگ میرے آئینۂ دل پر چڑھ گیا تھا اور جو کدورت اس پر بیٹھ گئی تھی آپ نے اس کو دور فرمایا۔ اور دین اسلام کی حقیقت روز روشن کی طرح مجھ پر واضح ہوگئی میں اس رب غفور کے اس احسان عظیم کا انتہائی شکرگزار ہوں۔

"منشآت جامع القوانین" جو مکاتب و مدارس میں بہت زیادہ رائج ہے اس کے مصنف بھی مولوی شیخ عبدالغفور کے شاگرد ہیں۔ جن کا نام خلیفہ شاہ محمدؒ ہے۔ خلیفہ شاہ محمد ایک عرصہ تک بلگرام میں اقامت گزیں ہوکر مولوی شیخ عبدالغفور کی صحبت سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہے۔ آپ کا قیام میر سید اسمٰعیل فاضل کے مکان میں تھا جن کا ذکر آئندہ اوراق میں کیا جائے گا۔

اُن کے مضامین میں ایک خط مولوی شیخ عبدالغفور کے نام سے بھی مندرج ہے۔ اگرچہ اس خط کی عبارت کوئی خاص بلند پایہ انشاء نہیں رکھتی۔ لیکن یہاں کاتب کی عبارت آرائی نہیں۔ بلکہ مکتوب الیہ کی منزلت کا بیان کرنا مقصود ہے۔

خط کا عنوان یہ ہے۔

"مکتوب سوم در جواب عنایت نامۂ فیض شمامہ قبلہ ارباب فضائل کعبۂ اصحاب فواضل مولوی شیخ عبدالغفور زینت بخش بلگرام لازال معمورًا بالکرام تحریر یافت"

"اور خط کے اندر القاب اس طرح تحریر ہے"

"پیوستہ ذات قدسی صفات آں مجمع فیض سبحانی، منبع علوم روحانی، کاشف دقائق معقول ومنقول، واقف حقائق فروع اصول، مقتدائے کاروان منازل تحقیق پیشوائے رہروان مراحل تدقیق، مدّ اللہ ظلال نوالہ وکمالہ فیض بخش عقیدت آشنایان وہدایت فرمائے عبودیت گرایان باد۔"

---

(۴۲)

شیخ عنایت اللہ قدس سرہٗ

آپ شیخ عبدالکریم بلگرامی کے فرزند سعید ہیں۔ اپنے والد ماجد کی طرح اپنے زمانہ میں سب سے ممتاز اور یگانۂ روزگار رہے۔ اپنے والد اور چند دوسرے مشاہیر سے تعلیم حاصل کی عربی وفارسی، ہندی وسنسکرت، بھاکا اور ہندی موسیقی وغیرہ مختلف علوم وفنون میں آپ نے بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ سات قسم کی "کتابت یعنی خط" کے آپ ماہر ومشاق تھے۔ قرآن حکیم بھی آپ نے حفظ کیا تھا۔ آپ کو حضرت میر سید احمد کاشغی کالپوی قدس سرہٗ سے بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔ سید العارفین میر سید لطف اللہ بلگرامی سے آپ کو خواجہ تاشگی کی نسبت حاصل تھی۔

تزکیۂ نفس، نورانیت قلب اور پاکیزگی اخلاق میں آپ اعلیٰ مقام کے حامل تھے۔ امراء ورؤسا کی صحبت اور ان سے روابط وتعلقات سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے۔ تیر اندیش خاں کنبوہ (عالمگیری) حد سے زیادہ آپ کی عزت کرتا تھا۔ اسی تعلق خاطر کی بنیاد پر وہ کچھ دنوں تک "امادہ" کے مقام پر قیام پذیر رہا۔

آپ کے عجیب وغریب اطوار میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ علی الصباح اٹھ جاتے تھے اور ہندی راگوں میں سے ایک راگ گانے کے بعد فجر کی نماز کا ارادہ فرماتے تھے۔ جس طرح حاکموں کے دربار میں جاتے ہیں۔ اسی طرح لباس فاخرہ پہن کر، ہتھیار لگا کر اچھی سج دھج کے ساتھ نماز کی جانب متوجہ ہوتے تھے، نماز کے ارکان نہایت خضوع وخشوع اور حضور قلب کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ جب آپ سے لوگوں نے اس طرح سج دھج کے ساتھ نماز پڑھنے کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ جب ہم حاکموں، امیروں اور رئیسوں کے دربار میں عمدہ اور پُر تکلف لباس پہن کر ہتھیاروں کو زیب تن کر کے حاضر ہوتے ہیں تو ہم کو خداوند قدوس کے دربار میں جو ہمارا حقیقی اور ازلی بادشاہ ہے۔ اس سے کہیں زیادہ آراستہ ہو کر حاضر ہونا چاہیے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کے مطابق کہ "صفهم في القتال وصفهم في الصلوٰة سواء ظاهرا وباطناً" اپنے کو ہر حالت میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔

نے اس پر عرض کیا کہ کسی دوسرے کے سبق کے موقع پر میرا کام سُن لینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر اس فقیر کی قسمت سے کوئی علیٰحدہ وقت مقرر کر دیا جائے تو اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق کچھ عرض کیا جا سکتا ہے مولوی عبدالحکیم صاحب نے فرمایا کہ ان دنوں عصر و مغرب کے درمیان میرا وقت خالی ہے۔ میں تمھارے سبق کے لیے یہی وقت مقرر کرتا ہوں۔ میر سید اسمٰعیل نے دوسرے روز اسی وقت سبق شروع کر دیا۔ اثنائے درس میں بحث اور گفتگو کا سلسلہ اتنا دراز ہو گیا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ مولوی عبدالحکیم صاحب نے نماز کے بعد درس کی جانب توجہ فرمائی اور نماز عشاء کے وقت تک بحث کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔

مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ گفتگو اور بحث کا سلسلہ ختم ہونے ہی کو نہیں آتا تو فرمایا کہ کل تمھیں اول وقت آ جانا چاہیئے تاکہ ہم دوسرے سبقوں کو بند کر کے کل اسی سبق پر پہلے غور کریں۔ دوسرے دن صبح کو پھر سید اسمٰعیل بلگرامی حاضر ہوئے۔ دوسرے طلبہ بھی حاضر ہوئے۔ چاشت کے وقت سے نصف النہار تک بحث جاری رہی۔ اسی طرح تین دن لگاتار گذر گئے لیکن بحث کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بالآخر مولوی عبدالحکیم صاحب نے سید صاحب سے کہا کہ اس مسئلہ کا حل ایک طرح سے تم پر بھی ظاہر ہو گیا۔ سید صاحب نے عرض کیا کہ ایک حاشیہ نگار نے اس مقام پر اپنا حاشیہ تحریر کیا ہے اور حاشیہ جو خود سید صاحب کی تحریر تھا۔ مولوی عبدالحکیم صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ مولوی صاحب نے اس حاشیہ کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ اس عبارت کا مفہوم اور مطلب نہایت مشکل اور وقت طلب تھا لیکن حاشیہ کی عبارت نے اسکی پوری وضاحت کر دی اس کے بعد مولوی صاحب نے سید صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی سید صاحب نے جواب دیا کہ ملا عبدالسلام دیوہ کی خدمت میں رہ کر۔ مولوی صاحب کو یہ شبہ ہوا کہ ممکن ہے ملا عبدالسلام نے میرے امتحان کے لیے اپنے شاگرد کو بھیجا ہو۔ سید صاحب نے ان کے اس گمان پر قسم کھائی اور کہا کہ اس بات کو حقیقت حال سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور میں محض استفادۂ علمی کے لیے حاضر ہوا ہوں چنانچہ سید صاحب نے بقیہ درسیات کی تمام کتابیں مولوی صاحب کی خدمت میں رہ کر پڑھیں اور فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد ایک مدت دراز تک تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ کچھ دنوں بعد آپ نے نواب نجابت خاں[1] صفوی سے ملاقات کی اور خاص تقرب کا درجہ پایا۔ ملازمت پیشہ ہونے کے باوجود درس و تدریس ہمیشہ معمول رہا۔

کسی موقع پر صاحب قران شاہ جہان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں کی سرکار کے دو بلند رتبہ علماء جن میں سے ایک شیخ اور دوسرے صاحب افغان تھے۔ نواب نجابت خان کے گھر آئے۔ نواب صاحب کی مجلس میں ان کے دربار کے بعض فاضلین سے ان لوگوں کی گفتگو شروع ہوئی۔ نواب نجابت خاں نے اپنے دربار کے علمائے فاضلین کی کم تری کا احساس کر لیا۔ سید صاحب اس وقت مجلس میں موجود نہیں تھے۔ نواب نے فوراً ایک شخص کو سید صاحب کے پاس بھیجا۔ سید صاحب فوراً اسی دم حاضر مجلس ہوئے

۱؎ میرزا شاہ رخ والی بدخشاں کے تیسرے لڑکے تھے۔ شاہجہانی سال میں نجابت خاں کے خطاب اور دو ہزاری منصب سے نوازے گئے۔ عہد عالمگیری میں خان خاناں بہادر سپہ سالار کا اعزاز حاصل ہوا۔ [illegible]ھ میں وفات پائی۔ (مفتاح التواریخ، مآثر الامرا)۔

اور مجلس کے ایک کنارے بیٹھ کر دونوں فریق کی گفتگو سنتے رہے پھر ان دونوں فاضلین سے کہا کہ آپ لوگوں کو میری جانب بھی متوجہ ہونا چاہیئے۔ یہ سنتے ہی دونوں فاضلین نے اپنے بحث کا رُخ سید صاحب کی جانب موڑ دیا۔ میر سید اسمٰعیل نے اپنی شیریں زبانی فصاحت اور مضبوط دلائل سے ان دونوں کو خاموش اور مغلوب کر دیا۔ افغان فاضل نے کج بحثی کا طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے تلوار کھینچ لی۔ سید اسمٰعیلؒ نے بھی وہ تلوار جو نواب کی مسند پر رکھی ہوئی تھی اٹھا کر میان سے باہر نکال لی۔ حاضرین مجلس نے فوراً درمیان میں آکر دونوں کو روکا۔

نواب نجابت خاں، میر سید اسمٰعیل کے مبلغ علم اور شجاعت کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور کہا "ہمارے سید تلوار اور قلم دونوں کے دھنی ہیں" ۔ اور کچھ مدت کے بعد سید اسمٰعیل نے ملازمت چھوڑ دی اور بلگرام آکر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ لیکن طالبانِ علم کے لیے عام اعلان کر دیا کہ جس کو تحصیل علم کرنا ہو وہ بلا تکلف آکر دولت علم سے مالا مال ہو۔ اس طرح زندگی کا بقیہ حصّہ آپ نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں گذار دیا۔

آپ نے ۴، شوال المکرم ۱۱۳۴ھ روز شنبہ (سنیچر کے دن) اس دنیا سے رحلت فرمائی۔ "ختم اولیاء" آپ کی تاریخ وفات ہے۔ آپ کی آخری آرام گاہ بلگرام میں ہے۔

اسی سلسلہ میں اب میں ملّا عبد السّلام دیوہ، اور ان کے استاد ملّا عبد السّلام لاہوری اور میر فتح اللہ شیرازی کے حالات بھی قلمبند کر رہا ہوں۔

۴۳

ملّا عبد السّلام ساکن دیوہ قدس سرہٗ

آپ کا مولد و مسکن جو "دیوہ" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ صوبۂ اودھ کے علاقہ میں واقع ہے۔ آپ نے مختلف علوم و فنون خصوصاً علم عربی اپنے ہی وطن میں رہ کر حاصل کیے تھے۔ لیکن تقدیر الٰہی آپ کو لاہور تک لائی اور آپ وہاں ملّا عبد السّلام لاہوری کے سایۂ عاطفت میں پہنچ گئے۔ اپنے وطن مالوف میں جو کچھ علوم و فنون حاصل کیے تھے ملّا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی تحقیق و تکمیل کی اور استاد ہی کے نقش قدم پر آپ بھی گامزن رہے۔ اپنے استاد کے ہم نام تو تھے ہی، فضیلت علمی میں بھی آپ استاد کے ہم پلّہ ہوگئے۔ کچھ زمانہ تک استاد کی خدمت میں رہ کر استفادۂ علم و دانش کرتے رہے پھر آپ کو صاحب قران شاہ جہان کے دربار میں ملازمت حاصل ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک آپ شاہی لشکر کے مفتی کے عہدہ پر فائز رہے۔ جب عمر زیادہ ہو گئی تو اس منصب سے دست بردار ہو کر آپ دار السلطنت

لاہور میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور باقی عمر تشنگانِ علم و حکمت کو اپنے فیوض کے آب کوثر سے سیراب فرماتے رہے۔ آپ نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی تحریر فرمایا تھا۔

---

(۴۴)

ملاّ عبد السلام لاہوری قدس سرہ

آپ علوم عقلیہ اور فنون نقلیہ کے خزینہ تھے۔ علم ادب، فقہ اور اصول فقہ پر کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ آپ نے تحصیل علم امیر فتح اللہ شیرازی[۱] جیسے اکابر علماء سے کی۔ تقریباً ساٹھ سال تک فرائض تدریس ادا کرتے رہے۔ اور طالبین کی ایک کثیر جماعت کو علم و فضل کی دولت سے مالا مال کیا۔ تفسیر بیضاوی پر آپ نے حاشیہ بھی تحریر فرمایا۔ عمر شریف تقریباً نوے سال ہوئی۔ آپ فرماتے تھے کہ کتب متداولہ کے بارے میں بہت کچھ میں نے کہا اور ارباب علم کے سامنے ان کو پیش کر چکا ہوں اور وہ ان معروضات کو قبول بھی کر چکے ہیں لیکن درس و تدریس کی مصروفیات نے ان حقائق کو مجھے احاطۂ تحریر میں لانے کا موقع نہیں دیا۔

اب جبکہ اعضاء و قویٰ پر ضعف و اضمحلال کا غلبہ ہو چکا ہے اور قوت حافظہ بھی گھٹ گئی ہے جو کچھ دل و دماغ میں تھا سب نکل گیا۔ اپنے اس نسیان اور فراموشی پر سخت افسوس کرتے تھے آپ نے ۱۰۳۷ھ میں وفات پائی۔

---

(۴۵)

امیر فتح اللہ شیرازی قدس سرہٗ

آپ حکمت و فلسفہ میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ تحصیل علم کے سلسلہ میں آپ نے خواجہ جمال الدین محمود، مولانا کمال الدین شروانی، مولانا کرد، اور میر غیاث الدین منصور شیرازی[۲] کی درسگاہوں میں استفادہ کیا تھا

---

[۱] ان کے علاوہ دینیات کی تحصیل شیخ اسحاق بن کاکو (م ۹۹۶ھ) قاضی صدر الدین (م ۱۰۱۰ھ) اور شیخ سعد اللہ (م ۱۰۱۹ھ) سے بھی کی۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ) وغیرہ آپ کے شاگرد تھے۔ مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایک مدت تک آپ نے لاہور کے مفتی کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ (مآثر الامراء ۳ ج)

[۲] یہ میر صدر الدین شیرازی (۹۰۰ھ ۔ ۹۴۸ھ) عوام میں علامۂ دہر کے نام سے مشہور تھے۔ بہت سی تالیفات ہیں۔ (مقالات شعراء)

۵ "ولِلنّاسِ فی ما یعشقون مذاهب"۔
شیخ عنایت اللہ نے مولانا سحابی استرآبادی کی ان چند رُباعیوں کی شرح بھی تحریر فرمائی ہے جن کا تعلق قرآنی آیات سے ہے۔ آپ کا انتقال ۱۱۲۰ھ میں ہوا۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

(۴۶)

میر سیّد اسمٰعیل بلگرامی قدس سرہٗ

آپ سید محمد صغریٰؒ کی اولاد سے ہیں۔ اور میر سید طیب بن میر عبد الواحد اکبر قدس سرہ کے داماد ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: میر سیّد اسمٰعیل بن سید قطب عالم بن سید دلارہ بن سید عبد النبی جد القبیلہ = یہ قبیلہ محلہ "سید وارہ بن سید پیارے بن سید حسن بن سید محمود بڈہن کے چار قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے۔ اس خاندان کا شجرۂ نسب سید رفیع الدین کے تذکرے میں ابھی گذر چکا ہے۔ سید صاحب اپنے زمانہ کے مشہور ترین عالم و فاضل تھے۔ آپ دو واسطوں سے امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد ہیں۔ آپ معقولات (منطق و فلسفہ) میں ایک روشن دلیل تھے اور منقولات (حدیث و تفسیر و فقہ) میں دوسرے دلائل کو باطل کرنے والی ایک دلیل تھے۔ بہت سے طالبان علم کو آپ نے درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ "تہذیب المنطق" پر علامہ دوانی کے حاشیہ پر آپ نے بڑا عالمانہ اور ماہرانہ حاشیہ لکھا ہے۔ عقل و علم میں اتنا بلند پایہ رکھنے کے باوجود آپ بہت نرم دل اور بلند حوصلہ بھی تھے۔ آپ کی فیض رسانی عام تھی۔ ہندوستانی علم موسیقی میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ اور فن موسیقی کے اعلیٰ درجہ کے فنکار تھے۔ ابتداء میں آپ نے تحصیل علم کے لیے بلگرام سے باہر کا بھی سفر فرمایا اور ملّا عبد السّلام ساکن دیوہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہت سی مروّجہ درسی کتابیں آپ نے ملّا صاحب سے پڑھیں اور مقام فضیلت حاصل کیا۔ اس کے بعد مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے تدریس اسباق کی درخواست کی۔ ان کی اس درخواست پر مولوی صاحب نے اپنی معذوری کا اظہار کیا اور فرمایا کہ طلباء کے ہجوم کی وجہ سے اب میرے پاس کوئی وقت خالی نہیں ہے۔

ہاں! اگر تم فلاں طالب علم کا سبق بیٹھ کر سننا چاہو تو اس کی اجازت مل سکتی ہے میر صاحب نے سماعتِ درس کی یہ پیشکش قبول کر لی وہ سبق سنتے وقت اپنے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ قطعی کوئی گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح آپ نے ایک مدت گذار دی۔ ایک دن مولوی عبد الحکیم صاحب نے فرمایا کہ بہت زمانہ گذر گیا۔ تم نے کبھی اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ سید اسمٰعیل نے

اور میدان علم میں اپنا قدم اپنے اساتذہ سے بھی آگے رکھ دیا۔
عادل شاہ[1] بیجاپوری نے بڑی تمناؤں اور آرزوؤں سے آپ کو شیراز سے دکن بلالیا اور اپنا مختار عام بنادیا۔ کچھ عرصہ اسی طرح گذرا تھا کہ ۹۹۱ھ میں اکبر بادشاہ نے ان کی طلبی کا فرمان بھیجا۔ اس فرمان طلبی کے بموجب آپ فتح پور سیکری پہونچے۔ میرزا عبدالرحیم خانخاناں[2] اور حکیم ابو الفتح گیلانی[3] ان کا استقبال کرکے آپ کو دربار میں لے گئے۔ وہاں آپ پر بڑی نوازشیں کی گئیں۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ بادشاہ کے مصاحب بن گئے۔ اس کے بعد کل سلطنت کے صدر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔ انھوں نے خواجہ مظفر علی خاں کی لڑکی سے شادی کرلی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ترقی کرکے سہ ہزاری منصب پر پہونچ گئے تھے۔ اور ۹۹۳ھ میں "امین الملک" کا خطاب پاکر اور بھی سربلند و سرفراز ہوئے۔ فرمان شاہی نافذ ہوا کہ راجہ ٹوڈرمل[4] تمام ملکی اور مالی معاملات کو امیر فتح اللہ شیرازی ہی کے مشورہ کے مطابق سرانجام دیا کریں۔ میر شیرازی نے رعایا کی بھلائی اور سلطنت کے فائدوں پر مشتمل قواعد مرتب کرکے بادشاہ کے حضور میں پیش کیے۔ جن کو بادشاہ نے پسند فرمایا۔ اسی سال "عضد الدولہ" کے خطاب سے سرفراز فرمائے گئے۔ اور خاندیس کے حاکم راجہ علی خاں[5] کے مشیر سلطنت مقرر کیے گئے۔ مگر وہاں سے ناکامی کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ اور خان اعظم[6] سے جاکر ملے جو دکن کی سلطنت پر حملہ کرنے اور اس ملک کے سرداروں اور حاکموں کی گوشمالی

---

[1] سلطان ابراہیم عادل شاہ کے فرزند تھے۔ ۹۶۵ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد بمقام بیجاپور دکن تخت حکومت پر بیٹھے۔ تیئیس ۲۳ سال سلطنت کرنے کے بعد ۹۸۸ھ میں ایک خواجہ سرا کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ (مفتاح التواریخ)

[2] مرزا عبدالرحیم خان خاناں، مرزا بیرم خاں کے لڑکے۔ ولادت ۹۶۴ھ وفات ۱۰۳۶ھ۔ ترجمہ کتاب تزک بابری ان کی یادگار ہے جو بادشاہ عرش آشیانی کے حکم سے ترکی سے فارسی میں ترجمہ کی۔ (مآثر الامرا، مفتاح التواریخ، نزہۃ الخواطر)۔

[3] بن عبدالرزاق گیلانی۔ شیعہ، الحاد و گمراہی اور بد اخلاقی میں مشہور تھا اور اس میں بطور ضرب المثل اس کا نام لیا جاتا تھا۔ شرح قانونچہ (طب)، شرح اخلاق ناصری، اور مجموعہ رسائل موسومہ "چہار باغ" اس کی یادگاریں ہیں۔ ۹۹۷ھ میں حسن ابدال شہر میں وفات پائی۔ (منتخب التواریخ، مآثر الامرا، نزہۃ الخواطر)۔

[4] بادشاہ اکبر کا دیوان (وزیر مالیات) تھا۔ ملک کی آبادی اور عمال حکومت کا تقرر اور تنزل خالص اسی کے ذمہ تھا۔ ۹۸۱ھ میں بنگال کی صوبہ داری کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ اور ۹۹۸ھ میں بمقام لاہور فوت ہوا۔ (مفتاح التواریخ)۔

[5] شاہ علی بن مبارک بن عادل بن حسن بن نصیر الفاروقی معروف بہ راجہ علیخان برہانپوری اپنے بھائی محمد شاہ کے انتقال (۹۸۴ھ) کے بعد بمقام برہانپور (دار الحکومت خاندیس) تخت سلطنت پر بیٹھا اور عقل و شعور کے ساتھ حکمرانی کی۔ انصاف پسند اور فاضل تھا۔ اہل علم کو اکثر اپنے قریب کر لیا تھا۔ ۱۰۰۵ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر)

[6] یعنی مرزا عزیز کوکہ مخاطب بہ عزیز خان کوکلتاش۔ خان اعظم کے چھوٹے لڑکے ۱۶ جلوس میں اعظم خان کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ دیپالپور ان کی جاگیر مقرر ہوئی ۱۰۳۳ھ میں طبعی موت سے انتقال ہوا۔ (مفتاح التواریخ)۔

پر مامور کیے گئے تھے۔ چونکہ خان اعظم نے شہاب الدین احمد خاں[1] اور اپنے ساتھ کے دوسرے سرداروں کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا تو راجہ علی خاں نے حاکموں کے درمیان اس نفاق اور کشیدگی کو دیکھ کر دکن کی فوج کو اپنی طرف مائل کر لیا اور شاہی افواج سے مقابلہ کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

میر فتح اللہ نے بہت کوشش کی کہ راجہ علی خاں کو راہ راست پر لائیں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مجبوراً خان خاناں کے پاس گجرات گئے تاکہ ان سے مدد حاصل کریں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہاں سے ناکام واپس ہو کر خود بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ سنہ ۹۹۷ھ میں کشمیر کی سیر سے بادشاہ کی واپسی کے وقت کسی جسمانی عارضہ میں مبتلا ہو کر شہر ہی میں رہ گئے۔ اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا اور دار فانی سے عالم جاودانی کو روانہ ہوئے۔ پہلے لوگوں نے میر سید علی ہمدانی[2] قدس سرہ کے گھر میں ان کو دفن کیا تھا پھر بادشاہ کے حکم سے وہاں سے نعش کو نکال کر کوہ سلیمان پر ایک پر فضا اور پر بہار جگہ پر منتقل کر دیا۔ بادشاہ کو میر فتح اللہ شیرازی کے انتقال سے سخت ملال ہوا۔ بادشاہ نے اپنے رنج و ملال کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ:-

میر تو ہمارے وکیل، حکیم، طبیب اور منجم تھے۔ ہمارے رنج و غم کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اگر وہ جوہر قابل کسی فرنگی کے پاس ہوتا اور وہ فرنگی ان کے عوض میرے تمام خزانے طلب کرتا تب بھی میں اس گوہر گرانمایہ کو خرید لیتا اور پھر بھی میں گھاٹے میں نہ رہتا[3]

شیخ فیضی بادشاہ کے قلبی تاثرات کی تصویر اپنے الفاظ میں یوں کھینچتے ہیں۔

سے شہنشاہ جہاں را در وفاتش دیدہ پر نم شد سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطون زعالم شد

میر فتح اللہ شیرازی کی تصنیفات میں تہذیب المنطق[4] پر علامہ دوانی کے حاشیہ کا تکملہ ہے۔ اس مذکورہ حاشیہ پر میر صاحب کا حاشیہ علوم متداولہ میں شامل ہے۔ علمائے متاخرین عرب و ایران

---

[1] نیشاپور کے سادات سے تھے۔ پنج ہزاری منصب کا اعزاز حاصل تھا۔ مملکت مالوہ کی سپہ سالاری پر مقرر کیے گئے۔ ایک سال کے بعد گجرات کی حکومت بدلنے کی وجہ سے روپوش ہو گئے۔ پھر تقرری اور معزولی سے پہلے ہی سنہ ۹۹۹ھ میں انتقال ہو گیا۔ (مآثر الامرا)

[2] ولادت سنہ ۷۱۴ھ۔ آپ کی تالیفات ایک سو ستر سے زیادہ ہیں۔ ان میں مجمع الاحادیث، شرح اسماء حسنیٰ، ذخیرۃ الملوک، شرح فصوص الحکم، مرآۃ التائبین، شرح قصیدہ، ہمزیہ فارضیہ، آداب طریقین، اور قواعد عشرہ مشہور ہیں۔ (حدائق حنفیہ، خزینۃ الاصفیا، تذکرہ علمائے ہند)

[3] انشائے ابوالفضل جلد دوم میں میر فتح اللہ شیرازی کی وفات پر ایک طویل خط موجود ہے۔ جس میں اکبر کے تاثرات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں (مترجم)

[4] تہذیب المنطق والکلام مصنفہ علامہ سعد الدین تفتازانی متوفی سنہ ۷۹۲ھ۔ اس کے منطق کے باب پر علامہ جلال الدین دوانی سنہ ۹۰۸ھ نے نامکمل شرح لکھی تھی جس کو میر فتح اللہ شیرازی نے مکمل کیا۔ اس کے بعد اس پر حاشیہ بھی لکھا۔ (کشف الظنون)۔

کی تصنیفات جیسے محقق دوّانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور، مرزا جان وغیرہ کو میر فتح اللہ شیرازی ہندوستان میں لائے اور اپنے حلقۂ درس میں ان لوگوں کو شامل کیا۔ طالبانِ علم کی ایک کثیر جماعت نے میر فتح اللہ شیرازی کی درس گاہ سے فائدہ حاصل کیا اور ان کے عہد سے معقولات کی تعلیم کا ہندوستان میں ایک خاص رواج ہوگیا۔

۴۷

ملک بہاء الدین قدس سرہٗ

آپ محلہ خورد پورہ کے باشندہ ہیں اور ملک بُھلّن کے نام سے مشہور ہیں آپ اپنے نسب کے اعتبار سے

۱؎ علامہ جلال الدین محمد دوّانی (متوفی ۹۰۸ھ) بن سعد الدین۔ ولادت ۸۳۰ھ۔ آپ کثیر التصانیف ہیں۔ صاحب ریحانۃ الادب نے ان کی تصانیف کی تعداد ۷۹ لکھی ہے۔ منجملہ ان کے حاشیہ قدیمہ وجدیدہ شرح تجرید الکلام قوشجی (متوفی ۸۷۹ھ)، حاشیہ بر تحریر القواعد المنطقیہ شرح شمسیہ (شمسیہ مصنفہ قطب الدین رازی ۷۶۶ھ)، العقائد العضدیہ اور حاشیہ قدیمہ جدیدہ بہ اسم "تنویر المطالع" بر شرح مطالع رازی اور حاشیہ بر مطالعہ سید شریف مشہور اور متداول ہیں۔

۲؎ میر صدر الدین شیرازی (۹۰۳ھ)، محمد بن ابراہیم معروف بہ اخوند۔ فن فلسفہ کے مشہور عالم تھے ان کی تالیفات میں اسفار اربعہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ (مؤلفہ ابہری) اور دیگر رسائل مشہور ہیں۔ ان کی کنیت ابو المعالی ہے اور اہل علم میں ان کو صدر العلماء، صدر الحقیقہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ امیر اصیل الدین عبد اللہ بن عبد الرحمن الحسینی الدشتکی شیرازی کے ہم زلف ہیں، اور ملا قطب الدین و خواجہ نصیر الدین محمد طوسی کے شاگرد ہیں۔ میر فتح اللہ نے علامہ دوّانی کے مقابلہ میں حواشی قدیمہ وجدیدہ، تحریر کیا ہے۔ دونوں حضرات کی تحریر ایک شرح تجرید قوشجی پر "طبقات الصدریہ والجلالیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ورنہ میں، اور اسی طرح قطب الدین رازی کی شرح مطالع پر بھی دونوں حضرات نے ایک دوسرے پر اعتراضات کیے ہیں۔ (حواشی مقالات الشعراء مصنفہ حسام الدین راشدی)۔

۳؎ میر غیاث الدین منصور بن میر صدر الدین شیرازی (۸۶۶—۹۴۸ھ) فلسفہ و کلام میں ان کی بہت اہم تالیفات ہیں منجملہ ان کے محاکمات بین جلال صدر بر شرح مطالع اور شرح تجرید مشہور ہیں نیز حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ہیاکل النور" کی شرح، اپنے والد محترم کے رسالہ "اثبات واجب" کی شرح، منطق تعدیل المیزان جو منطق شفا کا خلاصہ ہے۔ خلاصۃ الحکمہ معیار الافکار، طب میں معالم الشفاء، سفر و میں دفن ہیئت میں حاشیہ بر شرح شفاء، شرح حکمۃ العین پر حاشیہ، ردِ دوّانی بر حاشیہ شمسیہ، خلاصۃ التلخیص (اختصار کتاب تلخیص المعانی) دوّانی کی تہذیب منطق کے حاشیہ کا رَد، اور اخلاق منصوری وغیرہ معروف ہیں۔ (مقالات الشعراء)

۴؎ شمس الدین حبیب اللہ بن عبد اللہ علوی و جبوری (م ۹۹۴ھ) معروف بہ فاضل میرجان شیرازی ان کی تالیفات "الموز & الفنون" شرح تجرید العقائد القدیمہ والجدیدہ پر حاشیہ، نصیر الدین طوسی کی شرح ابن سینا پر حاشیہ، مبارک شاہ کی شرح حکمۃ العین پر حاشیہ، شرح شمسیہ پر حاشیہ، حاشیہ المطالع المطول پر حاشیہ اور حاشیہ المختصر پر حاشیہ، لوامع الاسرار شرح مطالع الانوار (منطق و فلسفہ میں) پر حاشیہ، شرح مواقف پر حاشیہ، مطول پر حاشیہ، شرح مختصر المنتہی (قطب الدین شیرازی) پر حاشیہ معروف ہیں

انصاری الاصل ہیں اور شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبد اللہ[1] انصاری قدس سرہٗ کی اولاد میں ہیں۔ آپ کا خاندان ملک کے لقب سے شہرت رکھتا ہے۔ آپ کے خاندان کا یہ لقب ملک فیض اللہ کی وجہ سے ہے جو ملک بہاء الدین کے بزرگوں میں سے ہیں۔ آپ سے جب اس خاندانی لقب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ارشاد فرمایا کہ بادشاہوں نے ہمارے بزرگوں کو اپنے فرامین میں "ملک الامرا" لکھا ہے۔

ملک بہاء الدین ایک اعلیٰ درجہ کے ذہین و طبّاع فاضل تھے۔ سب سے پہلے آپ نے گوپامؤ جاکر ملا وجیہ الدین[2] گوپاموی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مولوی قطب الدین شہید سہالوی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے۔ اور تمام درسی علوم و فنون میں زبردست معلومات کا خزانہ جمع کر لیا۔ خصوصاً صرف و نحو (ام العلوم) کے فن میں آپ بہت بڑی مہارت رکھتے تھے۔

اپنے پیارے وطن ہی میں مقیم رہے اور ہمیشہ طالبان علم کے افادہ میں مشغول و ساعی رہے ۱۱۱۰ھ میں اس دار فنا سے عالم بقا کو رحلت فرما گئے۔ آپ کا مزار مبارک حضرت خواجہ عماد الدین بلگرامی قدس سرہٗ کے روضہ کے چبوترہ کے نیچے دروازہ کی جانب واقع ہے۔ آپ کے فرزند ارجمند شیخ فخر الدین کا تذکرہ پہلی فصل میں گذر چکا ہے۔

---

(۴۸)

سیّد ضیاء اللہ بلگرامی قدس سرہٗ

آپ سید محمد صغریٰ ساکن محلہ میدان پورہ کی اولاد سے ہیں۔ اپنے زمانہ کے ایک بلند پایہ متقی و ممتاز

---

[1] ولادت ۳۹۶ھ وفات ۴۸۱ھ بمقام ہرات۔ بزرگ ترین صوفی اور خراسان کے بہت بڑے دانشمند تھے۔ بہت سی کتابیں، رسائل اور مناجاتیں نیز بہت اشعار ان سے منسوب ہیں۔ زبردست شاعر تھے۔ تازی اور فارسی زبانوں میں لکھتے تھے۔ بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ اور بہت سی کتابیں اپنے شاگردوں اور مریدوں کو املا کرائیں۔ ان سے منسوب مشہور ترین کتاب طبقات صوفیہ ہے۔ یہ کتاب آقائے عبد الحی حبیبی کی تصحیح اور حواشی کے ساتھ افغانستان میں طبع ہو چکی ہے۔ یہ شیخ سلمی نیشاپوری کی طبقات پر مبنی ہے اور حضرت جامی کی نفحات الانس کا مبنیٰ ہے (مترجم)

[2] ملا وجیہ الدین گوپاموی بن عیسیٰ بن آدم بن محمد صدیقی گوپاموی، شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے پوتے ہیں اور ان کے والد شیخ اللہ دیہ خیر آبادی کے پوتے تھے سارے علوم اپنے دادا شیخ جعفر سے حاصل کیے۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی اور قاضی عصمت اللہ بن عبد القادر عمری ان کے شاگردوں میں ہیں۔

ملا صاحب "فتاویٰ ہندیہ" (عالمگیری) کی تالیف میں شریک تھے۔ کتاب حصن حصین کی شرح تحریر فرمائی۔ اور "خیالی" اور "مطول" پر حاشیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے رسائل تصوف میں ان کی یادگار ہیں۔ ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر)۔

اور جید عالم تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ سید ضیاء اللہ بن خان محمد بن عبدالغفار بن سید تاج الدین جو ان چار محلوں میں سے ایک محلہ کے مورث اعلیٰ تھے جو محلہ سید وارہ کہا جاتا ہے ان کا سلسلۂ نسب سید وارہ بن سید حسینی عرف سید دولارہ بن سید حسن بن سید محمود بدہن ہے ان سے اوپر کا سلسلۂ نسب سید رفیع الدین کے حالات کے تحت پیش کیا جا چکا ہے۔

سید ضیاء اللہ کے دادا سید عبدالغفار کی شادی سید محمد اشرف بن سید احمد عرف اوچھی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ سید محمد اشرف شیخ بہیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ سید محمد اشرف کے کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنے داماد سید عبدالغفار کو اپنا متبنّیٰ بنا لیا۔ سید عبدالغفار محلہ سید وارہ سے منتقل ہوکر محلہ میدان پورہ میں رہنے لگے۔

سید ضیاء اللہ نے آغاز شباب میں ہی قرآن پاک فن تجوید کی قید کے ساتھ حفظ فرمایا۔ اس کے بعد انھوں نے اکتساب علوم و فنون کے شوق میں ہمت اور حوصلہ سے کام لے کر ایک طالب علم کی حیثیت سے پورب کے بہت سے قصبات کا سفر کیا اور اس وقت کے مشہور و معروف علماء سے علوم و فنون حاصل کیے۔

آپ کو حضرت میر سید احمد بن میر سید محمد کالپوی قدس سرہما سے غائبانہ عشق پیدا ہوگیا اور ان کی شان میں آپ نے یہ شعر نظم فرمایا ؎

کالپی مکہ بلگرام یمن   اے تو احمد منم اویس قرن

اس کے بعد حضرت میر سید احمد کی خدمت میں حاضر ہوکر تصوف کی کچھ کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا اور بلگرام کے سجادہ پر بیٹھ کر عبادت الٰہی، تقویٰ اور پرہیزگاری اور علوم دینیہ کی درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ اس طرح طالبان دین کی ایک کثیر جماعت کو دین کی نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔ حضرت سید ضیاء اللہ بے حد متقی و پرہیزگار تھے۔ دین کی خدمت و اشاعت نیز احکام شرعیہ اور سنّت نبوی کی پابندی اور بجا آوری میں نہایت انہماک رکھتے تھے۔ ماہ شعبان کی ۲۵ تاریخ کو سہ شنبہ کے دن ۱۰۶۰ھ میں آپ نے اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو خواجہ عماد الدین بلگرامی قدس سرہ کے مزار کے پائیں چار دیواری کے باہر جنوبی دیوار کے متصل دفن کیا گیا۔

راقم الحروف (حضرت میر غلام علی آزاد بلگرامی مصنف کتاب) کہتا ہے ؎

خورشید سپہر علم و فضل و تقویٰ   آں میر ضیاء اللہ روشن سیما
دامن افشاند بر شبستان جہان   تاریخ شنو بمنزل قدس ضیاء ۱۰۶۰ھ

"ید بیضا" میں سید ضیاء اللہ مرحوم کی تاریخ انتقال ۱۰۶۱ھ تحریر ہے۔ مآثر الکرام کے پہلے نسخوں میں یہی سال لکھا گیا۔ بعد میں تحقیق ہوئی کہ تاریخ انتقال ۱۰۶۰ھ ہے۔ اسی سال کی مناسبت سے رباعی بھی نظم ہوئی۔

سید ضیاء اللہ اور علامہ میر عبدالجلیل کے والد ہم عمر تھے (جن کا تذکرہ تحریر کیا جائے گا) اور بچپن ہی سے دونوں میں بہت ربط و اخلاص تھا۔

سید ضیاء اللہ نے حضرت میر سید احمد کو یہ خط لکھا تھا۔ جس کلمحبت کے مناسب اور موزوں کرشمے بصورت تحریر جلوہ نما تھے۔ اگرچہ بظاہر وہ کلمات ملیح تھے لیکن حقیقت میں وہ نہایت شیریں اور خوشگوار تھے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

اس عید کے موقع پر میں قربان ہونا چاہتا تھا۔ ایام تفریق گذر چکے تھے اس لیے نثار کرنے کے لیے نقد سکوں کی تلاش کر رہا تھا۔ لیکن سوائے نقد جاں کے مجھے اور کچھ بھی نہ دستیاب ہو سکا۔ پھر میں نے چاہا کہ کچھ بکھرے ہوئے موتی جمع کر دوں (یعنی نثر کی شکل میں کچھ تحریر کروں) اور اپنی آرزوئے حسرت کو نثر کی شکل دوں لیکن جذبات کے گوہر گراں مایہ آنسوؤں کی شکل میں گرنے لگے اور نثر نے نظم کی شکل اختیار کر لی۔ لے پیش کرتا ہوں۔

اوّل بہ کرشمہ اش سلامے	وز دیدہ بہ غمزہ اش پیامے
از نالہ بعشوہ اش دعائے	وز ہجر بہ وصل او ثنائے
از اشک بہ پائے او سجودے	واز آہ بگوش او درودے
از گریہ بخندہ اش نیازے	واز غم بہ نشاط او گدازے
از دست دعا بدامن او	واز روح نثار بر تن او
شوقے ز نیاز من بنازش	آہے ز خروشش من بسازش
چوں خط شریف دلبر آمد	از نخل امید من بر آمد
لطفے کہ بنامہ اش نہاں بود	برگشتہ تیغ ہجر جان بود
ہجرے کہ بود مراد دلبر	از وصل ہزار بار خوش تر
چوں جاں برضائے دوست لیست لست	از ہر چہ رضائے اوست مست است
ہمت بمراد او کنم صرف	شد ختم سخن بذکر ایں حرف

سید ضیاء اللہ کے فرزند سعادت مند سید قادری کا ذکر پہلی فصل میں گذر چکا۔ سید ضیاء اللہ کے دوسرے صاحبزادہ سید احمد بن سید ضیاء اللہ علم کی دولت سے مالا مال تھے۔ قرآن کے حافظ اور خوش الحان قاری تھے۔ خوش نویسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ خط نسخ کی تحریر میں الفاظ اس طرح پروتے تھے کہ یاقوت ایسا گوہر بے بہا بھی بے قیمت ہو جائے۔ ان کا تحریر کردہ قرآن پاک اور تفسیر مدارک کا نسخہ آج بھی آنکھوں کو نور تازہ اور جلائے بے اندازہ عطا کرتا ہے۔

آپ نے اسّی سال کی عمر میں ۱۱۴۳ھ ذی الحجہ کی اکتیسویں تاریخ کو فردوس بریں کی سیر فرمائی۔

(وفات پائی) اور اپنے قدیم آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے آپ کے تیسرے فرزند میر سید اشرف بن سید ضیاء اللہ اپنے زمانہ کے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ علم وفضل سے بہرہ وافر پایا تھا۔ ہمیشہ اپنا وقت قرآن حکیم کی تلاوت، دینی کتب کے مطالعہ اور عبادتِ الٰہی میں صرف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۱۴۰ھ (بارہویں صدی کے چوتھے عشرہ) میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی جانب رجوع ہو کر اپنے والد مرحوم کے مزار کے پہلو میں خواجہ عماد الدین قدس سرہٗ کی درگاہ کے پائیں میں دفن کیے گئے۔

سید غلام حسین بن سید محمد اشرف مذکور نے تمام درسی کتابیں ترتیب کے ساتھ استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی روح اللہ روحہٗ سے پڑھیں۔ آپ ایک نہایت صالح اور نہایت متقی جوان تھے۔ اپنی تمام عمر میں کبھی گناہوں کے قریب بھی نہ پھٹکے۔ اکتیس سال کی عمر میں اپنے اعیانی بھائی سید احمد کے ساتھ ماہ شعبان سنہ ۱۱۶۶ھ میں سفر کے ارادہ سے وطن سے باہر نکلے۔ یہ ان کا پہلا سفر تھا۔ اثنائے سفر اٹاوہ کے قریب پہونچ کر دونوں بھائی ڈاکوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

(۴۹)

سید عنایت اللہ قدس سرہٗ

آپ کا سلسلۂ نسب یوں ہے: سید عنایت اللہ بن سید عبدالستار بن سید حاتم بن سید بدرالدین، جو محلہ سید واڑہ کے چار خاندانوں میں سے ایک خاندان کے جدِ امجد اور مورث اعلیٰ ہیں۔

سید عنایت اللہ محلہ سید واڑہ۔ کہ اسی خاندان کے ممتاز فاضل بے مثل فقیہ اور شہرۂ آفاق طبیب حاذق تھے۔ آپ نہایت ذہین وطباع اور عالی دماغ اور صاحب فکر رسا تھے۔ واقعات و روایات کی تحقیق میں بھی ایک خاص ملکہ آپ نے پیدا کیا تھا۔ اور قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہی مسائل حل کرنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس زمانہ کے بڑے بڑے بلند پایہ مفتی بھی آپ کی اس اعلیٰ صلاحیت کا لوہا مانتے تھے اور علمی واجتہادی برتری کا اقرار کرتے تھے۔

واقعات وروایات کی تحقیق کرنے والے لوگ دور دراز سے آپ کی خدمت میں اسی مقصد کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ ایام طفلی ہی میں آپ نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد میر سید اسماعیل بلگرامی کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر آپ نے دینی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح بتدریج تحصیل علم کی منزلیں طے کر کے تمامی علوم وفنون پر عبور حاصل کر لیا۔ اکثر وبیشتر آپ مطالعۂ کتب میں اپنا وقت صرف فرماتے تھے۔ سنہ ۱۱۲۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ اور اپنے باغ میں دفن کیے گئے۔ آپ کی اولاد میں دو صاحبزادگان بڑے

صاحبانِ فضل وکمال اور نہایت ممتاز عالم اور فاضل یگانہ تھے۔ یعنی سید محبوب جو ایک جلیل القدر عالم تھے آپ ہمیشہ درس وتدریس میں مشغول رہے استاد المحققین میر طفیل محمد روح اللہ روحہ آپ سے بہت خوش رہتے تھے۔ اور خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ نے بھی ۱۱۳۰ھ میں اس جہان فانی سے کوچ فرمایا۔

سید عنایت اللہ مرحوم کے دوسرے بیٹے سید مرتضیٰ جو سید نواب نسخ کے نام سے مشہور تھے آپ نے مروجہ علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد اپنے والد ماجد سے طب پڑھی۔ شہر کے ممتاز ترین اور صفِ اول کے اطباء حاذق میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ نبض شناسی میں بڑی مہارت تھی۔ آپ کو اللہ تبارک وتعالےٰ نے دستِ شفاء عطا فرمایا تھا۔ مرض کے دور کرنے میں آپ کو مسیحائی حاصل تھی۔ علم طب میں آپ نے ایک کتاب بھی تالیف فرمائی تھی۔

۱۱ ذیقعدہ ۱۱۵۸ھ کو آپ کی نبض حیات ڈوب گئی اور آپ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہہ کر ملک عدم کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اپنے بزرگوں کے مقبرہ میں آرام فرما ہیں۔ تقریباً اسی سال کی عمر پائی۔

۵۰

میر سید خیر اللہ بلگرامی قدس سرہ

آپ سید محمود اکبر کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا شجرۂ نسب اس طرح ہے۔ سید خیر اللہ بن سید عبد الحمید بن سید طیب بن سید عبد القادر بن سید ابو القاسم بن سید خان محمد بن سید محمود اکبر بلگرامی قدس سرہ۔

اپنے زمانہ کے بلند پایہ، باکمال اور ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ نہایت خوش طبع خوش مزاج اور خوش خلق بزرگ تھے۔ علاوہ ازیں اور بہت سے دوسرے اخلاقِ حمیدہ اور فضائل پسندیدہ سے متصف تھے۔ اس کے باوجود آپ کا روشن ضمیر اور پاکیزہ باطن طلب وتشنگی سے خالی نہ تھا۔ مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ کی مثنوی کا اس دور میں آپ سے بہتر کوئی درس دینے والا نہ تھا۔ درس وتدریس اور عبادات الٰہیہ میں معروف رہنا ہی آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا "جامع القوانین" کے مصنف خلیفہ شاہ محمد نے "مثنوی مولانا روم" میر خیر اللہ کی خدمت میں آکر پڑھی تھی۔ اور اپنی تصنیف میں خطوط کے ضمن میں ایک خط میر خیر اللہ کے نام بھی درج کیا تھا۔ جس کا آغاز اس طرح ہے۔

• مکتوب نہم۔ بخدمت خلاصۂ خاندان اصطفا، نقادۂ دودمان ارتضا، شرافت ونجابت دستگاہ میر سید خیر اللہ تحریر یافت؛ برضمیر خورشید نظیر آں زینت افزائے محفل سخن، رونق بخش مضامین نو وکہن، نگاہ آموز چشم بنیش، چراغ افروز بزم آفرینش، نمک خوان اہلیت، مردمک دیدۂ قابلیت، ابدع

قوانین مروت، مخترع آئین فتوت، اختر منیر برج نقابت، گوہر بے نظیر درج نجابت، مجمع الاخلاق فسیح الاشفاق واضح ولائح باد۔"

میر سید خیر اللہ شوال کی پانچویں تاریخ چہار شنبہ کے دن ۱۱۲۲ھ میں اس جہان فانی سے رحلت فرما کر جنت الماوی میں قیام پذیر ہوئے اور بلگرام میں اپنے بزرگوں کے مقبرہ میں دفن کیے گئے۔ میر صاحب کی موت مرگ مفاجات تھی!

"روی بیہقی فی شعب الایمان عن ابی السکن الھجری قال مات خلیل اللہ فجاءۃ و مات داؤد فجاءۃ و مات سلیمان بن داؤد فجاءۃ ھو تخفیف علی المومن و تشدید علی الکافر"

اس مقام پر راقم الحروف کا قلم ایک خاص واقعہ کی جانب رجوع ہوتا ہے اور سید خیر اللہ کے واقعہ کے ضمن میں میرے والد (مولف کتاب کے والد) سید محمد نوح کا واقعہ بھی اہل عقل و دانش کی عبرت و نصیحت کے لیے تحریر کرتا ہے۔

"محرم کی نویں تاریخ کو ایک شخص اچانک مرگیا۔ والد مرحوم اس میت کو دفن کرنے میں مشغول ہوئے۔ اور تدفین سے فارغ ہو کر گھر واپس آئے۔ اس واقعہ نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ دنیا اسی وقت سے ان کی نگاہوں میں حقیر نظر آنے لگی۔

علامہ مرحوم میر عبد الجلیل کے سعادت مند صاحبزادہ میر سید محمد کہتے ہیں کہ اس قسم کے دو واقعے نہایت ہی عبرتناک دیکھنے میں آئے۔ ایک تو سید خیر اللہ بن سید عبد الحمید کے انتقال کا واقعہ ہے۔ اور دوسرا سید لطف اللہ کے والد ماجد سید محمود کی وفات کا واقعہ ہے۔

جس کا بیان پہلی فصل میں حضرت سید العارفین قدس سرہ کے مریدین و متوسلین کے حالات کے سلسلہ میں تحریر کیا جا چکا ہے آپ (سید محمود) محرم کی دسویں تاریخ کو رات کے وقت بلگرام میں کئی جگہ تشریف لے گئے۔ آخر میں اپنے محلہ میدان پورہ میں آئے اور امام علیہ السلام کے تابوت کے چبوترہ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے اللہ کا لفظ مبارک زبان سے ادا فرمایا اور پھر آپ کی روح پاک اس قالب عنصری کو چھوڑ کر عالم بقا کی جانب پرواز کر گئی۔

سبک رواں زخم آسمان برآمدہ اند ✤ زراستی چو خدنگ انکماں برآمدہ اند

آپ کی وفات کا یہ حادثہ ۱۱۶۰ھ میں محرم کی دسویں تاریخ کی رات کو واقع ہوا تھا۔ جب کہ رات گذرنے میں صرف ایک پہر باقی تھا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے دن جبکہ آفتاب ایک نیزہ بلند ہو چکا تھا۔ باغ محمود میں اپنے والد سید فیروز کی قبر کے پاس دفن کیے گئے۔ آپ کی عمر شریف ستر سال تھی۔ مؤلف کتاب نے اپنے والد سید محمد نوح قدس سرہ کی تاریخ وفات ذیل کے قطعہ میں یوں بیان کی ہے۔

۵ میر سید نوح آں نخل ریاض مکرمت | روز عاشورا علم افراخت در ملک بقاء
سالکے پرسید از آزاد سال رحلتش | گفت حشر والدما باشہید ۱۱۹۵ھ کربلا

(۵۱)

سید محمد فیض بلگرامی قدس سرہ

آپ کے مورث اعلیٰ حضرت سید بدرالدین محلہ سید وارہ کے چار قبائل میں سے ایک قبیلے کے جدّ امجد ہیں چنانچہ سید محمد فیض بلگرامی کا شجرۂ نسب یوں ہے۔ سید محمد فیض بن سید محمد صادق بن سید صدر جہاں بن سید حاتم بن سید بدرالدین - سید محمد فیض نے میر سید اسماعیل بلگرامی کی خدمت میں رہ کر مروجہ علوم حاصل کیے۔ اور سند حدیث آپ نے حضرت قطب المحدثین میر سید مبارک بلگرامی سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی سے ایک تعلق خاص پیدا فرمایا۔ اور ان سے بے شمار علمی اصول و قواعد حاصل کیے۔ شمائل النبی اور حصن حصین کا فارسی میں آپ نے ترجمہ بھی تحریر فرمایا ہے ترجمہ شروع کرنے کی تاریخ اور اس کا نام ترجمہ شمائل نبی (بلغیر الف لام کے) لکھا اور اس کے ختم کرنے کی تاریخ سید ضیاء اللہ بلگرامی نے اس مندرجہ ذیل قطعہ میں لکھی۔ ترجمہ کا اختتام ۱۰۹۶ھ میں ہوا تھا۔

چو سید فیض منطوق فضائل | مترجم ساخت از جہد کماہی
سزد گر چرخ ذکر سعی تیرش | علم گرداند از مہ تا بہ ماہی
بحمد اللہ کہ شد ایں گنج معنی | نصیب عہد عالم گیر شاہی
ز یمن صحبت سید مبارک | خدا کردش بہ ایں دولت مباہی
خرد تاریخ ترتیبش رقم زد | زہے گنجینۂ فیض الٰہی !

یہ بات واضح رہے کہ بلگرام کی زمینداری محلہ سید وارہ کے چاروں قبیلوں ہی سے متعلق تھی سید محمد فیض نے اپنے زمانہ میں اس ذمہ داری کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور زمیندارانہ شان و شوکت کا علم آسمان تک بلند کر دیا۔ اتفاق سے شہر بلگرام کے حاکم "خان عالم" سے کچھ مخالفت پیدا ہو گئی جس کے سبب ۲۹ رمضان المبارک ۱۱۰۰ھ کو ایک سخت جنگ میں خان عالم غالب آگیا۔ سید محمد فیض کے گھر کا سارا ساز و سامان سب لوٹ لیا گیا۔ اس ہنگامہ میں ترجمۂ مذکور بھی درہم برہم ہو گیا۔ سید محمد فیض اس ظالم کی سرزنش کے لیے کمر بستہ ہوتے اور بلگرام سے نکل کر خلد مکان عالمگیر کے لشکر گاہ دکن جا پہنچے۔

علامہ مرحوم میر عبدالجلیل بلگرامی نے بھی اپنے قدیم تعلقات کے پیش نظر اس سفر میں سید محمد فیض کا

ساتھ دیا۔ اور ایسے وقت میں جبکہ دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے دوستی کا حق ادا کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا۔ سید محمد فیض ؒ نے بادشاہ عالمگیر کے لشکر گاہ تک پہونچ کر سارا واقعہ بادشاہ عالمگیر کے گوش گذار کیا۔ بادشاہ خان عالم کو بلگرام کی حکومت سے معزول کر دیا۔

سید محمد فیض ؒ اور علامہ میر عبد الجلیل ؒ حیدرآباد دکن سے اپنے وطن (بلگرام) واپس آئے۔ اس وقت آپ نے ترجمہ کو تلاش کیا۔ کتاب کے درمیانی حصہ کے صرف چند اجزاء ملے۔ باقی سب تلف ہو گئے تھے۔ سید محمد فیض ؒ نے دوبارہ پھر ترجمہ کرنے کے لیے ہمت کی۔ ۱۲ رذی الحجہ ۱۱۱۲ھ کو یہ ترجمہ ختم ہوا۔ دوبارہ ترجمہ ختم کرنے کی تاریخ قد تم بعون اللہ الاحد ورسولہ احمد" سے نکالی۔

استاد المحققین میر سید طفیل محمد نور اللہ مرقدہٗ، سید محمد فیض کے گھر میں مدتوں قیام پذیر رہے۔ سید محمد فیض، استاد کی خدمت کے سارے حقوق حتی المقدور ان ایام میں ادا کرتے رہے۔

سید محمد فیض کی وفات ۱۱۳۰ھ میں ہوئی۔ آپ کی قبر اسی چبوترہ پر بنائی گئی جس کو آپ نے اپنی زندگی میں اسی کام کے لیے بنوایا تھا۔ آپ نے تقریباً ساٹھ سال کی عمر پائی۔

۵۲

سید محمد باقر بلگرامی قدس سرہٗ

آپ سید محمد صغریٰ کی اولاد میں باشندگان محلہ میدان پورہ کے "پکے بھیتہ" سادات میں سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

سید محمد باقر بن سید داد بخش بن سید ابوالفتح بن سید عبد الباقی بن سید کمال الدین بن سید حسین بن سید فضل اللہ۔

اس سلسلہ کے باقی افراد کے اسماء گرامی پہلی فصل میں سید اجمل کے تذکرہ کے تحت لکھے جا چکے ہیں۔

سید محمد باقر قدس سرہٗ ایک جید عالم اور نہایت ذہین و طباع فاضل تھے۔ عربی ادب میں تو آپ کو کمال درجہ تبحر حاصل تھا۔ آپ نے سید فرید الدین بلگرامی عرف سید بدلی قدس سرہ کی خدمت میں پہونچ کر تمام علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ نے سید العارفین میر سید لطف اللہ قدس سرہ کے اعیانی بھائی سید نور اللہ کی شاگردی اختیار کی۔ ان دونوں عالی خاندان اساتذہ کا ذکر جمیل پہلی فصل میں تحریر کیا جا چکا ہے۔

آخر میں سید محمد باقر بلگرامی نے علامہ نامی میر عبد الجلیل بلگرامی کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے فیض

صحبت سے علوم و فنون کے بیش بہا خزانے جمع کیے اور ہر فن میں دستگاہ کامل حاصل کرلی۔ آپ کی تحریر کا انداز علامہ مرحوم کی طرح دل نشیں اور حسین تھا۔

آپ نے ۱۱۳۱ھ میں اس جہان فانی سے منہ پھیر کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ عمر شریف تقریباً ساٹھ سال تھی۔ قبر مبارک بلگرام میں ہے۔

۵۳

سید عبداللہ قدس سرہ

آپ کا تعلق بھی بلگرام کے ان سادات سے ہے جو محلہ میدان پورہ کے رہنے والے خاندانوں میں سے کسی نہ کسی ایک خاندان سے وابستہ ہیں۔ آپ علوم عربی و فارسی اور ہندی میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیت رکھتے تھے۔ درسیات کی تعلیم میں آپ قاضی علیم اللہ کھنڈوی کے شاگرد تھے۔ فن تحریر اور خوش نویسی میں آپ سات قسم کے خط میں مشاق اور ماہر تھے۔ فن سپہ گری اور اسلحہ کے استعمال کے علم و ہنر میں نیز جنگی ہتھیاروں کے بنانے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ کاغذی پھولوں کے بنانے میں بھی آپ کو اچھی مہارت تھی۔ آپ نے تمام عمر بڑی عزت اور شان کی زندگی بسر کی۔ اکثر نواب مبارز الملک سربلند خاں[1] کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بسلسلۂ ملازمت آپ فوج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

شیخ قوام الدین احمد آبادی نے فقیر (مؤلف) سے بیان کیا کہ جب سربلند خاں تونی پہلی بار ۱۱۳۲ھ میں صوبہ احمد آباد کے ناظم مقرر ہوئے تو انھوں نے سید عبداللہ کو صدارت کا عہدہ مرحمت فرمایا۔ سید عبداللہ نے ریاست کے وظیفہ خواروں اور جاگیرداروں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ بڑا احسان و اکرام کیا۔ سید عبداللہ بہت اعلیٰ درجہ کی علمی استعداد کے مالک تھے۔

شاہ اسد اللہ نے جو شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے پوتے اور سجادہ نشین تھے۔ سید عبداللہ کی خدمت میں "شرح مواقف" کا ایک نسخہ پیش کیا۔ اور میں نے فقہ کی کتاب "ہدایہ" حاصل کی۔ میرے ہی توسط سے مولانا نور الدین

---

[1] نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی۔ میر محمد رفیع نام تھا۔ تون کے رہنے والے تھے۔ جو ایران کا ایک شہر ہے۔ خلد مکاں کے زمانہ میں اپنے والد مرزا محمد افضل عرف مقتدر سے خاں کے ساتھ ایران سے ہندوستان آئے۔ والد کی وفات کے بعد اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ مختلف اعزازات کے حامل ہوئے۔ بادشاہی لشکر کے ایک امیر روح اللہ خاں بخشی کی لڑکی بدر بیگم سے نکاح کیا۔ چونکہ بدر بیگم، سلطان کی بیوی عائشہ کی بہن تھی اس لیے خلد مکاں کے زمانہ میں شاہزادہ کی جانب سے سربلند خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔ پھر مختلف حالات سے گزر کر گجرات کی صوبہ داری کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۱۵۹ھ میں نادر شاہ کے گنگے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ تاریخ مظفری میں ان کا سال وفات ۱۱۵۲ھ تحریر ہے۔ (مآثر الامرا)

اور سید عبد اللہ کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔

میں نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ نے محمد اعظم شاہ کے دور حکومت میں فلاں فاضل کو دعوت دے کر بلایا تھا۔ اور اسی موقع پر علمی بحث و مباحثہ شروع ہو گیا تھا جس کا اختتام شکر رنجی اور کدورت پر ہوا۔ اب آئندہ آپ ایسا نہ کریں۔ یہی بات میں نے سید عبد اللہ کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر کہی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ تم ایسی بات زبان پر کیوں لائے۔ علمی ذکر اور مباحثہ میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو فائدہ پہنچانے اور حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ سید عبد اللہ، مولانا کے گھر پر تشریف لائے۔ وہاں انھوں نے علمی بحث شروع کر دی اور اس انداز و حکمت سے گفتگو کی کہ مولانا اور مجلس میں موجود تمام حضرات بے حد مسرور ہوئے۔ اور سب نے سید صاحب کی بڑی تعریف کی۔ آخر کار "دار الخلافہ شاہ جہان آباد" میں مرض استسقاء میں مبتلا ہو گئے اور وہاں سے سید عبد اللہ بلگرام آئے اور چند ہی دنوں کے بعد آپ انتقال فرما گئے۔ "باغ محمود" کے مغربی سمت اپنے قبیلہ کی دوسری قبور کے درمیان دفن کیے گئے۔

آپ کا انتقال سنہ ۱۱۳۲ھ میں ہوا۔ قاضی علیم اللہ کھنڈوی کا نام کئی جگہ پہلی فصل میں گذر چکا ہے۔ اس فصل میں بھی اسی مقام پر سید عبد اللہ کی شاگردی کے تذکرہ میں ان کا ذکر آچکا ہے۔ چونکہ یہ فصل علماء اور فاضلین کے جماعت کی ایک انجمن ہے اس لیے اب مؤلف کا قلم قاضی علیم اللہ کھنڈوی کا ذکر خیر سامعین و ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

---

(۵۴)

قاضی علیم اللہ کھنڈوی قدس سرہ

کھنڈو، بلگرام سے چار کوس کے فاصلہ پر دریائے گنگا کے کنارے ایک قصبہ ہے۔ قاضی صاحب اخی جمشید[۱] راجگیری کی اولاد میں ہیں اور اس علاقہ کے مشہور علماء میں سے ہیں۔

---

[۱] حضرت اخی جمشید، حضرت مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت مخدوم صاحب ان کو "اخی" کے خطاب سے یاد فرماتے تھے۔ بس یہی "اخی" کے خطاب سے مشہور ہو گئے۔ مدت تک تربیت پاتے رہے اور آخر خرقہ خلافت حاصل فرما کر "صاحب ولایت دیار قنوج" بنائے گئے۔ اژدحام مخلوق کی وجہ سے گھبرا کر قنوج سے نکل گئے۔ اور موضع راجگیر میں سکونت اختیار فرمائی۔ ۸۰۰ھ میں وصال ہوا۔ قاضی صاحب، اخی جمشید راجگیری کے نواسے کے پوتے ہیں۔ نسب نامہ یوں ہے: قاضی علیم اللہ بن محمد بن معروف ابن بنت شیخ اخی جمشید راجگیری قدس سرہ (نزہۃ الخواطر، خزینۃ الاصفیا)۔

ایک عرصہ تک آپ نے قاضی حبیب اللہ سندیلوی کی شاگردی میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد ملا لطف اللہ کاکوروی[1] سے باقی علوم درسیہ کی تکمیل سے فراغت حاصل کی۔ کچھ دنوں میں اپنے موروثی پیشۂ قضاء کی مسند پر متمکن ہوئے۔ طلبہ کو علم دین پڑھانا اور ان کو دولت علم سے مالا مال کرنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد قاضی علیم اللہ گوپاموی کے ہاتھ سے عہدۂ قضا نکل گیا تو دکن جا کر بادشاہ خلد مکان کے دربار میں ملازمت کر لی۔ چونکہ اُس وقت کے فنون وعلوم میں آپ یکتا و ماہر تھے۔ وضع میں بھی سادگی پسند تھے او صاف واخلاق میں آپ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کے نمونہ تھے۔ اسی لیے بادشاہ کو آپ سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی۔ بادشاہ نے بدستور سابق دوبارہ آپ کو قضا کا عہدہ مرحمت فرمایا۔ اور بانگرمؤ کے جوار میں ایک گاؤں جاگیر کے طور پر عنایت فرمایا اور آپ کو رخصت کرتے وقت دکن کے سکۂ رائج الوقت میں سے ایک سو دینار بھی عطا کیے۔ قاضی صاحب ان تمام عطیات وانعامات کے ساتھ اپنے وطن مالوف واپس آئے اور زندگی کے باقی ایام علم دین کی اشاعت میں گذارے۔ ۱۱۱۵ھ میں اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر عالم روحانی کی جانب رحلت فرما گئے۔ لوگوں نے آپ کی نعش مبارک گوپاموسے راجگیر لے جا کر اخی جمشید قدس سرہٗ کے مرقد منورہ کے جوار میں دفن کر دی۔

امام مولوی لطف اللہ کورویؒ جو قاضی علیم اللہؒ کے استاد تھے اُس دور کے علماء کے استاد اور امام تھے۔ بڑے بڑے جید علماء آپ کی درس گاہ حکمت پناہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ان ہی میں سے مولوی علی اصغر قنوجی[1] نور اللہ مرقدہٗ بن شیخ عبد الصمد ایک جلیل القدر عالم اور نہایت متقی اور ولی کامل بھی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ختم ہوتا ہے ان کے اجداد میں کوئی بزرگ انقلاب روزگار کے باعث مدینہ منورہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) سے کرمان چلے گئے۔ اور وہیں اقامت فرمائی۔ اُن کے اکابر میں سے "فتاویٰ عمادیہ" کے مصنف حضرت مولانا عماد الدین کرمانی بھی ہیں۔ حضرت مولانا عماد الدین[2] کے فرزند ارجمند شیخ مبارک کرمان سے ہندوستان تشریف لا کر بمقام شہر قنوج قیام فرما ہوئے۔ اسی وقت سے ان کی اولاد اس شہر میں آباد ہے۔

مولوی علی اصغر کو آغاز شباب ہی میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ آپ نے مختصرات اور مطولات مختلف مقامات پر مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ مطولات مولوی لطف اللہ کوروی (روح اللہ روحہٗ) سے آپ نے پڑھیں۔ شیخ احمد ملا جیونؒ امیٹھوی جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے اور مولوی علی اصغر دونوں مولوی

[1] شیخ جمال اولیاء کوروی کے شاگرد رشید تھے۔ حنفی مسلک اور اپنے وقت کے مشاہیر میں شمار تھا، علوم عربیہ، فقہ اور اصول فقہ میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ شیخ احمد بن ابی سعید امیٹھوی اور شیخ علی اصغر ان کے شاگرد تھے۔ (نزہۃ الخواطر)

[2] مولانا عماد الدین، عبد الرحیم ابو الفتح زین الدین مولف "الفصول العمادیہ" کے والد ہیں۔ ۶۵۱ھ میں مولف اس کتاب کی تالیف سے بمقام سمرقند فارغ ہوئے۔ (الفوائد البہیہ)۔

لطف اللہ کے شاگرد رشید اور ہم سبق تھے۔ ہر دو حضرات ایک ساتھ (یعنی مولوی علی اصغر اور ملا جیون) مولوی لطف اللہ کی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ اس کے بعد مولوی علی اصغر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں انھوں نے شیخ پیر محمدؒ سے بیعت کی۔ اور حسب ہدایات مرشد وہیں چلہ نشینی کی۔ پھر مرشد کامل سے اجازت ارشاد و تبلیغ حاصل کر کے قنوج واپس آگئے۔ اور وہیں تادم آخر گوشہ نشینی، عبادت و ریاضت الٰہی میں زندگی گذارتے رہے۔ ساٹھ سال تک طالبان علم دین کو اپنے فیوض و برکات سے مالا مال کیا۔ طلباء کی ایک کثیر جماعت نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اور آپ سے دستار فضیلت حاصل کی۔ آخر عمر میں "نواتب التنزیل" نامی قرآن حکیم کی ایک تفسیر بھی لکھی۔[1]

فقیر کو بھی دو تین بار مولوی لطف اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آپ کی ذات گرامی تقویٰ اور تقدس کا نمونہ تھی۔ سنہ ۱۱۴۰ھ میں حضرت مولوی لطف اللہ قدس سرہٗ رحلت فرمائے عالم جاودانی ہوئے۔ اور اپنی مسجد کے سامنے چبوترہ کے نیچے دفن کیے گئے۔

راقم الحروف نے مصرعۂ ذیل میں آپ کی تاریخ وصال لکھی۔

شد نہاں آفتاب صبح علوم
سنہ ۱۱۴۰ھ

۵۵

میر عبدالہادی قدس سرہٗ

میر عبدالہادی بن عبدالواحد اصغر بن میر سید طیب بن میر عبدالواحد بلگرامی قدس سرہٗ۔ آپ بلند مرتبہ سید اور بلند پایہ دانشور تھے۔ آپ علوم عقلیہ اور نقلیہ کی ایک جامع کتاب کی مانند تھے۔ اور سارے فروعی اور اصولی مسائل کے لیے لوح محفوظ کے مماثل تھے۔ آپ کے اخلاق حسنہ اور خصائل محمودہ انک لعلیٰ خلق عظیم کی تفسیر تھے اور ظاہری حسن و جمال آیت کریمہ: ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم کی تشریح کا مصداق تھا۔

سن شعور کو پہونچتے ہی آپ عین آغاز شباب میں علمی و انسانی کمالات حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ مروجہ علوم کی ابتدائی کتابیں آپ نے میر سید اسمٰعیل بلگرامی سے پڑھیں۔ میر صاحب کے انتقال کے بعد تحصیل علم کی غرض سے مولوی سید قطب الدین شمس آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور درجۂ اوسط کی کتابیں ان سے پڑھیں۔ وہاں سے پھر ملا قطب الدین شہید سہالوی کے شاگردوں میں شامل ہوئے اور باقی

[1] یہ تفسیر آج کل نایاب ہے۔ مترجم

تمام درسی کتابیں ان سے پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ حضرت ملا قطب الدین شہید سہالوی کے شاگردوں میں سب سے زیادہ لائق اور ممتاز تھے۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد اپنے وطن مالوف واپس ہو کر آپنے درس و تدریس کا کام نہایت گرم جوشی کے ساتھ شروع کیا۔ اکثر اہل ذوق حضرات نے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کمالات حاصل کیے۔ اور "عالم" کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

کچھ دنوں بعد تقدیر کی گردش سے مجبور ہو کر بادشاہ خلد مکان (اورنگزیب عالمگیر) کے لشکر گاہ کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر بادشاہ کے دربار سے آپ کو جو منصب عطا ہوا اُس کی انجام دہی کے سلسلہ میں آپ کو الہ آباد اور اس کے مضافات میں موضع "پنڈی" وغیرہ کے انتظامات اور نگرانی کے لیے صوبہ داری کے ممتاز عہدہ پر فائز کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد آپ نے اس خدمت سے دستبرداری کی اور کنارہ کش ہو کر اپنے وطن مالوف کی راہ لی۔ اور دوبارہ پھر اپنی قیام گاہ کو تعلیم و تدریس کا مرکز بنا دیا۔ اور باقی تمام عمر اسی طرح خلق اللہ کو فیوض و برکات سے مالا مال کرتے رہے اور اہلِ کمال لوگوں میں مسرت و انبساط کے ساتھ اپنا وقت گذارتے رہے۔ ۲۰ ربیع الاول شریف ۱۱۳۳ھ کو اس دار فانی سے اپنا رختِ سفر باندھ کر عالمِ جاودانی کی جانب کوچ فرمایا۔

۵۶

شیخ جمال اللہ قدس سرہٗ

بلگرام کے فرشوری شیوخ میں محلہ میدان پورہ کے رہنے والے ہیں۔ اور قاضی اللہ داد قدس سرہٗ کی اولاد میں ہیں جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ آپ انتہائی با اخلاق اور منکسر المزاج سوز و گداز اور دل درد مند رکھنے والے شخص تھے۔ خداوند کریم نے آپ کو علم و فضل کا بھی بہت بڑا سرمایہ عطا فرمایا تھا۔ آپ ہمیشہ کتب بینی اور درس و تدریس ہی میں مشغول رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے مجھ فقیر کی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ نماز کی امامت کے بارے میں "نہر الفائق"[1] اور علم فقہ کی دوسری کتابوں میں فقہا یہ فرماتے ہیں کہ: "المیتمم عن

---

[1] شرح کنز الدقائق (فقہ حنفیہ میں جزئیات کی کتاب ہے اور درسیات میں متداول ہے) مصنف شیخ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد معروف بہ حافظ الدین نسفی متوفی ۷۱۰ھ۔ اس کتاب کے شارح مولانا سراج الدین عمر بن نجیم نے متقدمین اور متاخرین کی آراء اور ان کے خیالات کا نچوڑ بڑے اہتمام سے جمع کیا ہے۔ خاص کر زین العابدین بن نجیم مصری متوفی ۹۷۰ھ کی کتاب بحر الرائق کی تلخیص کی ہے۔ یہ شرح کتاب الطہارۃ سے کتاب القضاء کے باب الحبس تک تحریر کی گئی ہے (کشف الظنون) کنز الدقائق کی متعدد شرحیں ہیں۔ ان میں ایک فخر الدین زیلعی متوفی ۷۴۳ھ کی شرح ہے جو تبیین الحقائق کے نام سے موسوم ہے۔ دوسری شرح "رمز الحقائق" قاضی بدر الدین محمود بن احمد العینی متوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے۔ (کشف الظنون)

الجنابة اولیٰ بالامامة من المتیمم عن الحدث" پھر فرمایا کہ اگرچہ علماء مجتہدین کا قول ہمارے لیے سند ہے اور یہ قول دلیل رکھتا ہوگا۔ لیکن دل یہ چاہتا ہے کہ اس امر کا علم دلائل عقل کے ساتھ حاصل ہو جائے میں نے عرض کیا کہ اس وقت ایک دلیل سمجھ میں آرہی ہے کہ حدث اکبر والے شخص کا تیمم، غسل کا قائم مقام ہے اور حدث اصغر والے کا تیمم وضو کے برابر ہے اس لیے طہارت کبریٰ والا شخص، طہارت صغریٰ والے کے مقابلہ میں امامت کا زیادہ مستحق ہے۔ ممکن ہے کہ حدث اکبر والے (یعنی نجاست کبریٰ والے کو) اور حدث اصغر والے (یعنی بے وضو شخص) کو، دونوں کو اس سے پہلے غیر شعوری طور پر جنابت واقع ہو گئی ہو تو ایسی حالت میں طہارت کبریٰ والا شخص اپنی سابقہ اور حالیہ نجاستوں دونوں سے پاک و صاف ہو گیا۔ اور نجاست حکمی کا شک و شبہ اس سے دور ہو گیا اور طہارت صغریٰ والا شخص اس مشکوک نجاست حکمی سے دور نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں جب کہ ایک شخص جنابت (نجاستِ کبریٰ) کا غسل کر چکا ہو اور دوسرے شخص نے حدثِ اصغر کو دور کرنے کے لیے صرف وضو کیا ہو تو ان دونوں اشخاص میں سے نجاست حقیقی کے امکان اور احتمال سے وہی شخص دور اور طاہر ہوگا جس نے غسل کیا ہے۔

حضرت شیخ جمال اللہ قدس سرہ اپنی عمر کے اواخر میں احمد آباد (گجرات) کی طرف چلے گئے اور بڑودہ کے شہر میں جو گجرات سے چالیس کوس کے فاصلہ پر ہے پہنچ کر بیمار پڑ گئے۔ ۱۰۳۰ھ میں بعمر تقریباً پچپن ۵۵ سال میں وصال فرمایا اور وہیں دفن بھی کیے گئے۔

---

(۵۷)

میر احمد قدس سرہٗ

آپ کا سلسلۂ نسب میر احمد بن سید عبد اللہ بن سید محمود اصغر بلگرامی قدس سرہٗ ہے۔

میر صاحب کے والد ماجد کا نام دراصل سید عبد اللطیف ہے جو سید عبد اللہ کے ایمانی بھائی تھے چونکہ سید عبد اللہ کے کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے انھوں نے میر صاحب کو اپنا متبنّیٰ بنا لیا تھا۔ اور میر صاحب نے خود کو احمد بن عبد اللہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس لیے عوام کے نزدیک وہ اسی نسبت سے مشہور ہیں۔ آپ نہایت علم و فضل کے مالک اور بلند کردار کے انسان تھے۔ اپنے اوصاف حمیدہ، علم و فضل اور بہت سی اخلاقی خوبیوں کے سبب اپنے ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز تھے۔ آپ کے بھائی سید معین الدین کا ذکر سید جان محمدؒ کے تذکرہ کے سلسلہ میں آئندہ صفحات میں آئے گا۔

سید احمد کو لوگ عرف عام میں "مدا" اور ان کے بھائی سید معین الدین کو "موناں" کہتے تھے۔

چونکہ ان دونوں بھائیوں نے تمام عمر رئیسانہ اور امارت کے ساتھ بسر کی تھی اسی لیے شہر کے لوگوں میں یہ مثل مشہور ہو گئی تھی کہ "مدا، موناں سدا سوناں" سید احمد بڑے خوشنویس اور نہایت پختہ تحریر کے کاتب تھے۔ خطِ نستعلیق اور خطِ شکست دونوں میں آپ کو بڑی مہارت تھی۔ آپ کا دستور یہ تھا کہ ہر روز بلا ناغہ فجر کی نماز کے بعد آپ دو ورق کتابت ضرور کر لیا کرتے تھے۔ اس معمول کی وجہ سے بہت سی کتابیں آپ کے قلم کی لکھی ہوئی اب بھی موجود ہیں۔

میر صاحب اپنی سخاوت اور شجاعت میں بے نظیر تھے۔ آپ کو نواب مکرم خان بن نواب شیخ میر عالمگیری نے پہلے تو موضع "پہاسو" کا حاکم بنایا تھا۔ اس کے بعد "داسنہ" وغیرہ مواضع کی حکومت عطا فرمائی۔ جو دہلی کے مضافات میں ہے۔ آپ اپنی اس ذمہ داری کو بڑی دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

حکومت و ریاست کی ان مصروفیات کے باوجود آپ اپنا وقت عزیز عبادت الٰہی میں بھی نہایت پابندی اور اہتمام کے ساتھ صرف فرماتے تھے۔ ۴ر جمادی الاول ۱۰۹۶ھ کو جنت الفردوس کی راہ لی۔ آپ کا انتقال مراد آباد ضلع میں قصبۂ سنبھل (مراد آباد) کے قریب ایک مقام پر ہوا۔ آپ نے اپنے بھائی سید معین الدین کو یہ وصیت کی تھی کہ آپ کی نعش کو آپ کے وطن پہونچا دیں گے۔ آپ کے جسم کو پہلے تو لوگوں نے مراد آباد کی سرزمین میں دفن کیا۔ پھر چھ ماہ کے بعد بلگرام میں منتقل کر کے "باغ محمود" میں دفن کر دیا۔

راقم الحروف (مؤلف) نے قرآن پاک کی آیت کریمہ "وَتَحِیَّتُهُمْ فِیهَا سَلَامٌ" ۱۰۹۶ھ سے آپ کی تاریخ وفات نکالی۔

میر احمد نے سلطان اورنگ زیب عالمگیر خلد مکان رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں "باغ محمود" کے کنارے ۱۰۹۲ھ میں ایک کنواں بنوایا تھا جو "حوضِ کوثر" کے مانند ہے۔ اسی وقت سے محلہ میدان پورہ کے رہنے والے تمام لوگ اور اس کے اطراف کے باشندگان اسی کنویں سے پانی پیتے ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف نے اس کنواں کی تاریخ ذیل کے قطعہ میں قلم بند کی ہے۔

محیطِ جود احسان میر احمد — کہ فیضش در جہاں گردید ساری
عمارت کرد چاہِ خیر بنیاد — کہ دارد تا قیامت استواری
ز آبِ حوضِ کوثر جام سرشار — جزائے ایں عمل یابد ز باری
بکام تشنگاں تاریخ سالش — رقم کردم زلالِ خیر جاری ۱۰۹۲ھ

میر احمد، سید ضیاء اللہ قدس سرہما کے ہم عصر اور ساتھیوں میں سے ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ میر احمد کا تذکرہ بھی اس سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ مگر ان کا ذکر اس مقام پر اس لیے کیا گیا تا کہ میر احمد و علامہ عبد الجلیل مرحوم کے تذکروں میں زیادہ فصل اور بُعد نہ رہے۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ میر احمد اور سید ضیاء اللہ دونوں "آپس" میں بڑے گہرے

روحانی تعلقات رکھتے تھے۔ اس مقام پر میں میر احمد اور سید ضیاء اللہ کے دو خطوط بطورِ نمونہ و یادگار (جو ایک دوسرے کو ان دونوں نے تحریر کیے تھے۔) قلمبند کر رہا ہوں!

میر احمد کے نام سیّد ضیاء اللہ کا خط

در خرمنِ کائنات کردیم نگاه — یک دانہ محبت است وباقی ہمہ کاہ

سبحان اللہ! کیا کہنے ہیں اس ایک دانہ کی قیمت کے جو خشخاش کے دانہ سے بھی چھوٹا ہے حضرت آدم صفی اللہ علیہ السّلام نے اس ایک دانہ کی طلب میں جنت کی نعمتوں کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا اور ہر قسم کی تکلیف اور سختی جو بھی ان کو پیش آئی انھوں نے خندہ پیشانی سے اسے برداشت کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اس دانہ کے اشتیاق میں نہ جانے کتنے آنسوؤں کے موتی لٹائے کہ "وابیضت عیناہ من الحزن" اس کی تفسیر میں آیا ہے۔ صدر نشین محفل رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے استغنا اور بے پروائی برتی اور وہ بھی اس طرح کہ مکّہ (زاد اللہ شرفا وتعظیما) کے پہاڑ بھی سونے کے بنا دیئے گئے مگر گوشۂ چشم سے بھی آپ نے التفات نہ فرمایا۔ دررفعنالک ذکرک سے آپ کی عظمت و بلندی ظاہر ہے۔ مختصر یہ کہ اس کائنات میں ایک متنفس ایسا نہ ہوا۔ نہ ہے اور نہ ہوگا جس کے سر میں یہ سودائے خیال نہ ہو۔ بیچارہ مجنوں اسی خیال میں دنیا سے گذر گیا۔ غریب فرہاد نے اسی شوق میں جان دے دی۔ زلیخا نے اسی دانہ کی قوت سے بیٹے کو باپ کی آغوش سے جدا کر دیا۔ افسوس ہے اس عقلمند پر جو اپنی حماقت سے اس دانہ کی طلب سے باز رہا۔ اب ہم اپنے مقصد پر آتے ہیں۔ بندہ اگرچہ چاہنے والوں کے لطیف مذاق اور ان کے حوصلے سے واقفیت نہیں رکھتا لیکن بہرحال کسی حد تک لذت سماع پیدا کر لی ہے۔ جس پر پورا پورا بھروسہ کرتا ہے۔ درآں حالیکہ یہ فقیر خود کو اہل محبت لی خاکپا سمجھتا ہے۔ لیکن کچھ نہیں معلوم کہ آں عزیز نے اپنے دانہ کو جو مقسوم ازل ہے (ہمیشہ سے محبت کی یہ دولت ملی ہوئی ہے) کیوں ایک ایسے پرندہ کے سامنے ڈال دیا ہے جو انتہائی بلند پرواز ہے۔ یا تکانِ سفر کے باعث ایک جگہ پڑے ہوئے سامان میں ملا دیا ہے جس پر گرد و غبار جم گیا ہے اس بے توجہی کا سبب جو واقعی ہے کسی طرح ظاہر کریں اور تحریر کریں جس سے دل کی بے چینی رفع ہو۔

یہ مفروضہ کہ یہ مخلص دوستی کے حقوق میں کم سمجھا جائے یہی اس کی غفلتوں کا ثمرہ ہے، برمحل ہے لیکن چونکہ بدی کا بدلہ بدی سے دوستی اور محبت کے مسلک میں اچھا نہیں ہے اس لیے یہ ہونا چاہیئے کہ کہ اس طرف کی کاہلی اور سستی پر نظر نہ ڈال کر اپنی جانب سے احسان فرمائیں۔ اور پریشان احوال کو عفو و درگذر کے اعلیٰ کردار سے احسان مند فرمائیں۔ کیونکہ خوش آئند وعدے اور عاشقی کے حقوق ذہن سے اتر گئے ہیں۔

اے عجب آں عہد وآں سوگند کو | وعدہ ہائے آں لبے چوں قند کو
گر فراق بندہ از بد بندگی است | چوں تو باید بدکنی پس فرق چیست

میر احمد کا جواب سید ضیاء اللہ کے نام

عنبر کی خوشبو سے بھرے ہوئے مکتوب گرامی نے دوستوں کے دماغ کو معطر کر دیا اور دل مضطر کو سکون بخشا۔ یقیناً محبت کے پہاڑوں کا وزن انا عرضنا الامانۃ علے السموات والارض کے ارشاد باری کے مطابق معلوم ہے کہ آسمانوں کی شکلوں نے اپنی تمام تر بلندیوں کے ساتھ اور تمامی مخلوقات نے باوجود عظمت و بزرگی کے اس وزن گراں کے اٹھانے میں کس قدر "تھر آہٹ" محسوس کی ہے۔ اور کمر جھکا کر معذرت کا اظہار کیا ہے اور سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی آسانی کے ساتھ اس کو اٹھا لیا۔ اور اولیائے امت قدس اللہ اسرارہم نے ان کی اتباع کے طفیل خشخاش کے دانہ سے بھی کمتر چیز سمجھ کر نیاز کے شانہ پر رکھ لیا۔ اور ھل من مزید کا نعرہ بھی لگایا لیکن ہم حیوان صفت اس دانہ سے صرف اتنا ہی معلوم کر سکے کہ اس کا پھل بھول اور نسیان (بھول چوک) اور اس کا پتہ بے پروائی اور بیکاری ہے۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ انا ظلمنا کی فریاد عذر خواہ ہوئی اور شرمندگی کے آنسوؤں نے داغ گناہ کو دھو دیا۔

بغیر از عذر تقصیر اندریں راہ
ندارد چارۂ بیچارہ درویش

بہر حال عزیزوں کے ارادۂ بلند کی مدد اور ان کے انفاس قدسیہ کی برکت سے امید ہے کہ غفلت و نسیان کا پردہ اس خیر اندیش کے سامنے سے اٹھ جائے گا اور دریائے محبت کا ایک ذرہ نصیب ہو جائے گا۔

کوتاہ کنم سخن کزیں پس | وصل است جواب نامہ و بس

---

(۵۸)

میر عبدالجلیل نور اللہ ضریحہٗ

آپ حضرت میر احمد مذکور الصدر کے باکمال صاحبزادے ہیں۔ اس بات پر تمام بزرگوں کا اتفاق ہے کہ حضرت میر عبدالجلیل قدس سرہٗ بڑے بلند پایہ متقی اور جلیل القدر عالم و فاضل تھے۔ دل اطہر کی پاکیزگی، قلب انور کی صفا اور ذات و صفات کی بزرگی و برتری کے لحاظ سے آپ اپنے زمانہ کے یکتا اور

بے مثل علماء و مشائخ میں سے گذرے ہیں۔ اپنا دل ہمیشہ بادشاہ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی یاد سے پُرجوش اور اس کے ذکر میں معروف رکھتے تھے۔ بایں ہمہ دنیاوی بادشاہ کی خدمت کے لیے بھی کمر بستہ رہتے تھے۔ ؎

مرد حق در عین دنیا داری از دنیا بری است — ملک در دست سلیمان نیست در انگشتری است

ان کے جملہ فضائل و کمالات میں سے ایک سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ نے اپنی خوش نصیبی کی برکت سے شاہ ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا اور آپ کے دست اقدس پر بیعت کی۔ اس عطیۂ کبریٰ اور نعمت عظمیٰ کا شکریہ آپ نے منقبت کے اپنے ایک قصیدہ میں یوں ادا کیا ہے ؎

دین پناہا! تفضل آگاہا! — دل پاک تو شمع عرفان است
کردہ ام بیعت تو در رؤیا — این سعادت ز فضل رحمان است
دستم آخر گرفتہ بہ کرم — می شناسم کہ ایں چہ احسان است
من و ایں رتبہ از کجا لیکن — مور پروردہ سلیمان است

اور عالم بیداری میں سید لیسین حموی صاحب سجادہ غوث صمدانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے سلسلہ سے اویسی تھے اور غائبانہ بیعت کی تھی۔ آپ نے ابتدائی کتابیں استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامیؒ کے ساتھ میر سید سعد اللہ بلگرامیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر پڑھیں۔ اس کے بعد پورب کے قصبات میں گھوم پھر کر متوسطات مختلف مقامات پر پڑھیں۔ بالآخر حضرت شیخ غلام نقشبندؒ لکھنوی کے حلقۂ درس میں درسیات کی تکمیل کی۔ علم حدیث کی تکمیل آپ نے قطب المحدثین حضرت میر سید مبارکؒ بلگرامی نور اللہ مضجعہٗ سے کی۔ تمام عقلی و نقلی علوم میں خصوصاً علم حدیث و تفسیر، لغت اور ادبیات عربی کے تمام دوسرے فنون نیز علم تاریخ اور فن موسیقی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ قوت حافظہ اتنی زبردست تھی کہ قاموس اللغت[1] شروع سے آخر تک آپ کو زبانی یاد تھی۔

احادیث نبوی، اسماء الرجال، اشعار، ضرب الامثال اور فن تاریخ کے واقعات آپ کو اس قدر یاد تھے کہ سامعین متحیر و ششدر رہ جاتے تھے۔ زمانہ کی آنکھوں نے ایسی جامعیت سے متصف اور باکمال جوہر ایک مرد جو ہر فن میں مہارت تامہ رکھتا ہو نہیں دیکھا تھا جس کے جوہر قابل اور کمالات فن نے اس باکمال کے وجود باجود کی برکتوں سے شہر بلگرام کو عزت و شہرت عطا کر رکھی تھی۔

اورنگ آباد دکن میں آپ کو سلافۃ العصر کے مصنف سید علی معصوم[2] مدنی سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔

---

[1] یعنی القاموس المحیط مصنفہ محمد بن یعقوب مجد الدین فیروز آبادی۔ یہ کتاب مصر میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ اور اس کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں جیسے تاج العروس اور منتہی الارب فی لغات العرب مصنفہ شیخ عبد الرحیم بن عبد الکریم صفی پوری۔ ناشر۔ [2] میر علی معصوم مدنی (۱۰۵۲ھ - ۱۱۱۹ھ) ابن سید نظام الدین احمد بن سید معصوم شیعی دشتکی شیرازی مشہور ادیب اور شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ سلافۃ العصر فی محاسن اعیان العصر، قاموس کے طرز پر فن لغت میں انوار الربیع فی انواع البدیع، الدرجات الرفیعہ فی طبقات الامامیۃ الشیعہ، دیوان شعر اور کتاب سلوۃ الغریب ان کی تالیفات ہیں۔ میر علی معصوم کا خاندان شیراز میں علم و فضل کا گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔ (نزہۃ الجلیس، ابجد العلوم، ایضاح المکنون، البدر الطالع، نزہۃ الخواطر)

حضرت سید علیؒ فرماتے تھے کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں میر عبدالجلیل جیسا جامع علوم و فنون اور باکمال شخص نہیں دیکھا۔

سید علی معصومؒ مدنی کا ذکر اس کتاب کی دوسری جلد میں آئے گا۔ شیخ غلام نقشبند لکھنوی قدس سرہ بھی ہمیشہ علامہؒ میر عبدالجلیل کی تعریف و توصیف فرمایا کرتے تھے۔ شیخ غلام نقشبندؒ لکھنوی نے اپنی قوت فکر سے ایک تاریخی دائرہ کھینچ کر علامہ مرحوم میر عبدالجلیل کے پاس بھیجا اور دائرہ کے بنانے کا طریقہ ان کو تحریر نہیں کیا۔ علامہ مرحوم نے اپنے ذہن رسا سے اس دائرہ کا راز معلوم کر لیا اور ایک دوسرا دائرہ جو پہلے والے اصلی دائرہ سے زیادہ خوشنما اور لطیف تھا۔ اپنی جانب سے بنا کر شیخ غلام نقشبند لکھنویؒ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس دائرہ کو دیکھ کر حضرت شیخ نے ایک خاص خط اپنے قلم سے لکھ کر علامہ مرحوم میر عبدالجلیل کو ارسال کیا۔ اس کی عبارت (کا ترجمہ) ذیل میں درج ہے۔

"میر والا مدارج انسانی، مجمع فیوضات ربانی سلامت۔ انعامات کی خوشبو سے بھرا ہوا گرامی نامہ جس میں بلگرام پہنچنے کی تفصیل اور وقائع نگاری اور بخشی گری کے عہدہ پر تقرری کی تفصیلات درج ہیں موصول ہوا۔ انتہائی مسرت کا باعث ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دوستوں کی خواہش کے مطابق اطمینان کے ساتھ اس جانب گامزن ہوئے۔ فقیر کو انتہائی مخلص سمجھ کر یاد اور دعا سے دور نہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اطمینان قلب میں مسرتوں کا اضافہ فرمائے۔

دوسرے یہ کہ مرسلہ رسالہ معجز نما اور دائرہ پہونچا۔ زبان اس کی تعریف سے قاصر ہے۔ یقیناً آپ کی ذاتِ مقدس اس زمانہ میں بے نظیر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ ہما پایہ ہمیشہ رکھے کیا کہنے ہیں آپ کے فہم اور روشن دماغ کے کہ اس دائرہ کا آغاز و مبدا بھی آپ کو معلوم نہیں تھا اور آپ نے دائرہ خود ہی بنالیا۔ غرض کہ آنجناب کا کمال تحریر سے باہر ہے۔ دیکھنا ہے کہ ملاقات کے لیے اشتیاق کی گھڑیاں کب ختم ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا فرمادے۔ والسلام (خط کا مضمون ختم ہوا)

اسی مذکورۂ بالا دائرہ کے طریقہ پر محرر سطور (مؤلف کتاب) نے بھی علامہ مرحوم کی تاریخ وصال کا ایک دائرہ وضع کیا ہے جو دوسری جلد[1] میں آئے گا۔



[1] یہ دائرہ مولف کی کتاب "ماثر الکرام" کی دوسری جلد سرو آزاد میں تحریر ہے یہاں اس کی نقل دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اس دائرہ سے تاریخ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ چودہ خانوں میں سے جس خانہ کو بھی چاہیں "مبدا" قرار دے دیں اور تمام اعداد کو جمع کریں۔ نتیجہ حسب مرضی حاصل ہو جائے گا۔ (مترجم)

اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایات سے آپ دونوں جہاں کی نعمتوں اور دولتوں سے مالا مال اور کامیاب ہوئے قرآن حکیم کی آیت کریمہ وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ؕ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ؕ (سورہ النحل آیت ۱۲۲) کے مضمون کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری و باطنی دونوں طرح کی نعمتوں سے بکمال درجہ نوازا تھا۔ استاد المحققین میر طفیل محمد روح اللہ روحہٗ کی اتفاق رائے سے آپ نے تحصیل علم کے لیے دار الخلافہ آگرہ کا قصد فرمایا۔ وہاں بادشاہ خلد مکان کے میر منشی نواب[1] فضائل خان کے ساتھ رہ کر آپ نے بہت سے فوائد حاصل کیے۔ (جو اس زمانہ میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر آگرہ میں گوشہ نشین ہو کر مقیم تھے) نواب مذکور ہی کی مدد کے باعث آپ نے آگرہ میں کچھ عرصہ قیام فرمایا۔

جب شاہ حسین خاں بادشاہ خلد مکان (اورنگ زیب عالمگیر) کے دربار سے دیوان کے عہدہ پر فائز ہو کر لکھنؤ کے لیے متعین کیے گئے اور دکن سے اکبر آباد پہنچے تو انھیں کے ساتھ علامہ میر عبد الجلیل مرحوم بھی لکھنؤ آئے اور وہاں پانچ سال تک مقیم رہ کر آپ نے خان مذکور سے بہت سے فائدے حاصل کیے۔ آپ کی ظاہری اور دنیاوی ترقی کی بنیاد یہیں سے پڑی۔ حضرت شیخ غلام نقشبند لکھنوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہو کر تحصیل علم کا موقع بھی آپ کو اسی زمانہ میں میسر آیا۔ جب شاہ حسین خاں لکھنؤ کی دیوانی کے عہدہ سے معزول ہو کر صوبۂ پٹنہ کی دیوانی کے عہدہ پر مامور کیے گئے تو ان کی معیت میں علامہ میر عبد الجلیل بھی پٹنہ تشریف لے گئے۔ اور کچھ عرصہ تک آپ نے اس علاقہ میں نہایت سکون و اطمینان کی زندگی گزاری۔ پھر کسی تقریب میں آپ کو بلگرام آنے کا اتفاق ہوا۔ بلگرام کے زمیندار سید محمد فیض نے اسی زمانہ میں خارج علم کے فتنہ و شر سے پریشان ہو کر (جس کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے) بادشاہ خلد مکان کے دربار میں حاضری کے لیے دکن کا سفر کیا۔ سید محمد فیض سے خصوصی تعلقات کی بنا پر علامہ مرحوم بھی اُن کی حمایت و ہمراہی میں دکن کے سفر کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اور دونوں حضرات ایک ساتھ بادشاہ خلد مکان کے لشکر گاہ میں وارد ہوئے۔ اس سفر میں اورنگ آباد پہنچ کر ناصر علی[2] سے ملاقات ہوئی اور کچھ عرصہ بعد ہی

---

[1] میر ہادی ابن میر جامی اکبر آبادی مخاطب بہ فضائل خاں۔ بادشاہ عالمگیر کے امراء میں سے تھے۔ شیخ عبد العزیز بن عبد الرشید حسینی اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے لڑکے شہزادہ محمد اعظم کے مقرب خاص تھے۔ تمام معاملات میں شہزادہ کے معتمد تھے۔ آخر میں شاہی ملازمت سے سبکدوش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے اور درس و تدریس کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ عالمگیر بادشاہ نے ان کو کتب خانہ کے ناظر کا منصب عطا کیا تھا۔ تمام علوم و فنون میں یکتا تھے سنہ ۱۱۱۳ھ میں انتقال ہوا۔ (مآثر الامراء، نزہۃ الخواطر) [2] ناصر علی سرہندی صاحب علم، شاعر بے بدل اور صوفی مشرب تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ شیخ محمد معصوم کے شاگرد تھے۔ امراء کے ساتھ تعلقات تھے۔ بڑے آرام و سکون کی زندگی گزاری۔ مرزا فقیر اللہ مخاطب بہ سیف خاں بدخشی، خواجہ شاہ کے لڑکے عادل شاہ مخاطب بہ شریف خاں غضنفر خاں، ذو الفقار خاں ابن اسد خاں وزیر اعظم بادشاہ خلد مکان وغیرہ کے ملازم رہے اور ان لوگوں کی تعریف میں بڑھ چڑھ کر قصائد کہے۔ جب ذو الفقار خاں نے کرناٹک فتح کر کے نیا الاوہ کیا تو آپ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس علاقہ میں شاہ حمید مجذوب کے بہت معتقد ہو گئے۔ اور ان کی شان میں بھی قصائد مدحیہ تحریر کیے۔ آخر میں دکن سے دار السلطنت شاہجہان آباد آ کر مقیم ہو گئے یہاں تک کہ سنہ ۱۱۰۸ھ میں جنت الفردوس کی راہ لی۔ (مفتاح التواریخ، خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، کلمات الشعراء)

بلگرام واپس آنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اسی دوران خبر ملی کہ شاہ حسین خاں صوبۂ بنگال کے دارالسلطنت مرشد آباد میں انتقال کر گئے۔ علامۂ مرحوم نے ذیل کے قطعہ میں ان کی تاریخ وفات قلمبند فرمائی۔

خان خورشید نسب شاہ حسین — ذات او مظہر آیات جلی
آں امیرے کہ در انواع شکوہ — داشتہ مرتبۂ بے بدلی
گوہر فکر وزیرانِ جہان — پہلوی رائے منیرش عملی
در ہزار و صد و ہشت از ہجرت — کرد نہضت بہ ریاضِ ازلی
سال تاریخ خرد گفت چنیں — باد حشرش بہ حسین ابن علی

شاہ حسین کے انتقال کے بعد ان کے سعادت مند فرزند میر محمد رضا نے (۱۱۰۹ھ) جو شاہزادہ عظیم الشان[1] بن شاہ عالم کے ہم زلف تھے۔ بنگالہ سے بادشاہ خلد مکان کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلہ میں بلگرام بھی آئے اور علامۂ مرحوم کے دیوان خانہ میں کچھ روز قیام پذیر رہے۔ وہاں سے میر محمد رضا اور علامۂ مرحوم دونوں ایک ساتھ ۱۱۱۱ھ میں دکن کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ سفر کی دشوار گذار اور دور دراز منزلیں طے کرتے ہوتے "اسلام پور" میں جو "بیجا پور" کے مضافات میں ہے عالمگیری لشکر گاہ میں پہنچ کر شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ ایک دن علامۂ مرحوم مرزا یار علی بیگ کی مجلس میں شریک ہوئے جو حضور بادشاہِ معظم کے حالاتِ زندگی کے مصنف تھے۔ میرزا کا دستور تھا کہ ہمیشہ قاموس (فنِ لغت کی ایک مستند اور بلند پایہ کتاب) کی صحت اور مقابلہ کیا کرتے۔ اور اس کام میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا کرتے تھے۔ مرزا صاحب نے قاموس کے کچھ پیچیدہ اور حل طلب مسائل ذی صلاحیت اہل محفل کے سامنے پیش کیے۔ حاضرین محفل میں سے کوئی شخص بھی ان کے سوالات کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکا۔ علامۂ مرحوم نے مرزا کے پیچیدہ مسائل کو نہایت معقول طور پر حل کر دیا اور حاضرین مجلس نے علامۂ موصوف کی بہت کچھ تعریف کی۔ مرزا یار علی بیگ نے علامۂ مرحوم کی عزت افزائی اور قدر شناسی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انھوں نے علامہ کی ظاہری و باطنی کمالات کی نہایت مناسب الفاظ میں بادشاہ سے تعریف کی اور بادشاہ عالی جاہ کی خصوصی توجہ علامۂ مرحوم کی جانب مبذول فرمائی۔ بادشاہ سلامت نے بلگرام سے قریب سائی پور کے محال سے کچھ جاگیریں اور آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے شایانِ شان "بخشی گری" کا منصب اور "گجرات شاہ دولہ" کی وقائع نگاری کا عہدہ آپ کو عطا فرمایا۔ علامۂ موصوف

---

[1] شہزادہ عظیم الشان بادشاہ عالمگیر کے زمانہ سے ہی بنگال کی صوبہ داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایک عرصہ تک شہر پٹنہ میں اس علاقہ کے نظم و نسق کے سلسلہ میں مقیم رہے اور پٹنہ کا نام تبدیل کر کے عظیم آباد رکھا جب انھوں نے اپنے والد شاہ عالم بن عالمگیر کے علالت کی خبر سنی۔ اپنے صاحبزادہ محمد فرخ سیر کو اپنا نائب بنا کر عظیم آباد میں چھوڑا اور خود والد کی خدمت میں پہنچے اور جہاندار شاہ سے جنگ کے دوران شہید ہوئے۔ (مفتاح التواریخ)۔

و مرحوم نے اس عہدہ پر فائز ہونے کی تاریخ ذیل کے قطعہ میں یوں قلمبند فرمائی :۔

مرا از جناب خلافت عطا شد — زروئے کرم خدمت عیش افزا
خرد گفت تاریخ تفویض خدمت — وقائع نگاریٔ گجرات زیبا

علامہ مرحوم نے عطیات و انعامات شاہی کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے دکن سے اپنے وطن مالوف کی حاضری کا ارادہ کیا اور اسی سال ذی الحجہ کے مہینہ میں وطن واپس آنے کی مسرت حاصل فرمائی۔ اس کے بعد ۱۱۱۳ھ میں بماہ محرم بلگرام سے گجرات کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ماہِ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ کو گجرات پہنچ کر اس کی فضا کو اپنی برکتوں سے منوّر فرمایا۔ علامۂ مرحوم نے تقریباً چار سال تک یہ دونوں خدمتیں نہایت خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دیں۔ پھر ۱۱۱۶ھ میں ان دونوں عہدوں سے دستبردار اور سبکدوش ہو کر اپنے وطن مالوف کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی سال جمادی الاولیٰ کے مہینہ میں بلگرام پہنچ کر وطن کی سرزمین کو اپنے قدموں کی برکتوں سے منوّر فرمایا۔ اس وقت مؤلف (میر غلام علی آزاد) کی عمر تین ماہ کی تھی۔ مرزا یار علی بیگ غائبانہ علامۂ مرحوم کی قدردانی و امداد میں معروف رہتے تھے۔ چنانچہ اس سال بھی انھوں نے علامۂ مرحوم کے لیے بادشاہ خلد مکان کے دربار سے بھکر اور سیوستان کے صوبوں کے بخشی گری، وقائع نگاری اور سوانح نویسی کی خدمتیں منظور کرائیں۔ اور ان عہدوں کے لیے فرمان شاہی حاصل کر کے اپنے خاص قاصد کے ذریعہ بلگرام میں اطلاع بھیجی۔ اور لکھا کہ اب کے پچھلی دو خدمتوں کے بجائے کئی خدمتیں عطا کی گئی ہیں۔ علامہ کو دکن کی زحمتِ سفر نہیں اٹھانی چاہیئے۔ بلکہ اپنے وطن مالوف سے براہِ راست اس مقام پر پہنچنا چاہیئے۔ جہاں کی یہ خدمات سپرد کی گئی ہیں۔ مرزا یار علی بیگ نے ایک دوسرے قاصد کو شاہی فرمان کی ایک نقل کے ساتھ بھکر اور سیوستان بھیجا اور وہاں کے لوگوں کو متذکرہ بالا عہدوں پر علامہ مرحوم کے تقرر سے باخبر کر دیا۔ اتفاق سے جس قاصد کو مرزا نے بلگرام بھیجا تھا راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جب قاصد کی متوقع مدت آمد و رفت پر کافی زمانہ گذر گیا تو قدردان مرزا نے شاہی دربار کے دفتر سے فرمان شاہی کی ایک دوسری نقل حاصل کر کے ایک دوسرے قاصد کے ہاتھ بلگرام روانہ کیا۔ اس خوشخبری کی اطلاع پاتے ہی جمادی الاولیٰ ۱۱۱۸ھ کے مہینہ میں علامۂ مرحوم فوراً بلگرام سے صوبہ سندھ کو روانہ ہو گئے۔ اور اسی سال ۴ رجب المرجب کو شہر بھکر میں تشریف فرما ہوئے۔ بھکر پہنچ کر علامۂ مرحوم نے اپنے نئے عہدہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ بادشاہ خلد مکان (اورنگ زیب عالمگیر) کے انتقال کے بعد بھی چونکہ شاہزادوں اور ارکان سلطنت کے دلوں پر علامۂ مرحوم کی قدر و منزلت اور رعب و عظمت کا گہرا نقش جما ہوا تھا۔ اس لیے آنے والے ہر دور میں تخت سلطنت کے وابستگان متواتر دربار شاہی سے علامہ مرحوم کی خدمات مذکورہ پر مستقل کے احکام بھیجتے رہتے تھے۔ تاکہ علامہ کو بھکر سے باہر نکلنے کی

ضرورت پیش نہ آئے۔ یہاں تک کہ بادشاہ محمد فرخ سیر کے زمانہ میں پرگنہ "جتوئی" کے مقام پر جو صوبہ بھکّر کے علاقہ میں واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک عجیب و غریب طریقہ سے ظاہر ہوئی۔ وہ یہ کہ چھوٹے اولوں کے برابر مصری کے ٹکڑے اَبر سے برسے۔ اور اس غیبی شیرینی کی بارش سے ایک عالم شیریں دہن اور شیریں کام ہوا۔ علامہ مرحوم نے اس عجیب و غریب واقعہ کو اپنی ایک رُباعی میں نظم کر کے وقائع کے رجسٹر میں شامل کر کے (وقائع کے مراسلات کے ساتھ) دربار شاہی میں بھیج دیا۔ رباعی مذکور درج ذیل ہے سے

فرخ سیر آں شہنشہ با برکات — چرخ از ادب او شدہ شیریں حرکات

در سندھ ز یمن عہد عشرت مہدش — بارید سحاب ریزۂ قند و نبات

میر جملہ سمرقندی جو اس وقت تمامی امور سلطنت کے مہتمم اور مدار المہام تھے اور حضور معلّٰی کے سوانح کی خدمت بھی انھیں کے سپرد تھی اور آخر میں صدر الصّدور کے عہدہ پر فائز ہو گئے تھے۔ علامہ مرحوم کے واقعات کی اس رپورٹ اور فرد وقائع کو دیکھتے ہی، بغیر اس کے کہ اس کی تحقیقات کا حکم دیں اس اطلاع کے غلط اور خلاف واقعہ ہونے پر گمان کر بیٹھے۔ اور اسی بنا پر انھوں نے علامہ میر عبد الجلیل قدس سرہٗ کو ۱۱۳۰ھ کی ابتدا میں ان کے عہدہ سے برطرف کر دیا۔ علامہ مرحوم نے اسی سال بھکّر سے شاہی دار السلطنت (شاہ جہان آباد) کی طرف رخ کیا۔ وہاں پہونچ کر اُس خلوت میں جہاں نواب قطب الملک سید عبد اللہ خاں وزیر اعظم اور امیر الامراء سید حسین علی خاں دونوں حضرات یکجا ہوتے تھے۔ آنجناب نے سارا واقعہ بیان کیا۔ اور رباعی مذکور بھی دونوں حضرات کو سُنائی۔ امیر الامراء سید حسین علی خاں نے فوراً اسی مجلس میں علامہ مرحوم کے عہدہ کی بحالی کا حکم نافذ فرمایا۔

علامہ مرحوم نے اس حکم نامہ کی سند حاصل کر کے بھکّر کے شہر کو ارسال کر دی اور یہ تازہ حکم

ے ان کا نام عبد اللہ تھا۔ خلد مکان کے زمانہ میں ابتدا از جہانگیر نگر عرف ڈھاکہ کے جو صوبہ بنگال میں ہے قاضی مقرر ہوئے۔ بعد میں شہر عظیم آباد کے قاضی مقرر کیے گئے۔ فرخ سیر کے زمانہ میں (۱۱۲۴ھ - ۱۱۳۱ھ) ہفت ہزاری کا منصب سات ہزار سوار اور خطاب میر جملہ خان خانان معظم خاں بہادر مظفر جنگ سے نوازے گئے۔ اگرچہ بظاہر دیوان خاص اور محکمۂ ڈاک کے دارو غہ تھے۔ لیکن دربار شاہی میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ کسی فرمان پر بادشاہ کی دستخط ان کی دستے سے ہوتی تھی۔ سادات بارہ سے حسد پیدا ہوا اور ان کی شکایت بادشاہ کے کان تک پہونچائی۔ اسی سبب سے سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں سے اختلاف پیدا ہوا جو بالآخر ان کے تنزل کا سبب بنا۔ بادشاہ فردوس آرامگاہ کے زمانہ میں انتقال ہوا۔ (مآثر الامراء مفتاح التواریخ) ے یہ دونوں بھائی سادات بارہہ میں سے تھے۔ سید عبد اللہ خاں بہادر شاہ کے زمانہ میں (۱۱۱۹ھ - ۱۱۲۴ھ) صوبیداری الٰہ آباد اور حسین علی خاں صوبہ داری بہار سے سرفراز کیے گئے۔ فرخ سیر کے زمانہ میں (۱۱۲۴ھ - ۱۱۳۱ھ) سید عبد اللہ خاں نے وزارت کی خلعت و قطب الملک بہادر یار وفادار ظفر جنگ اور سید حسین علی خاں امیر الامراء کے خلعت سے ممتاز ہوئے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۱ھ) حسین علی خاں جو چھوٹے بھائی تھے۔ بادشاہ کی مرضی سے دکن کے راستہ میں میر حیدر خاں کاشغری کے ہاتھ سے ۱۱۳۲ھ میں مار ڈالے گئے۔ اور قطب الملک ۱۱۳۳ھ میں اسیر ہوئے۔ کچھ دنوں مجلس میں شامل رہے پھر ۱۱۳۵ھ میں انگور زہر دے دیا گیا۔ میر عبد الجلیل واسطی نے حسین علی خاں کی شہادت کے سلسلہ میں ۱۲ اشعار پر مشتمل مرثیہ بھی لکھا ہے جو ان کی تاریخ بھی ہے۔ (مفتاح التواریخ، نزہتہ الخواطر)

شیخ محمد رضا بجگری کے پاس بھیج دیا گیا[1] اور شیخ محمد رضا بجگری کو غائبانہ وہاں کا نائب مقرر کر دیا گیا آپ سنہ ۱۱۳۰ھ میں خود ہی اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ اور اپنی خدمات کی ذمہ داریاں آپ نے میر سید محمد رضا کے سعادت مند بیٹے کو سپرد کر دیں۔ اور سولہ سال کی مدت کے بعد سنہ ۱۱۳۲ھ میں آنجناب نے اپنے وطن مالوف بلگرام کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے پھر با برکت اور منور فرمایا۔ بلگرام میں صرف ایک سال قیام فرما کر آپ نے پھر دار الخلافہ شاہجہان آباد کا سفر فرمایا۔ آپ کی بلگرام تشریف آوری کے وقت راقم الحروف (مؤلف کتاب) کی عمر سترہ[2] سال تھی۔ اس وقت فقیر کو سن شعور میں علامہ مرحوم کی زیارت کا یہ شرف پہلی بار نصیب ہوا تھا۔ یہ بندۂ ناچیز (مؤلف) اور میر محمد یوسف ہم دونوں آنجناب کے حقیقی خواہرزادے ہیں اور ہم دونوں نے آپ کی شاگردی کی سعادت حاصل کی ہے اور شروع سے آخر تک ہم نے حدیث کی کتابیں آپ ہی سے پڑھیں۔ اکثر کتب احادیث کی اجازت بھی لی۔ اس کے بعد سنہ ۱۱۳۴ھ میں ہم دونوں بھائی شاہجہان آباد گئے اور وہاں تقریباً تین سال تک حضرت علامہ کی صحبت میں رہے۔ وہاں بھی آپ سے احادیث کی بعض کتابیں پڑھیں۔ قاموس کا بھی کچھ حصہ پڑھا۔ اس کے علاوہ دوسرے فنون بھی ہم دونوں نے علامہ مرحوم سے حاصل کئے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر خلد مکان کے زمانہ سے محمد شاہ کے عہد تک تمام امرا اور وزرائے سلطنت اور حکام تمامی حضرات حضرت علامہ مرحوم کی بڑی عزت کرتے تھے اور انتہائی ادب واحترام سے پیش آتے تھے آپ کی خدمت اور صحبت عالیہ میں حاضری کے لیے بیتاب اور بے حد متمنی رہتے تھے۔ آپ کا طریقہ صدق وصفا، عبادت اور حق آگاہی کا طریقہ تھا۔ بہت بڑی تمکنت وعزت اور وقار ومنزلت کے مالک تھے۔ بادشاہ کی طرف سے عطا کیے ہوئے اختیارات اور مراتب عالیہ کے باوجود دیانت، ایمانداری اور پرہیزگاری کی راہ سے سرمو انحراف نہیں فرمایا۔

سید حسین امتیاز خاں جن کا تخلص خالص[3] اصفہانی تھا سرزمین ہند سے ولایت ایران کے سفر پر

---

[1] دراصل یہ ٹھٹھ کے رہنے والے تھے اور بھکر میں آکر آباد ہو گئے۔ عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ عہد عالمگیری (۱۰۶۹ھ۔ ۱۱۱۸ھ) محمد شاہ (۱۱۳۱ھ۔ ۱۱۶۱ھ) تک حکومت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس درمیان میں سات تیموری بادشاہوں کا انھوں نے زمانہ دیکھا۔ عالمگیر شاہ عالم (۱۱۱۹ھ۔ ۱۱۲۴ھ) محمد معز الدین جہاندار شاہ، محمد فرخ سیر (۱۱۲۴ھ۔ ۱۱۳۱ھ) رفیع الدرجات (۱۱۳۱ھ صرف تین ماہ) شاہجہان ثانی (۱۱۳۱ھ صرف تین ماہ) محمد شاہ (۱۱۳۱ھ۔ ۱۱۶۱ھ) سنہ ۱۱۳۲ھ میں وفات پائی۔ "محمد رضا داد جان در جہان خلد" سے میر قانع نے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ (مقالات شعرا) [2] مرزا باقر قورچی کے لڑکے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد دکن میں بادشاہ خلد مکان سے ملے اور ملازمان سلطانی میں داخل ہو گئے۔ امتیاز خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔ عالم شاہ کے زمانہ (۱۱۱۸ تا ۱۱۲۴ھ) میں ایران کا ارادہ کیا۔ راستہ میں بلوچستان کے مقام پر سندھ کے ایک زمیندار خدا یار خاں نے مروا ڈالا۔ میر عبد الجلیل واسطی بلگرامی نے تاریخ وصال کہی۔ "آہ آہ امتیاز خاں" (سرو آزاد، مفتاح التواریخ، مقالات شعرا)

روانہ ہوئے جب سیوستان کے مقام پر پہنچے تو سندھ کے زمیندار خدا یار خاں نے (۱۱۳۳ھ) سید حسین کو قتل کرا دیا اور ان کے لاکھوں روپے کے قیمتی مال ومتاع پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد علامہ مرحوم کے پاس پیغام بھیجا کہ یہ خبر وہ بادشاہ کی اطلاعی رپورٹ میں واقعہ کی صحیح شکل میں نہ لائیں۔ اس خدمت کی خاطر خواہ انجام دہی پر علامہ مرحوم کو سونے کی دو ہزار اشرفیاں بھی پیش کر رہا تھا۔ جنکی قیمت چودہ ہزار روپیہ تھی۔ علامہ مرحوم نے اس کی اس ناپاک پیشکش پر اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی کرم فرمائی سے میں خود دولت مند ہوں۔ اس نے اپنے فضل وکرم سے کسی کا محتاج نہیں بنایا ہے۔ اگر میں آج کسی صحیح واقعہ کو غلط بیانی کے پردہ میں چھپا کر حقیقت کی اطلاع بادشاہ تک نہ پہنچاؤں گا تو کل قیامت میں بادشاہ حقیقی کے سامنے کیا جواب دوں گا۔

آپ مستحق لوگوں کے حالات وواقعات کی تحقیق اکثر خصوصیت کے ساتھ خفیہ طور پر فرماتے تھے۔ اور "وان تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خير لكم" پر عمل فرماتے تھے۔ دین کے فرائض اور سنتوں کی ادائیگی کے بعد آپ کا سب سے بڑا مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا۔ جمعہ کے دن فجر کے بعد سے زوال کے قبل تک آپ "دلائل الخیرات[1] شریف" کا ختم فرماتے تھے اور اثناء ورد میں گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ دلائل الخیرات کی کتاب جو آپ کے خاص وظائف میں شامل تھی خود اپنے ہاتھ سے تحریر کی تھی۔ آپ کا وہ قلمی نسخہ آج بھی موجود ہے۔

زوال کے قریب آپ یوم جمعہ کے غسل مسنونہ کی جانب متوجہ ہوتے تھے۔ غسل سے فراغت کے بعد مسجد تشریف لے جاتے تھے۔ رمضان المبارک میں کسی روز بھی رفع حاجت کے لیے دن کے وقت بیت الخلاء نہیں جاتے تھے۔ گھر پر تشریف فرما ہوں یا سفر میں ہوں نماز تراویح کبھی ترک نہیں فرماتے تھے۔

آپ کے اوصاف حمیدہ میں ایک نہایت عمدہ اور پسندیدہ صفت یہ بھی تھی کہ جب آپ کچھ لکھنے کا ارادہ فرماتے تھے تو پہلے بسم اللہ پھر حمد وصلوٰۃ ایک خاص کاغذ پر تحریر فرماتے۔ اس کے بعد جو کچھ لکھنا مقصود ہوتا تھا لکھتے تھے۔ زندگی کے آخر تک کبھی آپ نے یہ عمل ترک نہیں کیا۔ آپ نے باقیات صالحات میں سے ایک بہت بڑا کتب خانہ چھوڑا ہے۔ اس کتب خانہ کے اکثر کتابوں کی اصلاح وتصحیح اور اصل نسخوں سے ان کا مقابلہ آپ نے بذات خود فرمایا ہے۔ اس کتب خانہ کی بہت سی کتابیں آپ نے اپنے

---

[1] دلائل الخیرات الشیخ ابو عبد اللہ محمد بن سلیمان بن ابی بکر الجزولی متوفی ۸۷۰ھ کی تالیف ہے جس میں درود پاک مختلف اقسام سے تحریر ہے۔ بابرکت کتاب ہے۔ اکثر حضرات صوفیہ ومشائخ اور اہل دل حضرات نہایت ذوق وشوق سے اس کی مداومت رکھتے ہیں اور بطور وظیفہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ شیخ محمد مہدی بن احمد بن علی بن یوسف الفاسی الفقیری نے اس کی شرح لکھی ہے جو "مطالع المسرات بجلاء دلائل الخیرات" کے نام سے موسوم ہے اس کا معتبر ترین نسخہ شیخ ابو عبد اللہ محمد صغیر سہیلی کا ہے جس کی تعلیم اپنی وفات سے قبل خود مصنف نے کی ہے

دست مبارک سے تحریر کی ہیں۔ ابتداء میں آپ نہایت عمدہ قسم کا خط نستعلیق تحریر فرماتے تھے۔ بعد میں آپ نے خطِ نستعلیق میں ایک طبعزاد خوبصورت طریقہ پر نیا خط ایجاد فرمایا۔ آپ کی تحریر ایسی دلکش ہوتی تھی جس سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا۔ آپ کو کتابیں لکھنے (نقل کرنے) کا اس قدر شوق تھا کہ آپ نے بھکّر کے قیام کے آخری دنوں میں اپنے دست مبارک سے صحیح بخاری[1] شریف مکمل تحریر کر ڈالی۔ ابھی اپنی نقل کا اصل نسخہ سے مقابلہ ہی فرما رہے تھے کہ شاہی خدمت کے عہدہ سے برطرف ہونے کا اتفاق واقع ہوگیا، معزولی کے بعد آپ نے شاہجہان آباد پہنچنے کے ارادہ سے اپنا خیمہ نوشہرہ کے مقام پر نصب فرمایا۔ جو شہر بھکّر کے مضافات میں ایک گاؤں ہے۔ صرف صحیح بخاری شریف کی نقل کا اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے کی غرض سے آپ نے اس موضع میں چھ ماہ تک قیام فرمایا۔ چونکہ آپ کے ساتھ لواحقین کی تعداد زیادہ تھی اس لیے اس اثنائے قیام میں آپ کے ہزاروں روپے خرچ ہوگئے۔ آپ کا تحریر کردہ وہ نسخہ آج بھی آپ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

آنجناب کی ولادت باسعادت کی تاریخ جو آپ ہی کے قلم سے لکھی ہوئی ہے میرے دیکھنے میں آئی۔ ۱۳ رشوال المکرم سنہ ۱۰۷۱ھ تاریخ ولادت ہے آپ کی ولادت اور نشوونما بلگرام ہی میں ہوئی۔ اور وصال ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۸ھ شنبہ کی رات کو دار الخلافہ شاہجہان آباد میں ہوا۔ نعش مبارک وصیت کے مطابق آپ کے وطن مالوف بلگرام میں لائی گئی۔ ۶ رجمادی الاولیٰ کو جمعہ کے دن سنہ ۱۱۳۸ھ میں عصر کے اوّل وقت آنجناب کے والد ماجد میر احمد مرحوم کے قدم میں (پائیتیں) دفن کیے گئے۔ عمر شریف چھیاسٹھ سال ایک مہینہ دو دن تھی۔

آپ کے نتائج فکر میں ایک مثنوی آپ کی یادگار ہے جس کو آپ نے "امواج الخیال[2]" کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ بلگرام کی تعریف میں آپ کی مثنوی "امواج الخیال" کا ایک مطلع نمونہ کے طور پر درج ہے:۔

آب و گِلِ من کہ فیض عام است از خطۂ پاک بلگرام است

اس مطلع میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان کا پاکیزہ خمیر اپنے مَولد کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور شاخ اپنے جڑ کی طرف لوٹتی ہے۔

آپ کی کرامت اور نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آپ کا جسم مبارک سورج کی گرمی اور دنوں کے گزرنے کے باوجود بالکل صحیح و سالم رہا۔

---

[1] تالیف ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ

[2] اس کتاب میں سادات بلگرام کا نسب نامہ تحریر کیا گیا ہے۔ اور اس مثنوی میں ہندوستانی موسیقی کے اکثر قواعد بیان کیے گئے۔ (سرو آزاد)

آپ کی نعش مبارک کو شاہجہان آباد سے آپ کے وطن مالوف (بلگرام) تک پہونچنے میں چودہ[۱۴] دن صرف ہوئے۔ لیکن اتنے دنوں تابوت میں رکھا ہوا وہ جسم ذرا بھی متغیر نہیں ہوا۔ کسی عضو میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ کے جسم مطہر کو تابوت سے نکال کر اس طرح چارپائی پر رکھا گیا جس طرح کوئی تازہ میت چارپائی پر رکھی جاتی ہے۔ چارپائی قبر کے کنارہ لائی گئی۔ کمر کے نیچے چادر لگا کر آپ کے جسم مطہر کو لحد کے اندر اتارا گیا۔ استاد المحققین میر طفیل محمد طاب ثراہ قبر کے اندر اترے اور آپ کے جسم اطہر کو اپنے مبارک ہاتھوں سے دفن کیا۔

راقم الحروف (مؤلف) نے قرآن پاک کی آیت کریمہ "اولٰئک لھم عقبی الدار جنات عدن" سے آپ کی تاریخ وفات نکالی۔ اسی طرح قرآن پاک کی ایک دوسری آیت "للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ" سے بھی آپ کی تاریخ وفات نکالی گئی ہے۔

اپنی تفسیر میں بیضاوی نے بیان کیا ہے کہ "الحسنیٰ الجنۃ والزیادۃ ھو اللقاء"۔ نہایت عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ "للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ" علامہ مرحوم کی زبان پاک پر آپ کی حیات میں اکثر جاری رہا کرتی تھی۔ اس کا ذکر حضرت علامہ مرحوم کے مضامین کے سلسلہ میں پہلے ہی آچکا ہے۔ آنجناب کے فرزند سعادت مند میر سید محمد نے آپ کے مضامین کا ایک حصہ جمع کیا ہے۔

شاہ عبد الرزاق بانسہ قدس اللہ سرہ کے خلیفہ سید اسمٰعیل بلگرامی نے کسی وقت علامہ مرحوم کو ایک خط لکھا تھا۔ جس کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"میر صاحب مشفق مہربان، فیض رساں، سلامت۔"
"حقیقت نوم و یقظہ بر ارباب معلیٰ منکشف و ہویدا است"
"بعضے نوم را بر یقظہ ترجیح دادہ اند و بعضے یقظہ را"
"بر نوم۔ ایں معنی را مشروحاً تحریر فرمائید۔ والسّلام علیکم وعلیٰ من لدیکم"

علامہ مرحوم نے اس سوال کا جو جواب تحریر فرمایا ہے اس کی عبارت ذیل میں درج ہے۔

"بیدار دل، خوابیدہ ہوا، ثابتِ مقام تسلیم و رضا سلامت"
"از معارضۂ نوم در تفضیل یقظہ و نوم نگارش یافتہ"
"رمز آگاہا! اگرچہ منطوق کلام الناس نیام فاذا ماتوا"
"انتبھوا وحدیث شریف اختصام ملاءِ اعلیٰ در"
"تصعید عمل متیقظ بہ بالا و بہ انحطاط درجہ جواب دارد"

؎ چشم تو نہ بخت ماست پر خواب چرا ست؟

"[۱] مضمون آیۂ کریمہ وتحسبھم ایقاظاً وھم رقود و نقلبھم"

ذات الیمین و ذات الشمال کلہا باعتبار کفالۂ تقلیب"
کہ مشتمل است بر اسرار عجیب دلالت بر رفعت شان از خود،،
خوابیدگان دارد۔
؎ زہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداریست!
واگرچہ ظاہر خطاب قم یا نومان ناظر بہ تذمیم است۔ اما تغطیہ بہ فضل عبا مشعر بہ
غایت تعظیم و ہم چنیں مضمون ایں منظومۂ ہندی۔
ع یار آیو تب گا توں سوتے کیسیں مجگت پرایت ہوئے۔
اگرچہ ایمائے بہ تنقیص نوم دارد۔ اما بفحوائے دوہرہ ؎
سپنیں دیکھو پیہ میں کھل گئی آنکھ اجاگ   اور گنوا وت سوے سب ہوں تو گنوا یو جاگ
از غایت نزاکت کارے مبنی است بہ تفضیل نوم بر بیداری خوشا خجالت آں عاشقی
کہ در شب ہجرت بہ خوابش آئی و او شرمسار بر خیزد۔ تحقیق مقام آنکہ تا سرے بر خیال
او داری۔ اگر بیداری است بہ از نوم و اگر نوم است بہ از بیداری نمک ریزی کشیلی
در چشم و مژہ برائے رفع خواب و خوابیدن جبو دہفت سال و اول در آمدن او بہ
بہشت، ہر دو صواب است ما حصر فکر سقیم و فوق کل ذی علم علیم۔"

حواشی رقعہ

قولہ اختصام ملاء اعلیٰ:۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں فرشتے باہم ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ ہر فرشتہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کام میں دوسرے فرشتوں سے سبقت لے جاؤں: اول دوسرے کو کھانا کھلانا۔ دوسری بات نرم اور شیریں گفتگو کرنا۔ تیسری بات یہ کہ ایسے وقت نماز پڑھنا جب کہ لوگ سو رہے ہوں۔ یہ مکمل حدیث مشکوٰۃ شریف کے باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ کی تیسری فصل میں موجود ہے۔

قولہ باعتبار کفالہ تقلیب:۔ یعنی نقلبہم بہ صیغۂ متکلم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے خود ہی اصحاب کہف کی کروٹ بدلی۔

قولہ قم یا نومان:۔ غزوۂ خندق میں جس رات کو کفار مکہ معرکۂ جنگ کو چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ اس رات کو گھنے سیاہ بادل، سخت سردی اور تیز طوفانی ہوا تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ الیمانی کو لشکر کفار کا پتہ لگانے کے لیے بھیجا اور دعا فرمائی کہ حذیفہ الیمانی سردی اور بھوک سے محفوظ رہیں چنانچہ آپ جب تک اس خدمت کی انجام دہی کے لیے باہر رہے آپ کو سردی اور بھوک کا

کوئی احساس نہیں ہوا۔ لیکن جیسے ہی واپس آئے آپ کو بہت زیادہ سردی محسوس ہونے لگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فضل جا یعنی اپنے لباس مطہر کا وہ زائد گوشہ جو آپ کے دوش مبارک پر تھا حذیفۃ الیمان کو اڑھا دیا۔ اپنا مبارک پاؤں ان کے سینہ پر رکھ دیا اس سے ان کو فوراً سکون مل گیا اور سو گئے۔ جب نماز فجر کا وقت قریب آگیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قم یا نومان! یعنی اے بہت زیادہ سونے والے اٹھ!

قولہ عبود:۔ بفتح عین مہملہ و تشدید بائے موحدہ مضموم: ایک حبشی غلام کا نام ہے۔ جو سات برس تک برابر سوتا رہا اور وہ غلام سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ جنت میں سب سے پہلے اس کے داخلہ کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ کے پیغمبر کو ان کی امت نے ایک کنوئیں میں قید کر دیا تھا۔ وہ غلام پیغمبر پر ایمان لایا۔ اور پوشیدہ طور پر اس قوم کا راز معلوم کر لیا۔ اس کا قصہ پوری تفصیل کے ساتھ قاموس میں لفظ عبد کے مادہ میں بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ اس کتاب میں سادات بلگرام کے شجرۂ انساب کے بیان کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لیے اس مقام پر علامہ مرحوم کے اس قصیدہ کا بیان کرنا مناسب ہوگا۔ جس میں موصوف نے اپنا شجرۂ نسب تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے۔ قصیدہ یہ ہے۔

(مذکورہ قصیدہ اکاون اشعار پر مشتمل ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے پہلے چار اشعار درج کیے جاتے ہیں اور باقی اشعار میں جن بزرگوں کے اسماء موجود ہیں ان سے شجرہ مرتب کر کے شامل کر دیا گیا ہے تاکہ افادیت بھی باقی رہے اور غیر ضروری تفصیل سے بھی بچا جا سکے۔ فاخری)

مائیم نخل سبز ریاض پیمبری — احسان ماست بر ہمہ از سایہ گستری
نخلے کہ اصل ثابت او ختم انبیا است — فرعش گذشت از سر ایں چرخ چنبری
آں ختم انبیاء کہ بتول است دخترش — آرائش منصۂ پاکیزہ گوہری!
آں دختر نبی کہ بود شوہرش علی — دریائے فیض ساقی صہبائے کوثری

(ابنہ حسین شہید کربلا ابنہ زین العابدین سجاد ابنہ سید عیسیٰ ابنہ سید محمد ابنہ سید علی ابنہ سید حسین ابنہ سید علی عراقی ابنہ سید حسن ابنہ سید علی ابنہ زید ابنہ سید عمر ابنہ زید سوم ابنہ یحییٰ ابنہ سید حسین ابنہ داؤد ابنہ ابو الفرح واسطی ابنہ سید ابو الفراس ابنہ ابو الفرح ثانی ابنہ سید حسین ابنہ سید علی ابنہ محمد صغری (جنہوں نے سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں بلگرام فتح کیا اور جن کا وصال ۶۴۵ھ میں ہوا۔ ان کا تذکرہ اسی کتاب میں گذرا۔ فاخری) ابنہ سید عمر ابنہ سید حسین ابنہ سید نصیر ابنہ سید حسین ابنہ سید سالار ابنہ لطف اللہ ابنہ سید دادن ابنہ سید محمود ابنہ سید نوح ابنہ سید حسین ابنہ سید محمود ابنہ عبد اللطیف ابنہ سید احمد ابنہ علامہ مرحوم

میر سید عبد الجلیل قدس سرہٗ ۔)

راقم الحروف (مؤلف) آنجناب کا حقیقی خواہر زادہ اور اس آفتاب کا ایک محتاج اور بھکاری ذرہ ہے ۔ آپ مجھ ناچیز پر ایک خاص عنایت و کرم کی نظر رکھتے تھے ۔

دار الخلافہ شاہجہان آباد کی ملازمت کے زمانہ میں آپ نے کئی بار فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس میری کوئی نشانی باقی رہے ۔ آنجناب کے دینی اور دنیوی تعلیم و تربیت کے احسانات و حقوق اس ناچیز پر اتنے زیادہ ہیں کہ یہ ذرۂ بے مقدار آسمان کے تاروں اور زمین کے ذروں کی طرح ان کا شمار نہیں کرسکتا ۔ اس خاکسار اور ناتواں سے جو کچھ ممکن ہوسکا وہ یہی تھا کہ حجاز کے مقدس مقامات پر حاضر ہوکر خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ دُربار میں یعنی مواجہہ شریف کے مقام پر دست بستہ و سر خمیدہ آنجناب کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سے نہایت عجز و انکسار اور خضوع و خشوع اور حضور قلب کے ساتھ دعائیں کیں ۔ علاوہ ازیں ایک عمرہ کا ثواب حضرت والا کی روح پُر فتوح کو بخشا اور اپنی صلاحیت کے مطابق جس کو آپ ہی کی عنایات عالیہ نے جلا بخشی تھی اس ناچیز نے آنجناب کی مدح میں ایک قصیدہ بھی عربی زبان میں لکھا مجھے امید ہے کہ آنجناب کی روح اقدس اس ناچیز ہدیہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے گی ۔ اس قصیدہ نگاری اور مدح سرائی میں جس خلوص و عقیدت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ ٹھکانے لگ گیا اس لیے کہ مولانا سید مصطفیٰ بن سید عمر ردسی سورتی نے جب اس قصید کو سنا تو فرمایا ھذہ قصیدۃ یحق ان یغبط فیھا یعنی یہ قصیدہ اس لائق ہے کہ اس پر رشک کیا جائے ۔ سید احمد امام زادہ یمن نے اس قصیدہ کی ایک شرح بھی لکھی ہے ۔

سید احمد ائمۂ یمن کی اولاد میں سے ہیں ۔ یعنی سلاطین یمن کی نسل سے آپ کا نسبی تعلق ہے عہد حاضر کے یمن کے بادشاہوں کی جماعت میں جو شخص بادشاہت کے درجہ تک پہونچا وہ قاسم بن محمد ہیں جن کا لقب امام منصور[1] باللہ ہے جو حسن[2] مثنیٰ بن امام حسن[3] سبط رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی اولاد اور

---

[1] امام منصور باللہ القاسم بن محمد (۹۶۷ + ۱۰۲۹ھ = ۱۵۵۹ + ۱۶۲۰ء) ابن علی بن محمد بن علی بن رشید بن احمد بن امیر حسین بن علی بن یحییٰ بن محمد بن یوسف الاصغر الملقب بالاشل بن القاسم بن الامام الداعی یوسف الاکبر بن امام منصور یحییٰ بن الامام الناصر احمد بن الامام الہادی یحییٰ بن الحسین بن قاسم بن ابراہیم بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن الحسن بن الحسن بن امیر المومنین علی بن ابی طالب ۔ ان کی تصانیف میں کتاب الاعتصام ہے جس میں اہل بیت اور محدثین کی کتابوں سے ایسی حدیثیں جمع کی تھیں جنہیں اپنے مسلک کے لیے دلائل قائم کرتے تھے ۔ اسکے مکمل کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے اور اسے علامہ احمد بن یوسف بن حسین بن احمد زبادہ نے تتمہ لکھ کر " انوار التمام المشرقۃ لضوء الاعتصام " کے نام سے موسوم کیا ۔ دوسری کتاب الاساس لعقائد الاکیاس ہے جس کی متعدد علماء نے شرحیں لکھی ہیں ۔ کتاب الارشاد ، مرقاۃ الوصول بھی ان کی تصانیف ہیں ۔ یمن میں امام منصور سلطنت تا سمجھیے باقی ہیں (البدر الطالع ۔ بلوغ المرام ۔ الاعلام زرکلی)

[2] حسن مثنیٰ متوفی تقریباً ۹۰ھ (تہذیب ابن عساکر) [3] حسن السبط (۳ھ ۔ ۵۰ھ = ۶۲۴ ۔ ۶۷۰ء) خلفائے راشدین میں پانچویں خلیفہ ہیں ۔ اثنا عشریہ میں دوسرے امام ہیں ۔ امیر معاویہ کے مقابلہ میں بمقام بیت المقدس ۴۱ھ میں خلافت کی ذمہ داری سے جان چھڑالی ۔ اور اس سال کو عام الجماعۃ کا نام دیا آپ کی مدت خلافت چھ ماہ پانچ دن ہے (تہذیب التہذیب ۔ اصابہ یعقوبی ۔ حلیۃ ابی نعیم ۔ ابن اثیر صفۃ الصفوہ)

ذریات میں ہیں ان کے صاحبزادہ حسنؒ بن قاسم نہایت بہادر اور فن سپہ گری میں ماہر تھے ۔ روم کے ترک جو عرصہ دراز سے یمن کے پورے ملک پر قابض تھے ان کو حسن بن قاسم نے ہی مغلوب اور مفتوح کیا ۔ ترکوں کا سردار قانصوہ ١٠٤٤ھ میں امان طلب کر کے یمن سے نکل گیا وہ خود تو مکہ معظمہ چلا گیا لیکن باقی ماندہ ترکوں نے امیر مصطفیٰ کو اپنا سردار بنا لیا اور زبید پر قبضہ کر لیا ۔ لیکن حسن کی تلوار کے ڈر سے وہاں قیام نہیں کر سکے اور ١٠٤٩ھ میں امیر مصطفیٰ بھی یمن سے نکل بھاگا اور مکہ معظمہ کا رخ کیا ۔ اب ملک یمن کے تمام شہر امام زیدیہ قاسم بن محمد کے ہاتھ میں آ گئے ۔ قاسم بن محمد کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا ابن قاسمؒ جس کا لقب مؤید باللہ تھا بادشاہ ہوا ۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بھائی متوکل علی اللہ اسمٰعیلؒ بن امام منصور باللہ قاسم بن محمد تخت سلطنت پر بیٹھا ۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا مؤید باللہ محمدؒ بن اسمٰعیل تخت نشین ہوا ۔ اس کے انتقال کے بعد مہدی لدین اللہ احمدؒ بن حسن (ترکوں کو یمن سے نکالنے والے) بن قاسم بن محمد تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا ۔ اس کے انتقال کے بعد ملک یمن کی بادشاہت محمدؒ بن احمد بن حسن (جس نے ترکوں کو ملک یمن سے نکال باہر کیا تھا) کے قبضہ میں آئی ۔ اس کے انتقال کے بعد منصور باللہ قاسم کی اولاد میں سے حسینؒ بن قاسم بن محمد تخت نشین ہوا ۔ اس کے انتقال کے بعد متوکل علی اللہ قاسمؒ بن حسین بن احمد بن حسن (ترکوں کو یمن سے نکالنے والا) تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا اس کے انتقال کے بعد ناصر لدین اللہ

ـه ١ (٩٩٦-١٠٢٨ھ) یمن کے بادشاہوں میں اپنے زمانہ میں ملک میں استقلال حاصل کیا ۔ (خلاصۃ الاثر) ۔

ـه ٢ بن قاسم المؤید باللہ محمد بن قاسم (٩٩٠-١٠٥٤ھ) الامام محمد اپنے والد (١٠٢٩ھ) امام قاسم بن محمد کی وفات کے بعد خلیفہ ہوئے کتاب "تصفیۃ النفوس" تالیف کی ۔ (خلاصۃ الاثر ۔ بدر الطالع) ۔

ـه ٣ متولد ١٠١٩ھ ١٦١٠ء ۔ وفات ١٠٨٧ھ ١٦٧٦ء ١٠٥٤ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ١٠٥٥ھ میں پورے یمن پر قبضہ حاصل کیا ۔ مذہب زیدیہ کے مجتہد عالم تھے ۔ العقیدۃ الصحیحۃ فی الدین النصیحۃ الرسالۃ الی جمیع القضاۃ ۔ شرح جامع الاصول اربعین (مذہب زیدیہ میں) اور اس کی شرح مسئلہ طلاق ثلاثہ وغیرہ ان کی تالیفات ہیں ۔ (ہدیۃ العارفین ۔ خلاصۃ الاثر ۔ بلوغ المرام ۔ البدر الطالع)

ـه ٤ (١٠٢٤-١٠٩٧ھ) مطابق (١٦٣٣-١٦٨٦ء) البدر الطالع میں ہے کہ امام مہدی احمد بن حسن کے انتقال کے بعد ١٠٩٢ھ میں امام منتخب ہوئے (بلوغ المرام ۔ خلاصۃ الاثر ۔ البدر الطالع) ۔

ـه ٥ (١٠٢٩-١٠٩٢ھ) (١٦٢٠-١٦٨١ء) اسمٰعیل متوکل علی اللہ کی وفات کے بعد خلافت کا دعویٰ کیا (شوکانی ۔ خلاصۃ الاثر وغیرہ) ۔

ـه ٦ امام مہدی (١٠٤٧-١١٣٠ھ = ١٦٣٧-١٧١٨ء) مؤید باللہ محمد بن متوکل علی اللہ اسمٰعیل کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھے اور ١١٢٩ھ میں لائے گئے اور جنگوں کے بعد نکالے گئے "السمط المنیرہ" ان کی تالیف ہے جس میں اپنے دادا امام قاسم کی تصانیف سے بہت متفرق مسائل کو جمع کیا ہے (ہدیۃ العارفین ۔ بلوغ المرام ۔ البدر الطالع)

ـه ٧ الامام المنصور باللہ الحسین (١١٠٧-١١٦١ھ = ١٦٩٦-١٧٤٧ء) ابن المتوکل علی اللہ قاسم بن حسین بن احمد بن حسن بن امام قاسم متوکل علی اللہ قاسم بن حسین کے انتقال کے بعد ١١٣٩ھ میں برسر حکومت آئے ۔ شروع میں محمد بن اسحاق کے حق میں نکالے گئے پھر غلبہ حاصل کر لیا ۔ (بلوغ المرام ۔ زرکلی ۔ البدر الطالع)

ـه ٨ متوفی ١١٣٩ھ ۔ ١١٢٨ھ میں اہل صنعا نے ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی (زرکلی ۔ بلوغ المرام تاریخ یمن ۔ المقتطف من تاریخ الیمن وغیرہ) ۔

ـه ٩ (١٠٩٠-١١٧٦ھ) مشاہیر علماء میں تھے اور بے مثل شاعر تھے انکے لڑکے نے انکا دیوان مرتب کر کے "نفحات الاشواق فی نظم المولیٰ محمد بن اسحاق" کے نام سے موسوم کیا (طیب السمر ۔ البدر الطالع ۔ المقتطف ۔ بروکلمان ۔ زرکلی) ۔

محمد بن اسحاق بن احمد بن حسن (ترکوں کو یمن سے نکالنے والا) نے زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لی۔ اور ایک سال حکومت کرنے کے بعد حکمرانی سے الگ کر دیا گیا۔

پھر حسین بن متوکل علی اللہ قاسم بن حسین بن حسن (مخرج اتراک) کی حکومت کی باری آئی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے عباس بن حسین نے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ اس زمانہ میں وہی بادشاہ ہے۔ قصیدہ کی شرح لکھنے والے کا نسب دو واسطوں سے امام مہدی لدین اللہ[۵] احمد بن حسن (مخرج اتراک) تک پہونچتا ہے اس طرح سے ملک یمن کے بعض مقامات کی حکمرانی کا موقع کچھ زمانہ تک شارح قصیدہ کے والد عبد اللہ (سید احمد بن عبد اللہ بن ابی طالب بن احمد بن حسن) کو بھی حاصل ہوا۔ آخر کار حسین بن متوکل علی اللہ قاسم مذکور نے عبد اللہ کو دھوکہ دے کر قید کر دیا۔ اور ان کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ عبد اللہ اس واقعہ کی تحریر (اس کتاب کی تالیف) کے وقت تک بقید حیات ہیں۔ شارح قصیدہ سید احمد اپنے والد کی قید کے بعد دکن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے راقم الحروف (مولف کتاب) کے ذریعہ نواب نظام الدولہ شہید سے ملاقات کی۔ نواب آپ کے ساتھ بڑی عزت و تعظیم کے ساتھ پیش آئے اور آپ کے حق میں بڑی سہولتیں پیدا کیں۔ قصیدۂ مذکور یہ ہے۔

(یہ عربی قصیدہ ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ طوالت کا باعث ہوگا اگر اسے نقل کیا جائے۔ قارئین کے لیے اس کا مطلع درج ذیل ہے۔ فاخری)

ادرك عيلا لقا دمنك يكفيه طرقك الناعس المرانى يشفيه

---

(۵۹)

میر محمد جان بلگرامیؒ

آپ علامہ مرحوم حضرت میر عبد الجلیل قدس سرہ کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں۔ اس طریقے سے آپ کا سلسلۂ نسب میر محمد جان بن سید معین الدین بن سید عبد اللطیف بن سید محمود اصغر بلگرامی قدس سرہ تک پہونچتا ہے۔ سید معین الدین عجائب روزگار میں سے تھے۔ عقل و فہم اور دانشمندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ علامۂ مرحوم ان کو عقل مجسم کہا کرتے تھے۔ آپ نے آخر وقت تک اپنے زمانہ کے امراء و حکام کے سامنے بڑی عزت و وقار کی زندگی بسر کی۔ ان کے بڑے بھائی میر احمد نے نواب مکرم خاں کی طرف سے مضافات دہلی کے بعض علاقوں کی حکومت اور زمینداری حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ اپنے بھائی کے ساتھ ان مواضع

---

[۵] المہدی لدین اللہ (۱۱۳۱ - ۱۱۸۹ھ) (۱۷۱۹ - ۱۷۷۵ء) (ملوغ المرام)۔

کی امینی کے عہدہ پر مامور اور متعین تھے۔ دونوں بھائیوں میں اس طرح کا میل جول اور اتحاد و اتفاق تھا کہ دونوں کو ایک قالب دو جان کہیے۔ ان دونوں بھائیوں کی دیانت داری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مضافات دہلی کے بعض مواضع کا حاکم بنا دیا گیا تھا اور دوسرے کو امین کا عہدہ دیا گیا۔

جب نواب مکرم خاں صوبۂ ملتان کی صوبہ داری پر مامور ہوئے تو انھوں نے سید معین الدین کو صوبۂ ملتان کی منصفی کا عہدہ عنایت کیا۔ سید صاحب نے اس نازک اور اہم ذمہ داری کو انتہائی خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور شہر کے چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب کو اپنے عدل و احسان کے ذریعہ راضی و خوشنود رکھا۔ آخر کار ملتان ہی کے شہر میں ۱۳ ار شعبان سنہ ۱۱۰۳ھ میں دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر جنت الفردوس کی راہ لی۔

آپ کے صاحبزادہ سید کرم اللہ نے (جن کا ذکر آئندہ اوراق میں کیا جائے گا) قرآن پاک کی آیۂ کریمہ "یدخلہ جنات" سے آپ کی تاریخ وفات نکالی۔ قبر شریف ملتان ہی کے شہر میں حضرت شیخ موسیٰ[1] جیلانی قدس سرہٗ کے مزار کی چہار دیواری میں گنبد مبارک کے دروازہ کی سیڑھیوں کے پاس بائیں جانب اندر کی طرف واقع ہے۔

راقم الحروف (مؤلف) نے سنہ ۱۳۷۶ھ میں سیوستان کے سفر سے واپسی کے موقع پر آنجناب کے مرقد شریف پر حاضر ہونے اور فاتحہ و ایصال ثواب کا شرف حاصل کیا تھا۔

حضرت میر جان محمد کی ولادت ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۱۰۸۳ھ کو ہوئی۔

آپ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ ایک بے مثل قاری اور متبحر عالم بھی تھے۔ آپ کی تحریر نہایت پاکیزہ اور خوشنما ہوتی تھی۔ بہترین خوشنویس تھے۔ ایران والوں کی صحبت میں زیادہ رہنے کی وجہ سے آپ کو فارسی زبان میں گفتگو کرنے کی بڑی اچھی مہارت تھی۔ نہایت فصیح و بلیغ زبان میں گفتگو فرماتے تھے گویا موتی بکھیرتے تھے۔ طہارت و پاکیزگی اور صفائی کا بھی بہت اہتمام رکھتے تھے۔ شب و روز نوافل و وظائف کی ادائیگی میں مصروف رہتے تھے خود فرماتے تھے کہ بیس سال کی عمر سے میری تہجد کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ راتوں کو جب نمازیں ادا کرتے تھے تو یاد الٰہی میں اس طرح گریہ و زاری کرتے تھے۔ کہ سننے والوں پر بھی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ دعائیں اس درد بھری آواز میں مانگتے تھے کہ سامعین کے دل بھی پگھل جاتے تھے۔ سنہ ۱۱۳۶ھ اللہ تعالےٰ نے آپ کو ایسی توفیق عطا فرمائی کہ آپ نے شاہی جاگیرداری اور عہدہ کو نیز امرا اور وزرا کی صحبت کو خیرباد کہہ کر دنیاوی مال و دولت اور عیش کوشی ترک کر دی۔ پہلے دارالخلافہ شاہجہان آباد سے اپنے وطن بلگرام تشریف لائے اور اپنے خاندان کے تمام لوگوں نیز

---

[1] سید موسیٰ پاک شہید فرزند سید حامد گنج بخش گیلانی جمال الدین ابوالحسن۔ بعہد اکبر بادشاہ سنہ ۹۵۵ھ میں جام شہادت نوش کیا۔ ملتان میں آرام فرما ہیں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے استفادہ کیا ہے (خزینۃ الاصفیاء، نزہۃ الخواطر، اخبار الاخیار)

دوست احباب اور اہل و عیال کو جمع کر کے فرمایا کہ: میں نے دنیا کا عیش و آرام اور دولت و نعمت بہت کچھ دیکھا۔ آپ لوگوں کی خدمت بھی جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے انجام دی۔ اب چونکہ میری ضعیفی کا زمانہ آچکا ہے اور میری زندگی اب اپنی آخری منزل سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حج بیت اللہ کے لیے اپنا سامان سفر باندھ لوں اور تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کروں۔ اس کے بعد اپنی بقیہ زندگی مدینہ طیبہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) میں گذار دوں۔ اب مناسب یہ ہے کہ آپ لوگ طیبِ خاطر کے ساتھ مجھ کو اجازت دیجیے اور آج اس شخص کو جس کی زندگی اس دنیا میں بہت تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے۔ اس جہان فانی سے گذرا ہوا سمجھیے۔

مختصر یہ کہ اہل و عیال اور اعزہ و اقارب کو راضی کرنے کی کوشش کر کے اور ان سب کو صبر و تحمل پر آمادہ کر کے اپنی منزل مقصود کے لیے بندرگاہ "ٹھٹھہ" کی طرف روانہ ہو گئے۔

۱۷ ربیع الآخر ۱۱۳۷ھ کو سیوستان پہنچے۔ راقم الحروف (مؤلف) بھی ان دنوں وہیں موجود تھا۔ اسی ماہ کی اٹھائیسویں تاریخ کو سیوستان سے آگے بڑھے اور ۱۵ جمادی الاول ۱۱۳۷ھ کو بصرہ جانے والے جہاز میں بیٹھ گئے۔ سوء اتفاق سے جہاز بندر عباس کے قریب پہنچ کر ٹوٹ گیا۔ بہت سا مال اور بہت سے لوگ سمندر میں ڈوب گئے۔ جہاز کے ملازمین اور ملاح وغیرہ سب کے سب ایک چھوٹی سی کشتی میں (جو جہاز کے پیچھے بندھی رہتی ہے) بیٹھ گئے۔ ان لوگوں نے حضرت میر محمد جان قدس سرہ کو بھی اسی کشتی میں بٹھا لیا۔ الحمد للہ کہ کشتی سلامتی کے ساتھ ساحل سے جا لگی۔ میر صاحب وہاں سے بصرہ روانہ ہوئے۔ بہت سے جنگلات اور نہایت دشوار گذار پہاڑیاں طے کرتے ہوئے بڑی تکلیفیں اٹھا کر بصرہ پہنچے وہاں سے دارالسلام بغداد، سامرہ، نجف اشرف اور کربلائے معلی پہنچ کر وہاں کے مقامات مقدسہ اور مزارات عالیہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔

جب نادر شاہ[1] نے اپنے عہد حکومت میں بدعت کے مراسم کو مملکت ایران سے مٹا دیا تو آپ سوداگروں کے ایک قافلہ کے ساتھ مشہد مقدس تشریف لے گئے۔ اور آٹھویں امام[2] (یعنی حضرت امام علی موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ)

---

[1] نادر شاہ، امام قلی کا لڑکا قبیلۂ افشار سے تھا۔ ۱۱۰۰ھ میں مضافات خراسان میں پیدا ہوا۔ ۱۱۳۸ھ میں شاہ طہماسپ صفوی کی خدمت میں پہنچا۔ اور ۱۱۴۵ھ میں شاہ طہماسپ اور اس کے لڑکے عباس مرزا کو معزول کر کے خود تخت نشین ہو گیا۔ ۱۱۵۱ھ میں تمام افغانستان اور ہندوستان دہلی تک فتح کر کے شاہ پر (خوارزم) فوج کشی کی و دجلہ فرات سے لے کر دریائے سندھ تک ایک بڑے ملک پر اس نے حکومت کی۔ اس کے خدام و درباریوں نے سازش کر کے ۱۱۶۰ھ میں اس کو قتل کر دیا۔ (حواشی مقالات الشعراء سید حسام الدین راشدی)

[2] امام علی موسیٰ رضا متوفی ۲۰۳ھ شیعوں کے عقائد کے تحت بارہ اماموں میں سے آٹھویں امام ہیں۔ ان کے آخری امام محمد بن حسن خالص ہیں جو ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ معتمد علی اللہ عباسی کے زمانہ میں سامرہ کے ٹھنڈے پانی میں پوشیدہ ہو گئے (۲۶۵ھ میں)۔ ابن الوردی کے قول کے مطابق ان کے غائب ہونے کے وقت ان کی عمر صرف نو سال تھی۔

سید حمیری کے اعتقاد کے تحت محمد بن حنفیہ مہدی موعود ہیں لیکن فرقہ عسکریا امامیہ کہتا ہے کہ مہدی موعود محمد بن حسن خالص بن علی الہادی عسکری ہیں جو دوسری مرتبہ ظاہر ہوں گے۔ (تفسیر ربوالہ نور الابصار۔ حجج الکرامہ فی آثار القیامہ)

کے روضۂ مبارکہ کی زیارت سے سربلندی حاصل کی۔ وہیں سے آپ نے بیت اللہ کی زیارت کا احرام باندھا۔ اور حج و عمرہ کے تمام ارکان ادا کرنے کے بعد فوراً مدینہ منورہ (علی ساکنہا الصلوٰۃ والسلام) حاضر ہو کر روضۂ منورہ مطہرہ کی زیارت باسعادت سے مشرف ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مآب دروازہ کی زنجیر مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اور اس آستانۂ مبارکہ و عالیہ پر مرنے کی تمنا میں بقیہ تمام زندگی اس شہر مبارک سے اپنا قدم باہر نہیں نکالا۔ حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ پُر خلوص دعا اپنی زبان حسرت ترجمان پر ہمیشہ جاری رکھتے تھے: اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک؛ بالآخر آپ نے صرف چند ماہ اس بابرکت شہر میں زندگی پائی۔

قیام مدینہ کی اس تھوڑی سی مدت میں آپ صبح سے شام تک روزانہ مسجد نبوی میں بیٹھے رہتے تھے اور قرآن پاک کے ان تمام نسخوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے جو مسجد نبوی کے لیے وقف کیے گئے تھے۔ اسی عجیب مقدس شغل میں آپ اپنے اوقات مسعود و مبارک کو گذارا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مقررہ ساعت بھی آپہونچی۔ جب کہ آپ نے ۱۵، رجب المرجب ۱۴۳۰ھ کو دنیائے فانی چھوڑ کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ مدینہ منورہ کے لوگ وہاں کے دستور کے مطابق آپ کے جنازہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ شریف اور حجرۂ پاک کے درمیان سے گذار کر جنت البقیع میں لے گئے۔ وہاں آپ کو سیدنا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور چاروں ائمہ کی قبۂ منورہ کے پائیں میں چار گز کے فاصلہ پر شرق رویہ دفن کیا گیا۔

آپ کیسے خوش نصیب تھے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا دونوں جہان کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ خاص کر زندگی کے آخری ایام میں کیسی عظیم سعادتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں۔!

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ راقم الحروف (مؤلف) اپنے قیام کے دوران ہر جمعہ کو فاتحہ کی غرض سے جنت البقیع جاتا تھا اور سعادت حاصل کرتا تھا۔

ہندوستان کی طرف واپسی کے بعد برادر عزیز مرتبت میر محمد یوسف سلمہٗ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں حضرت میر محمد جان بلگرامی قدس سرہٗ کی شان میں ان کے حالات پر مشتمل عربی زبان میں ایک قصیدہ لکھوں۔ برادر محترم کی فرمائش پوری کرنا میرے لیے ضروری ہو گیا۔ لہٰذا مندرجہ ذیل قصیدہ مندرجہ بالا مضامین کے تحت میں نے عربی زبان میں لکھ کر حاضر کر دیا۔ (قصیدہ چونتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ طوالت کے سبب صرف اس کا مطلع قارئین کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ فاخری)

ارضا ھناک مراتع الغزلان — حتی الغمام بساکب ھتان

۶۰

سید کرم اللہ بن سید معین الدین بلگرامی قدس سرہٗ

آپ حضرت میر جان محمد رحمۃ اللہ علیہ مذکور کے اعیانی بھائی ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۰۸۰ھ میں ہوئی۔ نہایت بلند و پاکیزہ اخلاق کے مالک تھے۔ اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔ احادیث اور سیرت کی کتابیں اکثر آپ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ ادھیڑ عمر کو پہنچ کر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ آپ نے پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ جرأت ایمانی، تقویٰ و پرہیزگاری، فیاضی و سخاوت اور فلاح دارین کی فکر جیسی پسندیدہ عادتوں میں آپ اپنے دور کے ممتاز اور یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔

آپ ایک عرصۂ دراز تک دریائے علوم میر عبدالجلیل مرحوم کے نائب کی حیثیت سے بادشاہ وقت کی وقائع نگاری اور بخشی گری کے عہدہ پر فائز تھے۔ آخر کار کسی تقریب کے سلسلہ میں پنجاب تشریف لے گئے۔ وہیں محرم کی دوسری تاریخ کو جمعہ کے دن بعد نماز عصر ۱۱۳۲ھ میں سیالکوٹ کے شہر میں ایک کافر کے ہاتھ سے (جس نے اس علاقہ میں غلبہ حاصل کر رکھا تھا) آپ نے اپنی خوش بختی کے پیالہ سے شہادت کا خوشگوار شربت نوش فرمایا۔ ہفتہ کے دن اسی شہر میں حضرت امام الحق[1] رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے دالان کے قریب دفن کیے گئے۔

حضرت امام الحق (امام لاحق) حضرت امام زین العابدین[2] رضی اللہ عنہ کی ذریات طیبات اور اولاد صالحین میں سے ہیں۔ آپ اس مقام کے صاحب ولایت ہیں۔

سیوستان میں میر کرم اللہ مرحوم نے ایک عالی شان بلند و وسیع و عریض مسجد تعمیر کرائی تھی جو آپ کے اعمال صالحہ اور کار خیر کی ایک انوکھی یادگار ہے۔ مسجد مذکور سوانح نگار کی حویلی کے سامنے دریائے سندھ کے کنارہ پر شیخ جمعہ[3] قدس سرہٗ کی درگاہ کے قریب واقع ہے۔ سیوستان سندھ کا مشہور ترین شہر ہے۔

---

[1] سید امام علی الحق سیالکوٹی، حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم مریدین میں تھے صاحب کرامات اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ خرقۂ خلافت ملنے کے بعد پیر و مرشد کے حکم سے سیالکوٹ کی طرف تشریف لائے حضرت بابا صاحب نے انکو لاحق کا خطاب عطا فرمایا تھا انکو امام الحق لکھنا صحیح نہیں ہے (خزینۃ الاصفیاء و تاریخ سیالکوٹ) [2] ابن حسین شہید دشت کربلا رضی اللہ عنہ۔ آپکا نام علی اصغر تھا اور ذکی و امین لقب تھا۔ ۳۸ھ مطابق ۶۵۸ء میں اپنے دادا حضرت علیؓ کی شہادت سے دو سال پہلے پیدا ہوئے واقعہ کربلا میں تیئیس سال کے تھے آپ کی والدہ ماجدہ حضرت شہر بانو (یزدجرد ایرانی) کی صاحبزادی تھیں سادات اہل بیت اور بزرگان تابعین میں بہت مشہور تھے۔ ثقہ روایت میں آپکی شان میں فرزدق کا قصیدہ ہشام بن عبد الملک کے مقابلہ میں معروف و مشہور ہے۔ حضرت ملا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی میں اسکا ترجمہ کیا۔ آپکی وفات ۱۸ محرم ۹۴ھ ۷۱۲ء میں ہوئی۔ (وفیات الاعیان، طبقات ابن سعد، الیعقوبی، حلیۃ الاولیاء، تذکرۃ الجلیس، منہاج، النقصار) [3] مخدوم جمعہ کا شمار جلیل القدر اولیاء اور جید علماء میں ہوتا ہے۔ عالم باعمل اور فاضل کامل تھے۔ سید علی ثانی شیرازی (۹۸۱ھ) اور شیخ اسحاق ارجانی (۸۰۰ھ) کے ہم عصر تھے۔ آپ کی وفات ۱۰۰ھ کے قریب ہوئی۔ تحفۃ الکرام۔ تحفۃ الطاہرین)۔

حضرت مخدوم لعل شاہباز قدس سرہ اسی شہر میں آرام فرما ہیں (موجودہ سیہون شریف)۔

اب اس مقام پر مولف کا وہ قلم جو حضرت مخدومؒ کے قرب کا تمنائی ہے آنجناب کے مختصر حالات قلمبند کرتا ہے تاکہ حضرت مخدوم علیہ الرحمہ کی بزرگی اور عظمت بعض منکرین کے گمانِ باطل کے خلاف صفحۂ قرطاس پر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے۔

---

(۶۱)

مخدوم لعل شاہباز قلندر الحسینی المرندی السیوستانی قدس سرہٗ

راقم الحروف (مؤلف) نے مولانا محب علی[1] ٹھٹھوی کی تحریر میں جو اپنے دور کے ان بزرگوں میں ہیں جن کا ذکر جمیل شاہجہان نامہ اور دوسری تاریخی کتابوں میں ہے یہ عبارت دیکھی ہے کہ :-

"حضرت مخدوم لعل شہباز قلندر کا اسم شریف عثمان ہے"

اس کے علاوہ فقیر نے ایک سیاہ پتھر کی تختی پر ایک عبارت اس طرح کھدی ہوئی دیکھی تھی کہ :

شیخ عثمان مرندی قطب دین باز سپید و مرند بفتح میم و رائے مہملہ وسکون نون و دال مہملہ قریہ الیست از قرایائے تبریز" انتہی

آپ کا نسب تیرہ واسطوں سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ تک پہونچتا ہے[2]۔ صاحب تذکرۂ مشائخ سندھ فرماتے ہیں کہ :

حضرت مخدوم کی ولادت و پرورش گاہ "مرند" ہے۔ "مرتبۂ رجال" تک پہونچنے کے بعد بابا ابراہیم کی خدمت میں پہونچ کر مرید ہوئے جو حضرت شیخ جمال مجرد کے مرید تھے۔ ایک سال پیرو مرشد کی خدمت میں رہ کر مرتبۂ کمال کو پہونچے اور خرقۂ خلافت واجازت حاصل کیا۔ کبھی شادی نہیں کی۔ آخر میں ہندوستان تشریف لائے اور حضرت شیخ فرید گنج شکر و شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور

---

[1] بن صدر الدین محمد یا حید رعلی مرید شیخ محمد بن فضل اللہ نائب رسول اللہ ولادت ۹۸۲ھ۔ وفات ۱۰۵۵ھ۔ حافظ عبد الغفور نے تاریخ ولادت ووفات اس طرح فرمائی :

فضل یزداں ولادت سعدش   جامع الفضل منتہائے حیات

(ذخیرۃ الخواطر، شاہجہان نامہ، مآثر رحیمی، بادشاہ نامہ، برہانپور کے سندھی اولیاء حصہ دوم، مولانا محب علی سندھی از سید حسام الدین راشدی)

[2] تحفۃ الکرام اور خزینۃ الاصفیاء میں شجرہ تفصیلاً موجود ہے۔

حضرت شیخ صدرالدین عارف کی بہت سی صحبتوں میں شریک ہوئے[1]۔ سیوستان ہی میں مستقل قیام فرمایا۔

ضیاء برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں:

جب آنحضرت ملتان پہونچے تو خان شہید یعنی سلطان محمد قا[2] ان نے جو آپ کا انتہائی معتقد تھا۔ خدمت اور تواضع کا فریضہ انجام دیا اور بہت سی نذریں پیش کیں اور انتہائی کوشش کی کہ حضرت ملتان میں قیام فرمائیں۔ حضرت کے لیے خانقاہ بھی بنوائی۔ لیکن آپ ملتان کے قیام پر راضی نہ ہوئے۔ ایک دن خانِ شہید نے حضرت شیخ صدرالدین عارف اور حضرت شیخ عثمان شاہباز مروندی کو مجلس میں طلب کیا اور عربی غزلیں سرود (آلہ ہائے طرب) کے ساتھ گائی گئیں۔ ہر دو بزرگ شیوخ اور کچھ اور درویش جو وہاں موجود تھے۔ سماع اور رقص میں تھے اور خان شہید دست بستہ کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔" انتہیٰ

جب ربیع الاول شریف ۱۱۴۳ھ کی دسویں تاریخ کو راقم الحروف (مولف) سیوستان کے شہر میں پہونچا تو میر سید محمد خان نے بخشی گری اور وقائع نگاری کی خدمت میرے سپرد کر دی اور خود بلگرام روانہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی مدت میں میری ملازمت ختم ہو گئی اور فقیر کے دل پر اس کا سخت صدمہ ہوا۔ ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں ایک شہر کی گلی سے گذر رہا ہوں۔ ایک شخص میرے سامنے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ گلی اس سے آگے بھی جاتی ہے! اس نے عربی زبان میں کہا کہ تم کو کچھ لوگ ملیں گے۔ چند قدم آگے جا کر میں نے دیکھا کہ تین بزرگ سندھی لباس اور وضع قطع میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان تینوں بزرگوں میں سے ایک ان کے پیشوا تھے۔ میں نے قریب جا کر ان کو سلام کیا۔ اور شیخ مقتدا کے سامنے دوزانو ہو کر ادب سے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا میری ملازمت بحال ہو گی۔ اس سوال کو سنتے ہی انھوں نے فوراً اپنا سر گریبان کی طرف جھکا کر مراقبہ کیا اور پورے ایک پہر کے بعد اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اور فرمایا کہ بحال ہو جائے گی۔ میں نے کہا کیا ایسا ہی ہوگا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں تو کہہ رہا ہوں۔ آخر ایک سال کے بعد میری ملازمت بحال ہو گئی۔ اور شیخ کا قول سچ ثابت ہوا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بشارت دینے والے بزرگ وہی حضرت مخدوم لعل شاہباز قدس سرہ تھے۔ اور پورے ایک پہر کا مراقبہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اس مقصد کی کامیابی میں ابھی پورے ایک سال کی مدت درکار ہے۔ حضرت مخدوم لعل شہباز قدس سرہ کی وفات ۲۱ رشعبان المعظم ۶۷۳ھ ہے۔

---

[1] شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا متوفی ۶۶۱ھ، شیخ صدرالدین عارف بن شیخ الاسلام متوفی ۶۸۴ھ، شیخ فریدالدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ (اخبار الاخیار)۔ اور تحفۃ الکرام میں حضرت جلال بخاری کے تذکرہ کے ضمن میں تحریر ہے کہ شیخ بہاء الدین، شیخ فرید اور شیخ جلال بخاری و شیخ مرندی "چہار یار" کے لقب سے ملقب ہیں۔

[2] بن سلطان غیاث الدین تغلق شاہ دہلی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ۷۲۵ھ میں بمقام دہلی تخت فرماں روائی پر بیٹھا۔ تقریباً ۲۷ سال حکومت کے بعد دریائے سندھ کے کنارے پر ۷۵۲ھ میں انتقال کیا۔ (مفتاح التواریخ)۔

۶۲

روح الامین خاں[1] رحمۃ اللہ علیہ

آپ محلہ قاضی پورہ بلگرام کے عثمانی شیوخ میں سے ہیں۔ آپ کو قدرتی طور پر حضرت روح القدس سے تائید حاصل تھی۔ آپ عربی، فارسی اور ہندی کے جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ اور ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے پاکیزہ اخلاق اور بلند کردار کی خوشبو سے عوام و خواص کے مشام جان معطر رہتے تھے۔ مزاج میں ظرافت اور لطافت بہت زیادہ تھی۔ زبان سے سلاست و فصاحت کا چشمہ جاری رہتا تھا۔ حافظہ اس قدر زبردست تھا کہ تینوں زبانوں کے ہزاروں اشعار، علمی مسائل، سینکڑوں واقعات اور بڑے بڑے قصیدے اور مثنویاں آپ کے نوک زبان پر تھیں۔ ایسے حاضر جواب تھے کہ جب بھی کسی علم و فن سے متعلق آپ سے سوال کیا جاتا برجستہ جواب دیتے تھے۔

آپ کو سید العارفین میر سید لطف اللہ قدس سرہٗ سے مرید ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ تمام باطنی فضائل کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ نے آپ کو ظاہری علم وفضل اور مال و دولت سے بھی مالامال کیا تھا۔ آپ کی فیاضی اور بہادری کی ہر طرف شہرت تھی۔ ہمیشہ فوج ولشکر، علم و نقارہ و طبل کے مالک اور فیل نشین رہے۔ اپنے ہم وطنوں، پڑوسیوں، دوستوں اور دشمنوں سبھی کے ساتھ نہایت اخلاق و احسان سے پیش آتے تھے۔

کچھ عرصہ تک آپ نے صوبہ پنجاب کے دو خاص شہروں سیالکوٹ اور جالندھر کے بائیس پرگنوں کی حکومت کا کام سنبھالا۔ اور کچھ زمانہ تک صوبۂ اودھ کے نائب صوبہ دار کے عہدہ پر بھی فائز رہے آخر کار آپ نے صوبۂ اودھ کے ناظم برہان الملک سعادت خاں[2] نیشاپوری کی رفاقت اختیار کر لی۔ اور باوجود ملازمت کے کبھی آپ نے کتابوں سے اپنا تعلق ختم نہیں کیا۔ آخری عمر میں بھی جبکہ آپ کا سن شریف ستر سال سے تجاوز کر چکا تھا۔ آپ نے صحیح بخاری شریف اور صحیح مسلم شریف کی اپنے ہاتھ

---

[1] ابن قاضی محمد سعید، اللہ یار خاں شہید کی بہن ان کے عقد میں تھیں۔ ان کے منظومات کی تعداد تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے (مفتاح التواریخ، تاریخ خطۂ بلگرام)۔ [2] ان کا نام میر محمد امین تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ بن خلد مکان کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آئے اور کچھ دنوں نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات کے ساتھ رہے اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں رفتہ رفتہ عنایت خسروانہ سے نوازے گئے۔ صوبہ داری گجرات اور اودھ حاصل ہوئی۔ اور نواب برہان الملک سعادت خاں کا خطاب ملا۔ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ سے جنگ کے بعد شاہجہان آباد میں زخموں کی شدت اور تکالیف برداشت نہ کر سکے اور انتقال فرما گئے۔ شاہ جہان آباد ہی میں مدفون ہوئے۔
(مفتاح التواریخ، مآثر الامراء)

سے کتابت کی اور ان پر حاشیے بھی لکھے۔ احادیث نبوی کی خدمت سے آپ کو حد درجہ رغبت و محویت تھی۔
یہاں تک کہ ذیقعدہ کی ۱۵ تاریخ کو منگل کے دن ۱۱۵۱ھ میں ہندوستان کی اس جنگ میں جو ایران کے بادشاہ نادر شاہ[1] کے ساتھ شہر کرنال کے قریب واقع ہوئی تھی۔ نہایت بہادری کے ساتھ دشمنوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور اسی مقام پر دفن کر دیئے گئے۔

نظام الدین احمد صانع جوان کی اولاد میں ہیں فرماتے ہیں۔ ؎
(سات اشعار میں ان کی تاریخ وفات تحریر کی ہے۔ اس کا آخری شعر مطالعہ فرمائیں۔ قانوعی)

سال تاریخش نوشتم صوری و ہم معنوی
سال ہجرت بد ہزار و یک صد و پنجاہ و یک ۱۱۵۱ھ

اپنی موزونی طبع کے تحت یہ دو اشعار بھی فرمائے ہیں۔

در سایۂ مژگان رخ یار است بہ بنشید
آسائش گل در تہ خار است بہ بنشید

ہر اشک کہ گل کرد ز نوک سر مژگان
منصور صفت بر سر دار است بہ بنشید

۶۳

سید عبد الواحد بلگرامی روح اللہ روحہٗ

سید عبد الواحد بن سید طفیل بن سید محمد اعظم بن سید محمود اصغر قدس سرہم۔ تمام حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سید عبد الواحد بلگرامی مادر زاد ولی کامل تھے۔ آپ کے فضائل خداداد اور وہبی تھے۔ آپ کی ولادت ۱۰۹۵ھ میں ہوئی۔ ابتدائی زندگی میں اس زمانہ کے ممتاز اور مشہور فاضلین سے تحصیل علم میں مشغول رہے۔ اس کے بعد استاد المحققین جناب سید طفیل نور اللہ ضریحہٗ سے بھی کافی استفادہ کیا اور جلیل المرتبت عالم بن کر ان کی خدمت سے جدا ہوئے۔ شاطبی (رسالہ شاطبیہ) کو زبانی یاد کر لیا اور تقویٰ

---

[1] نادر قلی بیگ، پہلے ملک میں جگہ جگہ ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ اور تباہی و بربادی میں مشغول تھا کہ اسی زمانہ میں شاہ حسین صفوی کے لڑکے شاہ طہماسپ صفوی نے اشرف خاں سے جنگ کے لیے اس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ۱۱۴۲ھ میں اشرف خاں کو شکست دی اور سات سال اکیس روز بعد سلطنت ایران پھر خاندان صفویہ میں منتقل ہوئی۔ نادر قلی بیگ طہماسپ قلی خاں کے خطاب سے مفتخر ہوئے ۱۱۴۸ھ کے آخر میں شاہ طہماسپ کو قید کر کے خود بادشاہ ایران ہو گیا۔ ۱۱۵۱ھ میں ہندوستان فتح کرنے کے ارادہ سے ادھر آیا۔ شاہ جہان آباد سے چار منزل دور کرنال کے میدان میں محمد شاہ بادشاہ کو شکست دی۔ صلح کے بعد محمد شاہ کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ دہلی کو جا کر لوٹا۔ مال و دولت اور بیش بہا جواہرات، سونا، چاندی نقد وغیرہ غرضکہ جو کچھ ہاتھ لگا لے کر ۱۱۵۲ھ میں واپس ایران چلا گیا۔ آخر کار ۱۱۶۰ھ میں علی قلی خاں نے جو اس کا بھتیجا تھا اس کو قتل کر دیا اور امراء کی مدد سے خود تخت پر بیٹھا۔ اور خود کو علی شاہ کا لقب دیا۔ (مفتاح التواریخ)

وعبادت کا طریقہ اختیار کیا۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک فرائض ونوافل ادا کرتے تلاوت قرآن، کتابوں کا مطالعہ اور معرفت الٰہی کی راہ پر چلنے کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں جانتے تھے۔

یقیناً وہ ایک فرشتہ تھے جو اخلاق الٰہی کے زیور سے آراستہ کرکے بشکل انسانی بھیجے گئے تھے۔ گناہ کبیرہ تو کیا، گناہ صغیرہ بھی تمام عمر ان کے دامن کے قریب پھٹکنے نہ پایا ہوگا۔ ایک مرتبہ آپ کے خادم نے ایک مٹھی بھوس چھپا کر پڑوسی کے چھپر سے لے لی اور اسی سے آگ جلا کر کھانا پکایا۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا اور فرمایا کہ یہ مٹھی بھر بھوس پڑوسی کی اجازت کے بغیر لی گئی تھی۔

آپ کی وفات چہار شنبہ کے دن ۲۳، رمضان المبارک ۱۱۶۱ھ میں دار الخلافہ شاہجہان آباد میں واقع ہوئی۔ آپ کو مومن خاں کے باغ میں دفن کیا گیا۔ جو شاہ مرداں[1] کے قرب وجوار میں واقع ہے۔

راقم الحروف (مؤلف) کہتا ہے ؎

سید مستجمع علم وعمل	در ریاضت ہمچو ماہ نو تمام
ہاتفے فرمود سال رحلتش	رفت عبدالواحد قدسی مقام

سید صاحب کی تحریر بڑی پاکیزہ اور خوشنما ہوتی تھی۔ متعدد قرآن پاک اور بہت سی دینی کتابیں آپ نے اپنے قلم سے تحریر کی تھیں۔ اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں آپ نے اپنی خوشنما تحریر میں "نہج البلاغہ" بھی نقل کی تھی۔ وطن (بلگرام) میں قیام کے زمانہ میں آپ نے راقم الحروف (مؤلف) کے لیے "شافیہ ابن حاجب" لکھی تھی۔

فقیر راقم الحروف (مؤلف) نے "شافیہ ابن حاجب" کے نیچے یہ عبارت لکھ دی:۔

"تحررت بحمد اللہ سبحانہ ھذہ النسخۃ المسماۃ بالشافیہ وھی لاعلام قوانین الصرف شافیہ للشیخ العلامہ ابو عمرو عثمان بن الحاجب الذی ثنا مہ علی تعالی ھذہ الصناعۃ واجب نقلہ اللہ بالرحمۃ الواسعۃ وادخلہ فی الجنان محلاً واسعاً استکتبھا عن السید البادع والنور الساطع حافظ کلام اللہ الجلیل السید عبد الواحد بن السید خلیل وانا العبد الملتجی الی ربہ السامی غلام الحسینی الواسطی البلگرامی اللھم اغفر لی ولوالدی وللمؤمنین والمومنات بالنبی العربی صاحب الشفاعات وصل وسلم علیہ وعلی آلہ الاطہار وصحبہ الاخیار۔"

[1] علی جی یا علی گنج، درگاہ کربلا کے قریب۔ بیان کرتے ہیں کہ ادھم بائی زوجہ محمد شاہ بادشاہ جو احمد شاہ کے عہد میں نواب بائی اور نواب قدسیہ صاحب الزمانی کے خطابات سے سرفراز ہوئی شیعہ مذہب کی تھی۔ ۱۱۶۷ھ میں اس نے ایک پتھر پر کہیں حضرت علی کا نشان قدم پایا، سنگ مرمر کا حوض بنا کر اس نے وہ پتھر اسی حوض میں نصب کروا دیا۔ اسی وجہ سے وہ مقام علی جی یا شاہ مرداں علیہ السلام کے نام سے موسوم ہو گیا۔ (واقعات دار الحکومت دہلی۔)

۶۴

سید محمد اشرف المعروف بہ سید درگاہی قدس سرہٗ

آپ بلگرام کے رہنے والے حسینی ترمذی سادات میں سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

سید محمد اشرف بن سید عبدالدائم بن سید احمد بن سید عبدالفتاح بن سید فریدالدین بن سید محمد بن سید عبدالقادر بن بندگی سید حسن بن سید محمد بن سید قاسم بن شاہ حسین بن شاہ اسمٰعیل بن سید برہان الدین بن سید تاج الدین بن سید عبدالحمید بن سید نعمان بن سید حمزہ بن سید حسین بن مخدوم سید احمد زاہد بن سید حمزہ بن سید ابابکر بن سید عمر بن سید محمد بن مخدوم سلطان احمد توختہ بن سید علی بن سید حسین بن سید محمد مدنی معروف بہ شاہ ناصر مدفون ترمذ بن سید حسن خمیس بن سید موسیٰ الخمیس بن سید علی بن امام حسن اصغر بن امام زین العابدین علی بن امام حسین سبط رضی اللہ تعالٰی عنہم۔

حضرت سید محمد اشرف کے بزرگوں میں سب سے پہلے جو بزرگ ترمذ سے ہندوستان آئے وہ سید احمدؒ توختہ ہیں (تائے فوقانی پر ضمہ وخائے معجمہ و تائے فوقانی) ہندوستان آکر لاہور میں مقیم ہوگئے۔ وہیں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون بھی ہوئے۔ حضرت سید احمد توختہ کے بیٹے سید محمد بن سید قاسم قنوج تشریف لائے اور وہیں مقیم ہوگئے۔ جب شیر شاہ نے داعی پور کے قریب شیر گڈھ کے نام سے ایک بستی آباد کی اور بخاری سادات نیز شہر قنوج کے دوسرے بزرگوں کو وہاں قیام پذیر ہونے کے لیے مجبور کیا تو سید محمد قدس سرہٗ نے قنوج سے شیر گڈھ جاکر قیام کیا۔

جب حکومت و بادشاہت تھوڑے ہی زمانہ کے بعد خاندانِ افاغنہ سے تیموری خاندان میں واپس آئی تو قنوج کے لوگ شیر گڈھ سے اپنے اصلی وطن (قنوج) کی طرف واپس آئے۔ لیکن سید محمد قدس سرہٗ

لہ لاہور کے قدیم مشائخ وسادات میں سے تھے۔ غیبی اشارہ کے تحت ترمذ سے ہندوستان تشریف لائے۔ اثنائے سفر آپ کی دو صاحبزادیاں بی بی حاقہ اور بی بی تاج بھی ہمراہ تھیں۔ کیچ مکران کے مقام پر پہنچ کر اپنی بڑی صاحبزادی کا شاہزادہ بہاء الدین محمد بن سلطان قطب الدین محمد بادشاہ کیچ مکران سے جو شیخ ابوالحسن ہنکاری قریشی کی اولاد میں سے تھے۔ عقد کر دیا۔ اور خود لاہور پہنچ گئے اور محلہ چہل بی بی میں سکونت اختیار کی۔ اس کے بعد ان کے حقیقی برادر زادہ شاہ فرید بھی لاہور پہنچ گئے اور سید صاحب نے اپنی دوسری صاحبزادی کا عقد شاہ فرید سے کرکے اندرون ہمدان کو روانہ کر دیا۔ سید توختہ نے ۶۰۰ھ میں بمقام لاہور وفات پائی۔ اور محلہ چہل بی بی در طویلہ غلام محی الدین قریشی میں مدفون ہوئے۔ توختہ ترکی زبان میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کھڑا ہوا ہو۔ سید احمد ایک مرتبہ اپنے پیر کے دروازہ پر رات بھر کھڑے رہے تھے۔ صبح کو پیرو مرشد نے "توختہ" کے لقب سے ملقب فرمایا۔
(خزینۃ الاصفیاء، نزہۃ الخواطر، تاریخ آئینۂ اودھ، احمد گنج بخش اردو ترجمہ)

نے کہا کہ ہم تو فقیر ہیں، ہمارے لیئے جنگل ہی مناسب ہے اور پھر وہیں مقیم ہو گئے اور باقی زندگی وہیں گذار دی لیکن آپ کی وفات کے بعد آپ کی نعش قنوج میں لاکر دفن کی گئی۔

آپ کے صاحبزادہ سید حسن قدس سرہٗ نے ایک عالی شان مسجد شیر گڈھ میں تعمیر فرمائی تھی۔ جس کا قطعہ تاریخ راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے۔ اس کا مادۂ تاریخ "خیر المکان" ہے۔ آپ نہایت سخی اور فیاض تھے۔ ہر کس و ناکس کے لیے آپ کا دستر خوان بچھا رہتا تھا۔ قبر شریف داعی پور میں ہے۔ سید فرید الدین بن سید محمد بن سید عبد القادر بن بندگی سید حسن قدس سرہٗ داعی پور سے بلگرام آکر بس گئے تھے۔ اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اسی وقت سے آپ کی اولاد میدان پورہ محلہ "احاطۂ ٹھکرا" میں قیام پذیر ہے۔ حضرت سید اشرف درگاہی علامۂ مرحوم میر عبد الجلیل اور استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی کے خاص دوستوں میں تھے آپ باطنی کمالات کے آئینہ دار اور انسانی فضائل کے سرچشمہ اور مرکز تھے آباؤ اجداد اور بزرگوں کے طور و طریقہ کے حامل تھے۔ آپ کی پیشانی سے بزرگی کے آثار و انوار روشن تھے۔ آپ کی ولادت ۱۰۶۱ھ میں ہوئی۔

فرماتے تھے کہ مجھے تحصیل علم کا شوق دلانیوالے اور طلب علم پر آمادہ کرنے والے علامۂ مرحوم میر عبد الجلیل ہوئے۔ علامۂ مرحوم نے مجھے اس وقت شوق دلایا جبکہ میری شادی ہو چکی تھی اور میں ازدواجی زندگی گذار رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اب جبکہ میں نے جوانی کی منزل میں قدم رکھ دیا ہے تو اب تحصیل علم سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ یقیناً فائدہ ہوگا۔ مختصرات آپ نے مجھے خود پڑھائی اور شرح ملا جامیؒ میں نے جناب سید العارفین کے بھائی سید نور اللہ قدس سرہم سے پڑھی۔ مختصر معانی، حاشیۂ خطائی، تین جلدیں، شرح وقایہ کی، شرح ہدایہ اور حکمت و معقولات کی کتابیں میں نے میر سعد اللہ بلگرامی کی شاگردی میں پڑھیں۔ مناظرہ کی کتابیں میں نے ملا شہاب الدین چوبی پوری[1] کی خدمت میں رہ کر پڑھیں جو جلیل القدر عالم اور ملا باسو کے شاگردوں میں سے تھے۔ اس کے بعد میں نے ملازمت اختیار کر لی۔

سید محمد اشرف قدس سرہٗ بہت اعلیٰ خوشنویس تھے۔ آپ نے علامۂ مرحوم کا طرز تحریر اپنا لیا تھا۔ آپ کا طرز تحریر بالکل علامہ مرحوم کے طرز تحریر سے ملتا جلتا تھا۔

آپ نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں ہی شرح وقایہ کی پوری کتاب شروع سے آخر تک مع مفید حاشیوں کے لکھ کر آنے والوں کے لیے بہترین یادگار چھوڑی ہے۔ آپ کی عبادت و ریاضت درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی تھی۔ اگرچہ آپ کی عمر کا اکثر حصہ سفر ہی میں گذرا۔ لیکن کبھی نماز تہجد ترک نہیں کی۔

---

[1] چوبی پورہ قنوج کے ضلع میں ایک دیہات ہے۔ مولانا شہاب الدین منطق و فلسفہ کے مشہور عالم تھے۔ شیخ غلام مصطفیٰ بن محمد الحسنی جائسی سے دیگر فنون حاصل کیے۔ (نزہۃ الخواطر)۔

جب آپ تلاش معاش میں وطن سے باہر نکلے تو سب سے پہلے شاہزادہ محمد معظم بن خلد مکان (یعنی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے تیسرے لڑکے۔ ولادت ۱۰۶۳ھ جلوس ۱۱۱۸ھ اور ۱۱۱۹ھ میں دھول پور کے معرکہ میں مقتول ہوئے۔) کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور باعزت و معتبر ملازمین کی جماعت میں شامل کر لیے گئے۔ کچھ عرصہ تک نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی کی صحبت میں نہایت عزت و شان کی زندگی بسر کی خاص ذمہ داریوں کے عہدوں پر آپ فائز رہے۔ ۱۱۵۰ھ کے آخری ایام میں آپ نے نواب صفدر جنگ کی مصاحبت کا عہدہ قبول کر لیا۔ آخر میں آپ احمد شاہ بن محمد شاہ بادشاہ کے وزیر مقرر ہوئے۔

۱۱۶۰ھ میں جب کہ آپ کی عمر نوّے سال کے قریب پہونچ چکی تھی۔ ملازمت کے مشغلہ سے دست بردار ہو کر وطن عزیز بلگرام میں تشریف لا کر گوشہ نشین ہو گئے۔

آپ اپنا قیمتی وقت ہمیشہ عاقبت کو سنوارنے میں خرچ کرتے تھے۔ اور تمام وقت نماز، روزہ، تلاوت قرآن، تفسیر و حدیث اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف فرماتے تھے۔ عمر کی زیادتی اور اعضاء کی کمزوری کے باعث خود سے کھڑے رہنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ چھڑی کے سہارے پر یا کسی دوسرے کی مدد سے اٹھ کر کھڑے ہوتے تھے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن محلہ میدان پورہ کی جامع مسجد میں سوار ہو کر آیا کرتے تھے۔ اور حاضرین مسجد سے ملاقات کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگرچہ نماز عید عذر شرعی کی بنا پر مجھ سے ساقط ہو چکی ہے (معاف ہو چکی ہے) لیکن پھر بھی آج کے روز انتہائی زحمت اٹھا کر مسجد میں حاضر ہونے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ میسر آجائے۔ اور احباب سے ملاقات بھی ہو جائے۔

الٰہی! تو ہی بہتر جانتا ہے کہ سال آئندہ یہ نعمت مجھے نصیب ہو گی یا نہیں؟ آخر کار صفر کی نویں تاریخ ۱۱۶۵ھ کو جبکہ آپ کی عمر تقریباً اکانوے سال کی ہو چکی تھی۔ اس جہان فانی سے اپنا دامن سمیٹ کر عالم روحانی و جاودانی کی راہ لی۔

راقم الحروف (مؤلف) نے ان کی وفات کی تاریخ ذیل کے قطعہ میں قلمبند کی ہے۔

میر اشرف سر آمد فضلا — برد تشریف سوئے منزل قدس
ہاتف گفت سال رحلت او — اشرف واردان محفل قدس
۱۱۶۵ھ

آپ کے دو عالم و فاضل بیٹوں کا ذکر جن کے اسماء گرامی میر عبد الواحد اور بندگی حسن ہیں۔ شعراء کے زمرے اور ان کے تذکروں میں آئے گا۔[1]

[1] میر عبد الواحد ہجری تخلص واحد، فارسی و ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ میر عظمت اللہ بے خبر کے دوستوں میں تھے ۱۱۳۴ھ میں کنارے جنگ کے دوران مضافات لاہور میں شہادت پائی۔ شکرستان خیال کے نام سے ایک کتاب بھی ہے جس میں حقیقی کے بارے میں نظم و نثر دونوں تحریر کی ہیں۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، مخمس، ترجیع بند پر مشتمل ایک دیوان بھی ہے جس میں ذوقی تخلص کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی سید حسن اپنا تخلص کرتے تھے۔ عین جوانی میں وطن مالوف سے نکل کر شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم دوم ۱۱۲۴ھ کی ملازمت کی۔ ان کے والد اس وقت شاہزادہ محمد اعظم بن خلد مکان کے ملازم تھے ۱۱۱۹ھ میں انتقال ہوا۔ (سرو آزاد)

۶۵

میر سید محمد سلمہٗ اللہ تعالےٰ

آپ حضرت علامۂ مرحوم میر سید عبد الجلیل قدس سرہٗ السامی کے فرزند سعادت مند ہیں۔

۱۴ ربیع الاوّل شریف سنہ ۱۱۰۱ھ شنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی۔ اس قول ناطق کے مطابق کہ الولد الحر یقتدی بآبائہ الغر آپ بھی اپنے والد مرحوم کی جامعیتِ علمی اور کمالاتِ فن کے آئینہ دار تھے۔ خصوصاً عربی ادب ولغت اور قوت حافظہ میں آپ اپنے زمانہ کے علماء و فضلاء کے امام تھے۔ آپ نے تمام درسی کتابیں استاد المحققین میر طفیل محمد بلگرامی طاب ثراہ کی خدمت میں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے والد ماجد علامہ میر عبد الجلیل مرحوم سے بہت سے ظاہری و باطنی کمالات حاصل کیے۔

باپ کو اپنے بیٹے سے جو قدرتی اور (لازمی) پدری شفقت ہوتی ہے اس کے علاوہ بھی مرحوم کو اپنے فرزند ارجمند میر سید محمد سے انتہائی خصوصی محبت و شفقت تھی۔ جس وقت علامۂ مرحوم بھکر سے دار الخلافہ شاہجہان آباد تشریف لائے آپ نے اپنے صاحبزادہ میر سید محمد کو اپنے پاس بلایا۔ پھر اس کے چند ہی دنوں بعد آپ نے ایک دوسرا خط بھیج کر کچھ دنوں ٹھہر جانے کا حکم فرمایا۔ اور تحریر کیا کہ میرے حکم ثانی کا انتظار کرو۔ والد ماجد علامۂ مرحوم کے خط کے جواب میں میر سید محمد نے تحریر فرمایا کہ لن ابرح الارض حتی یاذن لی ابی۔ علامۂ مرحوم بیٹے کے اس جواب کو پڑھ کر بیحد مسرور ہوئے اور فوراً ہی یہ رباعی لکھ کر بھیج دی ؎

تا یاذن لی ابی بخطت دیدم — گلہائے طرب از چمن دل چیدم
از غایت اہتزاز پروانہ صفت — اے شمع پدر گرد سرت گردیدم

حکومتِ بھکر اور سیوستان کی وقائع نگاری، سوانح نگاری اور بخشی گری کے عہدوں پر متمکن رہے اور بادشاہ خلد مکان کے زمانے سے محمد فرخ سیر[1] بادشاہ کی سلطنت کے آخری وقت تک خدمت شاہی علامہ مرحوم کے لیے نامزد تھی۔ اگرچہ علامۂ مرحوم اپنی حیات میں ہی ان عہدوں سے مستعفی ہو گئے تھے۔ اور مذکورہ بالا عہدوں کی نامزدگی شاہی دربار سے اپنے فرزند ارجمند میر سید محمد کے لیے منظور کرائی تھی۔ میر سید محمد نے سنہ ۱۱۳۲ھ میں ان مقامات پر پہونچ کر ان فرائض منصبی کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے

---

[1] معین الدین محمد فرخ سیر ولد عظیم الشان بن شاہ عالم بہادر شاہ۔ ولادت سنہ ۱۰۹۵ھ میں ہوئی۔ سنہ ۱۱۲۴ھ میں جہاندار شاہ پر فتح پانے کے بعد اکبر آباد میں تخت شاہی پر بیٹھا۔ اور سید عبد اللہ خاں کو قطب الملک بہادر، یار وفادار، ظفر جنگ کے خطابات کے ساتھ خلعت وزارت عطا کی۔ امیر الامرائی اپنے بھائی سید حسین علی خاں کو مرحمت کی۔ سنہ ۱۱۳۱ھ میں معزول ہونے اور آنکھ سے معذور ہو جانے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ (مفتاح التواریخ)

لیا۔ اور اپنی ذمہ داریوں کو شروع سے آخر تک ایسی خوش اسلوبی، دیانت اور حسن معاملگی کے ساتھ انجام دیا کہ وہاں کے عوام و خواص اور شرفاء سب کے سب اب تک ان کو یاد کرتے ہیں اور ان کے اوصاف حمیدہ اور ذکر خیر میں رطب اللسان ہیں۔

۱۱۴۳ھ میں آپ نے کاتب الحروف (مؤلف) کو سیوستان میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود اپنے وطن مالوف بلگرام تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں وہاں قیام فرمایا۔ تاکہ اُن شکایتوں اور بدگمانیوں کو دور کریں جو اُن کی ملازمت کے سلسلہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ آپ دارالخلافہ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں کے بعض حکام اور وزراء کے ذریعہ آپ نے ملازمت سے متعلقہ تمام شکایتوں اور رخنہ اندازیوں کو دور کرا دیا۔ اور ۱۱۴۵ھ آپ دوبارہ سیوستان تشریف لائے اور فقیر (مؤلف) کو آپ نے ۱۱۴۷ھ کے وسط میں ہندوستان کی طرف روانہ کیا اور خود بنفس نفیس حسب دستور اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب کہ نادر شاہ سندھ کے پورے علاقہ پہ قابض ہو گیا۔ اور اس نے بادشاہ سابق کے تمام عہدوں کو ختم کر دیا۔

لیکن سندھ کے قدیم بادشاہ خدایار[1] خاں نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ آپ کو سیوستان میں بحفاظت تمام مقیم رکھا اور آپ کی حیثیت کے مطابق سرکاری عہدہ عطا فرمایا لیکن چونکہ نادر شاہ اور اس کے حکام کے فتنوں کا بازار ملک میں ہر طرف گرم ہو چکا تھا اور ملک کے پرانے طریقے اپنے انداز پہ باقی نہیں رہے تھے۔ اس لیے آپ کا دل و دماغ وہاں کے قیام سے بیزار ہو گیا۔ مجبوراً آپ نے نہایت تاکید کے ساتھ بار بار اصرار کر کے خدایار خاں کو اجازت دینے پر راضی کر لیا اور آپ ۵ / رمضان المبارک ۱۱۵۵ھ کو سیوستان چھوڑ کر مارواڑ کے راستہ اپنے وطن مالوف کی جانب روانہ ہوئے۔ منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے ۷ / محرم الحرام ۱۱۵۶ھ کو اپنے محبوب وطن بلگرام میں بخیر و عافیت پہنچ گئے۔

واضح رہے کہ ۱۱۵۶ھ میں جس سال راقم الحروف (مؤلف) کی ولادت ہوئی تھی اسی سال سے بھکھر اور سیوستان کے انتظامات کی ذمہ داریاں تمام تر علامہ مرحوم کے سپرد کر دی گئی تھیں۔

ہمارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے اصل مالک کی حیثیت سے اور کبھی ایک قائم مقام (نائب) کی حیثیت سے ان عہدوں پہ فائز رہے۔ ابتداء میں علامہ مرحوم خود بھکھر میں تشریف فرما رہے۔

سید محمد اشرف بن سید عبد العزیز کو جن کو آنجناب کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا۔ اپنا نائب اور قائم مقام بنا دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے میر محمد اشرف کو وطن واپس جانے کی اجازت دیدی

---

[1] میاں محمد یار ملقب بہ خدایار خاں ولد نصیر محمد بن الیاس بن داؤد بن آدم کلہوڑا۔ ۱۱۳۵ھ میں وفات پائی۔
(تحفۃ الکرام)

اور اپنے برادر عم زاد میر کرم اللہ بن سید معین الدین کو سیوستان میں اپنا نائب مقرر کیا۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ بھی آگیا جبکہ آپ کو اپنی ملازمت چھوڑ دینی پڑی۔ چنانچہ علامہ مرحوم بادشاہ کے دربار میں خود حاضر ہوئے اور اپنی ملازمت کو حسب دستور سابق بحال کرایا۔

اور شیخ محمد رضا[1] بھکری کو آپ نے تحریر فرمایا کہ ملازمت کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح انجام دیں۔ اس کے بعد آپ نے راقم الحروف (مؤلف) کے والد محمد نوح کو روانہ کیا۔ فقیر کے والد تقریباً سات سال تک بھکر اور سیوستان میں علامہ مرحوم کے نائب کی حیثیت سے اپنی ملازمت کی ذمہ داریاں بجا لاتے رہے۔ جب یہ ذمہ داریاں میر سید محمد کے نام پر مقرر کی گئیں تو وہ وہاں پہنچ گئے اور حضرت والد ماجد اپنے وطن کو واپس آگئے۔

کچھ عرصہ تک کاتب الحروف (مؤلف) نے خود بھی خان بلند اقبال کی خدمت نیابت انجام دی جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ چالیس سال کے بعد آسمان کی گردش اور زمانہ کی نیرنگی نے کچھ ایسی کروٹیں بدلیں کہ ہمارا خاندان سندھ سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم۔

جناب میر سید محمد اپنے ظاہری اور باطنی کمالات، برگزیدہ خصوصیات، پسندیدہ صفات اور پاکیزہ اخلاق کے باعث ممتاز شخصیت کے حامل تھے۔ اپنی راست گوئی، روشن ضمیری، پاک باطنی اور خصوصاً اپنی عالی ہمتی، بلند حوصلگی، سخاوت و فیاضی میں آپ یگانۂ روزگار تھے۔ سید العارفین قدس سرہ کے مرید خاص اور اللہ تعالٰے جل شانہٗ کے مقبول بارگاہ بندہ تھے۔ آپ کے اوقات اکثر و بیشتر مطالعۂ کتب میں بسر ہوتے تھے۔ مطالعہ میں اکثر فتوحات مکیہ جیسی حقائق کی کتابیں رہا کرتی تھیں۔ سنہ ۱۱۵۵ھ میں آپ نے "مستطرف[2]" کا جو فن ادب میں ایک بہترین کتاب ہے، انتخاب فرمایا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ اور حمد و صلوٰۃ کو یوں تحریر فرمایا ہے۔

الحمد للہ الذی علمنا من البیان ما ھو مستطرف۔ والھمنا من الکلام ما ھو مستظرف والصلوٰۃ والسلام علے من انزل علیہ نون والقلم واسند علیہ احادیث الکرم و علے آلہ الذین وجب علینا الاقتداء بآثارھم واصحابہ الذین حق علینا الاھتداء بانوارھم۔

---

[1] بھکر کے مشہور ترین علماء میں سے تھے۔ سنہ ۱۱۴۳ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر)

[2] المستطرف فی کل فن مستظرف۔ تالیف شہاب الدین محمد۔ (۷۹۰ — ۸۵۰ھ) بن احمد ابو الفتح الابشیہی۔ محل، آداب، مواعظ اور حکایات میں بہترین کتاب ہے۔ آخر میں درود شریف کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ (مترجم)

(٦٦)

میر محمد یوسف سلمہٗ اللہ تعالیٰ

میر محمد یوسف بن سید محمد اشرف بن سید عبد العزیز بن سید معین الدین بن سید عبد اللطیف بن سید محمود اصغر بلگرامی قدس سرہ۔ بہت بلند پایہ بزرگ ہیں۔ آپ شہر فضل و کمال کے خدیو مصر تھے (یعنی آپ میں بہت سے کمالات جمع تھے) آپ نے عقل و دانش کی زلیخا کو اس کے پیرانہ سالی میں جوانی کا خوشنما لباس پہنا کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ (یعنی آپ کو خداوند تعالیٰ نے وہ فہم و فراست عطا کی تھی جس سے آپ نے دانشوران زمانہ کو حیرت میں ڈال دیا تھا) آپ نے علم و ہنر کی کھیتی کی پیداوار کو علمی قحط سالی کے دور میں بھی نہایت ارزاں فرما دیا تھا (یعنی اپنی جد و جہد اور علمی سرگرمی کے ذریعہ آپ نے علم دین کی نعمت عام کر دی تھی) آپ کو اللہ تعالیٰ نے وہ ذہن رسا عطا کیا تھا کہ بڑے بڑے اور پیچیدہ مسائل آن واحد میں حل فرما دیا کرتے تھے۔

آپ کی یادداشت اور قوت حافظہ، بیشمار معلومات کا ایک حسین عجائب خانہ تھی۔ (آپ کا حافظہ بہت قوی اور زبردست تھا) عمل جو علم کے درخت کا پھل ہے وہی آپ کے باغ کا سرمایہ تھا (آپ عالم باعمل تھے) حسن اخلاق جو شرافت و انسانیت کے گلدستہ کا سب سے خوش رنگ پھول ہے وہی آپ کے پھلواری کی رونق و زینت کا باعث ہے (آپ ایسے با اخلاق اور کریم النفس تھے کہ آپ کا آستانہ عالیہ ہمیشہ مرکز انام و مرجع خواص و عوام رہتا تھا)۔ آپ کی ولادت ۲۱ ر ماہ شوال ۱۱۱٦ھ کو دوشنبہ کے دن ہوئی۔

آپ حضرت علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب چار واسطوں سے حضرت علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی سے جا کر مل جاتا ہے۔ حضرت علامہ سے آپ کی خالہ زادہ ہونے کی نسبت خصوصیت رکھتی ہے۔

آپ نے تمام درسی کتابیں از اوّل تا آخر استاذ المحققین جناب میر سید طفیل محمد روح اللہ روحہا سے پڑھیں۔ عربی ادب، حدیث و تفسیر اور سیرت نبوی کی تمام کتابیں آپ نے جد امجد استاذ الاساتذہ حضرت میر عبد الجلیل بلگرامی قدس سرہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

عروض و قافیہ اور ادب کے بعض فنون اور دوسرے مضامین آپ نے میر سید محمد رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھے۔ آپ کے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک کتاب یا دو کتابیں آپ دو مختلف اساتذہ سے پڑھتے تھے یا ان کی سماعت کرتے تھے۔ اور اس کے بعد خود مطالعہ فرما کر مندرجہ رموز و نکات پر غور فرماتے۔

اگر کبھی کسی استاد کی طبیعت سوء اتفاق سے ناساز ہو جاتی تو پھر دوسرے استاد سے بھی درس کا مشغلہ ملتوی فرما دیتے تھے۔

اپنے قیام وطن اور ایام طالب علمی میں اپنا زیادہ تر وقت طلبہ کی تعلیم میں صرف فرماتے ۱۱۵۶ھ میں آپ نے دارالخلافہ شاہجہان آباد میں پہنچ کر وہاں کے بعض ان علماء سے جو علوم و ریاضیات میں ممتاز اور ماہر تھے، ریاضی، ہیئت، ہندسہ اور حساب کا علم حاصل کیا۔ اور ان فنون میں آپ نے مہارت تامہ حاصل کی پھر حضرت سید العارفین قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اس طرح سے آپ کو خداوند کریم نے شریعت و طریقت دونوں کی دولت سے مالا مال فرمایا ہے۔ دنیاوی اور معاشی مشغلوں میں مصروف ہونے کے باوجود آپ اپنے اوقات کی حفاظت فرماتے ہیں۔ اور احکام شریعت کی تعمیل میں پوری کوشش فرماتے ہیں۔ ۱۱۶۲ھ میں آپ نے مسئلہ توحید کی تحقیق کے موضوع پر ایک کتاب "الفرع الثابت من اصل الثابت" کے نام سے تالیف فرمائی جس میں چار باب ہیں اور ایک خاتمہ ہے۔ اس کتاب کا طرز تحریر انتہائی سنجیدہ، شستہ اور پر لطف ہے۔ اس کے مطالب اور محتویات نہایت اعلیٰ اور مقاصد بہت پاکیزہ اور مبارک ہیں۔ اس میں بہت سی نایاب اور گراں مایہ باتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کی کوششوں کو کامیاب فرمائے۔ آمین۔

راقم الحروف نے اس کتاب کے تکملہ کی تاریخ یوں عرض کی ہے:

میر یوسف عزیز مصر کمال
از خم معرفت کشیدہ رحیق

کرد در وحدت شہود رقم
نسخۂ تازۂ بہ فکر عمیق!

از احادیث و از کلام اللہ
کرد اثبات حق زہے توفیق

ہست ایں نقش دلنشیں الحق
یادگارے زخامۂ تدقیق

سال تالیف ایں کتاب خرد
گفت "شمع مجالس تحقیق"

۱۱۶۲ھ

۶۷

سید سعد الدین علیہ رحمۃ اللہ

ابن سید جمال الدین بن سید مربی بلگرامی قدس سرہٗ جن کا بیان مشائخ کے ذکر کے سلسلہ میں اس سے قبل گذر چکا ہے۔ سید سعد الدین نے تمام درسی کتابیں میر عبدالواحد بلگرامی کے تیسرے خلیفہ و سجادہ نشین میر سید نعمت اللہ کی خدمت میں پڑھیں۔ اور نہایت قابلیت و صلاحیت علمی پیدا کی۔

کچھ دنوں تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ اس کے بعد ملازمت اور کسب معاش کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس طرح تصنیف و تالیف اور پڑھنے پڑھانے کا شغل بند ہو گیا۔ آخرکار ملازمت سے دست بردار اور مستعفی ہو کر اپنے وطن مالوف بلگرام میں مقیم و گوشہ نشین ہو گئے۔
پھر آپ نے اپنا اصلی مشغلہ اختیار فرمایا۔ اور تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

---

(۶۷)

شیخ عثمان احمد رحمۃ اللہ علیہ

آپ قاضی احسان اللہ[۱] عثمانی بلگرامی کے فرزند سعید ہیں۔ آپ کے والد ماجد آجکل شہر بلگرام کی مسند شریعت (قضاۃ) پر متمکن ہیں۔ شیخ عثمان احمد نے اپنے والد ماجد ہی کو ابتدائے سن شعور سے ہی اپنی راہنمائی کے لیے خضر راہ بنایا۔ پھر حصول علم کے لیے بلگرام سے باہر نکلے۔ اور پورب کے دوسرے طالبین علم کی طرح آپ بھی اکناف و اطراف میں اس غرض کے لیے سیر و سفر کرتے رہے[۲]۔
آخرالامر آپ ملا عظیم الدین[۳] ساکن ملاواں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کے علاوہ دیگر فضلائے عصر کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فیضان علم سے سیرابی حاصل کرتے

---

[۱] عرف قاضی محمد عثمان بن قاضی محمد امر (م ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) بن قاضی محمد فضیل (م ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء) بن قاضی محمد یوسف ثالث (م ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۲ء) قاضی احسان اللہ کی ولادت (۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء) میں ہوئی اور انکی وفات ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں ہوئی۔ (تاریخ خطۂ بلگرام از قاضی محمد شریف) [۲] شیخ عثمان احمد عرف قاضی احمد اللہ کی ولادت ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں ہوئی۔ پہلے سید پیر محمد خلف مولوی سید محمد فاضل رسولدار حسینی قنوجی کے شاگرد ہوئے اسکے بعد سندیلہ میں ملا عبید اللہ خلف مولوی زین العابدین (شاگرد رشید علامہ کمال فتحپوری) سے متداولات پڑھیں۔ اور شرح عقائد ملا سعد مع حاشیہ خیالی و عبد الحکیم، شرح وقایہ، فرائض شریفی، شرح ہدایۃ الحکمۃ، میبذی اور اسکے علاوہ متفرقات اور بعض معقولات مولوی دین محمد بن شیخ وجیہ الدین سے پڑھیں آخرالامر ملاواں جا کر معقولات تحری و حدیث مشکوٰۃ شریف میں صحاح ستہ تک اور تفسیر بیضاوی ملا محمد عظیم ملانوی سے پڑھیں۔ ۱۲۲۸ھ میں وفات پائی۔
حواشی شرح وقایہ، حضرت ملا جامیؒ کی تصنیف "الدرۃ الفاخرہ" کا ترجمہ اور رسالہ مسجلات فی تاریخ القضاۃ" اور دوسری بہت سی کتابیں اور رسالے آپ کی یادگار ہیں۔ (نزہۃ الخواطر، تاریخ خطۂ بلگرام)
[۳] بن کفایت اللہ فاروقی گوپاموی متوفی بعد ۱۱۶۰ھ۔ منطق و فلسفہ میں یگانۂ روزگار تھے دیگر علوم و فنون اور حکمت کی کتابیں ملا قطب الدین بن شہاب الدین گوپاموی (م ۱۱۲۱ھ) سے پڑھیں اور فنون حدیث شیخ صفت اللہ بن مدینۃ اللہ حسینی خیرآبادی (م ۱۱۵۰ھ) سے حاصل کیا اور سند حدیث بھی انھیں سے لی۔ متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں۔
(شرح سلم العلوم، حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ، حاشیہ میر زاہد، حاشیہ ملا جلال۔ نزہۃ الخواطر)۔

رہے۔ ابتداء سے انتہا تک تمام کتب متداولہ آپ سے پڑھیں۔ اور اس طرح آپ نے علم و فضیلت میں بڑا مرتبہ حاصل کر لیا۔ اب اس وقت شہر بلگرام میں علم و دانش کا چراغ روشن فرما کر طالبین کی راہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

---

(۶۹)

سید غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ

بن سید محمد ارشد بن سید خضر بن سید کمال الدین بن سید پیارہ بن سید عالم بن سید حسین بن سید فضل اللہ۔

سید غلام نبی نہایت روشن دماغ اور صاحب کمال شخصیت ہیں۔ مختصرات کی ابتدائی کتابیں آپ نے ملا قطب الدین گوپاموی کے بعض شاگردوں سے پڑھیں۔ منقولات (حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ) کی تمام کتابیں اور معقولات (منطق اور فلسفہ) کی کچھ کتابیں آپ نے ملا احمد اللہ سے جو مولانا حاجی صفت اللہ قدس سرہم کے صاحبزادے شاگرد اور خلیفہ تھے، پڑھیں۔ منقولات اور معقولات کی اکثر کتابوں کی تکمیل درس جناب شیخ کمال الدین محمد سہالوی فتحپوری کی خدمت میں کی۔

چونکہ مولوی احمد اللہ قدس سرہ کے حقوق آپ پر زیادہ تھے۔ اس لیے آپ کی سند فراغت اور دستار بندی شیخ کمال الدین محمد کی رضامندی اور اجازت سے مولوی احمد اللہ ہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ اور اپنے زمانہ کے تمام مشہور اور ممتاز علماء و فضلاء میں شمار کیے جانے لگے۔ اس کے بعد آپ نے کسی تقریب کے سلسلہ میں ۱۱۶۸ھ کے اواخر میں بلگرام سے ارکاٹ اور ترچناپلی کا سفر کیا۔ پھر وہاں سے اُسی سال ذی الحجہ کی بیسویں تاریخ کو آپ اورنگ آباد تشریف فرما ہوئے۔ اور کچھ دنوں اس فقیر کے گھر بھی مہمان رہے۔ ۱۹، محرم ۱۱۶۹ھ کو آپ اسی مقام کی جانب دوبارہ واپس لوٹ گئے۔

اب یہ راقم الحروف (مؤلف) ان اساتذہ کے حالات قلمبند کرنا چاہتا ہے۔ جن کے اسماء گرامی برسبیل تذکرہ نوک قلم پر اس تذکرہ میں آچکے ہیں۔ اس طرح بزرگوں کی خدمت کرنے کی راہ میں اپنی کوشش کا قدم رکھتا ہے۔

---

(۷۰)

مولوی قطب الدین گوپاموی قدس سرہٗ

آپ گوپامؤ کے شرفاء اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے۔ آپ کے والد ماجد قاضی شہاب الدین[۱] اپنے وقت کے ممتاز علماء میں سے تھے۔

آپ کے والد نے مولوی عبد الرحیم[۲] مراد آبادی سے جو مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی کے شاگرد رشید تھے۔ کمالات علمی حاصل کیے تھے۔ تمام علوم میں خصوصاً علم ہیئت و ہندسہ میں بے مثل و بے نظیر عالم تھے۔ آپ کی وفات سنہ ۱۱۳۰ھ میں واقع ہوئی۔

مولوی قطب الدین اپنے والد ماجد کے شاگرد تھے۔ آپ معقولات و منقولات کے تمام علوم و فنون کے ممتاز اور متبحر عالم تھے۔ علم فرائض میں آپ فن ریاضی کے زبردست ماہر تھے۔ اپنے شاگردوں کو بھی آپ مرتبۂ کمال تک پہونچا دیتے تھے۔

۲۵ رمضان المبارک سنہ ۱۱۶۰ھ کو آپ نے عالم فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ کیا۔ اور جنت الفردوس میں آرام فرما ہوئے۔

راقم الحروف (مولف) کہتا ہے۔ ؎

مولوئی زمانہ قطب الدین　　کرد از عالم فنا رحلت

سال تاریخ او طلب کردم　　ہاتفے گفت وارث جنت

۱۱۶۰ھ

---

(۷۱)

حاجی صفت اللہ خیر آبادی قدس سرہٗ

آپ شیخ الہدیہ[۳] خیر آبادی قدس سرہٗ کی اولاد میں بلند پایہ شیخ اور عالی مرتبت عالم تھے۔ علم ظاہر

---

[۱] بن محمد حسین بن عبد السلام بن شہاب الدین عمری حنفی گوپاموی جو حضرت شیخ محب اللہ عمری الہ آبادی کے نواسہ تھے۔ کتب متداولہ ملا قطب الدین سہالوی سے پڑھیں۔ سنہ ۱۱۲۰ھ کے بعد وفات پائی۔ [۲] بن عبد الرشید بہاری ثم مراد آبادی۔ متوفی تقریباً سنہ ۱۱۱۸ھ۔ ملا عبد الحکیم کی خدمت میں ۷ سال تک رہے۔ شیخ سعد اللہ بگرامی بھی ان کے شاگرد ہیں۔ (نزہۃ الخواطر)۔ [۳] بن مرتضیٰ اللہ بن زین العابدین بن عبد الوالی بن ابو الفتح (۹۰۰ھ) بن نظام الدین المعروف بہ شیخ الہدیہ (۹۹۳ھ) حضرت امام موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں تھے۔ اسی صفی

اور علم باطن دونوں میں اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے۔ علوم عقلی (منطق و فلسفہ وغیرہ) اور نقلی (حدیث و تفسیر و فقہ وغیرہ) میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے میدان فقر و درویشی میں بھی آپ کو اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ مولوی قطب الدین[1] شمس آبادی کے شاگرد رشید اور حاجی عبداللہ سیاح[2] کے مرید ہیں۔ حضرت غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادوں سے آپ نے کئی سال تعلیم حاصل کی۔

آپ کی درسگاہ سے بہت سے علماء اور فضلاء صاحب علم و فضل بن کر نکلے۔ ۱۲۴۲ھ میں آپ نے سفر حج بیت اللہ کے لیے احرام باندھا۔ ارکان حج کی ادائیگی اور زیارت حرمین شریفین کے بعد ایک عرصہ تک وہاں قیام فرمایا اور شیخ محمد طاہر[3] مدنی نوراللہ ضریحہٗ سے سند حدیث حاصل کی۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک وہیں درس حدیث بھی دیتے رہے۔ حرمین شریفین کے تمام علماء آپ کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ اور حد سے زیادہ آپ کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ آپ کے حلقۂ درس میں طلباء کی بڑی جماعت حاضر و شامل رہتی۔ آپ کے سرچشمۂ فیض سے فائدہ اٹھا کر علماء کی ایک کثیر تعداد علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہوئی۔

راقم الحروف (مؤلف) نے بھی حرمین شریفین کے اکثر علماء سے آپ کی بڑی تعریفیں سنی ہیں جن علماء نے آپ سے علمی استفادہ کیا تھا۔ وہ آپ کے شاگرد ہونے پر فخر کیا کرتے تھے۔

تین بار حج کرنے کے بعد آپ اپنے وطن واپس آئے۔ حرمین شریفین سے واپس آنے کے بعد آپ نے علوم عقلیہ (منطق و فلسفہ وغیرہ) کی تعلیم و تدریس بالکل بند کر دی اور زندگی کے آخری ایام تک تفسیر و حدیث پڑھانے اور وعظ و تذکیر میں مشغول رہے۔

اس کے علاوہ آپ اپنے اکثر اوقات تزکیۂ باطن، مجاہدۂ نفس اور عبادت و ریاضت میں صرف فرماتے تھے۔

۱۱۳۲ھ میں آپ بلگرام تشریف فرما ہوئے۔ اور علامہ مرحوم میر عبدالجلیل سے ملاقات کے لیے

سابقہ حاشیہ:۔ وجہ ان کو رشوی بھی کہا جاتا ہے۔ رسالہ قطبیہ میں مرقوم ہے کہ حاجی صاحب مذکور نے شیخ قطب الدین سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان سے شیخ مبارک بن دائم عمری گوپاموی (۱۱۶۲ھ) سید محمد طاہر رضا بجھانپوری اور شیخ محمد نے علم حاصل کیا۔ (نزہۃ الخواطر)۔

[1] متوفی ۱۱۲۱ھ تاریخ وفات "عفت شعار"

[2] میر سید الدین پھلواروی کے مرید و خلیفہ تھے عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام تھا۔ ۱۱۱۵ھ میں انتقال فرمایا۔ تاریخ وصال "غاب قطباً" ہے [3] بن ابراہیم کردی مدنی ۱۱۳۵ھ ۔ ۱۷۳۳ء۔ ابو طاہر مدنی کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ "انفاس العارفین" میں ان کا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔ شیخ محمد طاہر مدنی نے "خزانہ بغدادیہ" کا اختصار بھی تحریر فرمایا ہے۔ (سلک الدرر، انسان العین فی مشائخ الحرمین۔ فہرس الفہارس)۔

میر صاحب کے دیوان خانہ میں تشریف لائے۔ اسی سلسلہ میں مجھ کو بھی ان کی زیارت باسعادت کا شرف حاصل ہو گیا۔

۱۰ ذیقعدہ بروز پنجشنبہ ۱۱۶۰ھ میں آپ نے اس عالم فانی کو خیرباد کہہ کر عالم جاودانی کی راہ لی۔ اور رحمت الٰہی کی آغوش میں پہنچ کر ابدی سکون و راحت حاصل کی۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حاجی صفت اللہ کی تاریخ وفات "ملا نظام الدین" نکلتی ہے جو اُن کے معاصر تھے۔ جن کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

راقم الحروف نے انکی تاریخ وفات یوں کہی ہے۔ ؎

بحر عرفان صفت اللہ کہ بود　　　عالم عامل والا مرتبت
خامۂ فکرت من تاریخش　　　زد رقم "صدر نشین جنت" ۱۱۶۰ھ

آپ کی عمر شریف اسی۸۰ سال تھی۔ مزار پاک خیر آباد میں ہے۔ آپ کے فرزند سعید مولوی احمد اللہ[1] نے حدیث و تفسیر اور فقہ وغیرہ اپنے والد ماجد سے پڑھی اور علوم فلسفہ و منطق وغیرہ شیخ کمال الدین محمد[2] سہالوی فتحپوری کی خدمت میں پڑھے۔

آپ نے اپنی ساری زندگی طالبین حق اور شائقین علم و فضل کو علوم ظاہری و باطنی سے فیضیاب کرنے نیز رشد و ہدایت اور تزکیۂ باطن میں صرف کر دی۔

غرۂ ماہ رجب ۱۱۷۶ھ میں آپ اس دار فانی سے رحلت فرما کر عالم قدس میں آرام فرما ہوتے اور اپنے والد ماجد کے احاطۂ مزار کے متصل دفن ہوئے۔

۷۲

شیخ کمال الدین محمد سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ سہالی کے رہنے والے انصاری شیوخ میں سے ہیں اور ملا نظام الدین سہالوی قدس سرہٗ کے

---

[1] مولوی احمد اللہ کا سن ولادت ۱۱۳۲ھ ہے۔ مولوی غلام امام متوفی ۱۱۸۰ھ اور مولوی غلام صدیق متوفی ۱۱۹۵ھ ان کے صاحبزادگان ہیں۔ [2] ابن شیخ محمد دولت ابن محمد یعقوب بن فرید بن سعد اللہ بن احمد بن حافظ الدین انصاری سہالوی فتحپوری یا شیخ محمد یعقوب حضرت محب اللہ الٰہ آبادی کے خواہر زادہ ہیں۔ اور ان کے دادا حافظ الدین بھی شیخ قطب الدین کے دادا ہیں۔ اسی طرح شیخ محمد عاشق ابن عبد الواحد بگرامی کے چچا قاضی محمد دولت ہیں۔ جنھوں نے ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد فتحپور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دہلی جا کر لشکر قنادی جندے (فتاویٰ عالمگیری) میں شامل ہوئے۔ سورت کے قریب اثنائے سفر میں شہادت پائی۔

(نزہۃ الخواطر)

برادران علم زادیں سے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی شادی فتحپور میں جو سہالی سے تین کوس کے فاصلہ پر واقع ہے مخدوم زادوں کے خاندان میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد ماجد کو اس مقام کے قضا کا عہدہ بھی ملا تھا۔ ان دونوں تعلقات کی بنا پر انھوں نے اسی جگہ سکونت بھی اختیار کر لی تھی۔

شیخ کمال الدین محمد فتحپور میں ہی پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد انھوں نے اول سے آخر تک تمام علمی مرحلے ملا نظام الدین سہالوی کی خدمت میں رہ کر طے کیے۔ آپ ملا صاحب کے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور قابل فخر سمجھے جاتے ہیں[1] اپنے استاذ مکرم حضرت ملا نظام الدین سہالوی کے زمانہ سے لے کر تا ایندم یعنی عرصۂ دراز سے تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہیں۔ آپ نے اپنے فیوض و برکات کے ذریعہ علماء و فضلاء کی ایک کثیر جماعت کو علم و فضل کے آخری درجہ تک پہونچا کر صاحب کمال بنا دیا۔

آپ کی تصانیف میں علم کلام میں العروۃ الوثقیٰ اور حاشیہ شرح عقائد جلالیہ[2] بہت مشہور اور مخصوص ہیں۔

حاشیہ[1]: شیخ کمال الدین محمد کے تلامذہ میں محمد برکت بن عبد الرحمٰن الہ آبادی، مولانا محمد حسن (م ۱۱۹۹ھ)، محمد ولی بن قاضی غلام مصطفیٰ لکھنوی (۱۱۹۸ھ) مولانا محمد اعظم سندیلوی (۱۱۹۰ھ) شیخ عبد اللہ بن زین العابدین سندیلوی، شیخ احمد بن صفت اللہ خیرآبادی (۱۱۶۷ھ) وغیرہم ایسے جید علما شامل ہیں۔ ان کی تصانیف میں شرح کبریت الاحمر، العروۃ الوثقیٰ کے علاوہ بہت سے رسائل و حواشی بھی ہیں ۱۱۷۵ھ میں وفات ہوئی۔ "برّد اللہ مضجعہ" تاریخ وفات ہے (نزہۃ الخواطر) شرح عقائد جلالیہ[2]، علامہ جلال الدین محمد دوانی (۸۳۰–۹۱۸ھ / ۱۴۲۷–۱۵۱۲ء) بن مولانا سعد الدین اسعد مشہور فلسفی عالم کی تصنیف ہے۔ جن کی ولادت گازرون کے قریب "دوان" میں ہوئی۔ صاحب ریحانۃ الادب نے اور علامہ زرکلی نے مختلف مقامات پر آپ کی تالیفات کی فہرست تحریر کی ہے۔ منجملہ ان کے: انموذج العلوم، شرح عقائد عضدیہ، حاشیہ علی مباحث امور عامہ، شرح تہذیب المنطق، شرح ہیاکل النور، اخلاق جلالی (فارسی) بہت مشہور ہیں۔

علامہ جلال الدین دوانی نے شرح تجرید الکلام مولفہ محقق علاؤ الدین علی بن محمد معروف بہ قوشجی پر جو شرح جدید کے نام سے مشہور ہے ایک حاشیہ بھی لکھا ہے جو حاشیہ قدیمہ جلالیہ" کے نام سے مشہور ہے امیر سید صدر الدین شیرازی نے بھی قوشجی کی شرح جدید پر حاشیہ لکھا ہے جس میں علامہ دوانی پر اعتراضات کیے ہیں۔ علامہ نے اس پر دوسرا حاشیہ بنام "حاشیہ جدیدہ جلالیہ" لکھ کر امیر صدر الدین کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ امیر صدر الدین نے پھر اس پر حاشیہ لکھا اور اس میں جواب الجواب کے طور پر علامہ کے جواب کا رد کیا۔ پھر علامہ نے اس پر تیسرا رد لکھا اور اس کا نام "الاجد الجلالیہ" رکھا اسی اثنا میں امیر شیرازی انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ امیر غیاث الدین منصور (م ۹۰۰–۹۴۸ھ) اس معرکہ میں سامنے آئے اور انھوں نے "الاجد الجلالیہ" کا رد "تجرید الحواشی" کے نام سے تحریر کیا۔ یہ تمام اعتراضات اور رد ایک مجموعہ کی شکل میں "طبقات الصدائیہ والجلالیہ" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (مقالات الشعراء اور اس پر پیر حسام الدین راشدی کے حواشی)

۷۳

راقم ایں سواد یعنی بندۂ آزاد رحمۃ اللہ علیہ

پہلے بھی راقم الحروف نے فقیر آزاد کے احوال کے ضمن میں روشناسی کا مرتبہ حاصل کیا ہے اب اس انجمن میں بھی اپنے فضیلت مآب بھائی میر محمد یوسف[1] سلمہٗ اللہ تعالیٰ کے حالات کے ضمن میں فقیر نے خود کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا طفیلی بنایا ہے۔ (ان اعزہ کے ضمن میں بھی اپنا تذکرہ کر رہا ہوں) اب میری خواہش یہ ہے کہ میں حرمین شریفین کے سفر کی سرگذشت ارباب توجہ کے سامنے پیش کروں اور اس سوانح حال کو زمزمۂ حجاز کے لیے مخصوص کر دوں۔

میں نے جو جمال جہاں آرائے محمدی کا شیدائی اور حبِّ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے فتراک کا صید بستہ ہوں۔ اپنے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا میں مسجد مکہ معظمہ زادہا اللہ تعالیٰ شرفاً و تعظیماً میں حاضر ہوں اور سید کائنات مفخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے ایک محراب میں قیام فرما ہیں۔ فقیر ناچیز سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس ناچیز غلام کی جانب خاص طور پر متوجہ ہوئے۔ اور نہایت معجز نما انداز سے تبسم فرما کر اس گدائے کوئے مدینہ سے کچھ باتیں دریافت فرمائیں۔

سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال باکمال کی وہ روح پرور و جان بخش حیات نورانیت خصوصاً اس مبارک تبسم کی لمعات ابھی تک اس فقیر کی نگاہوں میں مہمان ہیں۔ اس وقت سے تا ایندم اس فقیر کا یہ عالم رہا ہے کہ جب بھی اس مبارک خواب کی یاد آجاتی ہے دریائے محبت و غلامی جوش مارنے لگتا ہے۔ اور میں اس میں ڈوبنے لگتا ہوں۔

بالآخر اس عنایت و کرم کے جذبۂ و کیف نے مجھے بے خود بنا دیا۔ اور میری ناتوانی اور کم حوصلگی کو طاقت پرواز بخش دی۔ اور آسمان پر برق تپاں و دواں جیسی ہمت عطا فرمائی۔ چنانچہ دو شنبہ کے دن ماہ رجب ۱۱۵۰ھ میں فقیر نے پیادہ پا یکہ و تنہا اپنا رخت سفر باندھ لیا اور اعزہ و احباب کو اپنے اس ارادہ کی کوئی خبر نہیں دی۔ اس اندیشہ سے کہ اگر ان لوگوں کو میرے اس عزم کی اطلاع ہو گئی تو میرے مقصد میں حائل ہوں گے۔

راقم الحروف نے اس سفر کے تفصیلی واقعات پر مشتمل ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ جس کا نام "طلسم اعظم" رکھا ہے اور یہی نام اس سفر کے آغاز کی تاریخ بھی ہے۔

---

[1] میر محمد یوسف ۱۱۴۲ھ مؤلف کتاب کے خالہ زاد بھائی تھے۔ (فاخری)۔

راقم الحروف اپنا مقصد اس طرح شروع کرتا ہے ؎

دم صبح کہ مہر عالمتاب | سر برآورد از نشیمن خواب
جلوہ گر شد بہ کرسیِ مینا | با دلِ گرم و دیدۂ بیضا

(چودہ اشعار ہیں بوجہ طوالت چھوڑ دیئے گئے۔ اہلِ ذوق فارسی میں اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں)

(فارسی)

فقیر کے گھر والوں کو تین دن کے بعد اطلاع ہوئی۔ سب حیرت زدہ رہ گئے۔ فقیر کے اعیانی بھائی سید غلام حسن غفران پناہ نے تین منزل تک فقیر کا تعاقب کیا۔ آخر کار یہ دیکھ کر قید سے آزاد شدہ آہو کے وحشی کو دوبارہ پکڑنا اور اس پر قابو پانا بڑا مشکل ہے بحالت مایوسی واپس چلے گئے۔ دور بینی کے پیش نظر فقیر نے اپنا جوتا الٹ کر پہن لیا۔ اور ایک گم نام اور غیر معروف راستہ اختیار کیا۔ فقیر کو اثنائے سفر میں جو تکلیفیں جھیلنی پڑیں ان کی تفصیل زبانِ قلم سے سماعت فرمایئے۔

داغ ایں راہ مرغِ وہم وخیال | زخم مقراض بیم در پر و بال
رہزنان صف کشیدہ چوں صف خار | ہمہ مضراب تشنۂ رگ تار
برنہ خیز در پا نتادۂ او | مار خوابیدہ است جادۂ او
پیک ایں راہ تیز ناوک دار | جامہ از تن کند دم رفتار
رہزنش کاسہ از گدا گیرد | خارا و دامن ہوا گیرد

الغرض مالوا کے مضافات میں سرونج نامی مقام کی حدود تک فقیر نے پیادہ پا راستہ طے کیا۔ چونکہ فقیر اس سے پہلے پاپیادہ چلنے کا عادی نہیں تھا اس لیے پیروں میں اتنے چھالے پڑ گئے کہ پاؤں خوشۂ انگور معلوم ہوتے تھے۔ کانٹوں کی نوکوں نے چھالوں کو چھید کر چھلنی بنا دیا تھا۔ پیروں کے تلوے گویا بھڑوں کے چھتے بن گئے تھے۔

می بریدم رہے بہ بے پائی | با رفیقے کہ بود تنہائی
صبح تا شام راہ می رفتم | خوں چکاں تر ز آہ می رفتم
ہمہ کہسار و دشت ناہموار | قدم مور و ایں رہِ دشوار
ہر قدم رود ہا و جیحونہا | چوں دم تیغ تشنۂ خونہا
موج خوناب وجوشِ آبلہا | ریخت در راہ رنگ سلسلہا
ہر کجا دست زد بدامن دل | کرد شمشیر کلفتم بسمل

حسن اتفاق سے نظام الملک نواب آصف جاہ طاب ثراہ (اول بانی سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن) کا لشکر ان دنوں مالوہ کے علاقہ میں خیمہ زن تھا۔ تقدیر الٰہی نے فقیر کو اپنی مخصوص عنایت سے نوازا۔ نواب موصوف

نے نیمر کا ہ تک پہونچا دیا اور ایک کرم فرمانے جس سے اس سے پہلے فقیر کی کوئی ملاقات یا تعارف نہ تھا۔ نہایت ادب و احترام کے ساتھ اپنے مہمان خانہ میں لے جا کر ٹھہرایا اور نہایت نیازمندی اور عقیدت کے ساتھ پُرتپاک مہمان نوازی کی یہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت آراستہ و پیراستہ "رتھ" میری سواری کے لیے بھی مجھے عنایت فرمایا۔

اس "رتھ" کے اوصاف فقیر کی زبانِ قلم سے سماعت فرمایئے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

رتِ رنگین لباس و خوش الواں | راہ رفتہ بسانِ تخت رواں

بارہ اشعار ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ترک کیے جاتے ہیں۔ صاحبِ ذوق حضرات اصل کتاب فارسی میں ملاحظہ فرمائیں۔ (فاخری)

اسی سال ۲۲ رشعبان کو نواب آصفجاہ طاب ثراہ سے شرفِ ملاقات بھی نصیب ہوا۔ اور فقیر نے ان کی شان میں مندرجہ ذیل رباعی پیش کی۔

اے حامیٔ دیں محیط جود و احساں | حق داد ترا خطاب آصف شایاں

او تخت بدرگاہ سلیماں آورد | تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

اس فقیر نے قدرت کلام اور موزونیٔ طبع کے باوجود تمام عمر امراء اور رؤسا کی مدح سرائی کے لیے کبھی زباں نہیں کھولی لیکن یہ رباعی محض سفرِ حج میں استعانت کے خیال سے نوکِ زباں پر آگئی۔ علاوہ ازیں دو اشعار عربی زبان میں بھی اسی موضوع پر کہے گئے ہیں۔ جو کتاب کے دوسرے حصہ میں نواب نظام الدولہ شہید کے تذکرہ میں لکھے جائیں گے۔

چونکہ نواب آصف جاہ اس علاقہ میں مرہٹوں کی سرکش فوجوں کو شکست دینے اور ان کی سرکوبی کی طرف مائل اور متوجہ تھے۔ اس لیے رمضان کے پورے مہینہ تک شہر بھوپال کے اطراف میں جنگ کے شعلے بھڑکتے اور قیامت کے سے زلزلے پیدا ہوتے رہے۔ اس میدان میں بھی فقیر کے اسپ قلم نے اپنی جولانی دکھائی ہے اس نظم کا مطلع یہ ہے۔

فوج اسلام و کفر صف آراست | طرفہ شورِ قیامتے برپا است

یہاں بھی آٹھ اشعار متروک کیے گئے ہیں۔ (فاخری)

انجام کار رمضان کی آخری تاریخوں میں صلح ہو گئی اور نواب صاحب کی عنایت اور اعانت سے فقیر کو حسبِ منشا زادِ راہ کے ساتھ سواری بھی عطا ہوئی۔

ماہِ شوال کی ابتدائی تاریخوں میں فقیر شہر بھوپال سے سفرِ حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور ۲۱ رشوال کو برہانپور کی خوشگوار اور پرمسرت فضاؤں میں پہونچ گیا۔ پھر اسی سال ماہِ ذیقعدہ کی دسویں تاریخ کو بندرگاہ "سورت" پہونچ گیا۔ اور ۲۴ ر ذیقعدہ کو جہاز پر سوار ہو کر خشکی سے سمندر میں آگیا بابت ۱۱۵۱ھ کے

ذی الحجہ کا چاند فقیر کو سمندر ہی میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

محرم الحرام کی ۱۸ تاریخ کو جہاز جدہ کے ساحل سے جا لگا۔ ۱۹ محرم کو میں جدہ کے مبارک شہر میں داخل ہو گیا۔

شیخ محمد فاخر متخلص بہ زائر الہ آبادی جن کا تذکرہ دوسری جلد میں آئے گا۔ اس وقت جدہ میں تشریف فرما تھے۔ ایک جہازی مسافر سے جس کا جہاز میرے جہاز سے دو روز قبل جدہ پہنچ چکا تھا۔ فقیر کے آنے کی اطلاع پاکر جدہ کی بندرگاہ پر سمندر کے کنارے اس فقیر کا انتظار فرما رہے تھے۔

جیسے ہی میں نے اپنا قدم سمندر سے (جہاز سے اتر کر) خشکی پر رکھا ان سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات سے فقیر کو بہت مسرت و انبساط حاصل ہوا۔ محرم کی تیئسویں تاریخ کو مکہ معظمہ شرفہا اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر پہنچنے کی سعادت نصیب ہوئی اور بیت اللہ کی چوکھٹ پر ناصیہ سائی کا شرف مجھے میسر آیا۔

چونکہ مدینہ منورہ کی زیارت کا شوق اور جذبہ دل میں موجزن تھا اور صبر و تحمل کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ لہذا ۲۶ محرم کو بعد نماز جمعہ فقیر نے دفعۃً مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا۔

صفر کی ۵ / ۷ تاریخ کو کہ یہی تاریخ اس فقیر کی تاریخ ولادت بھی ہے سحر کے وقت مدینہ منورہ کی خاک پاک کو سرمۂ بصیرت بنانے کی سعادت نصیب ہوئی اور چشم آرزو کو قبۂ اقدس سے مس کرنے کی توفیق خیر رفیق سے نوازا گیا۔

مدینہ طیبہ کے قیام کے مہینوں میں فقیر نے حضرت مولائی و استاذی شیخ محمد حیات سندھی المدنی نور اللہ ضریحہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صحیح بخاری کی سند لی۔ اور صحاح ستہ نیز تمام مفردات کی بھی اجازت کے شرف سے مالا مال کیا گیا۔

اکثر راتوں میں فقیر مسجد نبوی میں حجرۂ مبارکہ اور منبر شریف کے درمیان بیٹھ کر صحیح بخاری شریف کا مطالعہ کرتا۔

انھیں لمحات میں فقیر کی زبان عقیدت و محبت ترجمان سے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کے حضور میں ایک نعت بھی ادا ہو گئی جو درج ذیل ہے:-

نمود جلوہ اعجاز شمع مطلبی — نہ ماند شوخی چشم شرار بولہبی
فدائے خاصیت وادی عقیق شوم — کہ گرد ریگ روانش علاج تشنہ لبی

---

[1] شیخ محمد فاخر زائر بن شاہ محمد یحیٰ عرف شاہ خوب اللہ الہ آبادی۔ حضرت شاہ محمد افضل الہ آبادی قدس سرہٗ کے نواسہ اور خانقاہ افضل کے (جو بعد میں حضرت زائر کے برادر زادہ شاہ محمد اجمل کے نام سے موسوم ہوگئی) سجادہ نشین تھے۔ پیدائشی ولی تھے۔ محدث اور عالم باعمل تھے۔ مؤلف کتاب مآثر الکرام سے مراسم دیرینہ رکھتے تھے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ ہر دو حضرات ایک ہی سلسلہ محمدیہ ابو العلائیہ کے خوشہ چیں تھے۔ فقیر ناچیز مترجم انھیں کی اولاد میں ہے اور ان کا سجادہ نشین ہے۔ (فاخری)

زیارت تو کند آفتاب ہر شب نذر — رود صباح جلو ریز جانب عربی
زبسکہ ذوقِ شکست تو داشت ساغر ماہ — گرفت زنگ نزاکت زشیشۂ حلبی
خوش است حسن تقاضا ز باغبان کریم — نصیب ذائقہ ام کن حلاوت رطبی
بہ آفتاب نبوت رسانده ایم نسب — تواں ز ذرۂ ما دید نور خوش نسبی
بہ ملک ہند چو من نیست طوطیٔ آزاد — کہ کرد تربیت من شکر لب عربی

عربی زبان میں ایک قصیدہ بھی لکھا جس کو دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بموقعۂ حاضری مواجہہ شریف میں پڑھ کر سنانے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ قصیدہ بھی "تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد" نامی مجموعہ میں جو آجکل عربی زبان میں تحریر کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ درج کیا جائے گا۔

اسی سال ۱۴ر شوال کو فقیر نے دربار دُر بار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے فریضۂ حج ادا کرنے کی اجازت حاصل کی۔ ۲۶ر شوال کو مکہ مکرمہ میں دوبارہ حاضری کی عزت نصیب ہوئی اور ذی الحجہ میں فقیر کو ارکان حج کی ادائیگی سے فراغت نصیب ہوئی۔ وقوفِ عرفات جمعرات کو کیا گیا۔ ادائے حج کی تاریخ "عمل اعظم" سے نکالی گئی۔

اللھم اصلح لنا اعمالنا وحقق آمالنا بالرکن والمقام وعتبۃ سید الانام علیہ وعلی آلہ وصحبہ الوف الصلوۃ والسلام۔

مکہ معظمہ اور طائف میں مجھے حضرت شیخ عبدالوہاب طنطاوی قدس سرہ کی صحبت اور خدمت کا شرف حاصل ہوا۔

فقیر نے آنجناب سے فن حدیث میں بہت سے فوائد کا اکتساب کیا۔ نئے سال ہجری یعنی ۱۱۵۲ھ میں مکہ معظمہ میں قیام کیا گیا۔ اسی سال ربیع الاول شریف میں شہر طائف پُر لطائف اور اس کے مضافات میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اور حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے روضۂ مطہرہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا۔ چنانچہ اس موقع پر میں نے ایک قطعہ بھی آنجناب کی منقبت میں تحریر کیا۔ جو درج ذیل ہے۔

اے صبا رو بہ مزار پسر عم نبی — خاک آں روضہ کم از عنبر تر نشناسی
کردہ ام خوب تماشا چمن طائف را — نرسد ہیچ گلی او بہ گل عباسی

اسی سال ربیع الثانی کے آخری ہفتہ میں طواف رخصت سے فارغ ہو کر فقیر جدہ کی بندرگاہ پر واپس آیا۔ پھر جمادی الاولی کی تیسری تاریخ کو جہاز میں سوار ہوا۔ آٹھ دن میں "مخا" کی بندرگاہ پر پہونچ گیا جو "یمن" کی مشہور بندرگاہ ہے۔

جہاز رانوں نے جہاز کو چار دن کے لیے "مخا" کے سامنے روکا تھا۔ اس لیے فقیر کو اس حسین مقام کی سیر کا موقع میسر آگیا۔ خصوصاً حضرت ابوالحسن علی بن عبداللہ شاذلی قدس سرہ کے روضۂ مبارکہ کی زیارت

باسعادت بھی نصیب ہوگئی ۔ اور ان کے فیوض و برکات سے فقیر مالا مال ہوا۔ ۲۹ رجمادی الاولیٰ کو ہمارا جہاز بندرگاہ سورت کے ساحل پر پہونچا۔ جمادی الآخر کی دوسری تاریخ کو میں اس مبارک بندرگاہ پر اترا اس طرح میرا "حجاز" کا سفر تمام ہوا اور فضل الہٰی سے سفر سے واپسی کی تاریخ بھی "سفر بخیر" ۱۱۵۲ھ سے نکالی گئی۔

"رب اختم سفرنا بالخیر والسلامۃ وارزقنا ثقل الموازین یوم القیامۃ بجاہ فیض خاتم جلالہ وخاتم صحیفۃ الرسالۃ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ افضل الصلوٰۃ واکمل التسلیمات"

اور مندرجہ ذیل غزل مکہ معظمہ کی یاد اور مدینہ منورہ کے جوش محبت میں فقیر نے عرض کی ہے :-

من از بوس حجر در کعبہ دل را شاد میکردم
مسی مالیدہ یاقوتِ کسے را یاد میکردم

زیارت می نمودم کعبہ را از گردش رنگی
بحکم شوق طوفِ تازہ ایجاد می کردم

دریں دار الاماں مشتاق تیغ قاتلے بودم
زبیتابی طواف خانۂ صیاد می کردم

چو آواز جرس از کارواں ہم پیش میرفتم
بیاد لیلیٰ محمل نشیں فریاد می کردم

بصحراہا غزالاں را سلام از دور می گفتم
بگلشنہا زمین بوسِ گل و شمشاد می کردم

زعکس غیر صافی داشتم آئینۂ دل را
بصاحب خانۂ ایں خانہ را آباد می کردم

اگر آزاد پائے سعی من از کار واماندے   بپائے ہمت والائے خود امداد می کردم

"اب اس تاریخی گلِ ہر رنگ کو دیکھنا چاہیئے جس کو میں نے قدرتِ الہیہ کے چمن اور معجزۂ نبویہ کے گلشن سے چُنا ہے اور اس بہترین عطر کو سونگھنا چاہیئے جس کو میں نے دریائے رحمت خداوندی سے تیار کیا ہے:

ایں نامۂ خاص روح پرور   ما طیبہ، تمامہ مسک
انجام بعونِ ایزدی یافت   تاریخ شنو "ختامہ مسک"
۱۱۶۶ھ

ت م ت

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ

کی

مشہورِ زمانہ نثری تصنیف

فیہ مافیہ

(ملفوظات مولانا رومیؒ)

کا

بہترین ، دلکش اور شستہ و رواں

اُردو ترجمہ

مع مقدمہ

از

حضرت شمس بریلوی

مصنف و مترجم غنیۃ الطالبین" اورنگزیب خطوط کے آئینہ میں عوارف المعارف و تاریخ الخلفاء

ناشر:-

رومی پبلشنگ کمپنی ، صدر کراچی

تاریخ
نعت گوئی

عربی، فارسی اور اُردو زبان میں صنف نعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم
کا
تدریجی ارتقاء
اور
عربی، فارسی اور اُردو زبان کی
بہترین اور بلند پایہ نعتوں کا
انتخاب

مرتبہ:
حضرت شمسؔ بریلوی و مولانا شاہ خالد میاں فاخری

ناشر:
دائرۃ المصنّفین، کراچی
پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵۰۴، کراچی نمبر ۱۹